الرسالہ

Al-Risala

January 2000 • No. 278 • Rs. 10

مشکل اوقات ہر ایک پر آتے ہیں، مگر وہ مشکل صرف اس شخص کے لیے بنتے ہیں جو مشکل وقت میں اپنے حواس کھو بیٹھے۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00	دعوت اسلام	0.00
اسلام ایک تعارف	80.00	ڈائری (جلد اول)	80.00	دعوت حق	0.00
اللہ اکبر	45.00	کتاب زندگی	65.00	نشری تقریریں	0.00
پیغمبر انقلاب	50.00	اقوال حکمت	25.00	دین انسانیت	0.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00	تعمیر کی طرف	8.00	فکر اسلامی	0.00
عظمت قرآن	35 00	تبلیغی تحریک	20.00	شتم رسول کا مسئلہ	0.00
عظمت اسلام	50 00	تجدید دین	25.00	طلاق اسلام میں	5.00
عظمت صحابہ	7.00	عقلیات اسلام	35.00	مضامین اسلام	0.00
دین کامل	60.00	قرآن کا مطلوب انسان	8 00	حیات طیبہ	7.00
الاسلام	45 00	دین کیا ہے؟	7.00	باغ جنت	7.00
ظہور اسلام	50.00	اسلام دین فطرت	7 00	نار جہنم	7.00
اسلامی زندگی	40 00	تعمیر ملت	7.00	خلیج ڈائری	0.00
احیاء اسلام	35.00	تاریخ کا سبق	7 00	رہنمائے حیات	7.00
راز حیات	65.00	فسادات کا مسئلہ	5.00	تعدد ازدواج	7.00
صراط مستقیم	40 00	انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00	ہندستانی مسلمان	0.00
خاتون اسلام	60 00	تعارف اسلام	5.00	روشن مستقبل	7.00
سوشلزم اور اسلام	50.00	اسلام پندرہویں صدی میں	5.00	صوم رمضان	7.00
اسلام اور عصر حاضر	30 00	راہیں بند نہیں	12.00	اسلام کا تعارف	4.00
الربانیہ	40.00	ایمانی طاقت	7 00	علما اور دور جدید	3.00
کاروان ملت	45 00	اتحاد ملت	7.00	سفر نامہ اسپین و فلسطین	0.00
حقیقت حج	30 00	سبق آموز واقعات	7.00	مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	2.00
اسلامی تعلیمات	35.00	زلزلہ قیامت	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	3.00
اسلام دور جدید کا خالق	25 00	حقیقت کی تلاش	8.00	یکساں سول کوڈ	5.00
حدیث رسول	40 00	پیغمبر اسلام	5.00	اسلام کیا ہے؟	3.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00	آخری سفر	7.00	میوات کا سفر	5.00
راہ عمل	25.00	اسلامی دعوت	7 00	قیادت نامہ	5.00
تعبیر کی غلطی	80 00	حل یہاں ہے	10.00	مطالعہ سیرت	0.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00	سچا راستہ	8.00	منزل کی طرف	4.00
عظمت مومن	7 00	دینی تعلیم	7.00	اسباق تاریخ	5.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00	امہات المومنین	20.00		
تاریخ دعوت حق	5 00	تصویر ملت	85.00		

Date 27-5-02

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

جنوری 2000 شمارہ 278

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 059.

جنت کی زندگی

جاپان کے سفر (دسمبر ۱۹۹۰) میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ میں نے کہا
موجودہ دنیا عارضی جگہ ہے اور آخرت ابدی قیام کی جگہ۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی "جنت" ابد
دنیا میں تعمیر کرے۔ انہوں نے کہا: انسان کسی راحت یا لذت کی چیز سے تھوڑی دیر کے بعد آ
جاتا ہے۔ چنانچہ جدید ترقی یافتہ دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر اکتاہٹ (boredom) کا مسئلہ پ
ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں ابدی جنت سے کیا فائدہ۔

جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ ہمیشہ سے یہی بات کہتے آرہے ہیں۔ مگر یہ صرف ایک
مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ اکتاہٹ استعداد تلذذ کے خاتمہ کی بنا پر آتی ہے نہ کہ خواہش تلذ
کے خاتمہ کی بنا پر۔

ان حضرات نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جب ہم کسی لذت سے انجوائے (enjoy) کر
چاہتے ہیں تو کچھ دیر بعد اس سے ہمارا جی بھر جاتا ہے۔ اور پھر اس میں ہمارے لئے لذت باقی نہی
رہتی۔ مگر یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ا
اندر غیر تسکین پذیر فطرت (insatiable nature) رکھتا ہے۔ انسان کو جو چیزیں مرغوب ہیں
ان سے وہ ابدی طور پر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔

مگر موجودہ دنیا میں انسان بے شمار محدودیتوں (limitations) کا شکار ہے۔ چنانچہ انسا
جب بھی کسی مرغوب چیز سے انجوائے کرنا چاہتا ہے تو تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی محدودیہ
اس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ رغبت کے باوجود وہ اس چیز سے انجوائے کرنے کی طاقت کھود
ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم ایک لذیذ چیز کھاتے ہیں تو اس چیز کی لذت ہمارے لئے ختم نہ
ہوتی بلکہ ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے، اس لئے ہم کو اسے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح اکثر دولت
لوگ رغبت کے باوجود چیزوں کو کھانا چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ انہیں اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ م

ہو کر طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے۔

یہی حال تمام دوسری لذتوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکتاہٹ یا بے رغبتی ہماری انجوائے کرنے کی استعداد کی حد ہے نہ کہ خود رغبت کی حد۔

جنت وہ جگہ ہے جہاں نہ صرف یہ ہوگا کہ تمام لذتیں مزید اضافہ کے ساتھ زیادہ مکمل حالت میں انسان کو دی جائیں گی، بلکہ ان لذتوں سے انجوائے کرنے کی استعداد کے سلسلہ میں اس کی محدودیت بھی ختم کردی جائے گی۔ جنت میں یہ تضاد ختم ہو جائے گا کہ آدمی انجوائے کرنا چاہتا ہے مگر اپنی کسی کمی کی بنا پر وہ اپنی مرغوب چیزوں سے انجوائے نہیں کرپاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت انسان کے لئے ابدی خوشیوں کی جگہ بن جائے گی۔

دنیا میں آدمی کو جس اکتاہٹ (بورڈم) کا تجربہ ہوتا ہے وہ دراصل ایک تضاد کا نتیجہ ہے۔ آدمی پیدائشی طور پر ایک معیار پسند (idealist) مخلوق ہے۔ وہ چیزوں کو ان کی آئیڈیل صورت میں پانا چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا میں ہر چیز غیر معیاری یا غیر آئیڈیل ہے۔ یہاں بورڈم کا اصل سبب یہی ہے۔

آدمی اپنے شوق کے تحت ایک چیز کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کو پانے سے پہلے وہ اس فریب میں رہتا ہے کہ یہ عین وہی آئیڈیل چیز ہے جس کا وہ طالب تھا۔ مگر حاصل کرلینے کے بعد جب وہ اس کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے مطلوب آئیڈیل سے بہت کم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کو تلاش کی لذت تو ملتی ہے مگر یافت کی لذت اسے نہیں ملتی۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے فریب لذت ہے اور آخرت میں حقیقی لذت۔ آخرت کی ہر چیز معیاری ہوگی۔ اس بنا پر وہ آدمی کے لئے حقیقی اور لامحدود لذت کا ذریعہ بن جائے گی۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے وہ جنت میں اس کو مزید اضافہ کے ساتھ مل جائے گا، اس لئے وہاں اس کے لئے اکتاہٹ کا کوئی سوال نہ ہوگا۔

اسلامی جہاد

جہاد زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ جس چیز کو ہم عمل یا جدو جہد (struggle) کہتے ہیں اسی کا عربی مترادف جہاد ہے۔ جہاد نہ کوئی پر اسرار چیز ہے اور نہ وہ تشدد کے ہم معنی ہے۔ وہ سادہ طور پر بھرپور کوشش کے لئے بولا جانے والا ایک لفظ ہے۔

اردو میں ہم کہتے ہیں کہ جب میں بڑا ہوا اور جدو جہد حیات کے مرحلہ میں داخل ہوا۔ اسی طرح عربی میں کہا جاتا ہے کہ بذل جهده، اس نے اپنی پوری کوشش صرف کی۔ اسی طرح انگریزی میں کہتے ہیں کہ :

We must struggle against this prejudice

کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا ایک عام انسانی صفت ہے۔ اس کے لئے جس طرح ہر زبان میں الفاظ ہیں اسی طرح عربی زبان میں بھی الفاظ ہیں۔ جہاد کا لفظ بھی اصلاً یہی مفہوم رکھتا ہے۔ کوشش کے لئے عربی میں سعی ایک عام لفظ ہے۔ لیکن جہاد کے لفظ میں مبالغہ کا عنصر شامل ہے۔ یعنی بہت زیادہ کوشش کرنا۔

البتہ یہاں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ جب ہم کوشش یا جدو جہد یا اسٹرگل کا لفظ بولیں تو اس میں ثواب یا عبادت کا مفہوم شامل نہیں رہتا۔ لیکن جہا کا لفظ جب اسلامی اصطلاح بنا تو اس میں اصطلاحی طور پر یہ مفہوم بھی شامل ہو گیا۔ یعنی کوشش کے معنی اگر صرف کوشش کے ہیں تو جہاد کا مطلب ایک ایسی کوشش کرنا ہے جو عبادت ہو اور جس میں مشغول ہونے پر انسان کو ثواب حاصل ہوتا ہو جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: جاهدوا في الله حق جهاده.

جہاد لغت میں

جہاد کی اصل جُهد ہے۔ اس کے معنی کوشش کے ہیں مگر جہد کے مادے میں مبالغہ کا مفہوم ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے : جهد اللبن (کوشش کر کے سارا مکھن نکال لینا) اور اجهد

الدابة(جانور کے اوپر طاقت سے زیادہ لادنا)اسی طرح کہا جاتا ہے **بذل جهده**(اس نے اپنی پوری طاقت صرف کی)اسی طرح کہا جاتا ہے: **لابلغن جهيداى فى الامر** (میں معاملہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا) جہاد یا مجاہدہ کا مفہوم بھی یہی ہے قرآن میں آیا ہے کہ: **جاهدوا فى الله حق جهاده** (اللہ کے راستہ میں پوری کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے)

مشہور عربی لغت لسان العرب میں بتایا گیا ہے کہ جہد کے معنی مبالغہ آمیز کوشش کے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے: **جهدت جهدى واجتهدت رأى ونفسى حتى بلغت مجهودى** (ص: ۱۳۳) یعنی میں نے ہر طرح اپنی پوری کوشش کی یہاں تک کہ میں اپنی آخری کوشش تک پہنچ گیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: **جهد الرجل فى كذا اى جد فيه وبالغ**۔ (آدمی نے معاملے میں کوشش کی اور اپنی پوری کوشش کر ڈالی) جہاد یا اجتہاد کا مطلب ہے: **بذل الوسع فى طلب الامر** (کسی کام میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا)

حالات کی نسبت سے کبھی جہاد یا جدوجہد کا یہ عمل دشمنوں سے مقابلہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت، باعتبار استعمال نہ کہ باعتبار لغت، اس میں محاربہ کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام راغب اصفہانی نے استعمال کی نسبت سے جہاد کی تین قسمیں بتائی ہیں: ظاہری دشمن سے مقابلہ اور شیطان سے مقابلہ اور نفس سے مقابلہ(**والجهاد ثلاثة اضرب: مجاهدة العدو الظاهر، ومجاهدة الشيطان، ومجاهدة النفس**)۔

جہاد قرآن میں

قرآن میں بھی جہاد یا اس کے مشتقات اسی معنی میں آئے ہیں جس معنی میں وہ لغتِ عرب میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی کسی مقصد کے لئے مبالغہ آمیز کوشش کرنا۔ لفظ "جہاد" قرآن میں چار بار استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ یہ لفظ کوشش اور جدوجہد کے معنی میں ہے نہ کہ براہِ راست طور پر جنگ و قتال کے معنی میں۔

اس سلسلہ میں پہلی قرآنی آیت کا ترجمہ یہ ہے: کہو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے

لڑکے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راستہ نہیں دیتا۔ (التوبہ ۲۴)

اس آیت میں اہل اسلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کی حد تک جاکر اسلام کے دعوتی مشن میں پیغمبر کا ساتھ دیں۔ خواہ اس کام میں ان کے ذاتی مفادات مجروح ہوں یا مال اور تجارت کا نقصان ہو یا جسمانی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں، ہر حال میں وہ اس دعوتی مشن میں پیغمبر کے ساتھی بنے رہیں۔ اس آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ اصلاً پیغمبر کے دعوتی مشن کے لئے آیا ہے نہ کہ جنگ کے لئے۔

قرآن کی دوسری سورہ میں حکم دیا گیا ہے کہ: تم منکرین کی بات نہ مانو اور ان کے ساتھ قرآن کے ذریعہ جہاد کبیر کرو (الفرقان ۵۲) اس آیت میں واضح طور پر جہاد سے مراد دعوتی جہاد ہے۔ کیوں کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ لفظ تیسری جگہ قرآن میں اس طرح آیا ہے: **ان كنتم خرجتم جهادا في سبيلي وابتغاء مرضاتي** (الممتحنہ ۱) یعنی اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضامندی کی طلب کے لئے نکلے ہو۔ یہ آیت فتح مکہ سے کچھ پہلے اتری۔ مدینہ سے مکہ کا سفر جنگ کے لئے نہ تھا۔ وہ دراصل ایک پرامن مارچ تھا جو صلح حدیبیہ کی صورت میں نکلنے والے پرامن نتائج کو حاصل کرنے کے لئے کیا گیا۔ چنانچہ اس موقع پر ایک مسلمان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: **اليوم يوم الملحمة** (آج کا دن لڑائی کا دن ہے) یہ سن کر رسول اللہ نے فرمایا کہ نہیں، آج کا دن رحمت کا دن ہے: **اليوم يوم المرحمة**۔ چوتھی بار قرآن میں یہ لفظ اس طرح آیا ہے: **وجاهدوا في الله حق جهاده** (الحج ۷۸) یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔ اس آیت میں جہاد سے مراد دعوتی جہاد ہے۔ یہ حقیقت اس کے سیاق سے بالکل واضح ہے۔

حکمتِ اعراض

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ میں لکھتے ہیں: میں نے ہندی اخبار ''ہندستان'' کا شمارہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ پڑھا۔ اس کے اداریہ میں یہ لکھا تھا کہ حال میں سورت (گجرات) میں ''گنیش وسرجن'' کا جلوس نکلا۔ اس موقع پر پولیس اور جلوس کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ پتھراؤ اور فائرنگ کے نتیجہ میں جلوس کے آٹھ افراد ہلاک اور کئی درجن زخمی ہو گئے۔ یہ جلوس شہر کے مسلم محلّہ کی ایک مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلم اور ہندو یا مسلم اور پولیس کے درمیان لڑائی ہو جاتی مگر عملاً اس کا الٹا ہوا۔ مسلمانوں نے وہاں پر صبر کا رویہ اپنایا جس کی وجہ سے انھیں اس کا پھل مل گیا۔ اس میں کسی بھی مسلمان کا نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ ٹکراؤ انتظامیہ اور ہندوؤں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ پڑھ کر آپ کی وہ بات یاد آگئی جو آپ ''الرسالہ'' یا کئی دیگر کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ (سہیل احمد، حسن البنا منزل، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ)

''سورت'' کا یہ واقعہ تمام اخباروں میں آچکا ہے۔ اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سبق کی طرف الرسالہ میں بار بار نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ ـــــ مسلم کش فسادات کا اصل سبب جلوس کا نکلنا اور اس کا مسلم محلّہ سے گزرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جب جلوس نکلے تو محلّہ والے اس کے مقابلہ میں غیر حکیمانہ رویہ اختیار کریں۔ حکیمانہ رویہ ہمیشہ حفاظت کا ضامن ہوتا ہے اور غیر حکیمانہ رویہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔

اس معاملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جلوس کے وقت وہاں کے مسلمان اگر منفی رد عمل کا طریقہ اختیار کریں تو مسئلہ مسلم ورسس پولیس بن جائے گا۔ اور اگر وہاں کے مسلمان ایسے موقع پر اعراض کا رویہ اختیار کریں تو سارا مسئلہ جلوس ورسس پولیس بن جائے گا۔ اس اصول کی صداقت بار بار فسادات کی صورت میں سامنے آچکی ہے۔ سورت کا مذکورہ واقعہ اس حکمت کی

یک مثبت مثال ہے۔

دور اول کے مسلمان مخالفین کی سازشوں اور زیادتیوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ س وقت نصیحت کرتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰) اب یہ غور کیجئے کہ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں صبر کس طرح ڈھال بن جاتا ہے۔ اور زیر سازش گروہ کو اس کے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آئے تو اس کے مقابلہ میں رد عمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اشتعال انگیز صورت حال کو دیکھ کر آدمی بھڑک اٹھے اور فوری جذبات کے تحت جوابی کارروائی کرنے لگے۔ اور دوسرا یہ کہ فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو بلکہ اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملے پر غور کرے۔ اور اس کے بعد جو کچھ کرے ٹھنڈے ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر کرے۔

مذکورہ تقسیم میں پہلی قسم کے رد عمل کا نام غیر صابرانہ رد عمل ہے اور دوسری قسم کے رد عمل کا نام صابرانہ رد عمل۔ دوسرے لفظوں میں اس فرق کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ غیر صابرانہ رد عمل پیش آمدہ صورت حال کا جذباتی جواب (emotional response) ہے۔ اس کے برعکس صابرانہ رد عمل یہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال کے مقابلہ میں جو جوابی کارروائی کی جائے وہ ایک سوچا سمجھا جواب (considered response) ہو۔

صبر کوئی بے عملی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے سامنے کوئی ناپسندیدہ صورت حال پیش آئے تو وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اعلیٰ ترین بہادری ہے۔ جب ایک آدمی بے صبری کے ساتھ جذباتی اقدام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اس کے برعکس جب ایک آدمی صبر والی روش اختیار کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھا۔ اس نے اپنے جذبات کو اپنی عقل پر غالب ہونے نہیں دیا۔

غلط سوچ کا مسئلہ

ماہنامہ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں: آپ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آدمی کے لئے جب کامیابی کا ایک موقع ختم ہو جائے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس کے بعد دوسرا موقع وہیں اس کے لئے موجود رہتا ہے جس سے وہ اپنی ترقی کا سفر دوبارہ شروع کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ آدمی کس طرح جانے کہ یہاں اس کے لئے دوسرا موقع موجود ہے۔ (سہیل احمد، نئی دہلی)

نئے موقع کو پہچاننے کی شرط صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی بند ذہن کے تحت نہ سوچے بلکہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے کے لئے تیار ہو۔ وہ دوسروں کو قصوروار ٹھہرانے کے مزاج سے اپنے آپ کو اوپر اٹھالے۔ اس کی ایک مثال ہندستان کے مسلمان ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے لیڈر اور ہمارے اخبارات مسلمانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ہندستان میں ان کا مقابلہ ہندو اکثریت سے ہے۔ یہاں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد بھی یہی ذہن باقی رہا۔ تمام بولنے والے اور لکھنے والے لوگ مسلمانوں کو یہی منفی سبق دیتے رہے۔ کچھ لوگ اس حد تک گئے کہ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ یہاں کا اکثریتی فرقہ ہندستانی مسلمانوں کے حق میں اس ملک کو دوسرا اسپین بنانا چاہتا ہے۔

اس غوغا آرائی نے مسلمانوں کے ذہن کو اتنا زیادہ بگاڑا کہ وہ سمجھنے لگے کہ ہندستان میں ان کے لئے کامیابی اور ترقی کے مواقع سرے سے موجود ہی نہیں۔ میں ۱۹۴۷ سے اس کے خلاف لکھتا اور بولتا رہا ہوں۔ آخر کار آزادی کے تقریباً ۴۰ سال بعد مسلمانوں کا ذہن بدلنا شروع ہوا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ ہندستان میں ان کے لئے ہر قسم کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں کے مسلمان ہر میدان میں مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام فطرت کے قوانین کے تحت چلتا ہے نہ کہ کسی متعصب فرقہ کے منصوبوں یا سازشوں کے تحت۔ کوئی فرقہ یا گروہ بالفرض چاہے بھی تو فطرت اس کے

راستہ میں رکاوٹ بن جائے گی اور وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹی طرف گھمانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس دنیا کا نظام فطرت کے اٹل قانون کے تحت چل رہا ہے نہ کہ کسی گروہ کی سازش کے تحت۔ فطرت کے اس قانون کا ایک حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ وہ اکثر حالات میں کمزور فریق کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ نام نہاد بڑے گروہ کے مقابلہ میں چھوٹے گروہ کی حمایت کرتا ہے۔ یہ قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ (البقرہ ۲۴۹)

ایک کمزور گروہ اپنے مقابلہ میں طاقتور گروہ سے کیوں کر بڑھ جاتا ہے اور فطرت کا قانون کس طرح اس کا مددگار بنتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خالق فطرت نے پیدائشی طور پر ہر انسان کے اندر اتھاہ امکانات رکھ دئے ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مگر ابتدائی طور پر یہ صلاحیت سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہے۔ یہ تمام اعلیٰ امکانات اس کے اندر بالقوۃ طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ انسان کا اپنا معاملہ ہے کہ وہ اس بالقوۃ (potential) کو بالفعل (actual) میں تبدیل کرے۔

یہاں دوبارہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ یہ تبدیلی دباؤ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی کسی فرد یا گروہ کے اوپر حالات کا جتنا زیادہ دباؤ پڑتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ عین وہی فطری معاملہ ہے جو، مثال کے طور پر، گنے کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر گنا رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ مگر معمول کے حالات میں یہ رس گنے سے باہر نہیں آتا۔ گنے کا رس صرف اس وقت اندر سے نکل کر باہر آتا ہے جب کہ اس پر غیر معمولی دباؤ پڑے۔ گنے کو اگر آپ نرم روئی میں رکھ دیں تو اس کا رس کبھی باہر نہیں آئے گا۔ لیکن جب آپ گنے کو کریشر (crusher) میں ڈالتے ہیں تو اس کے اندر بھرا ہوا میٹھا رس نکل کر باہر آجاتا ہے۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان بھی ہمیشہ دباؤ کے حالات میں ترقی کرتا ہے۔ یہی اصول فرد کے لئے بھی ہے اور یہی اصول جماعت کے لئے بھی۔ اس معاملہ کو مشہور برطانوی مورخ

آرنلڈ جے ٹوائن بی نے اپنی کتاب مطالعۂ تاریخ (A Study of History) میں کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ ۱۲ جلدوں کی اس کتاب میں اس نے بتایا ہے کہ تاریخ کی تمام بڑی بڑی تہذیبوں کو جو لوگ وجود میں لائے وہ اقلیت میں تھے۔ یہ دراصل اقلیتی گروہ ہے جو تاریخ کے تمام بڑے بڑے واقعات کے پیچھے کام کرتا رہا ہے۔

ٹوائن بی کے مطابق، اس کا اصول یہ ہے کہ اکثریتی گروہ کی طرف سے اقلیتی گروہ کو چیلنج پیش آتا ہے۔ یہ چیلنج اقلیتی گروہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اکثریتی گروہ کے مقابلہ میں زیادہ کام کرے۔ وہ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو دوسروں سے زیادہ استعمال کرے۔ حالات کا یہ دباؤ اقلیتی گروہ کو ابھارتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہیروانہ کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ٹوائن بی نے فطرت کے اس اصول کو تاریخ کی اکیس تہذیبوں کی عملی مثال سے ثابت کیا ہے۔

فطرت کا یہی قانون ہندستانی مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ وہ اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ملک کے چھوٹے اور بڑے گروہ کے درمیان ایک موازنہ (بیلنس) قائم کئے ہوئے تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندستان آزاد ہوا اور یہاں جمہوری دور آیا تو انگریز کا قائم کردہ موازنہ ٹوٹ گیا۔ اب مسلمانوں کی حیثیت اقلیتی گروہ کی ہو گئی اور ہندوؤں کی حیثیت اکثریتی گروہ کی۔ اس کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے جو انگریزوں کے زمانے میں موجود نہ تھے۔

ہندستانی مسلمانوں کے لئے بظاہر یہ ایک مسئلہ تھا۔ مگر فطرت کے قانون کے مطابق وہ ایک چیلنج تھا۔ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کی چھپی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کے ہم معنی تھا۔ بیداری کا یہ عمل ابتدائی طور پر ۱۹۴۷ کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ مگر اپنے پہلے دور میں وہ غیر شعوری حالت میں عمل کرتا رہا۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا اور بیداری کا یہ عمل شعوری طور پر شروع ہو گیا۔ اب یہ عمل اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ہر جگہ اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے دہلی میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کا معاشی پچھڑا پن کیوں؟ یہاں مختلف مقررین نے اظہار خیال کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے کہ اس ملک کے مسلمان پچھڑ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ اس ملک کے تقریباً ہر مسلمان نے ۱۹۴۷ کے بعد ترقی کی ہے۔ میں نے کہا کہ صنعتی انقلاب کے بعد ساری دنیا میں اور خود ہندستان میں ایک اقتصادی انفجار (economic explosion) آیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ایک قسم کا خلافِ زمانہ قول ہے کہ مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے پچھڑا ہوا گروہ بتایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا بیان بظاہر ہی قابلِ رد ہے۔

پھر میں نے اپنی تقریر میں حاضرین کو براہ راست خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ جو مسلمان اس ہال کے اندر موجود ہیں، ان میں سے ہر مسلمان کی اقتصادی حالت ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر آپ میں سے کسی کا معاملہ اس سے مختلف ہو تو وہ کھڑا ہو کر میرے اس بیان کی تردید کرے۔ حاضرین میں سے کسی ایک مسلمان نے بھی یہ نہیں کہا کہ ۱۹۴۷ میں میری جو معاشی حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج میری حالت خراب ہو چکی ہے۔

میں نے اس معاملہ کا باقاعدہ سروے کیا ہے اور اپنی کتاب ''ہندستانی مسلمان'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق، ہندستان کا تقریباً ہر مسلم ادارہ، ہر مسلم جماعت، ہر مسجد اور ہر مدرسہ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج دگنا اور چوگنا ترقی کر چکا ہے۔ تقریباً ہر مسلم خاندان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ تعلیم اور اقتصادیات کے میدان میں ہندستانی مسلمان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ یہ ترقی اتنا عام ہو چکی ہے کہ کسی بھی مسلم خاندان کا جائزہ لے کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

اس معاملہ کی ایک چشم کشا مثال وہ ہے جو جولائی ۱۹۹۹ میں سامنے آئی۔ نیویارک کے مشہور اقتصادی میگزین فوربس (Forbes) نے ساری دنیا کے ارب پتیوں کا سروے کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے ہندستان کے ارب پتیوں کا بھی سروے کیا۔ اس سروے کے نتائج فوربس

میگزین کے شمارہ ۵ جولائی ۱۹۹۹ میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہندستان کے تمام اخباروں، مثلاً ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، وغیرہ میں نقل ہوئے۔

فوربس میگزین کے سروے کے مطابق اس وقت ہندستان کے ارب پتیوں (billionaires) میں جو آدمی نمبر ایک پر ہے وہ بنگلور کا ایک مسلمان ہے جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے دس انتہائی بڑے دولت مندوں میں سے تین آدمی مسلمان ہیں۔ انٹیلی جنٹ انوسٹر (Intelligent Investor) کے شمارہ ۱۴ جولائی ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ایٹ دی ٹاپ (At The Top) کے عنوان سے چھپی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی کے شمارہ ۲۷ جون ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ویری رچ (Very Rich) کے عنوان سے چھپی ہے۔ دوسرے اخباروں میں یہ رپورٹ رچسٹ انڈین (Richest Indian) وغیرہ عنوانات کے تحت شائع ہوئی ہے۔

مستقبل کی قیادت

ایک تاریخی قانون

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹوائن بی ۱۸۸۹ میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۹۷۵ میں یارک شائر میں اس کی وفات ہوئی۔ ۳۵ سال کے لمبے مطالعہ کے بعد اس نے اپنی کتاب مطالعۂ تاریخ (A Study of History) لکھی۔ یہ کتاب بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی آخری جلد ۱۹۶۱ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں پوری انسانی تاریخ کی ۲۶ معلوم تہذیبوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور قوموں کے عروج وزوال کا ایک مربوط فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی اپنے تاریخی مطالعہ کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ جب بھی دنیا میں کوئی نئی تہذیب ظہور میں آتی ہے تو اس کے پیچھے کسی اقلیتی گروہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ دراصل اقلیت ہی ہے جو ان فطری اور تاریخی صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے جو کسی نئے تہذیبی انقلاب کو ظہور میں لانے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کا تخلیقی انقلاب کبھی کسی اکثریتی گروہ کے ذریعہ وجود میں نہیں آیا۔

آرنلڈ ٹوائن بی کے اس تاریخی فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ کسی تہذیب کا ابتدائی مرحلہ ماحول کے چیلنج سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ ماحول نہ تو اتنا سخت ہو جو ترقیاتی عمل کو ابھرنے نہ دے اور نہ اتنا موافق ہو کہ وہ تخلیقی روح کو معطل کر دے۔ تخلیقی اقلیت اس چیلنج کا جواب دے کر غیر فعال اکثریت کو قیادت فراہم کرتی ہے۔ چیلنج کا جواب دینے کے اس عمل کو مزید تقویت اقلیت کے پیش کردہ حل کی عمومی قبولیت سے ملتی ہے (جو اس کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے):

> The initial stage of a civilization is its growth, brought about by an environmental challenge, neither too severe to stiffle progress nor too favourable to inhibit creativity Which finds a response among a creative minority that provides leadership to the passive majority The mechanism of challenge-response is complemented by the general acceptance of and loyalty to the minority's solutions

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی ملک میں جو گروہ اقلیت میں ہو اس کو عین قانون فطرت کے تحت اکثریتی گروہ کی طرف سے چیلنج کا سامنا پیش آتا ہے۔ یہ صورت حال ایک طرف اقلیتی گروہ کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اس کو فعال بناتی ہے۔ دوسری طرف اکثریتی گروہ چیلنج سے محفوظ ہونے کی بنا پر غیر فعال ہوتا چلا جاتا ہے، اس کو وہ مہمیز نہیں ملتی جو اس کی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔ یہ صورت حال مکمل طور پر اقلیتی گروہ کے حق میں ہوتی ہے۔ اب اگر اقلیتی گروہ اتنا کمزور نہ ہو کہ حالات کے دباؤ کے تحت وہ کچل کر رہ جائے تو یہی وہ تاریخی گروہ بن جاتا ہے جو نئی تہذیب پیدا کرے اور انسانیت کو ایک نئے اور بہتر مستقبل کی طرف لے جائے۔

ایک قرآنی آیت

آرنلڈ ٹوائن بی نے جو بات کہی ہے وہ صرف ایک مورخ کا نقطۂ نظر نہیں ہے۔ وہ خود فطرت کا ایک اٹل قانون ہے جس کو ایک مورخ نے تاریخ کے مطالعہ کے ذریعہ دریافت کیا ہے۔ فطرت کا یہ قانون قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔۔۔ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے اذن سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹)

How often has a small group prevailed against a large group by the sanction of God. And God is with the people of patience.

اس آیت میں اذن سے مراد فطرت کا وہ قانون ہے جو خدا نے انسانوں کے درمیان ابدی طور پر قائم کر رکھا ہے۔ اس قانون کو قرآن میں دوسری جگہ عسر کے ساتھ یسر اور یسر کے ساتھ عسر (الانشراح) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس گروہ کو عددی برتری حاصل ہو وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتا ہے کہ محنت کے بغیر ہی اس کو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ یہ نفسیات اس کے اندر ذہنی اور عملی جمود پیدا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ پوری قوم آرام طلبی اور کاہلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کے قابل نہیں رہتی۔

اس کے برعکس جو گروہ عددی اور سماجی حیثیت سے اپنے کو کمتر محسوس کرے وہ غیر

لری قانون کے تحت زیادہ فعال ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ احساس کہ وہ برتر طاقت کی طرف سے چیلنج کی زد میں ہے اس کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ محنت کرے۔ وہ اپنے وسائل کو زیادہ بہتر اور زیادہ منظم طور پر استعمال کرے۔ وہ پیش آمدہ مسائل کا برتر حل (superior solution) دریافت کرے۔ اس قسم کی مسلسل سوچ اس کے اندر وہ چیز پیدا کردیتی ہے جس کو نفسیاتی علماء دماغی طوفان (brain storming) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اکثریتی فرقہ کے حالات اگر اس کے افراد کو ذہنی جمود میں مبتلا کردیتے ہیں تو اقلیتی فرقے کے حالات اس کے افراد کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر تاریخ کے تمام بڑے بڑے تہذیبی واقعات ہمیشہ اقلیتی گروہ کے ذریعہ ظہور میں آئے۔ اکثریتی گروہ نے کبھی کوئی بڑا تاریخی واقعہ انجام نہیں دیا۔

ہندستانی مسلمان

قرآن میں بیان کردہ مذکورہ قانون اور اس کی تاریخی تصدیق پر غور کیجئے تو ایک نہایت اہم حقیقت دریافت ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس حقیقت کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے۔ موجودہ ہندستانی مسلمان اس کا عین مصداق قرار پاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں ساری صورت حال اچانک بدلی ہوئی نظر آئے گی۔ وہ قوم جس کا معاملہ آج بظاہر ایک المیہ کی صورت میں دکھائی دیتا ہے وہ اچانک ایک طربیہ نظر آنے لگتا ہے۔ ایک قوم جو آج بظاہر ملک کے لئے ایک بوجھ (liability) سمجھی جارہی ہے، وہ ملک کے لئے ایک قیمتی اثاثہ (asset) کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مزید یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کی یہ امید افزا حیثیت صرف ہندستان کے لئے نہیں ہے بلکہ وسیع تر معنوں میں وہ ساری دنیا کے لئے ہے۔

آج کی دنیا کو گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو تمام قوموں میں صرف ہندستانی مسلمان وہ گروہ ہیں جن کے حق میں مذکورہ تاریخی شرطیں پوری ہورہی ہیں۔ وہ یہاں اقلیت میں ہیں مگر اتنی چھوٹی اقلیت نہیں کہ چیلنج کے مقابلہ میں بے بس ہو کر رہ جائیں۔ اقلیت میں ہونے کی بنا پر ایک

طرف انھیں اکثریت کے چیلنج کا سامنا ہے دوسری طرف ان کا ایک بڑی اقلیت ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اکثریت کے مقابلہ میں یکسر مغلوب ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس صورت حال نے ہندستان کے مسلمانوں کو بہترین موافق پوزیشن (advantageous position) میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔

ایک مثال

یہاں میں ایک مثال درج کروں گا جس سے اس معاملہ کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ مثال انڈونیشیا اور ملیشیا کی ہے۔ میں نے اپنے ایک بیرونی سفر کے دوران انڈونیشیا کے ایک سنئیر پروفیسر سے پوچھا کہ انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں پڑوسی ملک ہیں مگر ملیشیا کے مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں جو ترقی کی ہے، انڈونیشیا کے مسلمان وہ ترقی نہ کر سکے۔ مذکورہ پروفیسر نے جواب دیا کہ اس کا سبب دونوں کے مختلف حالات میں پایا جاتا ہے۔ ملیشیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا عددی تناسب تقریباً ففٹی ففٹی کا ہے۔ اس بنا پر وہاں مسلسل چیلنج کی حالت قائم رہتی ہے۔ وہاں کے مسلمان ہر وقت یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے غفلت کی تو فریق ثانی آگے بڑھ جائے گا اور وہ ایک پچھڑا ہوا گروہ بن کر رہ جائیں گے۔ یہ نفسیات ملیشیا کے مسلمانوں کو مسلسل متحرک رکھتی ہے۔ ان کا زیادہ عمل ان کی ترقی کی ضمانت بن گیا ہے۔

انڈونیشیا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۹۰ فیصد ہے۔ اس عددی اکثریت نے وہاں کے مسلمانوں کے اندر تحفظ کا احساس (sense of security) پیدا کر دیا ہے۔ یہ احساس ان کے لئے جمود کا سبب بن گیا ہے۔ چنانچہ ان کی صلاحیتیں زیادہ بیدار نہ ہو سکیں۔ وہ محنت کش بننے کے بجائے سہولت پسندی کی زندگی کے عادی بن گئے۔ اور جس قوم کا یہ حال ہو جائے وہ کبھی کوئی بڑی ترقی نہیں کر سکتی۔

برصغیر ہند میں اگر اس اصول کو منطبق کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان گویا انڈونیشی مسلمانوں کے مانند ہیں، اور انڈیا کے مسلمان ملیشیائی مسلمانوں کے

مانند...... بلکہ شاید یہ کہنا صحیح ہو گا کہ انڈیا کے مسلمان اس معاملہ میں ملیشیا کے مسلمانوں سے بھی زیادہ بہتر پوزیشن میں ہیں۔ کیونکہ ملیشیائی مسلمانوں کو ایک مساوی گروہ کی طرف سے چیلنج در پیش ہے، جب کہ انڈیا کے مسلمانوں کو عددی اعتبار سے ایک برتر گروہ کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کا ثبوت دینا ہے۔ اس فرق کی بنا پر یہ کہنا صحیح ہو گا کہ انڈیا کے مسلمانوں میں مقابلہ کی اسپرٹ جتنی زیادہ بیدار ہو گی وہ اس سے زیادہ ہو گی جو ملیشیا کے مسلمانوں میں بیدار ہوتی ہے۔

ان حالات کی بنا پر ہندستانی مسلمان ایک عظیم امکان کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ امکان کہ وہ فطرت کے اشارہ کو سمجھیں اور اس کو استعمال کر کے نہ صرف ہندستان کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک نئے دور کے نقیب بن جائیں۔

بیسویں صدی کا جائزہ

بیسویں صدی میں دنیا کے نقشہ پر کئی قومیں ابھریں جنھوں نے عالم انسانی کی قیادت کا رول ادا کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۔۔ سوویت یونین، امریکہ، ہندستان۔ مگر یہ تمام طاقتیں یا تو عملاً ناکام ہو چکی ہیں یا وہ ناکامی کے کنارے کھڑی ہوئی ہیں۔

۱۹۱۷ میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آیا، اس کے بعد سوویت یونین کی شکل میں اس کا ایک عظیم امپائر بن گیا۔ تقریباً ۷۵ سال تک شان و شوکت دکھانے کے بعد اس کا یہ حال ہوا کہ ۱۹۹۱ میں وہ ریت کے محل کی طرح ٹوٹ کر گر گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نظام سر تا سر غیر فطری بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ خدا نے اس دنیا کا نظام مسابقت (Competition) کے اصول پر قائم کیا ہے۔ مگر کمیونسٹ امپائر نے اس کو ختم کر کے ریاستی کنٹرول کی مصنوعی بنیاد پر زندگی کا نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ نظام اول دن ہی سے قابل عمل نہ تھا۔ کچھ دن تک وہ جبر اور پروپیگنڈہ کے زور پر چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ خود اپنی داخلی کمزوری کی بنا پر منہدم ہو گیا۔

امریکی نظام تقریباً دو سو سال سے بدستور ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

امریکہ کے ابتدائی دانشوروں نے اس کو صحیح فکری بنیاد یعنی مسابقت کے اصول پر قائم کیا۔ تاہم امریکی نظام میں اول دن سے ایک کمزوری شامل تھی۔ وہ یہ کہ یہ نظام مذہب اور سیاست کی تفریق کے اصول پر قائم کیا گیا اس قسم کی تفریق اصولی طور پر غلط ہے مگر وہ کم از کم اقتصادی پہلو سے ایک قابل بقا (sustainable) نظام تھا۔ اس لئے وہ ظاہری ڈھانچہ کے اعتبار سے چلتا رہا اور بظاہر اب بھی چلا جارہا ہے۔

تاہم گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ امریکی نظام اب آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہو رہا ہے۔ اس زوال کا نمایاں مظاہرہ ۹۔۱۹۹۹ میں موجودہ امریکی صدر بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی (Monica Lewinsky) کے واقعہ کی صورت میں ہوا۔ مونیکا لیونسکی واشنگٹن کے وہائٹ ہاؤس کی ایک نوجوان کارکن تھی۔ کلنٹن نے اس سے خفیہ جنسی تعلق قائم کر لیا۔ جب یہ راز افشا ہو گیا تو صدر کلنٹن نے دو اور غلطیاں کیں۔ ایک دروغ حلفی (purjury) اور دوسرے انصاف میں رکاوٹ ڈالنا۔ ۱۳ ماہ تک اسمبلی کی سطح پر کیس چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۲ فروری ۱۹۹۹ کو ممبران کی کثرت رائے سے کلنٹن کو بری کر دیا گیا۔

اس کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ امریکی عوام کی تقریباً ۷۵ فیصد تعداد صدر کلنٹن کے مواخذہ (impeachment) کے خلاف تھی۔ امریکی عوام کی رائے یہ تھی کہ صدر کلنٹن نے امریکی اقتصادیات کو بہتر بنایا ہے ایسی حالت میں اگر ان کی ذاتی زندگی غیر اخلاقی ہو تو ہمارے لئے وہ قابل لحاظ نہیں۔ امریکی عوام کے اس رجحان کی بنا پر صدر کلنٹن کے خلاف مواخذہ کی تحریک ناکام ہو گئی۔

۲۰۰ سال پہلے امریکہ نے سیاست کو مذہب سے جدا کیا تھا۔ اب یہ ثابت ہوا کہ امریکی قوم نے مزید آگے بڑھ کر اخلاقی اقدار (moral values) کو بھی اپنی سیاسی اور قومی زندگی سے الگ کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دوسری علیحدگی اتنے بڑے پیمانہ پر ہوئی ہے کہ نہ صرف امریکی عوام بلکہ ساری دنیا کے لوگوں نے اس کو جان لیا۔ بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کا یہ قصہ ایک ایسے زمانہ

میں پیش آیا جب کہ دنیا میڈیا اور انٹرنٹ کے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ چنانچہ پورے ایک سال تک یہ معاملہ ہر روز لوگوں کے سامنے آتا رہا۔ دنیا میں بسنے والا تقریباً ہر شخص اس کو جان گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ میں اخلاقی اقدار اور سیاست کے درمیان میں یہ جدائی خاموش عمل کے طور پر نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ اعلان اور اشتہار کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ برائی امریکی سماج میں اگر خاموش عمل کے طور پر ہوتی تو وہ امریکہ کے لئے کچھ اور زندگی کی ضمانت بن سکتی تھی جیسا کہ قدیم بادشاہوں کے ساتھ پیش آیا۔ مگر اس کو علی الاعلان اختیار کر کے امریکہ نے اپنے زوال کے سفر کو بہت زیادہ تیز کر دیا ہے۔ کوئی بھی نظام اخلاقی صفات سے محروم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور امریکہ یقینی طور پر اس تاریخی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

تیسری مثال ہندستان کی ہے۔ ہندستان میں تقریباً سو سال کی جدوجہد کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو آزادی آئی۔ سوامی دویکانند نے کہا تھا کہ آزادی کے بعد ہندستان ورلڈ لیڈر بنے گا۔ مگر عملاً کیا ہوا۔ یہ ملک لمبی مدت سے اونچی ذات اور نیچی ذات کے دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ حالات سے فائدہ اٹھا کر اونچی ذات والوں نے آزادی کو ہائی جیک (hijack) کر لیا۔ یہی لوگ آزادی کے بعد سے مسلسل ملک کے اوپر حکومت کر رہے ہیں۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ وہ ملک کو ایسا نظام دینے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں جو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں "ہر آنکھ کے آنسو پوچھنے والا ہو"۔

اس ناکامی کا سبب بالکل واضح ہے۔ ملک کے اونچے طبقہ (upper cast) کے پاس جو آئیڈیالوجی ہے وہ ایک ایسی محدود آئیڈیالوجی ہے جو پوری انسانیت کو اپنے دامن میں نہیں لیتی۔ اس آئیڈیالوجی میں اونچی ذات والوں کے لئے تو باعزت جگہ ہے۔ مگر نیچی ذات اور غریب عوام کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ اس آئیڈیالوجی کے مطابق، ہر آدمی جس حال میں ہے وہ خود اس کی اپنی ہی پچھلی زندگی کا لازمی اور ناقابل تقسیم نتیجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غریب اور مظلوم ہیں وہ فطرت کے جبری نظام کے تحت خود اپنے ماضی کے کردار کا نتیجہ بھگت رہے

ہیں۔ انھیں زندگی کے آخری لمحہ تک اس نتیجہ کو بہر حال بھگتنا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ملک کے نصف سے زیادہ حصہ کو اونچی ذات کے حکمرانوں کی نظر میں ایک ایسا کیس بنادیتی ہے جس پر رحم کرنا ضروری تو کیا ممکن بھی نہیں۔

پیدائش کے اس جبری نظریہ نے اونچی ذات کے حکمرانوں کو جو آئیڈیالوجی دی وہ ایک محدود آئیڈیالوجی تھی۔ اس محدود آئیڈیالوجی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان حکمرانوں کے دل میں وسیع تر انسانیت کے لئے نرم گوشہ پرورش نہ پاسکا۔ ان کے لئے آزادی صرف اس بات کا موقع بن کہ وہ سب کچھ اپنے لئے جمع کرلیں اور دوسروں کے لئے کچھ نہ چھوڑیں، کیونکہ دوسرے لوگ اسی لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ وہ محروم رہ کر اپنے پچھلے دور حیات کی غلطیوں کی سزا پائیں اور اسی حال میں مرکر وہ اس دنیا سے چلے جائیں۔

نئے گروہ کی ضرورت

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آخر میں یہ بات پوری طرح واضح ہو ہے کہ قیادت کی دعویدار تمام قومیں مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہیں۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ ایک نیا اور تازہ دم گروہ ابھرے جو اس خلا کو پر کرے اجو آنے والی کیسویں صدی کو حقیقی معنوں میں انسان کے لئے ایک نئی اور بہتر صدی بناد

میرے اندازے کے مطابق یہ نیا گروہ ہندستانی مسلمانوں کا گروہ ہے۔ تقریباً ٦٠ مسلم قوموں میں، ہندستانی مسلمان استثنائی طور پر اس خصوصیت کے مالک ہیں کہ وہ انڈونیشیا کو چھوڑ کر سب سے بڑے عددی گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک اکثریتی گروہ کی طرف سے چیلنج کا سامنا کررہے ہیں۔ چیلنج انسانی ترقی کی لازمی شرط ہے، اور یہ شرط اپنی پوری صورت میں موجودہ دور میں صرف ہندستانی مسلمانوں کے حق میں پوری ہورہی ہے۔ موجودہ ہندستانی مسلمان ہی اس حالت میں ہیں کہ قانون فطرت کے تحت ان کے اندر وہ تخلیقی اور تعمیری اوصاف پیدا ہوں جو کسی قوم کو اس دنیا میں قیادت کا اہل بناتے ہیں۔

علامہ اقبال اور مسٹر محمد علی جناح نے غالباً ہندستانی مسلمانوں کو اسی تعمیری رول کے لئے کھڑا کرنا چاہا مگر انھوں نے اس کے لئے جو تدبیر اختیار کی وہ درست نہ تھی۔ انھوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ پاکٹ (پاکستان) بنانا ان کے لئے اس قسم کا موقع دینے والا ثابت ہوگا مگر برعکس طور پر اس تدبیر نے ان مسلمانوں کو چیلنج کے ماحول سے محروم کر دیا، جب کہ چیلنج کا ماحول ہی کسی بڑے انسانی عمل کے ظہور میں آنے کی لازمی شرط ہے۔

تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان کے کچھ مسلم لیڈروں نے اس سلسلہ میں ایک نیا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے چاہا کہ مسلم۔دلت اتحاد قائم کریں اور اس طرح مسلمانوں کو زیادہ طاقت ور حیثیت دے کر انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ ملک میں کوئی بڑا رول ادا کر سکیں۔ مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ مسلم۔دلت اتحاد کا مقصد صرف مسلمانوں کے لئے تحفظ فراہم کرنا تھا۔ وسیع تر ملکی مفاد اس کا حقیقی نشانہ نہیں تھا۔ اور اس قسم کی محدود اسکیم کسی بھی مشترک سماج میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس دنیا میں وہی منصوبہ کامیاب ہوتا ہے جس میں دوسروں کی خیر خواہی شامل ہو۔ محض اپنی خیر خواہی کی بنیاد پر بنایا ہوا منصوبہ قانون فطرت کے خلاف ہے اس لئے اس کا کامیاب ہونا بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔

لائحۂ عمل

حالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہندستان میں وہ اسٹیج مکمل طور پر تیار ہو چکا ہے جس کو استعمال کر کے مسلمان اپنا تاریخی رول ادا کر سکیں۔ تاہم کوئی بڑا تاریخی رول صرف اس وقت ادا کرنا ممکن ہوتا ہے جب کہ اس کی تمام ضروری شرائط پوری کی ہوں، شرائط کی تکمیل کے بغیر اسباب کی اس دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ ✓

عملی پروگرام

۱۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں سب سے زیاد اہم بات یہ ہے کہ مسلمان اس پورے معاملہ کو خالص انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ وہ جو کچھ کریں عمومی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت

کریں۔ پنی گروہی برتری کا قیام یا پنے حقوق کا حصول جیسے ذ تی مقاصد کو لے کر گر کوئی جدوجہد شروع کی گئی تو پیشگی طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کسی بھی مثبت یا قابل لحاظ نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ س دنیا میں کسی نسان کی سب سے بڑی طاقت دوسروں کے حق میں خیر خو ہی ہے۔ سی طرح کسی نسان کی سب سے بڑی کمزوری س کی خود غرضی ہے۔ مسلمانوں کے ندر یہ خلاقی ور روحانی سپرٹ پید کرنا مجوزہ مشن کا سب سے پہلا نکتہ ہوگا۔

۲۔ موجودہ حالات میں دوسر ضروری کام یہ ہے کہ بڑے پیمانہ پر ہندو مسلم ڈ ئیلاگ شروع کیا جائے۔ کھلے ذہن کے تحت تمام فکری ور نظریاتی پہلوؤں پر گفتگو ہو۔ یہ کام مناظرہ کے ند ز میں نہیں ہونا چاہیئے بلکہ خالص سائنٹفک ند ز میں ہونا چاہیئے، یعنی وہی ند ز جو آج بھی مذہب کے سو دوسرے علمی موضوعات میں جاری ہے۔

۳۔ سی کے ساتھ ضروری ہے کہ مسلمان صحتمند مقابلہ کے مید ن میں پوری طرح د خل ہو جائیں۔ شکایت ور حتجاج ور مانگ ور مطالبات کے طریقہ کو مکمل طور پر ترک کر دیں۔ وہ رعایت حاصل کر کے جینے کے بجائے قابلیت کا ثبوت دے کر ملک میں پنی جگہ بنائیں۔ تعلیم، تجارت، نڈسٹری، تمام سماجی د روں ور پروفیشنل شعبوں میں متیازی لیاقت پید کر کے آگے بڑھیں۔

۴۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں قلیتی گروہ کے لئے جس غلبہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے س کی لازمی شرط، آیت کے مطابق، صبر ہے۔ قرآن کا یہ بیان حتمی طور پر یہ ثابت کرتا ہے کہ فطرت کے مذکورہ قانون کو پنے حق میں و قعہ بنانے کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ لوگوں کے ندر صبر و تحمل کا مادہ ہو۔ س سے مر د یہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال میں فوری رد عمل کا طریقہ ختیار نہ کیا جائے بلکہ سوچا سمجھا طریقہ ختیار کیا جائے۔ سوچا سمجھا طریقہ ختیار کرنے کے لئے ہمیشہ وقت درکار ہوتا ہے۔ تاکہ آدمی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ

معاملہ کو سمجھے۔ وہ تحقیق اور مشورہ کے مراحل سے گزر کر کوئی گہری رائے قائم کرے۔ اس طرح صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اقدام سے بچے اور منصوبہ بند عمل کا طریقہ اختیار کرے۔ جو لوگ مسلمانوں کو مثبت رول ادا کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر صابرانہ مزاج پیدا کریں۔ وہ ان کو جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کی تعلیم دیں۔

۵۔ کوئی بھی کام کرنے کے لئے اس کے مطابق بنیاد (base) درکار ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو اس ملک میں جو رول ادا کرنا ہے اس کے لئے بھی یہی ضروری تیاری درکار ہے۔ اور وہ بنیاد تعلیم اور کردار ہے۔ جو لوگ یہ درد رکھتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں اپنا مطلوب تعمیری کردار ادا کریں انھیں مہم کے انداز میں یہ کوشش شروع کر دینا چاہیئے کہ مسلمان صد فی صد تعلیم یافتہ بن جائیں۔ اس تعلیمی نشانہ کو پورا کئے بغیر آگے کا کام نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ انھیں دوسری مہم یہ جاری کرنا ہے کہ مسلمان اعلیٰ کردار کے حامل بنیں۔ مسجد اور مدرسہ سے لے کر اخبارات و رسائل تک ہر ذریعہ کو اس مقصد کے لئے پوری طرح استعمال کیا جانا چاہیئے۔ تعلیم آدمی کو باشعور بناتی ہے۔ اور اخلاق و کردار کے ذریعہ آدمی اس کا اہل بنتا ہے کہ وہ قابل اعتماد طور پر دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکے۔

۶۔ آزادی کے بعد ملک میں جو سماج بنا وہ نفرت اور تشدد کا سماج تھا۔ اس منفی فضا میں ملکی تعمیر کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے مہاتما گاندھی نے آزادی (۱۹۴۷) کے وقت کہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہنا ہوگا۔ ورنہ میں اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا:

Hindus and Muslims should learn to live together in peace and amity otherwise I will die in the attempt.

بدقسمتی سے ابھی تک نفرت اور کشیدگی کی یہ فضا ختم نہ ہو سکی۔ یہ فضا ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے اور پورے ملک کے لئے سخت مہلک ہے۔ اس کی موجودگی میں ملک کے اندر کسی

تعمیری منصوبہ کی تکمیل ممکن نہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ ہر ممکن کوشش کرکے اس کو ختم کیا جائے۔ ملک میں قومی یک جہتی اور برادرانہ محبت کا ماحول پیدا کیا جائے۔اس کے بعد ہی یہاں کوئی حقیقی ترقیاتی کام کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس وقت جو تلخی پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب وہ غلط فہمیاں ہیں جو مذہب کی نسبت سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کو دور کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔اس مقصد کے لئے ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر اسلام کے صحیح تعارف کی مہم جاری کی جائے۔ مختلف زبانوں میں اسلام کے مختلف موضوعات پر مثبت انداز کی کتابیں لکھ کر انھیں بڑے پیمانہ پر غیر مسلموں کے درمیان پھیلایا جائے۔

۸۔ کوئی قوم صحیح رول صرف اس وقت ادا کر سکتی ہے جب کہ اس کو صحیح قیادت حاصل ہو جائے مگر صحیح قیادت کا تعلق خود قیادت سے زیادہ قبولیت قیادت کی صلاحیت سے ہے۔ قوم کے اندر یہ مزاج ہونا چاہیئے کہ وہ تعمیری قیادت اور استحصالی قیادت کے فرق کو سمجھ سکے۔ وہ حقیقت پسندانہ کلام اور جذباتی کلام کو پہچانے۔ جس قوم میں یہ استعداد نہ ہو وہ ہمیشہ استحصالی قیادت کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مسلم عوام میں یہ مزاج پیدا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔اس کے بغیر کسی گہرے منصوبہ کے لئے مسلمانوں کو متحرک نہیں کیا جاسکتا۔

۹۔ سیاست کے میدان میں مسلمانوں کا رول اب تک منفی رائے دہندگی (negative voting) کی حد تک رہا ہے۔ یعنی کسی بنا پر جس سے انھیں ناراضگی ہو جائے اس کے خلاف ووٹ دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنا۔اس قسم کی منفی سیاست نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے اور نہ ملک کے لئے۔ جمہوریت دراصل طاقت میں اشتراک (power sharing) کی سیاست کا نام ہے۔ ہندستان میں مسلمان مرکزی پارلیمنٹ کی تقریباً ۱۰۰ سیٹوں پر فیصلہ کن بن سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر وہ اپنے ووٹ کو درست طور پر استعمال کریں تو ملک کے سیاسی نظام میں وہ فیصلہ کن تعمیری رول ادا کر سکتے ہیں۔ مگر ابھی تک یہ ممکن نہ ہو سکا۔

ضرورت ہے کہ ان کے اندر صحیح سیاسی شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ جذباتی سیاست کے بجائے تعمیری سیاست کا طریقہ اختیار کر سکیں اور یہاں کے سیاسی مواقع کو مفید طور پر استعمال کرنے کے قابل ہو جائیں۔

۱۰۔ مسلمانوں کو اس ملک میں مثبت سیاست کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ حالات کے اعتبار سے اس کی ایک ابتدائی تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ملک کے سنجیدہ افراد اور صالح عناصر کو لے کر ایک تعمیری محاذ بنانے کی کوشش کریں۔ اس محاذ کا مقصد اپنے حقوق کا حصول نہیں ہوگا بلکہ یہ ہوگا کہ وہ ملک کی عمومی تعمیر میں اپنا مثبت رول زیادہ مضبوط اور مستحکم طور پر ادا کر سکیں۔ اگر حقیقی معنوں میں اس قسم کا تعمیری محاذ بن جائے تو اس میں مختلف فرقوں کے سنجیدہ عناصر شامل ہو جائیں گے۔ حتی کہ ایک وقت آسکتا ہے جب کہ یہ محاذ تعمیر نو کے بارے میں پورے ملک کی امیدوں کی علامت بن جائے۔ یہ کام اگر خالص تعمیری انداز میں کیا جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت یہ محاذ ملک میں وہ خلا پر کرنے کے قابل ہو جائے جس کو صالح قیادت کا خلا کہا جاتا ہے۔

مظفر نگر کا سفر

سر سید ڈے ۱۹۹۴ کے موقع پر علی گڑھ یونیورسٹی ایسوسی ایشن کی مظفر نگر یونٹ نے روایتی ڈنر کے ساتھ ایک سیمنار منعقد کیا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کے لئے ریزرویشن اور ایجوکیشن۔ یہ سیمنار ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۴ کو مظفر نگر کے سعادت ہوسٹل میں ہوا۔ مجھ کو بطور چیف گیسٹ اس میں بلایا گیا تھا۔ سید شمیم حیدر زیدی اس کے پریسیڈنٹ اور راؤ عبد الحمید خاں اس کے سکریٹری ہیں۔

۲۳ اکتوبر کی دوپہر کو بذریعہ کار دہلی سے مظفر نگر کے لئے روانگی ہوئی۔ مظفر نگر کے دو صاحبان میرے ساتھ تھے — جناب رشید احمد صاحب اور جناب اجمل الرحمٰن صاحب۔ دہلی کی پر ہجوم سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم یوپی کے مغربی علاقہ میں داخل ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ سڑک کے دونوں طرف مسلسل سرسبز مناظر ہمارا استقبال کر رہے ہیں۔ اتنی زیادہ سرسبزی مشرقی یوپی میں نظر نہیں آتی۔

اس سرسبزی کا راز کیا ہے۔ اس کا راز اس علاقہ میں آبپاشی کا خصوصی نظام ہے۔ مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک مقام پر پہنچے جہاں ایک "ندی" کے اوپر پل بنا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ کون سی ندی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ندی نہیں ہے بلکہ وہ نہر ہے جس کو اپر گنگا کینال کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، گنگا ہمالیہ کی وادی سے نکلتی ہے اور بنگلہ دیش سے گزرتی ہوئی خلیج بنگال میں جا گرتی ہے۔ اس کی لمبائی ۲۵۰۰ کیلو میٹر سے کچھ زیادہ ہے۔ گنگا کے پانی کو، دو ہزار سال سے بھی زیادہ مدت سے آبپاشی کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ مگر مسلم سلطنت کے زمانہ میں بارہویں صدی عیسوی کے بعد اس آبپاشی کو بہت زیادہ ترقی حاصل ہوئی۔ مغل بادشاہوں نے گنگا ندی سے کئی نہریں نکالیں۔ انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا کا بیان ہے:

Irrigation was highly developed during the period of Muslim rule from the 12th century onward, and the Mughal kings later constructed several canals. (7/881)

اس نہری نظام کو انگریزوں نے مزید ترقی دی۔ انھوں نے اپر گنگا کینال بنائی۔ ذیلی نہروں کو ملا کر اس کی لمبائی ۵۹۵۰ میل ہے۔ وہ ہردوار سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا افتتاح ۱۸۵۶ میں ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ انگریزوں نے لور گنگا کینال بنائی جو اپنی ذیلی نہروں کے ساتھ ۵۱۲۰ میل لمبی ہے۔ وہ ۱۸۸۰ میں شروع کی گئی۔ ان نہروں نے اس علاقہ میں زرعی انقلاب برپا کردیا۔

انگریزوں نے ہندستان میں اس طرح کے بہت سے تعمیری کام کئے۔ مگر اپنی نوجوانی کی عمر میں مجھے انگریزوں کے بارہ میں ہمیشہ صرف بری باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ ان کی اچھی باتیں بعد کو صرف ذاتی مطالعہ کے ذریعہ مجھے معلوم ہوئیں۔ خبر رسانی کا یہی یک طرفہ طریقہ ہے جس نے تمام لوگوں کے ذہن کو موجودہ زمانہ میں منفی سوچ میں مبتلا کردیا ہے۔

راستہ میں میرٹھ آیا جو تقریباً دہلی اور مظفر نگر کے درمیان ہے۔ میرٹھ کا ایک قصہ یاد آیا جو حیات اللہ انصاری صاحب کے ایک مضمون مطبوعہ قومی آواز ۳۱ اگست ۱۹۹۴ میں چھپا تھا۔

میرٹھ میں ایک قاضی نجم الدین صاحب تھے۔ آزادی سے پہلے کے دور میں میرٹھ کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے ایک بار شہر کے صاحب جائداد لوگوں کو بلا کر کہا کہ کانگریس یہ چاہتی ہے کہ میرٹھ میں وہ اپنی شاخ قائم کرے۔ حکومت کی خواہش ہے کہ آپ میں سے کوئی صاحب دفتر قائم کرنے کے لئے اس کو اپنا مکان کرایہ پر نہ دیں۔ انگریز افسر نے سب سے وعدہ لیا کہ ہاں، ایسا ہی کیا جائے گا۔ قاضی نجم الدین صاحب کی باری آئی تو انھوں نے کہا: میں سرکاری حکم کی پابندی کروں گا اور کانگریس کو اپنا مکان ہرگز کرایہ پر نہیں دوں گا۔ البتہ بلا کرایہ کے اسے دے دوں گا۔ چنانچہ کانگریس کا دفتر قاضی نجم الدین کے گھر میں لمبے عرصہ تک رہا۔ مولانا آزاد اکثر وہاں آکر مقیم ہوا کرتے تھے۔ موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو بھی وہاں آتے رہتے تھے۔ قاضی صاحب کے گھر پر کئی بار چھاپے پڑے اور تلاشیاں ہوئیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے مسلمان ملک کے سیاسی عمل میں کتنا زیادہ شامل تھے، اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اسی میرٹھ میں مولانا اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴۔ ۱۹۱۷) پیدا ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا اسماعیل میرٹھی اردو کے بہترین مصلح شاعر تھے۔ برٹش دور میں جب کہ لوگ "مشکلات" کا انکشاف کرکے لیڈری حاصل کر رہے تھے، مولانا حالی نے "امکانات" کی نشاندہی کی۔ اسی طرح مولانا اسماعیل میرٹھی نے قومی ترقی کے لئے سیرت و کردار کی اہمیت کو واضح کیا۔ اگر حالی اور میرٹھی کا کلام مسلمانوں میں پھیلا ہوتا تو اس کے غیر معمولی نتائج نکلتے۔ مگر بدقسمتی سے مسلمانوں میں اقبال جیسے شاعر زیادہ مقبول ہوئے، جنھوں نے مسلمانوں میں فخر اور جذباتیت کا مزاج پیدا کیا۔ جب کہ ضرورت تھی کہ ان کے اندر تعلیم اور تعمیر کا مزاج پیدا کیا جائے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں غیر حقیقت پسندی کا مزاج زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہے۔ مزید یہ کہ اس دنیا میں چوں کہ خیالی بلند پروازی سے کام نہیں چلتا اس لئے لوگ ڈبل اسٹینڈرڈ بن رہے ہیں۔ ملت کے اسٹیج پر تو وہ "تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں" اور "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق" جیسے پرجوش الفاظ بول کر حاضرین کی داد لیتے ہیں لیکن وہ اپنے ذاتی معاملات کو ہمیشہ حقیقت پسندانہ انداز میں حل کرتے ہیں۔

راستہ میں دوپہر کا کھانا چیتل گرینڈ (Cheetal Grand) میں کھایا۔ گرد آلود سڑکوں سے گزرتی ہوئی ہماری گاڑی کھتولی پہنچی۔ یہاں وہ ایک موڑ پر مڑ کر ایک گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ اچانک ہمارے سامنے ایک سرسبز نخلستان موجود تھا۔ یہ ہوٹل چیتل گرینڈ کا وسیع کیمپس تھا۔ دہلی—مسوری روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں ہر وقت لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس ہوٹل کے مالک ایک مسلمان ہیں، لیکن گاہکوں میں ۹۹ فیصد ہندو ہوتے ہیں۔

چیتل گرینڈ والوں کو ابتداءً ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے خلاف فرقہ وارانہ

پروپیگنڈا کیا گیا۔ ان کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ مگر حکمت اور دانش مندی سے ہر چیز کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے ہوٹل کو کامیابی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچادیا۔

ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود ان کی کامیابی کا خاص راز ان کا معیار اور کوالٹی ہے۔ یہاں کی ہر چیز صفائی اور عمدگی کے اعلیٰ معیار پر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سڑک سے گزرنے والے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آتے ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو دہرہ دون، ہردوار اور رشی کیش وغیرہ مذہبی مقامات پر جانے کے لئے ادھر سے گزرتے ہیں۔ ہم جب ہوٹل کے کیمپس میں داخل ہوئے تو وہاں کاروں اور ٹورسٹ بسوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ہماری گاڑی کے ڈرائیور ایک سردار جی تھے۔ وہ پوری مہارت کے ساتھ سفید ایمبیسڈر دوڑا رہے تھے۔ وہ ہر گاڑی کو اپنے پیچھے چھوڑتے چلے جا رہے تھے۔ دہلی سے مظفر نگر تک جو گاڑی بھی انھیں اپنے آگے جاتے ہوئے دکھائی دی، اس کو چند منٹ میں انھوں نے پیچھے کر دیا۔

اپنی عادت کے مطابق، میں نے سردار جی سے کچھ سوالات کئے۔ مگر انھوں نے بس ایک دو لفظ میں مختصر جواب دیا۔ چنانچہ میں نے ان سے مزید سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تاہم اس تجربہ سے میں نے جان لیا کہ وہ اتنے کامیاب ڈرائیور کیوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا پورا دھیان صرف ایک کام پر دیتے ہیں۔ ذہن کی یہی یکسوئی (concentration) کسی بھی چیز میں اعلیٰ کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

دہلی سے باہر آنے کے بعد ہمارا راستہ زیادہ تر گرینڈ ٹرنک روڈ کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ سڑک شیر شاہ سوری نے اپنے زمانہ حکومت (۱۵۴۵-۱۵۴۰) میں بنوائی تھی۔ وہ مشرقی بنگال سے دریائے سندھ تک چلی گئی تھی اور ۱۵۰۰ کوس لمبی تھی۔ شیر شاہ سوری غیر معمولی قسم کا مدبر بادشاہ تھا۔ اس کی تعریف تمام ملکی اور غیر ملکی مورخین نے کی ہے۔ اس نے صرف پانچ سال تک حکومت کی اور اس قلیل مدت میں اتنے زیادہ رفاہی کام کئے جو کسی بھی دوسرے ہندستانی حکمراں

نے نہیں کئے۔

تاہم اس کے اندر ایک کمزوری تھی وہ ضرورت سے زیادہ باحوصلہ (over-ambitious) آدمی تھا۔ وہ شیر شاہ بننے پر راضی نہ تھا بلکہ شہنشاہ ہند بننا چاہتا تھا۔ اس بنا پر اس کا ٹکراؤ ہمایوں بادشاہ سے ہوگیا۔ اس ٹکراؤ کا غیر معمولی نقصان دونوں کو ہوا۔ اگر ہمایوں اور شیر شاہ میں مصالحت ہو جاتی تو شاید ہندستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ باحوصلہ ہونا اچھا ہے، مگر ضرورت سے زیادہ با حوصلہ ہونا اتنا ہی زیادہ برا ہے۔

ہماری گاڑی مظفر نگر میں داخل ہونے والی تھی کہ میرے ساتھی نے سڑک کے کنارے واقع ایک بڑے مکان کی طرف اشارہ کیا جس کا نام کہکشاں منزل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کوٹھی نواب زادہ لیاقت علی خاں (۱۹۵۱۔ ۱۸۹۵) نے یہاں بنائی تھی۔ وہ کرنال (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ پھر وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم بنے اور ان کو قائد ملت کا خطاب دیا گیا۔ اب ایک اور شخص نے اس مکان کو خرید لیا ہے اور اس کا نام رتن دیپ رکھ دیا ہے۔

نواب زادہ لیاقت علی خان جیسے ہزاروں لوگ ہیں جو ہندستان میں بہت اچھی حالت میں تھے۔ اس کے باوجود وہ لوگ تقسیم کے وقت ہندستان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ یہ ترک وطن رومانی تصورات کے تحت تھا۔ مگر نتائج بتاتے ہیں کہ وہ حقیقت پسندانہ نہیں تھا۔ خود نواب زادہ لیاقت علی خاں، دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہاں قتل کر دئے گئے۔ اب وہاں مہاجروں کا جو حال ہے وہ ایک ایسا معلوم واقعہ ہے جس کی بابت یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

مظفر نگر میں داخل ہو کر ہماری گاڑی ایک سڑک پر مڑی۔ وہ چلتی ہوئی ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ اس پر لکھا ہوا تھا: گلزار ابراہیم۔ یہ جناب عقیل احمد صاحب کا مکان تھا۔ ان کے والد کا نام ابراہیم تھا۔ اسی پر انھوں نے اپنے مکان کا نام گلزار ابراہیم رکھا ہے۔

عقیل احمد صاحب اور ان کے دو بھائی الگ الگ بھی ہیں اور ایک ساتھ بھی۔ ان کے یہاں مثالی اتحاد پایا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ ہر پہلو سے ترقی کر رہے ہیں اور مظفر نگر کے

مسلمانوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کے خاندانی اتحاد کا راز کیا ہے۔ عقیل احمد صاحب نے جواب دیا: ہم تینوں بھائیوں کا حال یہ ہے کہ کوئی چیز ہوتی ہے تو کوئی بھی اس کو خود لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ تم اسے لے لو۔

یہی مزاج اتحاد و ترقی کی جان ہے۔ جو لوگ لینے کے بجائے دینے کا مزاج رکھتے ہوں ان کے اتحاد و ترقی میں کبھی کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

"گلزار ابراھیم" میں پہلے سے جناب شاہد صدیقی (اڈیٹر نئی دنیا) اور پروفیسر اقبال حسین (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) موجود تھے۔ ان سے ملی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں تھنک ٹینک (Think Tank) کی بہت اہمیت ہے۔ ہندو صاحبان چنتک منڈل قائم کر کے یہ مقصد حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی ایک مسلم تھنک ٹینک بنانا چاہئے۔ ان لوگوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ طے ہوا کہ جلد ہی انشاء اللہ محدود افراد پر مشتمل ایک مسلم تھنک ٹینک قائم کیا جائے گا۔

مظفر نگر کی سڑکوں پر ہر جگہ کافی بھیڑ دکھائی دی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شہر اقتصادی سرگرمیوں کا شہر ہے۔ لیکن پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان سرگرمیوں میں زیادہ حصہ ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان یہاں کی اقتصادی سرگرمیوں میں شریک ہیں تو وہ بھی دوسرے درجہ کی حیثیت سے۔ تقریباً یہی حالت دوسرے مقامات کی بھی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ مسلمان ابھی جدید اقتصادیات کی اہمیت کو نہیں سمجھے۔ عجیب بات ہے کہ سر سید نے جب علی گڈھ کالج (موجودہ یونیورسٹی) قائم کیا تو ایک عرصہ تک اس میں کامرس کا شعبہ موجود نہ تھا۔ اقتصادی شعور میں مسلمانوں کے اس پچھڑے پن کا اثر آج تک باقی ہے۔

مظفر نگر یوپی کا ایک شہر ہے۔ وہ دہلی کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ دہلی سے بذریعہ کار تقریباً تین گھنٹہ کا راستہ ہے۔ ایک مغل حاکم خانِ جہاں نے ۱۶۳۳ میں اس کو آباد کیا اور اپنے باپ مظفر خاں کے نام پر اس کا نام مظفر نگر رکھا۔ مظفر نگر شہر کی آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ ہے۔ اس

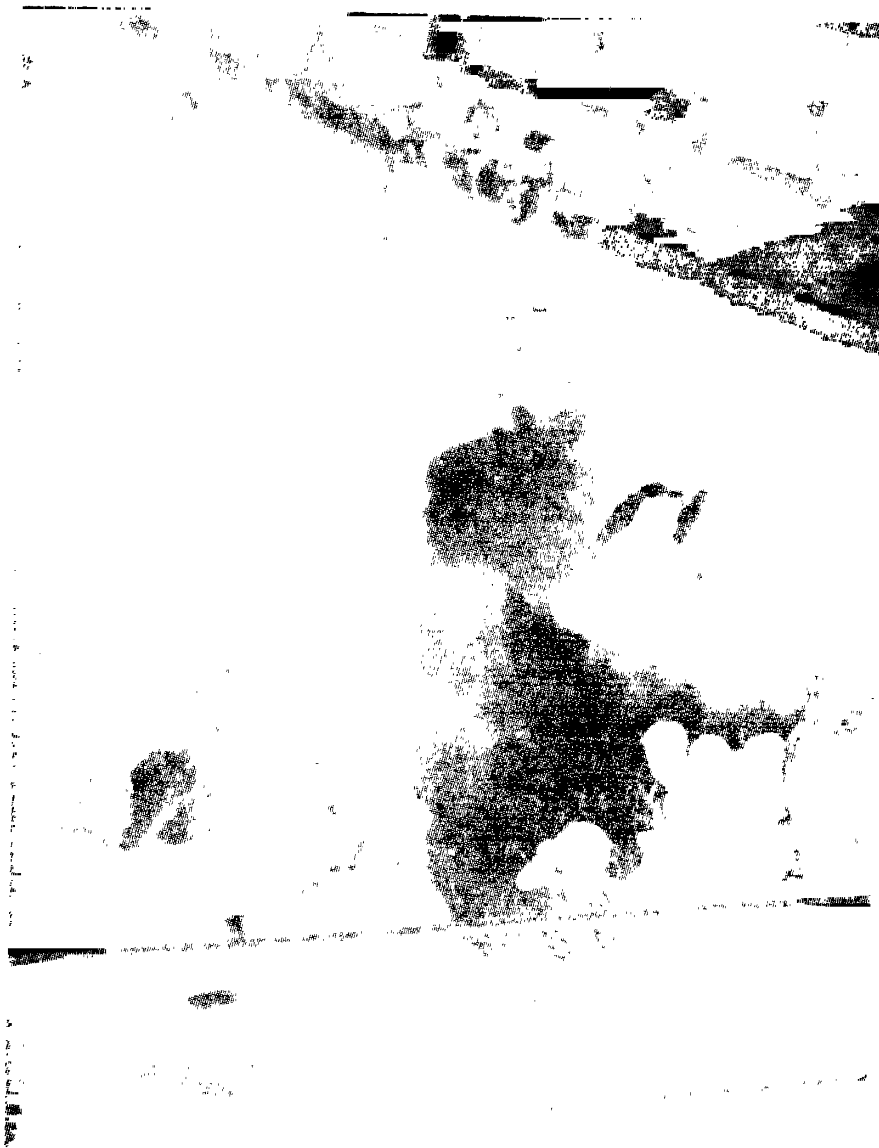
ہیں تقریباً ۳۳ فیصد مسلمان ہیں۔

مظفر نگر ضلع ہی میں قصبہ پھلت ہے جہاں شاہ ولی اللہ صاحب ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو پیدا ہوئے۔ پھلت شاہ صاحب کا ننہال تھا۔ پھلت میں مولانا محمد کلیم صدیقی نے امام ولی اللہ معہد للتربیۃ الاسلامیۃ کے نام سے ایک تعلیمی اور دعوتی ادارہ قائم کیا ہے۔ خاص طور پر دعوتی میدان میں وہ خاموشی کے ساتھ مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ ارمغان شاہ ولی اللہ کے نام سے نکل رہا ہے۔

آج شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام ہندستانی علماء میں ممتاز ترین نام کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ہندستان میں قرآن وحدیث کے علم کو زندہ کیا۔ آج بھی شاہ ولی اللہ صاحب کا فارسی ترجمہ قرآن کا بہترین ترجمہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب شاہ ولی اللہ زندہ تھے تو ان کے ہم عصر مسلمانوں نے ان کے اوپر قاتلانہ حملہ کیا۔ چنانچہ انھیں روپوش ہو جانا پڑا۔ انقلابی مصلح ہمیشہ اپنے ہم عصروں میں غیر مقبول ہوتا ہے مگر بعد کو وہ لوگوں کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ بابری مسجد کی تحریک پر آپ مسلم قیادت سے جدا ہو گئے۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر الزام ہے۔ مسجد کی اصل حیثیت کے بارے میں دوسروں سے میرا کوئی اختلاف نہیں تھا۔ دونوں میں جو فرق تھا وہ صرف یہ کہ میں یہ چاہتا تھا کہ بابری مسجد کے مسئلہ کو غیر مظاہراتی انداز میں حل کیا جائے۔ جب کہ دوسرے مسلم رہنماؤں نے معاملہ کی نزاکت کو نہیں سمجھا۔ انھوں نے اس کو غیر ضروری طور پر ایک مظاہراتی اشو بنا دیا۔ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ سراسر نادانی تھی۔ اور وہ ساری مصیبتیں اسی نادانی کی قیمت ہیں جو بعد کو ہمیں پیش آئیں۔

مظفر نگر کے بارہ میں ہندو مسلم فساد کی ایک خبر دہلی کے بعض اردو اخبارات میں ستمبر ۱۹۹۴ میں چھپی تھی۔ میں نے مظفر نگر پہنچ کر اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہاں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔



Uttarakhand activists run helter-skelter as police burst teargas shells in the Capital on Sunday • *The Pioneer, New Delhi, October 3, 1994*

اس زمانہ میں ذہن کو بگاڑنے کا کام سب سے زیادہ اخبارات کر رہے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کالجوں کو قتل گاہ بتایا تھا۔ اکبرالٰہ آبادی نے تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مگر موجودہ زمانہ میں ذہنی قتل کا سب سے بڑا ادارہ خود ہماری صحافت ہے۔ یہ صحافت، خاص طور پر اردو ہفت روزے تو گویا ذہن کو بگاڑنے کے کارخانے ہیں۔

اسی مہینہ اکتوبر کے شروع میں مظفر نگر کو اخباروں کے پہلے صفحہ پر جگہ ملی تھی۔ اس کا سبب ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۴ کو مظفر نگر کے قریب ہونے والا وہ واقعہ تھا جس میں بہت سے نوجوان مرے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

انڈیا کا اتری علاقہ پہاڑی علاقہ ہے۔ اس علاقہ کے لوگوں میں یہ تحریک ابھری ہے کہ اترا کھنڈ کے نام سے اس علاقہ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ علاقہ کے لوگ ۲ اکتوبر کو ۲۶ بسوں کے قافلہ کی صورت میں روانہ ہوئے تاکہ دہلی پہنچ کر اترا کھنڈ ریلی میں شریک ہوں۔ یوپی گورنمنٹ کے آڈر کے تحت پولیس اور پی اے سی نے مظفر نگر کے پاس ان بسوں کو روک لیا۔ اس کے نتیجہ میں پولیس اور اترا کھنڈ حامیوں کے درمیان تصادم ہوا۔ پولیس نے نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔ یہاں تک کہ گولی چلائی۔ اس حادثہ کے بعد علاقہ کے کئی شہروں میں تشدد پھیل گیا۔

دی پانیئر (۱۶ اکتوبر ۱۹۹۴) میں مسٹر وی ایم بادولا کا اس پر ایک معلوماتی جائزہ چھپا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ اترا کھنڈ مومنٹ ایک بے لیڈر اور بے پتورا (leaderless, rudderless) تحریک ہے۔ اس کی حقیقت سسٹم کے خلاف اندھے غصہ (blind anger against the system) سے زیادہ نہیں۔ اس قسم کی جذباتی تحریکیں صرف تباہی پر ختم ہوتی ہیں۔ بد قسمتی سے اکثر سیاسی تحریکوں کی نوعیت یہی ہے۔ سیاسی تبدیلی کی تحریک چلانا ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کام کے لئے صرف انھی سنجیدہ لوگوں کو اٹھنا چاہئے جو فی الواقع اس کی استعداد رکھتے ہوں اور وہ ایک لیڈر کی اطاعت بھی کر سکتے ہوں۔ جو تحریک بے لیڈر ہو یا اس کے کئی لیڈر ہوں

وہ اپنے انجام کے اعتبار سے خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک صاحب جوش وخروش کے ساتھ مسلمانوں کے لئے سروسوں میں ریزرویشن کی حمایت کررہے تھے۔ میں نے کہ کیسی عجیب بات ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کے نتیجہ میں جب مسلمان سرکاری ملازمتوں میں لئے جانے لگے تو اکبر الہٰ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶) نے اس پر طنز کرتے ہوئے :

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوۃ ہے نہ حج ہے   تو خوشی پھر اس میں کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

آج جب تبلیغی جماعت جیسی تحریکوں کی کوشش سے نماز روزہ کی کثرت ہوگئی تو مسلمان مقررین اس کا شکوہ کررہے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو نہیں لیا جاتا۔ میں نے کہ ملازمتوں کا تعلق رزرویشن سے نہیں ہے بلکہ محنت اور لیاقت سے ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ غیر مسلموں سے تعلقات بڑھارہے ہیں، اس سے کیا ملی فائدہ حاصل ہوا ہے۔ میں نے کہ میرا خاص مقصد باہمی غلط فہمی کو دور کرنا ہے اور اسلام کی صحیح تصویر سے انھیں روشناس کرانا ہے۔ یہ فائدہ خدا کے فضل سے برابر حاصل ہورہا ہے۔ اس سلسلہ کی مختلف مثالوں میں سے ایک مثال خبرنامہ ہے۔ الرسالہ میں ہر ماہ جو خبرنامہ چھپتا ہے اس کو آپ دیکھئے۔ پچھلے چند سالوں میں اتنے زیادہ انٹرویو میڈیا کی طرف سے اسلام پر لئے گئے ہیں جو ۱۹۴۷ سے اب تک کسی کے ذریعہ نہیں ہوئے تھے۔ غیر مسلموں کے اجتماعات میں تقریر کے مواقع، غیر مسلم جرائد میں اسلام کے موضوعات پر مضامین کی اشاعت، اور اس طرح کی دوسری چیزیں اس کے علاوہ ہیں۔

۱۹۸۶ تک بابری مسجد کا مسئلہ صرف ایک مقامی مسئلہ تھا۔ عدالت کے پرامن دائرہ میں اس پر کارروائی ہورہی تھی۔ اس وقت صرف تھوڑے سے ہندو اس سے وابستہ تھے۔ حتی کہ خود اجودھیا کی ہندو اکثریت اس سے الگ تھی۔ مگر جب ملکی سطح پر اس کے لئے جلسہ جلوس کے ہنگامے کھڑے کئے گئے تو ہندو فرقہ بھی جاگ اٹھا۔ اس طرح جو معاملہ ابتداءً صرف اجودھیا کے

چند ہندوؤں کا مسئلہ تھا وہ پورے ملک کے ہندوؤں کا مسئلہ بن گیا۔ نام نہاد لیڈروں کی یہی الٹی سیاست ہے جس نے مسجد کو گرانے کے حالات پیدا کئے۔ اسلامی شریعت کے مطابق، ہندو لیڈر شپ اگر مسجد کو گرانے کی ذمہ دار ہے تو مسلم لیڈر شپ اس کو گروانے کی ذمہ دار ہے۔

مغرب سے کچھ پہلے اجتماع گاہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں مظفر نگر کے مختلف علاقوں کو دیکھا۔ ساتھیوں سے شہر کے بارہ میں ضروری معلومات حاصل کیں۔

۲۳ اکتوبر کی شام کو مغرب کی نماز اجتماع گاہ کے قریب شیعہ مسجد میں پڑھی۔ ہم لوگوں نے مسجد کے صحن میں اپنی جماعت کی، ہماری نماز جب ختم ہو گئی اور افق پر کسی قدر اندھیرا محسوس ہونے لگا، اس وقت پیچھے سے اذان جیسی آواز آئی۔ ایک شیعہ مؤذن اوپر چڑھ کر اپنی اذان دے رہے تھے۔ ان کے الفاظ سنی اذان سے کسی قدر مختلف تھے۔

نمازِ مغرب کے بعد سیمنار کی کارروائی شروع ہوئی۔ اس کا موضوع، مطبوعہ کارڈ کے مطابق یہ تھا: مسلمانوں کا رزرویشن اور تعلیم:

Muslims' reservation and education

مقررین کے نام یہ ہیں ـــــ ایس نذر محمد زیدی ایڈوکیٹ، مسٹر اجمل الرحمٰن، مسٹر شاہد صدیقی، پروفیسر اقبال حسین، ڈاکٹر ایس یو خان، حاجی عقیل احمد۔

میں نے چیف گیسٹ کی حیثیت سے سب سے آخر میں تقریر کی۔ پہلے میں نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ میں نے کہ زمانہ رسالت میں مدینہ میں جو سب سے پہلا اسکول کھولا گیا اس کے تمام ٹیچر مشرک تھے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اس سنت کی خلاف ورزی کی۔ انھوں نے کہ ہم اپنے بچوں کو صرف مسلم اسکول میں پڑھائیں گے۔ ہندو اسکول اور کرسچین اسکول میں اپنے بچوں کو نہیں بھیجیں گے۔ اسی پالیسی پر مسلمان تقریباً سو سال تک چلتے رہے۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس نے موجودہ مسلمانوں کو تعلیم میں پیچھے کر دیا۔

اب جو لوگ رزرویشن کی بات کر رہے ہیں وہ گویا اپنی غلطی کی قیمت دوسروں سے وصول

کرنا چاہتے ہیں، مگر اسباب کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے مسلم لیڈر بار بار یہ غلطی کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی شوشہ والی بات میں الجھا دیتے ہیں۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی، اردو، مسلم پرسنل لا، معاہداتی سیاست، بابری مسجد، وغیرہ۔ اب اسی قسم کا نیا شوشہ رزرویشن کی صورت میں نکالا گیا ہے۔ یہ ہمارا اصل اشو نہیں ہے۔ یہ اشو کو چھوڑ کر نان اشو میں قوم کو الجھانا ہے۔ اس قسم کی سیاست کو ہمیں چھوڑنا پڑے گا ورنہ ہم کبھی ترقی کا درجہ حاصل نہ کر سکیں گے۔

سیمنار کے بعد "سر سید ڈنر" ہوا۔ لوگوں نے بڑی دھوم سے کھایا۔ میں تو سادہ کھانا کھانے کا عادی ہوں۔ اس لئے میں نے اس پروگرام میں نیم دلانہ شرکت کی، زیادہ پر جوش طور پر میں اس میں شریک نہ ہو سکا۔

ایک صاحب نے جنگ جویانہ انداز میں کہا: آپ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے بابری مسجد کے معاملہ میں ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا۔ مسلمانوں نے کب ٹکراؤ کیا۔ وہ تو چپ چاپ اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔ انھوں نے ہمارے گھروں میں گھس کر ہمارے ساتھ ظلم کیا۔

میں نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف یہ کہا کہ آپ اس وقت جس انداز میں بول رہے ہیں اسی کا نام ٹکراؤ ہے۔ آپ تو خود ہی اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ ہم میں ایسے لوگ ہیں جو غیر ضروری طور پر ٹکراؤ کر بیٹھتے ہیں اور اس کے بعد وہ فساد پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ تمام لوگوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

یہ سیمنار علی گڈھ کے اولڈ بوائز کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ایک صاحب نے ایک مطبوعہ کاغذ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹاف ایسوسی ایشن کی جنرل باڈی کی ایک خصوصی میٹنگ ۵ اکتوبر ۱۹۹۴ کو علی گڈھ میں ہوئی۔ اس میں متفقہ طور پر ایک رزولیوشن پاس ہوا جو ڈاکٹر مظفر حسین صدیقی (آنریری سکریٹری) کے دستخط سے پریس کو برائے اشاعت بھیجا گیا ہے۔

اس رزولیوشن میں گیا ہے کہ یونیورسٹی کیمپس کی حالت انتہائی حد تک بگڑ چکی ہے۔ لا قانونیت اور کرپشن عام ہے۔ طلبہ کا کیریر سخت خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ اس صورت حال کی ساری ذمہ داری موجودہ وائس چانسلر پر جاتی ہے۔ اس لئے انھیں فوراً استعفادے کر الگ ہو جانا چاہئے۔ رزولیوشن میں گیا تھا کہ جنرل باڈی مطمئن ہے کہ اپنی اس منصفانہ پوزیشن میں اس کو یونیورسٹی کے تمام لوگوں کی حمایت حاصل ہے:

It has the backing of the entire University community.

میں نے علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے سے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ اگر بگاڑ صرف وائس چانسلر میں ہوتا اور پوری یونیورسٹی کمیونٹی اس کے خلاف ہوتی تو ایسا عمومی بگاڑ یونیورسٹی میں وجود ہی میں نہ آتا، ایک شخص کبھی بھی عمومی بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے۔ اپنے کو برحق ثابت کرنے کے لئے کس طرح آدمی خلاف واقعہ باتیں بولتا ہے۔

سیمنار اور ڈنر سے فارغ ہو کر قیام گاہ (گلزار ابراھیم) پہنچا تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ یہاں جناب عقیل احمد صاحب، جناب اجمل الرحمٰن صاحب، جناب رشید احمد صاحب اور کچھ دوسرے حضرات اکٹھا ہو گئے۔ ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

ایک صاحب نے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں اس سے ہمیں پورا اتفاق ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت مسلمان سخت مایوسی میں مبتلا ہیں، انھیں مایوسی کی اس دلدل سے کس طرح نکالا جائے۔

میں نے کہ اس کا سبب داخلی ہے نہ کہ خارجی۔ موجودہ مایوسی کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کو بار بار ناقابل حصول نشانوں کی طرف دوڑایا گیا۔ ناقابل حصول نشانہ کی طرف دوڑانے کا نتیجہ ہمیشہ مایوسی ہوتا ہے اور قابل حصول نشانہ کی طرف دوڑانے کا نتیجہ ہمیشہ امید۔

۲۴ اکتوبر کی صبح کو نماز فجر کے بعد جناب عقیل احمد صاحب کے ساتھ چائے پی۔ اس کے بعد دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ عقیل احمد صاحب کے بھتیجے مسٹر محمد عظیم اس سفر میں میرے

ساتھ تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایم بی بی ایس کے طالب علم ہیں۔ وہ سر سید ڈے کے سلسلہ میں اپنے وطن آئے تھے، اور اب دہلی ہوتے ہوئے علی گڑھ جارہے ہیں۔ ان سے مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں گفتگو ہوتی رہی۔

انھوں نے بتایا کہ میرے والد نے بھی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ والد صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ہاسٹل میں وارڈن کا بہت دبدبہ ہوتا تھا۔ ہم لوگ وارڈن کے دباؤ میں رہتے تھے۔ یہ دباؤ ہمیں تعلیم کے علاوہ دوسری فضولیات سے بچائے رکھتا تھا۔ مگر عظیم صاحب نے بتایا کہ اب یہ حال ہے کہ مہینوں تک وارڈن کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔ ہوسٹلوں میں وارڈن کے کمرے ہیں۔ مگر وارڈن ہمیشہ باہر رہتے ہیں۔ وہ طلبہ پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں کرتے اس کی وجہ طلبہ میں بڑھی ہوئی انارکی ہے۔ پہلے طلبہ وارڈن سے ڈرتے تھے۔ اب وارڈن خود طالب علموں سے ڈرتے ہیں۔ اس نے تعلیم کا معیار آخری حد تک گرادیا ہے۔

تعلیمی معیار پست ہونے کا ایک سبب رزرویشن بھی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں پچاس فی صد سیٹیں انٹرنل کے لئے مخصوص ہیں۔ چنانچہ طلبہ سوچتے ہیں کہ ہم پڑھیں یا نہ پڑھیں، ہمارا داخلہ تو ہر حال میں ہو جائے گا۔ اس تحفظ نے طلبہ کے اندر علمی ذوق کا خاتمہ کردیا ہے۔

میں نے عظیم صاحب سے پوچھا کہ طلبہ پھر کرتے کیا ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کے اطراف میں کثیر تعداد میں ڈھابے کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر وہ چائے پیتے ہیں، گانا سنتے ہیں، تفریحی باتیں کرتے ہیں۔ یہی ان کا روزانہ کا مشغلہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ طلبہ جب آپس میں بیٹھتے ہیں تو کیا وہ اپنے کورس کی باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایسے طالب علم اتنے کم ہیں کہ ان کا کوئی فی صد مقرر کرنا مشکل ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ علی گڑھ کی ڈگری کی علی گڑھ سے باہر کوئی قیمت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رعایت ترقی کی قاتل ہے۔

عظیم صاحب نے ایک عجیب واقعہ بتایا۔ کچھ سال پہلے ٹاٹا کے لوگ علی گڑھ آئے۔ اور یہاں سے ایک درجن انجینئر طلبہ کو بھرتی کر کے لے گئے۔ انھوں نے ان طلبہ کو ایک بڑے

پلانٹ میں لگایا۔ مگر انھوں نے عدم مہارت کی بنا پر فیکٹری کے ایک قیمتی بوائلر کو تباہ کر دیا۔ اس میں ٹاٹا کا کئی کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس کے بعد یہ حال ہوا کہ ٹاٹا والوں کا جب کوئی اشتہار نکلتا تو اس میں یہ لکھا ہوا رہتا تھا:

Aligarh students need not apply.

ہم چلتے ہوئے پونے آٹھ بجے صبح مودی نگر میں داخل ہوئے۔ یہ ایک صنعتی شہر ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سڑک کے دونوں طرف کئی کیلو میٹر کی لمبائی میں آباد کیا گیا ہے۔ اس صنعتی شہر کو ملتانی مل مودی نے آباد کیا تھا۔ اس کے بعد گوجر مل مودی نے اس کو ترقی دی۔

یہاں سڑک کے دونوں طرف لڑکے اور لڑکیاں اسکول کا بیگ اپنی پیٹھوں پر لادے ہوئے چل رہے تھے۔ لڑکیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ ان کے لباس اور ان کے حلیہ سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تقریباً سب کے سب پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مودی نگر سے گزرتے ہوئے مجھے یہ غم ناک احساس ہوا کہ مسلمان زندگی کی سرگرمیوں سے دور ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص پاکٹ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر عمومی مراکز حیات میں ان کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ میں نے اپنی آنکھ بند کرلی۔ پھر خیال آیا کہ میں نے جس طرح آنکھ بند کر لی ہے، اگر ڈرائیور اسی طرح اپنی آنکھیں بند کر لے تو اس کی گاڑی آگے کی سواری سے ٹکرا جائے گی۔ مسافر خواہ سو رہے ہوں لیکن ڈرائیور کو جگنا پڑتا ہے، مسافر خواہ آنکھیں بند کر لے مگر ڈرائیور کے لئے اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں کہ وہ اپنی دونوں آنکھیں کھلی رکھے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہو۔

۲۴ اکتوبر کو ساڑھے نو بجے صبح میں دہلی واپس آگیا۔ دہلی سے مظفر نگر جاتے ہوئے ہم لوگ دو جگہ ٹھہرے تھے۔ چنانچہ وہاں پہنچنے میں چار گھنٹے لگ گئے۔ واپسی میں مسلسل سفر کیا گیا۔ اس لئے صرف ڈھائی گھنٹے میں ہم لوگ دہلی پہنچ گئے۔

تقابل کا مسئلہ

امریکہ کے ایک سفر میں میری ملاقات کچھ ایسے مسلمانوں سے ہوئی جو ہندستان سے جاکر امریکہ میں آباد ہوگئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے۔ ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ امریکہ میں ہمارے لئے پیس (امن) ہے، اور ہندستان میں ہمارے لئے پیس نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ پیس کا تعلق کسی ملک سے نہیں۔ بلکہ پیس کی ایک قیمت ہے، آپ جہاں بھی وہ قیمت ادا کریں، وہاں آپ کو پیس مل جائے گا۔ یہ قیمت ایڈ جسٹمنٹ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ امریکہ میں بھی مسلمانوں کے لئے وہ تمام مسائل موجود ہیں جو ہندستان میں ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندستان میں وہ ان مسائل کو لے کر بے برداشت ہو جاتے ہیں۔ اور امریکہ میں ان مسائل کے اوپر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں ان کے لئے امن ہے اور ہندستان میں ان کے لئے امن نہیں۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے پرسنل لاء میں مداخلت کا مسئلہ ہے، ملازمتوں میں امتیاز کا مسئلہ ہے، درسی کتابوں میں غیر اسلامی مضامین کا مسئلہ ہے، مسجد کی بے حرمتی کا مسئلہ ہے، وغیرہ۔ یہ تمام مسائل امریکہ میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہندستان میں ان چیزوں کو لے کر احتجاجی سیاست چلاتے ہیں اور امریکہ میں ان چیزوں کو نظر انداز کر کے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی روش میں اسی فرق نے بے امنی کا مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ دو ملکوں کے فرق نے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اکثر لوگ غلط تقابل میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر فکری غلطیاں غلط تقابل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ صحیح تقابل سے صحیح فکر بنتا ہے اور غلط تقابل سے غلط فکر۔ اس دنیا میں صحیح رائے صرف وہ لوگ قائم کر سکتے ہیں جو اس فکری حکمت کو جانیں۔ جو لوگ اس فکری حکمت سے محروم ہوں وہ صحیح رائے سے بھی محروم رہیں گے۔

سوال

حکمت یا وزڈم کیا ہے۔ حکیم (wise man) کس کو کہا جاسکتا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ لوگوں میں اس کا واضح تصور نہیں ہے۔ اکثر لوگ محض خوش فہمی کی بنا پر کسی کو حکیم الاسلام اور کسی کو حکیم الامت کہنے لگتے ہیں۔ اس معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عبد السلام اکبانی، ناگپور)

جواب

حکمت یا وزڈم ایک اعلیٰ ترین ذہنی صفت ہے۔ میرے علم کے مطابق، انسانی تاریخ میں سب سے کم پائی جانے والی صفت یہی ہے۔ عام زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکمت ایک ایسی ذہنی صلاحیت ہے جو گہری بصیرت کے نتیجہ میں کسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ برٹش کلرجی مین اور مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) ۱۸۶۰ میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے نہایت درست طور پر حکیم یا دانا شخص کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ دانا انسان وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو کیا ہے، انگریزی ڈکشنری میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے: کسی اور چیز کی نسبت سے اہمیت و معنویت ہونا:

Having significance in relation to something else

اس حکمت یا دانائی کی ایک تاریخی مثال حدیبیہ کا معاملہ ہے۔ اس موقع پر پیغمبر اسلام اور آپ کے مخالفوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کا ایک پہلو وہ تھا جو بظاہر سب کو دکھائی دیتا تھا۔ یعنی پیغمبر اسلام کا مخالفین کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان لینا۔ بظاہر یہ طریقہ اتنا نازیبا تھا کہ حضرت عمر نے اس کو دَنِيَّة قرار دیا۔ یعنی ذلت کو اختیار کرنا۔ (البدایۃ والنہایۃ ۱۶۸/۴)۔ مگر اسی کے ساتھ اس معاملہ کا ایک اور پہلو تھا جو بظاہر معاہدہ کے وقت دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ یہ کہ کسی بھی طرح اگر ایسا ہو کہ باہمی ٹکراؤ ختم ہو جائے اور دونوں فریقوں کے درمیان معتدل فضا میں انٹر ایکشن ہونے لگے تو لوگوں کے اندر تیزی سے اسلام پھیلنا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ

وقت آجائے گا جب کہ دشمن لوگ اسلام قبول کر کے اسلام کے قریبی مددگار بن جائیں (حم السجدہ ۳۴) جیسا کہ بعد کو عملاً پیش آیا۔ گویا حدیبیہ کے معاہدہ کا ایک پہلو وہ تھا جس کو ہر صاحب بصارت دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کا ایک اور اہم تر پہلو وہ تھا جس کو صرف صاحب بصیرت ہی دیکھ سکتا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں الفظو ں میں بیان کیا گیا ہے: **فعلم ما لم تعلموا** (الفتح ۲۷) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہیں جانی۔ اضافی قدر یا ریلیٹیو ویلو کو جاننے کی اہمیت یہ ہے کہ اکثر حالات میں یہی پہلو عملی اعتبار سے فیصلہ کن بن جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم مفکرین کی سب سے بڑی کمی یہی ہے کہ وہ اس حکیمانہ بصیرت سے خالی تھے۔ وہ سامنے کی چیزوں کو دیکھ کر اقدامات کرتے رہے۔ وہ ان دوسرے پہلوؤں کو دیکھنے سے قاصر رہے جو آخر کار فیصلہ کن بننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام اقدامات نہ صرف بے نتیجہ رہے بلکہ وہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والے (counter productive) ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر مصر اور پاکستان اور ایران میں اسلام پسندوں کا یہ سمجھ لینا کہ ان کی معاصر حکومت تمام خرابیوں کی جڑ (source of all evils) ہے۔ اگر وہ کسی طرح موجودہ حکمرانوں کو اقتدار سے ہٹا دیں تو وہاں شاندار طور پر اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ اسی طرح برصغیر ہند میں مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافی تقسیم مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ہے۔ ان تمام رہنماؤں کی مشترک کوتاہی یہ تھی کہ وہ صرف سامنے کی باتوں کو دیکھ سکے، وہ ان اضافی اسباب (relative factors) کو دیکھنے سے عاجز رہے جو آخر کار فیصلہ کن بن کر ان کی تمام خوش فہمیوں کو تہ و بالا کر دینے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام رہنماؤں کی ہنگامہ خیز تحریکیں مسلمانوں کی تباہی میں اضافہ کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔ اسی حقیقت کو حضرت عمر فاروق نے ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے کہ عقل مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کم تر شر کون سا ہے۔ (**لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر و لکنه الذی یعرف خیر الشرین**)

سوال

الرسالہ مئی ۱۹۹۹ پڑھا۔ اس میں ایک مضمون "جنتی کون" کے عنوان سے ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ: جنتی انسان وہ ہے جس نے دنیا ہی میں آخرت کا تجربہ کیا۔ جس نے آخرت میں خدا کو براہ راست دیکھنے سے پہلے اسی دنیا میں اس کو بالواسطہ طور پر دیکھا۔ (صفحہ ۴) اس جملہ کی وضاحت مطلوب ہے۔ دنیا میں خدا کو بالواسطہ طور پر دیکھنے سے کیا مراد ہے۔ (عبدالسلام، جامعہ دارالسلام، عمر آباد)

جواب

"خدا کو بالواسطہ دیکھنے" سے مراد وہی چیز ہے جس کو حدیث میں تعبد الله كانك تراه (البخاری) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے صرف اس کو قابل فہم بنانے کے لئے نئے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایک ہے خدا کی ذات کو دیکھنا۔ دوسرا ہے خدا کی آیات اور آلاء کے ذریعہ خدا کو پہچاننا۔ پہلے معنی میں صرف آخرت میں کسی کو خدا کا مشاہدہ حاصل ہوگا۔ دوسرے معنی میں یہ تجربہ اسی دنیا میں گزرتا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں، دنیا میں آدمی گویا کہ خدا کو دیکھتا ہے اور آخرت میں وہ خدا کو حقیقی طور پر دیکھے گا۔ پہلا دیکھنا بالواسطہ طور پر دیکھنا ہے، اور دوسرا دیکھنا براہ راست طور پر دیکھنا۔

سوال

قرآن نے سوچنے اور سمجھنے کی نسبت قلب کی طرف کی ہے۔ اور حالیہ سائنس کی تحقیقات یہ ہیں کہ یہ دونوں صلاحیتیں دماغ کی ہیں۔ دل (قلب) کی حیثیت ایک پمپ سے زیادہ نہیں۔ تو اس میں تطبیق کی صورت کیا ہوگی؟ (ابراراحمد رفعت، سورت)

جواب

قرآن میں قلب کا لفظ حیاتیاتی اصطلاح کے طور نہیں آیا بلکہ اپنے ادبی استعمال کے طور پر آیا ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں آج بھی قلب کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا

ہے جس معنی میں وہ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے معروف اصول کے مطابق، قرآن کی ان آیتوں میں قلب کے لفظ کو اس کے ادبی مفہوم کے اعتبار سے لینا چاہئے نہ کہ اس کے حیاتیاتی مفہوم کے اعتبار سے۔ قلب کے لئے انگریزی میں ہارٹ (Heart) کا لفظ ہے۔ حیاتیاتی کتاب میں اس لفظ کی تشریح گردش خون کے مرکز کی حیثیت سے ملے گی۔ لیکن آپ انگریزی کی کوئی ڈکشنری دیکھیں تو اس میں درجنوں ایسے استعمال ملیں گے جن میں ہارٹ کو مرکز جذبات کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً With all one's heart یعنی بہت خوشی سے۔ شیکسپیر کی ایک لائن اس طرح ہے: A good heart is worth gold اس معاملہ کا تعلق صرف قلب سے نہیں ہے بلکہ دوسرے سیکڑوں الفاظ سے بھی ہے۔ مثلاً سن لائٹ اور مون لائٹ، وغیرہ۔

سوال

تقدیر کیا ہے؟ انسان کا معاملہ تقدیر کے تحت ہے یا تدبیر کے تحت۔ اگر تقدیر کے تحت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انسان مجبور ہے۔ پھر انسان کا امتحان کیوں؟ اور اگر تدبیر کے تحت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ بہت سے معاملات میں انسان اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ (محمد اسحاق، عمر آباد)

جواب

یہ معاملہ پیچیدہ اس لئے نظر آتا ہے کہ لوگ اس معاملہ میں ثنائی طرز فکر (Dichotomous thinking) کا شکار ہیں۔ یعنی وہ سمجھتے ہیں کہ یا تو سارا معاملہ تقدیر پر مبنی ہے یا سارا معاملہ تدبیر پر۔ حالانکہ یہ معاملہ ففٹی ففٹی کا ہے۔ یعنی جزئی طور پر تقدیری اور جزئی طور پر تدبیری۔ ایسا اس لئے ہے کہ انسان موجودہ دنیا میں آزمائش کے لئے رکھا گیا ہے اور آزمائش کی مصلحت چاہتی ہے کہ ایسا ہی ہو۔ آدمی جب اپنے آپ کو مجبور محسوس کرے تو وہ عاجزانہ طور پر خدا کو پکارے اور جب وہ اپنے آپ کو آزاد پائے تو وہ خدا کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرے۔ قرآن میں خدا کے مطلوب بندوں کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: یدعون ربھم خوفاً و طمعاً (السجدہ۔۱۶)۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: الایمان بین الرجاء والخوف. اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ بندے کے اوپر اپنے رب کی نسبت سے دو مختلف قسم کی کیفیات طاری ہوں۔ کبھی خوف کی کیفیت اور کبھی امید کی کیفیت۔ یہ دوطرفہ کیفیات کسی بندہ کے اوپر صرف اسی وقت طاری ہو سکتی ہیں جب کہ وہ اس دنیا میں خوف کی حالت کا تجربہ کرے اور کبھی امید کی حالت کا۔ چونکہ حالات کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہو سکتیں اس لئے انسان کو بیک وقت جبر اور اختیار کے دوطرفہ نظام کے تحت اس دنیا میں رکھا گیا۔

سوال

مجھے قرآن کے مطالعہ سے دلچسپی ہے۔ اس سلسلہ میں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ قرآن فہمی کا اصول کیا ہے۔ (ایک قاری، الرسالہ)

جواب

قرآن کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے اس کا علمی اور فنی مطالعہ۔ اور دوسرا ہے قرآن کا تذکیری مطالعہ۔ اگر آپ قرآن کا علمی اور فنی مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو آپ کو بہت سے علوم میں گہری واقفیت پیدا کرنی ہوگی جن کی تعداد اہل تفسیر نے کئی درجن بتائی ہے۔ مگر اس قسم کا مطالعہ مخصوص علماء کا کام ہے۔ وہ عام انسان کی ضرورت نہیں۔ عام انسان جو قرآن کو سادہ طور پر سمجھنا چاہتا ہو اور اس کو پڑھ کر اپنی فکری اور عملی اصلاح کرنا چاہتا ہو، ایسے انسان کے لئے درجنوں علوم میں مہارت پیدا کرنا ضروری نہیں۔ ایسے آدمی کے لئے دو چیزیں کافی ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عربی زبان سے واقف ہو اور صالح نیت کے ساتھ قرآن کو پڑھے۔ تاہم اسی کے ساتھ اس کو مستند تفسیروں کا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہئے خاص طور سے عربی تفسیروں کا۔ ورنہ دوسری زبانوں میں لکھی ہوئی تفسیروں کا مطالعہ بھی اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے ذہنی سانچہ کے مطابق آیتوں کا مفہوم متعین نہ کرے بلکہ خود قرآن نیز حدیث کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کا درست مطالعہ آدمی کو ہدایت تک پہنچاتا ہے اور اس کا نادرست مطالعہ برعکس نتیجہ کا سبب بنتا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصّہ لینا ہے جو آج ملّت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوّت ہے اور ملّت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@ vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

فروری 2000 شمارہ نمبر 279

فہرست

New Book



Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051

جہادِ اکبر

حدیث میں آیا ہے کہ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے (احمد، الترمذی)۔ اپنے آپ کو برے جذبات سے اور برے اعمال سے روکنا بے حد مشکل کام ہے۔ اس کے لئے اپنی خواہشات سے لڑنا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کام کو اسلام میں جہاد اکبر کہا گیا ہے۔

صوفیوں کی زندگی اسی جہاد اکبر کا نمونہ ہے۔ اس جہاد میں خود اپنے آپ سے لڑنا پڑتا ہے۔ نفرت، حسد، گھمنڈ، بدخواہی، غصہ اور منفی سوچ جیسی برائیوں کو اپنے اندر سے نکالنے کے لئے خود اپنے آپ سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اس جہاد کے نتیجہ میں وہ انسان بنتا ہے جس کو قرآن میں ربانی انسان کہا گیا ہے۔ سماج میں امن اور محبت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ خیر خواہی اور انسانی احترام کا ماحول قائم ہوتا ہے۔ ہر قسم کی مثبت قدریں فروغ پاتی ہیں۔ انسانی تعمیر کا کام موافق ماحول میں ہونے لگتا ہے۔

اس کے برعکس سیاسی لیڈر جس جہاد کی نمائندگی کرتے ہیں وہ دراصل جہاد کے نام پر فساد ہے۔ اس خود ساختہ سیاسی جہاد میں دوسروں کے خلاف لڑائی چھیڑی جاتی ہے۔ اس میں نفرت اور تشدد پھیلتا ہے۔ امن وسکون ختم ہو جاتا ہے۔ قیمتی جانیں ہلاک ہوتی ہیں۔ انسانوں کو بے عزت کیا جاتا ہے۔ تعمیر وترقی کے تمام کام ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ اس کے ذریعہ کوئی نئی چیز حاصل نہیں ہوتی اور جو کچھ حاصل تھا وہ بھی کھو دیا جاتا ہے۔

سیاسی لیڈروں کا یہ نام نہاد جہاد قرآن کی اس آیت کا مصداق ہے: "اور جب وہ پھرتا ہے تو زمین میں سرگرم ہوتا ہے تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلائے اور کھیتوں اور جانوں کو ہلاک کرے۔ حالاں کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا" (البقرہ ۲۰۵) معلوم ہوا کہ جو سرگرمی اپنے نتیجہ کے اعتبار سے فساد اور خوں ریزی کا سبب بنے وہ اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح سچے اسلامی جہاد کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانی سماج کے لئے رحمت اور برکت کا ذریعہ ثابت ہو۔

حقیقت پسندی

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کا ایک قول ہے: **لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر و لکنه الذی یعرف خیر الشرین** (**العبقرایات الاسلامیة**، ص۵۰۵) یعنی دانش مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ بلکہ دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے بہتر شر کون سا ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اور دوسرے فرد یا ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاملہ کو طے کرنے کی صورت کیا ہو۔ وہ کون سار ہنما اصول ہے جس کی روشنی میں باہمی نزاعات کو طے کیا جائے۔

ایسے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ معاملہ کو خیر اور شر یا انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصے میں شر نہ آئے بلکہ خیر آئے۔ وہ اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائیں اور جو انصاف ہے اس کو حاصل کریں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ ساری کوشش کے باوجود آخر میں انھیں شکایت اور نقصان کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں کوئی بھی شخص اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح کے معاملہ میں ہر نزاع کے دو فریق ہوتے ہیں۔ کسی بھی فیصلہ کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک فریق کے ساتھ دوسرا فریق بھی اس پر راضی ہو۔ ایک فریق جس چیز کو خیر یا انصاف سمجھتا ہو، اگر دوسرا فریق اس کو تسلیم کرنے پر راضی نہ ہو تو اس کا نتیجہ دو طرفہ ٹکراؤ ہوگا۔ اور ٹکراؤ ہمیشہ مسئلہ کو بڑھانے والا ہوتا ہے نہ کہ اس کو گھٹانے والا۔

بنیاد پر ان کو طے کیا جائے۔

گھر کے اندر دو مردوں یا دو عورتوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ عملی حالات کے اعتبار سے ممکن کیا ہے اور ناممکن کیا ہے۔ حق اور ناحق یا صحیح اور غلط کی بحث میں پڑنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اختلاف کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آپ ممکن پر راضی ہو جائیں تو بیک وقت آپ کو دو فائدے حاصل ہوں گے ـــــ اختلاف کا فوری خاتمہ اور مواقعِ کار کا حصول۔

یہی اصول تمام انفرادی نزاعات کے لیے ہے۔ زندگی کی سرگرمیوں کے درمیان ہر شخص کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی مالی اور کبھی غیر مالی۔ ایسے مواقع پر جو شخص حق اور باطل یا صحیح اور غلط کی بحث چھیڑے وہ بلاشبہہ غیر دانش مند انسان ہے۔ اس کے بجائے جو عملی تقاضوں کو سمجھے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے ممکن پر راضی ہو جائے تو ایسا ہی شخص عقل مند ہے، اور یہی وہ شخص ہے جو اس دنیا میں کامیابی حاصل کرے گا۔

اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو لوگوں کی توجہ تمام تر اس پر لگ جاتی ہے کہ ازروئے انصاف کیا ہونا چاہئے یا ان کے نزدیک اس معاملہ میں حق کیا ہے اور پھر اس حق کے حصول کے لئے فریق ثانی سے لڑائی چھیڑ دیتے ہیں۔ یہ لڑائی اکثر سالہا سال تک جاری رہتی ہے اور اکثر کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچتی۔ اس طرح کے موقع پر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ مفروضہ حق کے حصول میں جو وقت اور طاقت خرچ ہوگی اس کو مقابلہ آرائی سے بچا کر اپنی مثبت تعمیر میں استعمال کیا جائے۔

ٹکراؤ ہمیشہ حق کے حصول کے نام پر کیا جاتا ہے۔ مگر عملی طور پر ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے دوران نہایت قیمتی مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں عقلمندی یہ ہے کہ ہر معاملہ میں یہاں عملی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ ایک شخص اپنی ذاتی زندگی میں آئیڈیل کو اپنا نشانہ بنا سکتا ہے، مگر جب اجتماعی زندگی کا معاملہ ہو تو اس کو ہمیشہ پریکٹکل بن جانا چاہئے۔

دانش مند کون

ایک برطانوی مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) کا قول ہے کہ —
دانش مند وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اس قول کا مطلب کیا ہے اس کو مثال سے سمجھئے۔ ایک طالب علم کو امتحان دینا ہے۔ وہ وقت کے مطابق اپنے گھر سے اسکول کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ راستہ میں ایک جاہل لڑکا اس سے الجھ جاتا ہے اور اس کو گالی دیتا ہے جس کے نتیجہ میں طالب علم کو غصہ آجاتا ہے۔

اب طالب علم اگر غصہ ہو جائے اور مذکورہ لڑکے سے انتقام لینے کے لئے اس سے الجھ جائے تو عین ممکن ہے کہ اس جھگڑے میں اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ وہ وقت پر امتحان حال تک نہ پہنچے اور نتیجۃً اس کا ایک سال ضائع ہو جائے۔

اسی طرح ایک شخص کو ضروری سفر کرنا ہے۔ وہ گھر سے روانہ ہوتا ہے تاکہ ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ٹرین پر سوار ہو کر وقت پر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ لیکن جب وہ گھر سے نکلا تو راستہ میں ایک شخص سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اب اگر وہ دیر تک اس آدمی سے جھگڑتا رہے تو عین ممکن ہے کہ اس کو اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ جب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچے تو اس کو معلوم ہو کہ اس کی ٹرین چلی گئی۔

ان مثالوں پر غور کیجئے۔ مذکورہ دونوں شخصوں کا ایک مسئلہ وہ تھا جو خود مقام واقعہ پر موجود تھا۔ یعنی ایک شخص کا انھیں گالی دینا یا زیادتی کرنا۔ یہ معاملہ کا وہ پہلو تھا جو براہ راست عین موقع کے وقت دکھائی دے رہا تھا۔ اسی کے ساتھ وہاں ایک چھپا ہوا پہلو بھی تھا جو بظاہر مقام واقعہ پر موجود نہ تھا مگر ایک صاحب بصیرت آدمی غور کر کے اسے جان سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اگر ان جاہلوں سے ٹکراؤ کیا جائے اور ان کو سزا دینے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک اور انتہائی

اہم مصلحت تباہ ہو جائے گی۔ یعنی وقت پر امتحان ہال یا ریلوے اسٹیشن نہ پہنچنا اور محض ایک وقتی نوعیت کی جذباتی تسکین کی خاطر زیادہ بڑے فائدہ سے اپنے آپ کو محروم کر لینا۔

مذکورہ قول میں اسی دوسرے یا بظاہر دکھائی نہ دینے والے پہلو کو معاملہ کا اضافی پہلو کہا گیا ہے۔ معاملہ کا ابتدائی پہلو، یعنی زیادتی کرنے والے کی زیادتی، ہر آنکھ والا دیکھتا ہے مگر معاملہ کے دوسرے پہلو یا اضافی قدر (relative value) کو وہی شخص دیکھے گا جو گہری بصیرت کا حامل ہو اور اپنے اقدام کا فیصلہ عقلی غور و فکر کے تحت کرتا ہو نہ کہ محض وقتی جذبات کے تحت۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں اکثر معاملات میں یہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ غیر دانش مند آدمی صرف سامنے کی صورت حال کو دیکھ پاتا ہے اور اس کے مطابق کارروائی کر کے اپنے معاملے کو بگاڑ لیتا ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے جو معاملہ کے دیگر پہلوؤں کو دیکھ سکے۔ جو سامنے کی صورت حال سے اوپر اٹھ کر ان حقیقتوں کا ادراک کر لے جو اگرچہ مقام واقعہ پر موجود نہیں مگر آخر کار ظاہر ہو کر وہی فیصلہ کن بن جائیں گی۔

موجودہ دنیا اسی دانش مندی کا امتحان ہے۔ جو آدمی اس اعتبار سے دانش مند ثابت ہو وہی اس دنیا میں کامیاب ہوگا۔ اور جو آدمی اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے اس کے لئے یہاں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

حق غالب رہا

اسلام خدا کا آخری دین ہے۔ آخری دین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے لئے خدا نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ قیامت تک ایک محفوظ اور زندہ مذہب کی حیثیت سے باقی رہے۔ ہر چیلنج اس کے لئے زندگی کا ایک نیا موقع ثابت ہو۔ ہر چیلنج اس کے لئے ایک اسٹپنگ اسٹون بن جائے۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے۔**الاسلام یعلو ولا یعلی** (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) تاہم اسلام کا یہ علو فکری اور تاریخی معنی میں ہے، وہ سیاست اور اقتدار کے معنی میں نہیں ہے۔ سیاسی اقتدار، خدا کے قانون کے مطابق بدلتا رہتا ہے (آل عمران ۱۴۰)۔ مگر فکری اور نظریاتی سربلندی جو اسلام کو عطا ہوئی ہے اس میں کبھی کوئی فرق آنے والا نہیں۔ یہ اسلام کی ایک ابدی صفت ہے نہ کہ کوئی وقتی صفت۔

قرآن میں اس حقیقت کو پیغمبر اسلام کی نسبت سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے——— وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے، اور اللہ اس پر نگراں ہونے کے لئے کافی ہے۔ (الفتح ۲۸) خدا کا یہ فیصلہ اس حد تک حتمی ہے کہ قرآن کے مطابق، اسلام کے مخالفین اگر اس کے خلاف کوئی شر کھڑا کریں تو وہ شر بھی اسلام کے لئے خیر بن جائے گا (النور ۱۱)

اسلام کے اس مستقبل کو یقینی بنانے کے لئے خدا نے تاریخ انسانی کو ایک ایسے رخ پر ڈال دیا کہ وہ ہمیشہ وہی کورس اختیار کرے جو اسلام کی موافقت میں جانے والا ہو۔ **وکفی باللہ شھیدا** (الفتح ۲۸) کا مطلب یہی ہے۔ حتی کہ اس معاملہ کو یقینی بنانے کے لئے خدا نے یہ غیر معمولی فیصلہ فرمادیا کہ نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی اس موافقِ اسلام تاریخی عمل (Historical Process) میں اپنا مثبت حصہ ادا کرتے رہیں۔ یہ حقیقت صحیح البخاری کی ایک روایت میں اس طرح آئی ہے: **ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر** (فتح الباری ۶/۲۰۸)

اسلام کی یہ صفت کوئی پراسرار چیز نہیں۔اس کو معلوم اسباب کے تحت سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ اسلام کا ایک محفوظ دین ہونا ہے۔اسلام کے محفوظ مذہب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عین حقائق فطرت کے مطابق ہے۔اسلام کا حقائق فطرت کے مطابق ہونا اس کے اندر یہ خصوصیت پیدا کرتا ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اپنی برتر صداقت کو باقی رکھے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں بعد کے زمانے میں بگاڑ آگیا۔اس بگاڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مذاہب نے حقائق فطرت کے ساتھ اپنی مطابقت کھودی۔اور نتیجۂ وہ صرف وقتی صداقت بن کر رہ گئے نہ کہ ابدی صداقت۔اس کے برعکس اسلام اپنی اصل ابتدائی حالت پر باقی ہے۔اس لئے حقائق فطرت کے ساتھ اس کی مطابقت بھی باقی ہے۔اسلام کی یہی امتیازی صفت ہے جس نے اس کے اندر ابدیت کی قدر (eternal value) پیدا کردی۔اپنی اس صفت کی بنا پر اسلام اسی طرح ابدی صداقت بن گیا جس طرح فطرت کے قوانین ابدی صداقت بنے ہوئے ہیں۔

اسلام کے حق میں خدا کا یہ فیصلہ پچھلے چودہ سو سال کے درمیان بار بار واقعہ بنتا رہا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر اس کے چند تاریخی حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

ا۔ اسلام ۶۱۰ عیسوی میں مکہ میں شروع ہوا جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی بار وحی نازل ہوئی۔اس وقت اسلام عددی اعتبار سے ایک فی دنیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج اہل اسلام کی تعداد ساری دنیا میں ایک بلین سے بھی زیادہ ہے۔پہلے دور میں اسلام کو جو چیلنج پیش آیا وہ اتنا بڑا تھا کہ اس کو انٹر نیشنل چیلنج کہا جاسکتا ہے۔ایک طرف عرب کے تمام قبائل اسلام کو آغاز ہی میں مٹادینے پر تل گئے۔دوسری طرف عرب کے باہر اس وقت کی دنیا کے دو سب سے بڑے ایمپائر، رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر اسلام کے دشمن بن گئے۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صرف ربع صدی کے اندر پورے عرب کو اسلامائز کر لیا گیا اور اس کے بعد اگلی ربع صدی میں اسلام رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کو ہمیشہ کے لئے توڑ کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔یہ واقعہ اتنا زیادہ انوکھا تھا کہ ایک غیر مسلم مورخ نے اس کا

اعتراف ان غیر معمولی الفاظ میں کیا ہے کہ :

The expansion of Islam was the most miraculous of all miracles.

اسلام کی تیز رفتار توسیع تمام معجزوں سے زیادہ بڑا معجزہ تھا۔

۲۔ دوسری مثال اس عظیم پولیٹیکل چیلنج کی ہے جو منگول قبائل کی طرف سے پیش آیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں وہ طوفان کی طرح اٹھے۔ انھوں نے بغداد کی خلافت کو تباہ کر دیا۔ انھوں نے سمرقند سے لے کر حلب تک تمام مسجدوں کو ڈھادیا۔ ان کا یہ غلبہ اتنا زبردست تھا کہ کچھ لوگ یہ کہنے لگے کہ اگر تم یہ سنو کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس پر یقین نہ کرنا **(اذا قيل لك أن التتر انهزموا فلا تصدق)**

اس وقت اسلام کی نظریاتی طاقت ظاہر ہوئی۔ مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں نے اٹھ کر تاتاریوں کے درمیان خاموش دعوتی کام شروع کر دیا۔ انھوں نے تلوار کے چیلنج کا مقابلہ اسلام کی نظریاتی طاقت سے کیا، اس کا معجزاتی نتیجہ نکلا۔ پچاس سال سے بھی کم مدت میں پوری تصویر بدل گئی۔ منگول کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئی۔ قرآن کے یہ الفاظ تاریخ بن گئے کہ :

فاذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولی حمیم (۴۱:۳۴)

ایک غیر مسلم مورخ نے اس واقعہ کو A dazzling victory for the faith of Mohammad کا نام دیا ہے۔ وہ مزید ریمارک دیتا ہے کہ :

The religion of muslims had conquered where there arms had failed.

مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو گئے تھے۔

ایک اور غیر مسلم مورخ نے اس واقعہ کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ —— فاتح نے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا:

The conquerors have accepted the religion of the conquered.

۳۔ اسلام کے خلاف تیسرا بڑا چیلنج وہ تھا جس کو نظریاتی چیلنج (آئیڈیالوجیکل چیلنج) کہا جا

سکتا ہے۔ یہ وہ چیلنج ہے جو کمیونزم کی طرف سے پیش آیا۔ کمیونزم (اشتراکیت) انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ سے ابھرا اور تقریباً سو سال تک پوری دنیا میں لوگوں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ ۱۹۱۷ میں روسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جب سوویت یونین بنا تو اس نے عالمی سپر پاور کی حیثیت حاصل کر لی۔ وہ بظاہر نا قابل شکست نظریہ بن گیا۔

مگر واللہ غالب علی أمرہ (یوسف ۲۱) کے مطابق خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا۔ اور ۱۹۹۱ میں سوویت ایمپائر ہاؤس آف کارڈس (تاش کے پتوں کے محل) کی طرح ڈھ پڑا۔ اس طرح کمیونسٹ ایمپائر کا آخری انجام صرف یہ ہوا کہ وہ عالمی سطح پر ایک ایسا نظریاتی خلا (ideological vacuum) چھوڑے جس کو دوبارہ صرف اسلام ہی پر کر سکتا ہو۔

۴۔ اسلام کے خلاف چوتھا چیلنج جدید سائنس کے ظہور کے بعد پیش آیا۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں جب سائنسی دریافتیں بڑھیں اور فطرت کے چھپے ہوئے قوانین معلوم ہوئے تو جدید ملحدین نے یہ کہہ کر خدا کا انکار کر دیا کہ کائنات کی توجیہ کے نام پر خدا کو مانا جاتا تھا۔ اب ہم نے فطرت کا قانون دریافت کر لیا ہے، اس لئے اب خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ جولین ہکسلے (۱۸۸۷۔۱۹۷۵) نے جدید الحاد کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ واقعات اگر فطری اسباب کے تحت ظہور میں آتے ہیں تو وہ فوق الفطری اسباب کا نتیجہ نہیں ہو سکتے:

> "If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes "

اسلام کے مذہبی سسٹم کی پوری بنیاد ایک خدا کے تصور پر قائم ہے۔ اس لئے الحاد کا یہ جدید ایڈیشن اسلام کے خلاف بظاہر زبردست چیلنج تھا۔ لیکن دوبارہ خدا کا فیصلہ تاریخ میں ظاہر ہوا۔ خود مغربی دنیا میں ٹاپ کے سائنس داں اس متھ کو توڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے، مثلاً سر جیمس جینس (۱۸۷۷۔۱۹۴۶) اور سر آرتھر اڈنگٹن (۱۸۸۲۔۱۹۴۴) وغیرہ۔

ان سائنس دانوں نے سائنسی دلائل کے ذریعہ اس حقیقت کو بتایا کہ جدید ملحدین کی یہ بات محض ایک مغالطہ ہے کیوں کہ خدا کی نسبت سے اصل مسئلہ توجیہ کا ہے جب کہ نیچر محض

ایک واقعہ ہے نہ کہ کوئی توجیہ :

Nature is a fact, not an explanation.

انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ نیچر مخلوق ہے، وہ خالق نہیں۔ نیچر توجیہ نہیں کرتی وہ خود اپنے لئے توجیہہ کی محتاج ہے :

, Nature does not explain, she herself is in need of an explanation

۵۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے لئے فکری اور نظریاتی غلبہ کو ابدی طور پر مقدر کر دیا گیا ہے۔ اسلام کے خلاف ہر چیلنج opportunity in disguise ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کی گیا ہے کہ ہر عسر کے ساتھ یسر ہے (الانشراح)۔ گویا اسلام کو خدا نے ایک ایسی ناقابل تسخیر طاقت بنا دیا ہے جو اپنے ہر مائنس کو پلس میں تبدیل کر سکے۔ اس حقیقت کو ایک برٹش مورخ پروفیسر کلٹ نے پیغمبر اسلام کے ریفرنس میں اس طرح بیان کیا:

He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

انھوں نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ وہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔



ایک کتاب

راج موہن گاندھی مشہور ہندستانی اسکالر ہیں۔ ان کی ایک کتاب ۱۹۹۹ میں پنگوئن بکس نے شائع کی ہے۔ ۴۶۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام "انتقام اور مصالحت" (Revenge and Reconciliation) ہے۔ کتاب میں جنوبی ایشیا کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں اسلام کی تاریخ بھی شامل ہے۔

اس کتاب میں مسلم حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ گیارہویں صدی میں مسلم حکمراں اسلام کا جھنڈا لے کر ہندستان میں داخل ہوئے۔ راستہ میں جو ملا اس کو انھوں نے قتل کر دیا، بے شمار بتوں کو توڑ ڈالا، ہیرے جواہرات کو لوٹا۔ ان کے ہاتھ سے تلوار کبھی جدا نہ ہوتی تھی (صفحہ ۶۸)۔ کتاب میں کثرت سے اس طرح کی باتیں درج کی گئی ہیں جب کہ ان کا کوئی مستند تاریخی حوالہ موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف کی دلیل کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> 'ہر مسلماں رگ باطل کے لئے نشتر تھا'۔ یہ بات خدا کی طرف سے اقبال نے اپنی نظم جواب شکوہ میں کہی ہے، جو کہ جنوبی ایشیا کے سب سے مشہور جدید مسلم شاعر تھے۔ خود ساختہ مذہبی فریضہ یا دعوت حق کے معاملہ میں ان کا ردعمل متشددانہ تھا، قول اور عمل دونوں اعتبار سے :

> "To every vein of falsehood, every Muslim was a knife". This is God speaking in *Jawab-e-Shikwa* ('Reply to the Complaint'), composed by one of south Asia's most famous modern poet, Iqbal. To a presumed religious duty or the call of truth, the response, whether in deed or verse, was violent. (p. 68).

مذکورہ کتاب ایک تاریخی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس میں اقبال کے شعر کا حوالہ نہایت

عجیب ہے۔ کسی تاریخی بیان کو مستند تاریخ پر مبنی ہونا چاہئے نہ کہ کسی شاعر کے شعر پر۔ اقبال کا مذکورہ مصرعہ یقینی طور پر ایک شاعرانہ تخیل ہے، اس کا اسلام کی حقیقی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن راج موہن گاندھی نے اس شعر کی بنیاد پر تاریخ کے بارے میں ایک سنگین نظریہ قائم کرلیا۔ یہ بات علمی اعتبار سے سخت قابل اعتراض ہے۔ تاہم یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس غلط تصویر کشی کے زیادہ بڑے ذمہ دار اقبال ہیں یا راج موہن گاندھی۔

کچھ مسلم بادشاہوں نے اپنے سیاسی مقصد کے لئے بعض سخت کارروائیاں ضرور کی ہیں مگر ان کا جنرلائزیشن یقینی طور پر درست نہیں۔ اس معاملہ میں مصنف کے خلاف بدگمانی اس وقت کم ہو جاتی ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اگر چہ مسلم بادشاہوں کے رول کے بارے میں سخت قسم کے منفی تاثر کا اظہار کیا ہے۔ تاہم انھوں نے مسلم صوفیاء کے مثبت رول کو بہت زیادہ سراہا ہے۔ حتی کہ صوفیاء کا یہ کارنامہ بھی انھیں قابل اعتراض نظر نہیں آتا کہ انھوں نے لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنایا (صفحہ ۷۵)

مصنف کے بارے میں تعصب کا شبہہ اس وقت اور کم ہو جاتا ہے جب ہم کتاب کا وہ حصہ پڑھتے ہیں جس میں ہندو عہد کا ذکر ہے۔ ہندو عہد کے بارے میں انھوں نے اس سے بھی زیادہ سخت تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً وہ مہابھارت کے عہد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: مہابھارت کے زمانہ میں انتقامی کارروائیاں عام تھیں اور عفو و درگذر کی حیثیت اتفاقی تھی۔ کہنے کے لئے اگرچہ عفو و درگذر کی بات کہی جاتی تھی مگر عمل زیادہ تر انتقامی ہوتا تھا:

In the Mahabharta, revenge is a fact, reconciliation a fancy; forgiveness is preached, vengeance practised. (p. 16)

کسی کتاب کا معاملہ ہو یا کسی تاریخ کا معاملہ، کوئی رائے قائم کرنے کے لئے ہمیشہ اس کے پورے مجموعہ کو دیکھنا پڑتا ہے۔ کسی جزء کو دیکھ کر رائے قائم کرنا یا اس کو جنرلائز کر دینا علم کے خلاف بھی ہے اور دیانت داری کے خلاف بھی۔

اس سلسلہ میں ایک اور قابل اعتراض بات علامہ اقبال کے اردو شعر کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اقبال کے شعر کے الفاظ یہ تھے: ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا۔ اس شعر میں نشتر کے لفظ کا انگریزی ترجمہ نائف (knife) کیا گیا ہے جو کہ درست نہیں۔ یہ ترجمہ مشہور انگریزی رائٹر مسٹر خوشونت سنگھ نے کیا ہے۔ خوشونت سنگھ انگریزی کے اچھے ادیب ہونے کے ساتھ اردو زبان سے بھی واقف ہیں۔ مگر یہ سمجھنا مشکل ہے کہ انھوں نے اس معاملہ میں یہ غلطی کیوں کی۔

اقبال کے شعر میں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ 'نشتر' ہے۔ اس کا ترجمہ مسٹر خوشونت سنگھ نے نائف کیا ہے جب کہ دونوں ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ نائف کا لفظ انگریزی میں اس کاٹنے والے آلہ کے لئے بولا جاتا ہے جس کے لئے اردو میں چھری یا چاقو کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مگر نشتر اس سے مختلف چیز ہے۔ نشتر کا لفظ اردو یا فارسی میں جراحی آلہ (surgical knife) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ نشتر کے لئے انگریزی میں صحیح الفاظ یہ ہیں:

scalpel, lancet, fleam.

اقبال کے اصل الفاظ کے مطابق، ان کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان رگِ باطل کے لئے جراحی آلہ تھا۔ لیکن مسٹر خوشونت سنگھ کے ترجمہ کے مطابق اس کا مفہوم یہ بن گیا کہ: ہر مسلمان رگِ باطل کے لئے ایک چھری تھا۔

اقبال کے شعر کو میں تاریخی اعتبار سے درست نہیں سمجھتا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہر مسلمان باطل کی رگ کے لئے نشتر بنا ہوا ہو۔ باطل کے مقابلہ میں مسلمان کا کام پرامن دعوت ہے نہ کہ جراحی نشتر زنی۔ لیکن ان کے شعر کا مذکورہ انگریزی ترجمہ کرنے والے مترجم بھی یکساں طور پر غلط ہیں۔ اقبال کا کلام اگر خلاف تاریخ ہے تو انگریزی مترجم کا ترجمہ خلاف دیانت۔

چترکوٹ کا سفر

۲۹دسمبر ۱۹۹۵کو دہلی سے چترکوٹ (مدھیہ پردیش) کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کی دعوت پر ہوا۔ اس کے تحت ہر سال کسی مقام پر آل انڈیا سمّیلن کیا جاتا ہے۔ اس سال ۳۰۔۳۱ دسمبر ۱۹۹۵کو یہ سمیلن مدھیہ پردیش کے تاریخی قصبہ چترکوٹ میں ہوا۔

دہلی سے "مہاکوشل ایکسپریس" کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ پہلا تجربہ ہی حوصلہ شکن تھا۔ ٹرین ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو کر روانہ ہوئی۔ یہ ٹرین نام کے اعتبار سے "مہا" تھی مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ غیر مہا ثابت ہوئی۔ یہ بر صغیر ہند کا خاص مزاج ہے۔ یہاں ہر آدمی نام کے اعتبار سے اپنے کو بڑا ظاہر کرتا ہے، حالانکہ اس کا کام حقیقۃً بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

میرے سامنے کی برتھ پر ایک تبّتی بدھسٹ تھے۔ ان کا نام پروفیسر سمدھونی رنپوچے (Prof. Samdhony Rinpoche) تھا، وہ بنارس میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بدھزم کے بارہ میں کئی باتیں بتائیں۔

سوالات کے دوران انھوں نے بتایا کہ گوتم بدھ کے بارہ میں یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ کون سی زبان بولتے تھے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ پالی زبان میں انھوں نے اپدیش دیا۔ مگر تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں۔ بدھزم پر جتنی بھی قدیم کتابیں ہیں وہ سب گوتم بدھ کے انتقال کے بعد تحریر کی گئیں۔ خود گوتم بدھ کے زمانے میں لکھی ہوئی کوئی تحریر آج موجود نہیں۔

۲۰سال کی عمر میں رنپوچے جی کو تبت سے بھاگنا پڑا تھا۔ اب وہ ہندستان میں پناہ گزیں کے طور پر رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ چین کو تبت سے کیوں اتنی زیادہ دلچسپی ہے۔ انھوں نے کہا کہ چین وشو شکتی بننا چاہتا ہے، اور وہ تبت کے بغیر ایسا نہیں بن سکتا۔ ان کے نزدیک، چین کی نظر انڈیا پر ہے۔ اور تبت کو وہ انڈیا کا دروازہ سمجھتا ہے۔ چین کا یہ خیال ہے کہ وشو کو مکتی دلانے کے

لئے اسے وشو پر قبضہ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے وہ انڈیا پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

انھوں نے انڈین اکسپریس ۲۷ دسمبر ۱۹۹۵ میں چھپا ہوا ایک لیٹر دکھایا۔ اس کے لکھنے والے میجر جنرل وی کے مدھوک (ریٹائرڈ) تھے اور اس کا عنوان تھا:

Chinese threat from Tibet

اس میں بتایا گیا تھا کہ چین انڈیا کی سرحد پر میزائلیں نصب کر رہا ہے اور ہمارے ملک کو چین کی طرف سے زبردست خطرہ ہے۔ اس لئے کم سے کم یہ ہونا چاہئے کہ چین اور انڈیا کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کے بارہ میں عدم آغاز کا ایک معاہدہ (no-first-use treaty) کر لیا جائے۔ اس وقت ہندستان میں ایک لاکھ ۳۰ ہزار (1,30,000) تبتی بطور پناہ گزیں مقیم ہیں۔

ٹرین میں ایک اور خاص آدمی سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام ایشور بھائی پٹیل تھا۔ وہ احمد آباد کے سابرمتی آشرم میں رہتے ہیں۔ وہ نیشنل کمیشن فار صفائی کرم چاری کے اہم ممبر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے مہاتما گاندھی سے ایک خاص سبق لیا۔ وہ یہ کہ "چھوٹا کام لے کر چلو" چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے ۳۰ سالہ ریسرچ کے بعد اس قسم کے بہت سے کام کئے ہیں۔

مثلاً انھوں نے یہ کہا کہ پانی کثرت استعمال کی بنا پر دن بدن نیچے چلا جا رہا ہے۔ انسان پانی کی سطح کو اوپر نہیں لا سکتا۔ البتہ وہ پانی کے استعمال کو کم کر سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایسے طریقے ایجاد کئے جن کے ذریعہ پانی کے استعمال کو کم کیا جا سکے۔ انھوں نے بتایا کہ ٹوائلٹ کے عام فلش میں ڈھائی لیٹر پانی ایک بار میں خرچ ہوتا ہے۔ اب انھوں نے ایسا فلش تیار کیا ہے جس میں ایک بار میں صرف ڈیڑھ لیٹر پانی خرچ ہوگا۔

اسی طرح انھوں نے دیہاتوں میں استعمال کے لئے ایسے چولھے تیار کئے ہیں جن میں لکڑی کا خرچ ۲۵ فی صد تک کم ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس کا دھواں اوپر چلا جاتا ہے اس لئے گھر کالا نہیں ہوتا، اور صحت کو نقصان نہیں پہنچتا۔ اس طرح کے کئی کام انھوں نے کئے ہیں جو کہنے میں تو چھوٹے ہیں مگر حقیقت میں بہت بڑے۔

میرے سامنے کی برتھ پر ایک صاحب انگریزی ناول پڑھ رہے تھے۔ یہ ناول باریک

ئپ میں ۱۲۳۶ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا نام اس طرح تھا:

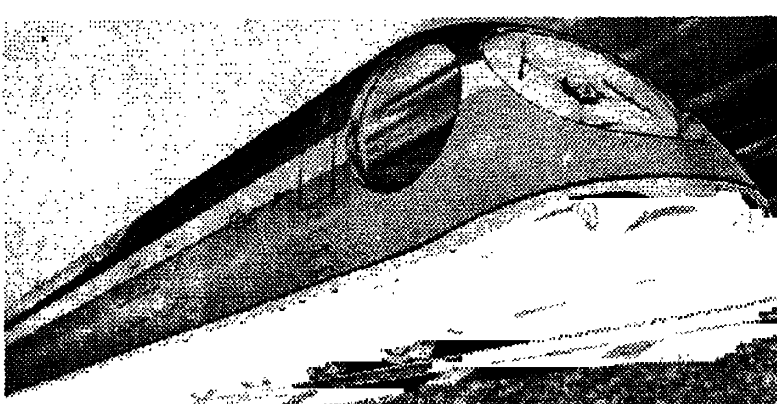
James Clavell's GAI-JIN, A Novel of Japan

اس کے آغاز میں بتایا گیا تھا کہ گائی جن کا مطلب خارجی (foreigner) ہے۔ وہ جاپان کے بعض تاریخی پہلوؤں کا افسانوی بیان تھا۔ تاہم اس میں یہ صراحت کی گئی تھی کہ یہ تاریخ نہیں ہے بلکہ فکشن ہے:

It is not history but fiction.

میں نے سوچا کہ مجھے اگر اس طرح کا ضخیم افسانہ پڑھنے کو کہا جائے تو وہ میرے لئے ایک سزا کے برابر ہوگا۔ لیکن لوگ ایسے ضخیم افسانوں کو مہنگے داموں میں خریدتے ہیں اور انھیں دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ میں علم کے لئے پڑھتا ہوں اور لوگ تفریح کے لئے۔

''جہاز ایک بار لیٹ ہوتا ہے، ٹرین بار بار'' اس کا تجربہ مجھے اس سفر میں ہوا۔ دہلی سے جب ہماری ٹرین لیٹ ہو کر چلی تو درمیان میں وہ بار بار مزید لیٹ ہوتی رہی۔ کسی دوسری ٹرین کو گزارنے کے لئے کئی بار ہماری ٹرین درمیانی اسٹیشنوں پر کھڑی کر دی گئی۔ ہوائی جہاز میں یہ مسئلہ نہیں۔ ایک بار جب وہ ہوائی اڈہ سے روانہ ہو جائے تو اس کے بعد وہ درمیان میں لیٹ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ اپنی منزل پر ہی پہنچ کر رکے گا۔



۱۲ ۱۷ کیلو میٹر کا سفر طے کر کے ہماری ٹرین ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ کی صبح کو چترکوٹ پہنچی۔ اس وقت گھڑی میں ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ جب کہ اس کا اصل وقت ساڑھے چار بجے صبح کا ہے۔ میرے ساتھی پروفیسر سدھونی رن پوچے نے کہا کہ "کبھی لیٹ ہونا اچھا ہوتا ہے"۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر ٹرین ٹھیک وقت پر آتی تو ابھی یہاں اندھیرا ہوتا۔ دو گھنٹہ لیٹ ہونے کی وجہ سے اب اجالا ہو چکا ہے۔ اور ہم لوگ اطمینان کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر جا سکتے ہیں۔

چترکوٹ یوپی اور مدھیہ پردیش کی سرحد پر ہے۔ صرف ایک دریا (مندا گنی) دونوں کو الگ کرتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن یوپی کے علاقہ میں واقع ہے۔ جلسہ کے منتظمین اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ہم لوگ چترکوٹ کے گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس میں پہنچے۔ یہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۲۰۲ میں تھا۔

یہ گیسٹ ہاؤس کھلی جگہ پر واقع ہے۔ میرے کمرہ کے سامنے دور تک سرسبز مناظر ہیں۔ سورج کی روشنی، چڑیوں کی آوازیں، فطرت کا پھیلا ہوا ماحول، اس طرح کی ایک دنیا ہے جو میرے سامنے ہے۔ مجھے فطرت کی دنیا اتنی زیادہ پسند ہے کہ جی چاہتا ہے کہ وہیں جا کر بس جاؤں۔ مگر انسان ایک متمدن مخلوق ہے۔ جنگلوں میں مستقل رہائش اختیار کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔

گیسٹ ہاؤس میں لوگ میرے کمرہ میں آتے رہے، اور ان سے مفید اور معلوماتی گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ مسٹر ڈی این بنرجی آئی اے ایس (رٹائرڈ سکریٹری) آجکل دہلی (کنگزوے کیمپ) میں واقع ہریجن سیوک سماج کے سکریٹری ہیں۔(Tel. 7234851) انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حضرت محمد صاحب نے عظیم طاقت حاصل کی۔ مگر ان کی شخصیت کا زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طاقت کو ضبط و تحمل کے ساتھ استعمال کیا جس میں بعد کی نسلوں کے لئے سبق ہے:

Hazrat Mohammad weilded great power in himself but the greater part of him is that he exercised even more restraint in the exercise of his powers which should serve as a lesson to posterity.

D.N. Banerjee, Secretary, Harijan Sevak Sangh,
Kingsway Camp, Delhi-9 (Tel. 7234851)

جموں سے بھی کئی لوگ اس کانفرنس میں آئے ہیں۔ ان میں سے ایک ۶۰ سالہ خاتون پروفیسر کوشلیاوالی ہیں۔ وہ جموں یونیورسٹی میں سنسکرت کی استاد ہیں۔ مہاکوشل اکسپریس جس سے میں چترکوٹ پہنچا اسی سے وہ بھی یہاں آئی ہیں۔

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میں پہلے سے آپ کو نہیں جانتی تھی۔ مگر ریلوے اسٹیشن پر آپ کو دیکھا تو مجھے آپ کی آنکھوں میں اور آپ کے چہرہ پر بڑی روحانیت نظر آئی۔ اس لئے میں آپ سے ملنے کے لئے آئی ہوں۔ انھوں نے درد کے ساتھ کہا: یہ گاندھی کے ہندستان کو کیا ہوا۔ آپ تو تجربہ کار ہیں، کچھ راستہ نکالئے کہ پھر سے دیش پہلے جیسا ہو جائے۔

Prof. Koshelya Walli, 20, Rajendra Nagar, Canal Road
Jammu (Tawi) Pin-180001 Tel. (Res.) 543545

اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کا تخیل مہاتما گاندھی کا دیا ہوا ہے۔ ونوبا بھاوے کا نام بھی اس میں شامل ہے۔ تاہم اس کو موجودہ نام کے ساتھ منظم انداز میں نرمل دیش پانڈے (ایم۔ پی) نے ۱۹۸۲ میں قائم کیا۔ نرمل دیش پانڈے (۶۲ سال) اس کی آل انڈیا صدر ہیں۔ سماجی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے انھوں نے شادی نہیں کی۔ وہ دہلی سے ایک ہندی پندرہ روزہ نتیہ نوتن کے نام سے نکالتی ہیں۔ چترکوٹ میں اس کا شمارہ یکم جنوری ۱۹۹۵ مجھے دیکھنے کو ملا۔ اس میں ایک مضمون پروفیسر محمد ہاشم قریشی (جے این یو) کا تھا۔ اس کا عنوان تھا: اسلام اور اہنسا۔ اس کے چند جملے یہ تھے:

"اہنسا ویروں کا ابھوشن ہے، کایروں کا نہیں۔ اہنسا کے لئے دل بڑا اور انوبل اونچا ہونا چاہئے۔ ویر لڑتے ہیں سدھانتوں کے لئے، یدھ کے لئے نہیں۔ کمزوروں، عورتوں اور بچوں کی رکچھا کے لئے لڑنا بھی اہنسا کا ہی مارگ ہے۔ اتہ اوشیک ہے کہ اسلام کے سدھانتوں کے آدھار پر اس کے انویائیوں کو آنکا جانا چاہئے نہ کہ انویائیوں کے بیوہار کے آدھار پر اسلام کو۔ مسلمان کی

کمزوری اسلام کی کمزوری نہیں ہے۔"

یہاں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم خاتون آئی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک جلگاؤں کی تھیں جن کا فیملی بیک گروئنڈ کانگریسی تھا۔ دوسری خاتون دہلی سے تھیں جن کا فیملی بیک گراؤنڈ مسلم لیگ سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک نے کہا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان میں کوئی لیڈر شپ نہیں۔

میں نے کہا کہ میری رائے تھوڑی سی مختلف ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں کا اصل مسئلہ فقدان قیادت کا نہیں ہے بلکہ فقدان قبولیتِ قیادت کا ہے۔ مثال کے طور پر سر سید اور مولانا آزاد دونوں مسلمہ طور پر قیادت کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ مگر دونوں ہی کے معاصرین نے انھیں رد کر دیا۔ سر سید کو انگریزوں کا ایجنٹ کہا گیا اور مولانا آزاد کو ہندوؤں کا ایجنٹ۔ پھر میں نے کہا کہ ہم زمانہ لوگوں کی قبولیت سے کوئی شخص لیڈر بنتا ہے نہ کہ مرحوم ہو جانے پر بعد کے لوگوں کی قصیدہ خوانی سے۔

۳۰ دسمبر کی دوپہر کو گیسٹ ہاؤس سے جلسہ کے لئے روانگی ہوئی۔ قریب پہنچے تو سڑک پر انسانوں کا ایک ہجوم نعرہ لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب دیہات سے آئے ہوئے عورت اور مرد تھے۔ ایک نعرہ کے الفاظ یہ تھے: ایک بنیں گے، نیک بنیں گے۔ اس کے علاوہ مہاتما گاندھی امر رہے، انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی تھے۔ میں گیٹ کے پاس پہنچا تو مجھ سے کہا گیا کہ یہ لوگ آپ کا آشرواد چاہتے ہیں۔ انھیں اپنا آشرواد دیجئے۔ دستی مائکروفون پر میں نے مختصر طور پر کچھ اخلاقی باتیں کہیں اور ان کو دعائیں دیں۔

رام چرت مانس کے مصنف تلسی داس بھی چترکوٹ آئے تھے۔ یہاں رہ کر انھوں نے اپنی کتاب تیار کی۔ ایک پنڈت جی نے بتایا کہ تلسی داس کے پاس اکبر بادشاہ کا پیغام آیا جس میں انھیں سیکری (راجدھانی) بلایا گیا تھا۔ تلسی داس خود نہیں گئے۔ انھوں نے ایک دوہا لکھ کر اکبر بادشاہ کو بھیج دیا:

آوت جات پنھیا ٹوٹی سنتن کو سیکریا سے کیاکام

یعنی تمہارے یہاں آنے جانے میں میرا چپل ٹوٹ جائے گا۔ میں ایک سنت ہوں سنت کو سیکری سے کیا مطلب۔

۳۰ دسمبر کی دوپہر کو جلسہ کا افتتاح تھا۔ رام لیلا میدان کے ایک وسیع پنڈال میں ملک کی چودہ ریاستوں سے آئے ہوئے پندرہ ہزار سے زیادہ آدمی جمع تھے۔ یہاں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔

دیدی نرمل دیش پانڈے نے کہا کہ تلسی داس نے اپنی رام چرت مانس اسی چترکوٹ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ اس کا ایک شعر یہ تھا:

چترکوٹ کے گھاٹ پر بھئی سنتن کی بھیڑ تلسی داس چندن گھسیں تلک دینھ رگھوبیر

انھوں نے کہا کہ آج دوبارہ اسی چترکوٹ میں سنتوں کی بھیڑ ہو رہی ہے۔ اجودھیا میں ایک انسان نے جنم لیا، اور چترکوٹ نے اس کو بھگوان بنادیا۔ انھوں نے کہا کہ رام راجیہ وہ ہے جہاں کوئی کسی سے بیر نہ کرے، جہاں نفرت اور بیر ہو وہ راون راج ہے۔ انھوں نے کہا کہ ونوبا جی کہا کرتے تھے کہ ہندستان کا دماغ شہر میں ہے مگر ہندستان کا دل گاؤں میں ہے۔

ایک ہندو وِدّوان نے بتایا کہ دنیا میں اٹھارہ الگ الگ رامائن ہیں۔ سب سے پہلے والمیکی نے رامائن لکھی تھی۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے رامائن لکھی۔ ان میں سے ایک تلسی داس کی رامائن ہے۔ اس طرح مجموعی طور پر اٹھارہ قسم کی رامائن ہیں۔ اگر والمیکی کی رامائن کو اصل قرار دیا جائے تو بقیہ سترہ رامائنیں اس کی تشریح قرار پائیں گی۔

یہاں ناناجی دیش مکھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے چترکوٹ میں ایک یونیورسٹی (مہاتما گاندھی وشوودیالیہ) بنائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے نوکریوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ ہم اس یونیورسٹی میں یہ ذہن بنانا چاہتے ہیں کہ تعلیم نوکری کے لئے نہیں ہوتی۔ وہ انسان بنانے کے لئے ہوتی ہے۔

مسٹر پنچم لال، آئی اے ایس پٹنہ سے آئے تھے۔ (Tel. 235209) وہ نہایت ذہین اور جرأت مند آدمی ہیں۔ وہ وہاں کلکٹر ہیں۔ مگر وہ نہ کسی نیتا کی سنتے ہیں اور نہ حکومت کی۔ وہ وہی کرتے ہیں جو انصاف کا تقاضا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا نباہ کیسے ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نوکری کی پرواہ نہیں۔

وہ نہایت شستہ اردو بول رہے تھے۔ انھوں نے اقبال کے کئی شعر سنائے۔ مثلاً حسب ذیل شعر:

اہل دانش عام ہیں کم ہیں مگر اہل نظر　　　کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا میرا ایاغ

سمیلن کے منچ پر میری نشست نرمل دیش پانڈے کے پاس تھی۔ درمیان میں انھوں نے منتظمین میں سے ایک شخص کو بلایا اور اس سے آہستہ سے کہا: دیکھئے، لوگ بہت منچ پر آرہے ہیں۔ اپنے لوگوں کو اتار دیجئے۔ منچ اگرچہ بہت بڑا تھا لیکن باہر کے مہمان ہی بہت کافی تھے۔ اور اس کی گنجائش نہیں تھی کہ تنظیم کے لوگ بھی آکر یہاں بیٹھیں۔ اس لئے انھوں نے ایسا کہا۔ میں نے سوچا کہ یہی صحیح اخلاقی اصول ہے کہ اپنوں کے ساتھ سختی اور دوسروں کے ساتھ نرمی کی جائے۔ جو لوگ اس کے برعکس عمل کریں، وہ اپنوں کے لئے نرم اور دوسروں کے لئے سخت بن جائیں، وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ نیکی کی بات کرتے ہیں۔ بشر میں تو دو بٹے تین شر ہے۔ ایسی حالت میں تو شر ہی کو غلبہ رہے گا۔ میں نے کہا کہ اس کو اور ڈھنگ سے دیکھئے تو برعکس طور پر آپ کو نظر آئے گا کہ بشر میں شر بہت کم ہے۔ آپ بشر میں شین کا حرف نکال دیجئے۔ اس کے بعد وہ بر بن جائے گا۔ بر کا مطلب نیکی ہے۔ اب آپ کو دکھائی دے گا کہ بشر میں دو بٹے تین نیکی ہے۔

اس طرح کی لفظی باتیں محض لطیفہ ہوتی ہیں۔ ان کو دلیل نہیں کہا جا سکتا۔ دلیل وہ ہے جو حقیقی واقعات پر مبنی ہو، نہ کہ لفظی الٹ پھیر کی بنیاد پر۔

ایک صاحب نے کہا کہ مسلم مہیلائیں ساری دنیا میں اتنی زیادہ پچھڑی ہوئی ہیں، اس کا کارن کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سارا معاملہ آپ کے غلط جنرلائزیشن کا ہے۔ اگر آپ اس واقعہ کو لیں کہ دنیا میں تین مسلم دیشوں (پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی) میں مسلم مہلائیں راج کر رہی ہیں اور اس کو جنرلائز کریں تو آپ کا سوال بدل جائے گا۔ اب آپ کہیں گے کہ مسلم مہلائیں ساری دنیا میں اتنی زیادہ آگے ہیں، اس کا کارن کیا ہے۔ مگر آپ نے کسی خاص محلّہ کی کچھ مسلم مہلاؤں کو لیا اور ان کو جنرلائز کر دیا تو آپ کو ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ مسلم مہلائیں بہت زیادہ پچھڑی ہوئی ہیں۔

چترکوٹ میں ملک کے مختلف حصوں سے لوگ آئے تھے۔ ایک صاحب بنگال کے تھے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو گاندھی بھکت بتایا۔ میں نے کہا کہ بنگالی کے بارہ میں پہلا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ انقلابی ہوگا۔ وہ سبھاش چندر کو ماننے والا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ سبھاش چندر بوس ایک پرجوش آدمی تھے۔ مگر دیرپا انقلاب (sustainable revolution) کی طاقت صرف گاندھی کی آئیڈیالوجی میں تھی۔ میں نے کہا کہ مگر آزادی کے بعد کے ہندستان نے تو بتایا ہے کہ خود گاندھی کی آئڈیالوجی بھی دیرپا نہیں تھی:

But the experience of post independent India has proved that even the Gandhian ideology was not sustainable.

پروفیسر رام چندر سنگھ (کاشی ودیا پیٹھ، بنارس) نے بہت سی باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ میں اسلام کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مگر میں پکا سہکاری ہوں۔ اسلام میں اگر قربانی نہ ہوتی تو میں اسلام کو سویکار کر لیتا۔ میں نے کہا کہ اسلام میں اگر قربانی کی تعلیم نہ ہوتی تو اسلام عالمی مذہب نہ ہوتا۔

چترکوٹ ایک تاریخی جگہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رام چندر جی کو جب چودہ سال کا بن باس ہوا تو اس کے بعد وہ یہاں آکر بارہ سال رہے تھے۔ میں نے ایک تعلیم یافتہ ہندو سے پوچھا کہ کیا یہاں اس زمانہ کا کوئی چنھ (نشان) ہے۔ انھوں نے کہا کہ قریب کے پہاڑ پر ان کے قدم کے نشان بتائے جاتے ہیں۔ مگر اس طرح کی چیزیں تاریخی طور پر قابل بحث ہیں:

But, historically, it is debatable.

ہندی اخبار امر اجالا کا شمارہ ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ دیکھا۔ اس کا اڈیٹوریل کا عنوان تھا: دیا پک تباد لے۔ درمیانی صفحہ کے مضمون کا عنوان تھا: اسلام اور راج نیتی۔ اس کے مضمون نگار آفتاب احمد تھے۔ میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ میں میڈیا کے ظہور نے ہمیں ایک نیا موقع دے دیا ہے۔ وہ یہ کہ ہم صرف ایک قابل اشاعت تحریر تیار کر سکیں۔ اور وہ اگلے دن اخباروں اور رسالوں میں چھپ کر لاکھوں لوگوں کے سامنے برائے مطالعہ موجود ہو گی۔

اجتماع گاہ میں ہندی زبان کا ایک ہینڈ بل تقسیم کیا گیا۔ اس کا عنوان تھا:

چترکوٹ کا یہ سندیش ایک رہے گا بھارت دیش

اتحاد کو لفظوں میں ڈھالنا کتنا زیادہ آسان ہے، اور اس کو حقیقت کی شکل دینا کتنا زیادہ مشکل۔

ایک صاحب نے بتایا کہ جس زمانہ میں چودھری چرن سنگھ پرائم منسٹر تھے، وہ ان سے ملے۔ انھوں نے چودھری جی سے گئو ہتیا اور برہمنوں کے بارہ میں کچھ بات کہی۔ چودھری چرن سنگھ نے سننے کے بعد کہا: آپ لوگ گائے اور برہمن کی بات تو کرتے ہیں، منش کی بات کبھی نہیں کرتے۔

بہت بڑے میدان میں اسٹیج بنایا گیا تھا۔ ہندستان بھر کے لوگ اس میں آئے ہوئے تھے۔ یہاں اسٹیج پر جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک پھلہاری بابا تھے جو اجودھیا سے آئے تھے۔ وہ سچے سادھو ہیں۔ وہ بابری مسجد کو توڑ کر مندر بنانے کے سخت خلاف تھے۔ اب بھی مقامی طور پر زیادہ ہندو انھیں کے ساتھ ہیں۔ مگر باہر سے آئے ہوئے لوگ اور گورنمنٹ کی بے عملی کی وجہ سے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا حادثہ پیش آیا۔ انھوں نے حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں سے مل کر کہا کہ اگر آپ ساتھ دیں تو میں سیکڑوں سادھوؤں کو لے کر موجودہ مندر کو توڑ کر دوبارہ وہاں مسجد بنا دوں گا۔ مگر انھیں حکومت کا تعاون نہیں ملا۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Phalahari Baba, Rajgopal Mandir, Ayodhya, Faizabad. (Tel.2042)

یہاں بہت سے لوگ ملے جنھوں نے اخبارات میں میرے مضامین پڑھے تھے یا مجھ کو ٹی وی پر دیکھا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو الرسالہ کے باقاعدہ قاری تھے۔ انھیں میں سے ایک محمد اسماعیل احمد لے تھے۔ وہ جالنہ سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ الرسالہ سے پہلے وہ الجمعیۃ ویکلی میں میرے مضامین پڑھا کرتے تھے۔

ہر تحریک اپنے وابستگان کے اندر کوئی خاص مزاج بناتی ہے۔ مثلاً سیاسی مزاج، احتجاجی مزاج، قومی مزاج وغیرہ۔ الرسالہ مشن کے سلسلہ میں میرا تجربہ ہے کہ جو لوگ پابندی سے اس کو پڑھتے ہیں ان کے اندر بھی ایک مخصوص مزاج بنتا ہے۔ یہ سنجیدگی اور حقیقت پسندی کا مزاج ہے۔ غالباً یہ صرف الرسالہ کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے قارئین میں اس قسم کا مزاج بناتا ہے۔ کسی اور تحریک کے سلسلہ میں کم از کم میں نے ایسا تجربہ نہیں کیا۔ اسی طرح تنقید کو برداشت کرنے کا مزاج بھی الرسالہ والوں میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ یہ تو سائنس کی دریافت کے خلاف ہے۔ پھر آپ اس کی کیا توجیہ کریں گے۔

میں نے کہا کہ قرآن میں ایسا موجود ہی نہیں۔ آپ کی مراد غالباً اس آیت سے ہے جس کے الفاظ ہیں کہ : **والشمس تجری لمستقر لها ذالك تقدير العزيز العليم** (یٰس) انھوں نے کہا کہ ہاں، میں نے کہا کہ اس آیت میں یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ اس میں جو بات ہے وہ یہ کہ سورج کا ایک مستقر یعنی اس کا ایک معین مدار ہے جس پر وہ گردش کرتا ہے۔ اور یہ عین سائنٹفک بات ہے۔ اس دنیا میں ذرہ سے لے کر بڑی بڑی کہکشاؤں تک کا نظام یہ ہے کہ ہر ایک کا ایک مرکز (مستقر) ہے، اور ہر چیز اپنے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہی ہے۔ زمین کا مستقر سورج ہے۔ اور سورج کا مستقر کچھ اور ہے۔ قرآن میں سورج کے خود اپنے مستقر کے گرد گھومنے کا ذکر ہے نہ کہ زمین کے گرد گھومنے کا۔

اس طرح کے اجتماعات کا سب سے بڑا فائدہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں بڑے پیانہ

پر لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک صاحب سے میں نے کہا کہ بالفرض اگر کوئی اور فائدہ نہ ہو تب بھی صرف ملنے کی خاطر (interaction for the sake of interaction) اس کو جاری رہنا چاہئے۔

جو لوگ صرف اپنے ہم قوم یا ہم مذاق لوگوں سے ملیں ان کی فکری ترقی یقینی طور پر رک جائے گی۔ فکری ترقی کو مسلسل جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر قسم کے لوگوں سے ملا جائے۔ حتی کہ ان لوگوں سے بھی جو ہم سے الگ رائے رکھتے ہوں۔ جو بظاہر ہمارے مخالف یا ہمارے دشمن ہوں۔ ملنا جلنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے، بشرطیکہ کھلے ذہن کے ساتھ ملاقات کی جائے۔

اس وقت رات کے ۸ بجے ہیں۔ اور میں گیسٹ ہاؤس میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جب میں کمرہ کا دروازہ کھول کر اس میں داخل ہوا تو اندر بالکل اندھیرا تھا۔ پھر بجلی کی سوئچ دبانے کے بعد اجالا ہو گیا اور یہ ممکن ہو گیا کہ میں اس کے اندر لکھ پڑھ سکوں۔

بظاہر یہ ایک سادہ سی بات ہے جو ہر روز ہر آدمی کے ساتھ پیش آتی ہے۔ تاہم اگر سوچئے تو اس میں بہت بڑی ایمانی خوراک موجود ہے۔ اللہ تعالی نے اپنی مخصوص حکمت کے تحت دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں بار بار اجالا اور اندھیرا آتا رہے۔ تاہم مختلف اسباب سے رات کے وقت بھی انسان کو روشنی کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے خدا نے مصنوعی روشنی کا امکان دنیا کے اندر رکھ دیا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ٹرین اور جہاز میں عمومی لائٹ بجھانے کے بعد بھی ایک نجی لائٹ ہوتی ہے جس کو محدود طور پر روشن کر کے کوئی شخص اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے۔ سورج کی عمومی روشنی کے ساتھ مصنوعی روشنی کا محدود انتظام واضح طور پر منصوبہ بندی کا ثبوت ہے۔ اور منصوبہ بندی ثابت ہونے کے بعد اپنے آپ منصوبہ ساز کا وجود ثابت ہو جاتا ہے۔

• ۳۰ دسمبر کو دوپہر کا کھانا میں نے کمرہ میں منگا لیا تھا۔ شام کا کھانا لوگوں کے ساتھ کھانے

کے لئے ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ وہاں ہم لوگ ایک میز کے گرد نو آدمی تھے۔ لوگ مسلسل بول رہے تھے۔ مگر میں بالکل خاموش سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔ دیر تک مجھے اس طرح سکوت کی حالت میں دیکھنے کے بعد ایک تعلیم یافتہ ہندو خاتون نے کہا: "مولانا صاحب اپنے میں رہتے ہیں، خدا کے ساتھ"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاہم میرا حال یہ ہے کہ مجھے بولنے سے زیادہ چپ رہنا پسند ہے۔ چپ رہنے کا مطلب سوچنا یا ذکر و فکر ہے، اور سوچنا یا ذکر و فکر کرنا بلاشبہہ ایک عبادت ہے۔

ہال کے اندر ٹی وی چل رہا تھا۔ اس پر گانے کی آواز آرہی تھی۔ جموں سے آئے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ آجکل عجیب حال ہو گیا ہے۔ ہندستانی گانے ویسٹرن ٹیون پر آتے ہیں۔ یہ تو ہندستانی گانوں کو تباہ کر دے گا۔

اس قسم کی نقل مذہب میں بھی بڑے پیانہ پر رائج ہے۔ لوگ اپنے مذہبی عمل کو خارجی شکلوں کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔

ایک صاحب (مسٹر جوشی) نے مسلم پرسنل لا میں ریفارم کی ضرورت بتاتے ہوئے کہا کہ قوانین کبھی مقدس نہیں ہوتے، اور نہ ابدی اور نا قابل تغیر ہوتے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کیوں کہ سماج کوئی جامد چیز نہیں۔ اور قوانین اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ وہ اس بات کی ضمانت دیں کہ بدلتے ہوئے سماج میں انصاف اور ہم آہنگی فراہم کر سکیں:

> Laws are not sacrosanct, unchanging and eternal. They cannot be. Because society is not static. And laws are designed to ensure just and harmonious social relationship in a changing society.

میں نے کہا کہ آپ کی یہ بات قدیم قیاسی منطق پر مبنی ہے جو اب علمی دنیا میں ختم ہو چکی ہے۔ آپ نے پیشگی طور پر فرض کر لیا کہ قوانین ہمیشہ قابل تغیر ہوتے ہیں، اس لئے اسلامی قانون کو بدلنا چاہئے۔ اس کے بجائے استدلال کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے اسلام کے قانون سے مثال دے کر یہ ثابت کریں کہ فلاں قانون فلاں متعین سبب کی بنا پر قابل تبدیلی ہو گیا ہے۔

اس کے بعد تبدیلی کا مطالبہ کریں۔ مگر آپ حقیقت کے بجائے مفروضہ کی بنیاد پر تبدیلی کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ایسا مطالبہ یقینی طور پر غیر علمی اور نا قابل قبول ہے۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو نے بتایا کہ ہمارے مولوی صاحب بچپن میں اپنے اشعار کے ذریعہ ہم کو جغرافیہ پڑھایا کرتے تھے۔ مثلاً انھوں نے سری لنکا کا جغرافیہ اس طرح ہمیں یاد کرایا تھا:

اک طرف لٹکا ہوا لنکا بہ شکل آم ہے

مجھے یاد آیا کہ اقبال احمد سہیل مرحوم نے اسی طرح کئی تاریخی کلمات موزوں کئے تھے۔ مثلاً محمود غزنوی کے داخلہ ہندستان (۱۰۰۱) کے لئے: ادھر ادھر ڈنڈا، بیچ میں دو انڈا۔

۳۱ دسمبر کی صبح کو نماز فجر ادا کی۔ اس کے بعد گیسٹ ہاؤس کی لمبی بالکنی میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت فضا میں کہر چھایا ہوا تھا۔ ہر چیز کہرے کہر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ قریب کے درخت بھی صاف دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سورج نکلنے کے ساتھ فضا صاف ہونا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح ایک اور کہر ہے جس نے موجودہ زمانہ میں تمام اعلیٰ حقیقتوں کو ذہنوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اس کو ذہنی کہر آلودگی (beffoging of mind) کہہ سکتے ہیں۔ یہ دوسرے قسم کا کہر پریس کے دور نے پیدا کیا ہے۔ لوگوں نے غلط قسم کی باتیں اور حقائق کی غلط تعبیرات اس طرح پھیلا دی ہیں کہ اب وہ انسانی ذہنوں پر پردہ بن کر چھا گئی ہیں۔ آدمی حقیقتوں کو ان کی صحیح صورت میں دیکھ نہیں پاتا۔ ہر آدمی غلط سوچ کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ فضائی کہر کو تو سورج نے ختم کر دیا، یہاں تک کہ ماحول کی ہر چیز اپنی واقعی صورت میں دکھائی دینے لگی۔ مگر ذہنی کہر کو کون صاف کرے گا۔ پھر خیال آیا کہ قیامت کا دن اس کے لئے عظیم تر سورج کی مانند ہوگا۔ اس وقت تمام حقیقتیں اپنی اصلی صورت میں دکھائی دینے لگیں گی۔ کامیاب وہ ہے جو اس سے پہلے اپنی چشم بصیرت سے حقیقتوں کو دیکھ لے۔ جو آدمی حقیقتوں کو قیامت کا سورج نکلنے کے بعد دیکھے، اس کے لئے وہ دن حسرت اور

محرومی کا دن ہوگا نہ کہ کامیابی کا دن۔

جلسہ کے منتظمین کا اندازہ تھا کہ موسم اچھا نہ ہونے کی وجہ سے شاید زیادہ آدمی نہ آ سکیں۔ مگر ۳۱ دسمبر کو بیس ہزار سے زیادہ آدمی چترکوٹ کے رام لیلا میدان میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ تعداد راشن ٹکٹ کی بنیاد پر تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ اور تھے جنھوں نے یہاں کھانا نہیں کھایا اس لئے انھوں نے ٹکٹ بھی نہیں لیا۔ ایک صاحب نے دور تک انسانوں کی بھیڑ کو دیکھ کر کہا کہ میرے خیال سے دو لاکھ آدمی ہوں گے۔ نظر کی بنیاد پر جو اندازے قائم کئے جاتے ہیں وہ اکثر غلط ہوتے ہیں۔

یہ لوگ ہندستان کے کونے کونے سے آئے تھے۔ بارش، جاڑے کا موسم، ٹرینوں اور بسوں کا صبر آزما سفر، کوئی چیز انھیں روک نہ سکی۔ بہت سے لوگ تو سیکڑوں میل دور سے بائیسکلوں کے ذریعہ سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ جب کہ انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہاں ان کے لئے کھانے اور ٹھہرنے کا کیا انتظام ہوگا۔

اس کے پیچھے موونگ فورس کیا ہے۔ یہ غالباً ایک ہی نفسیات ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسرے گروہوں میں مشترک طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اور وہ ہے تاریخ کا زور۔ اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کی پشت پر گاندھی، ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن جیسے بڑے لوگوں کے نام شامل ہیں۔ لوگ اپنے انھیں "اکابر" کے نام پر ہر طرف سے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ خدا یا حقیقت اعلیٰ کے لئے دوڑنے والے شاید نہ مسلمانوں میں ہیں اور نہ ہندوؤں میں۔

۳۱ دسمبر کو گیارہ بجے دوسرا سشن شروع ہوا۔ اس کا موضوع سرودھرم سمبھاؤ سمیلن تھا۔ سب سے پہلے ایک پارٹی نے مذہبی گیت گایا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا:

تری ذات پاک قرآن میں　　تری درس وید پران میں
گرو گرنتھ جی کے بکھان میں　　تو پرکاش اپنا دکھا رہا

پچھلے ۲۵ سال سے میں دنیا کے مختلف حصوں میں ہر مذہب کی کانفرنس میں شریک ہوتا

رہا ہوں۔ میرا احساس یہ ہے کہ مذہبی ڈائلاگ کی راہ میں دو قسم کے مسائل ہیں۔ سامی مذاہب میں یہ مسئلہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ اپنے ہی کو سچا سمجھتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں آرین مذاہب کا مسئلہ لوگوں کا یہ سمجھنا ہے کہ ہر مذہب سچا ہے۔ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر ڈائلاگ کے عمل کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے دونوں یکساں طور پر مسئلہ ہیں۔ پونے بارہ بجے ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ اتر پردیش کے راج پال موتی لال وورا آچکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کاروں کے قافلہ کے ساتھ وہ پنڈال میں داخل ہوئے۔

۳۱ دسمبر کے سروودھرم سمیلن میں پہلی تقریر مجھے کرنی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام کے بارہ میں آج بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کو نفرت کا یا مار کاٹ کا مذہب سمجھ لیا گیا ہے۔ مگر یہ بالکل الٹی بات ہے۔ اسلام سر تا سر امن اور محبت کا مذہب ہے۔ اسلام کا مقصد آدمی کو مادی کے بجائے روحانی بنانا ہے۔ اسلام جب کسی کے دل میں اترتا ہے تو وہ آدمی کے جینے کی سطح کو بلند کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی نفرت اور تشدد جیسی چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ غیر انسانی کام کیسے کرے گا۔

میں نے مختلف حدیثیں سنائیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ واقعات سنائے اور بتایا کہ آپ کا دل کس طرح ساری انسانیت کے لئے شفقت اور محبت سے بھرا ہوا تھا۔ آپ انسان کو ہر حال میں انسان کے روپ میں دیکھتے تھے، خواہ وہ اپنا ہو یا غیر۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب محبت ہی کا سبق دیتے ہیں۔ اقبال نے درست کہا ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

آخر میں میں نے کہا کہ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ ہم سب کو انسانیت اور پیار کے ساتھ رہنے کی توفیق دے۔ کیوں کہ پیار سے بھرے ہوئے سینے ہی اس دیش کو آگے لے جائیں گے۔ شانتی کی بانی بولنے والے لوگ ہی کسی نئے مستقبل کی تعمیر کریں گے۔

آج مجمع کافی تھا۔ پنڈال میں ۲۵ ہزار سے زیادہ لوگ اکٹھا تھے۔ ان میں چند کو چھوڑ کر سبھی

ہندو تھے۔ میں نے اسلام پر، تقریر کی تو پوری کانفرنس میں سب سے زیادہ خاموشی چھائی رہی۔ لوگ انتہائی توجہ کے ساتھ میرا ایک ایک لفظ سنتے رہے۔ یوپی کے گورنر موتی لال وورا نے آخر میں کہا: بہت اچھا لگا آپ کا بیان۔

میں نے سوچا کہ اس ملک میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے کتنے زیادہ مواقع تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں نے صرف ان مواقع کو برباد کیا۔ انھوں نے برادرانِ وطن سے مناظرہ بازی چھیڑ دی۔ بٹوارہ کی آندھی چلا کر دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے دور کیا۔ احتجاج اور حقوق طلبی کے ذریعہ فضا میں تلخی پیدا کرتے رہے۔ ایک کے بعد ایک ایسی تحریکیں اٹھائیں جو صرف نفرت اور تناؤ کو بڑھانے والی تھیں۔ ہمارے رہنماؤں نے کبھی بھی محبت اور خیر خواہی کے انداز میں کام نہیں کیا۔ انھوں نے اس ملک کے لوگوں کو مثبت انداز میں اسلام کا پیغام نہیں دیا۔ اس میں استثناء صرف صوفیاء کا ہے۔ جلسہ میں سبھی اخباروں کے نمائندے تھے۔ ہر اخبار میں میری تقریر کی رپورٹنگ ہوئی۔ روزنامہ نوکرم یگ (باندہ) یکم جنوری ۱۹۹۶ کا شمارہ راگھو وندر سجان نے مجھے لا کر دیا۔ اس کا ایک پیراگراف یہ تھا:

''مولانا وحید الدین خاں نے کہا کہ سبھی دھرم میں محبت اور انسانیت کی باتیں ملتی ہیں۔ اسلام کو مسلمانوں سے نہیں بلکہ مسلمانوں کو اسلام کی کسوٹی پر جانچا جانا چاہئے''۔

اس جلسہ میں زیادہ تر دیہات کے لوگ آئے تھے۔ منتظمین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اس کا مقصد دراصل عوام کو موبیلائز کرنا ہے۔ اس کے بہت سے سماجی اور اخلاقی فائدے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک جاہل عورت سے میں نے پوچھا کہ تم نے یہاں آکر کیا پایا۔ اس نے کہا کہ میں نے تو یہ پایا کہ ''ہندو مسلم سب ایک ہیں اور ہمیں ایک بن کر رہنا ہے'' اس طرح انھوں نے کہا کہ یہاں ہر ذات کے لوگ اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس طرح چھوت چھات کا ذہن ختم ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ یہاں آکر جب ہزاروں لوگوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر نیشنل اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بہت بڑے پریوار کے ممبر ہیں۔ وغیرہ

باندہ کے ایک صاحب ایک تھیلی لائے تھے۔ انھوں نے اسے دیدی نرمل دیش پانڈے کو پیش کیا۔ انھوں نے کہاکہ اس میں بڑے بڑے پونجی پتیوں کی رقمیں نہیں ہیں۔ بلکہ غریب لوگوں کی محنت کے پیسے ہیں۔ انھوں نے کہاکہ جب ہم نے لوگوں کو اکٹھا کر کے کہاکہ ہمیں سروودھرم سمبھاؤ سمیلن کے لئے کچھ دان پیش کرنا ہے۔ تو سب سے پہلے چندہ دینے والا ایک فقیر تھا۔ اس دن اسے بھیک میں دو روپیہ ملے تھے۔ اس نے اپنی جھولی خالی کرتے ہوئے اپنی ساری پونجی ہمیں دے دی، ہم نے کہاکہ تم اس میں سے ایک روپیہ لے لو۔ اس نے کہاکہ نہیں۔ میں ایک دن بھوکا رہ جاؤں گا۔ دیش کے لئے یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔

بمبئی سے ایک معمر مسلم خاتون مسز لطیفہ قاضی بھی اس اجتماع میں آئی تھیں (Tel 4922264) انھوں نے بتایاکہ ۱۰ سال پہلے میرے لڑکے ڈاکٹر قاضی سید محمد علی حیدر آباد میں ایم بی بی ایس کے طالب علم تھے۔ انھوں نے حیدر آباد میں آپ کی تقریر سنی۔ اس کو سن کر وہ رونے لگے۔ آپ نے اپنی تقریر میں بتایا تھاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے صلح کرنے کے لئے کاغذ سے رسول اللہ کا لفظ مٹادیا تھا۔ انھوں نے بتایاکہ ان کے یہ صاحبزادے اب نیویارک میں ایم ڈی کا کورس کر رہے ہیں۔ ان کا پختہ خیال ہو چکا ہے کہ اسلام امن کا مذہب ہے نہ کہ لڑنے بھڑنے کا مذہب۔

ایک صاحب نے کہا" جب تک چناؤ کی راج نیتی نہیں آئی تھی دیش میں کوئی مت بھید نہیں تھا۔ ہندو اور مسلمان کے بیچ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ الکشن کی راج نیتی نے سارا معاملہ بگاڑ دیا۔

اجودھیا سے آئے ہوئے سری مہنت رام نے کہاکہ مسلمانوں کے کچھ لیڈر جب نفرت کی بولی بولتے ہیں تو اس کے رد عمل میں فوراً ہندو فرقہ پرستوں کا سنگٹھن ہو جاتا ہے۔ ہم ہندو فرقہ پرستی کے خلاف ہیں۔ ہم اس سے لڑ رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے کچھ لیڈر، نفرت کی بولی بول کر ہمارا کام مشکل بنا دیتے ہیں۔

Shri Mahant Ram Kirpal Dass, Sanatan Mandir,
Ram Ghat, Ayodhya (Tel. 052876- 2137)

ایک مقرر نے بتایا کہ ونوبا بھاوے جی نے "جے جگت" کا نعرہ دیا تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ دیش کا نعرہ چھوڑ کر سارے جگت کا نعرہ کیوں دے رہے ہیں۔ ونوبا جی نے جواب دیا کہ ہماری سوچ عالمی ہونا چاہئے، البتہ ہمارا عمل مقامی اعتبار سے ہونا چاہئے:

We have to think globally but we have to work locally.

اجودھیا سے پروفیسر وائی آر ترپاٹھی آئے تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ سارے مذہب ایک ہیں۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کرسچین لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان پاپ کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ دوسری طرف ہندو وید بتاتے ہیں کہ ہر آدمی پرماتما کا انش کے روپ میں پیدا ہوتا ہے۔ جب مذہبوں کے بیچ میں ایسے اختلافات ہیں تو یہ کہنا کیسے چل سکتا ہے کہ سب مذہب ایک ہیں۔

Prof. Y. R. Tripathi, Principal K. S. Saket Postgraduate College,
Ayodhya Faizabad, U.P. (Tel. 0527- 814203 (R.)) (05276- 2305 O.)

میں نے کہا کہ "سارے مذاہب ایک ہیں" صرف ایک خیالی فلسفہ ہے۔ وہ کوئی عملی بات نہیں۔ مذھبی اختلاف کا حل اختلاف کو برداشت کرنا ہے نہ کہ اختلاف کو مٹانا۔

بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایک سابق ہندو استاد نے ۱۹۵۳ کا ایک واقعہ بتایا۔ ایک کانگریس مسلمان جنھوں نے آزادی کی جنگ میں اپنا سب کچھ لٹادیا تھا۔ آزادی کے بعد وہ لکھنؤ میں پنڈت گووند بلبھ پنت (چیف منسٹر) سے ملے۔ انھوں نے پنت جی سے کہا کہ میرے جاننے والے مجھ سے کہتے ہیں کہ تم کو آزادی سے کیا ملا۔ آپ مجھے کم سے کم ایم ایل سی بنادیجئے۔ تاکہ میں اپنے لوگوں کو جواب دے سکوں۔ گووند بلبھ پنت نے مذکورہ مسلمان سے کہا کہ تم کو ایم ایل سی بنا کر ہم کیا کریں گے۔ ہم کو تو وہ آدمی چاہئے جو ہم کو مسلمانوں کا ووٹ دلائے۔ مذکورہ مسلمان نے کہا کہ پنت جی کے یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا لگا جیسے مجھے آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا ہو۔

موصوف نے کہا کہ میں خود ایک کانگریسی ہوں۔ مگر آزادی کے بعد کانگریسی لیڈروں نے بس ووٹ کو سب کچھ سمجھ لیا۔ یہاں تک کہ لیگیوں اور فرقہ پرستوں سے انھوں نے صرف

اس لئے جوڑ پیدا کرلیا کہ وہ انھیں اپنے فرقہ کا ووٹ دلا سکیں گے۔

۳۰ دسمبر کی شام کو منچ پر نواح کے ایک بدھسٹ ڈاکٹر تاشی سامپھل (Tashi Samphel) سے ملاقات ہوئی۔ ان کی عمر ۴۲ سال ہے آج کل وہ سارناتھ کے تبت انسٹی ٹیوٹ میں استاد ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اسلام میں جس طرح لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ بیسک اصول ہے۔ اسی طرح بدھ دھرم کا بنیادی اصول کیا ہے۔ انھوں نے منکسرانہ انداز میں کہا: سبھی اکشل کرموں کو نہیں کرنا، کشل کرموں کو کرنا۔ اور من کو قابو میں رکھنا۔

ایک صاحب (مسٹر لال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے کہا کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ اس طرح کمیونزم پر بات چل پڑی۔ پہلے نظریاتی گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ سوویت یونین سے کمیونزم کی ناکامی یہ ثابت کرتی ہے کہ مارکسی نظریہ صحیح نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ عمل کی ناکامی سے نظریہ کی غلطی ثابت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ یہاں مسئلہ سادہ طور پر عملی ناکامی کا نہیں ہے بلکہ ایک مفروضہ کے غلط ثابت ہونے کا ہے۔ مارکس نے کہا تھا کہ انسانی شعور کوئی مستقل چیز نہیں۔ پیداوار اور تبادلہ کا نظام انسانی شعور کی صورت گری کرتا ہے۔ سوویت یونین میں یہ نظام مکمل طور پر بدل دیا گیا۔ مگر انسانی شعور میں مطلق کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دولت کی حرص، اقتدار پسندی، اغراض کا ٹکراؤ، سب بدستور پوری طرح جاری رہا۔

وہ بحث کرتے رہے۔ پھر میں نے موضوع بدل دیا۔ میں نے کہا کہ بالفرض اگر آپ کمیونزم کی نظریاتی غلطی نہ مانیں تو ایک اور بات تو خالص تاریخی ہے۔ اس کو تو بہر حال آپ کو ماننا پڑے گا۔ وہ یہ کہ کمیونسٹ نظام عملی طور پر چلنے والا (sustainable) نظام نہیں۔ اس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ سوویت سسٹم کسی خارجی حملہ کے بغیر خود اپنی داخلی کمزوریوں کی بنا پر ٹوٹ گیا۔ جب کہ وہ نظام جس کو مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کہا تھا، وہ رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مزید طاقت کے ساتھ چلا جارہا ہے۔ پھر جو نظام سرے سے قابل عمل ہی نہ ہو، اور اگر قابل عمل ہو تو اس وقت جب کہ بدترین تشدد کے ذریعہ انسانی آزادی کا خاتمہ کردیا

جائے۔ پھر ایسے نظام کی انسان کو کیا ضرورت۔

ایک ۶۰ سالہ مسلم خاتون سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے شادی نہیں کی ہے۔ انھوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی ہے اور ایک یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا تنہائی (loneliness) کا احساس نہیں ہوتا، انھوں نے کہا کہ اب دو تین سال سے ہونے لگا ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد یہ احساس اور زیادہ بڑھ جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ کچھ عورتیں گھریلو زندگی کے جھنجھٹ سے بچنے کے لئے شادی نہیں کرتیں۔ جوانی کی عمر میں یہ ایک خوش نما بات دکھائی دیتی ہے۔ مگر جب عمر زیادہ ہوتی ہے تو ایسی زندگی سراپا مسئلہ بن جاتی ہے۔

یہاں تمام آنے والوں کو کھانا کھلایا جارہا تھا۔ اس لئے ان کی تعداد کا قطعی اندازہ کرنا ممکن تھا۔ ۳۱ دسمبر کو معلوم ہوا کہ آنے والوں کی تعداد ۲۰ ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ دور اور قریب سے کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں وسیع پنڈال میں جمع تھے۔ اسٹیج سے اعلان کیا گیا کہ یہاں دیش کے کونے کونے سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ کنیا کماری سے لے کر کشمیر تک کے لوگ یہاں جمع ہیں۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں ہی میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جلسوں اور میلوں میں بھاری تعداد میں آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح کے اجتماعات کے بارہ میں میرا نظریہ یہ ہے کہ ان کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر آدمی، خواہ وہ امیر ہو یا غریب، کسی نہ کسی وجہ سے ٹنشن میں رہتا ہے۔ آجکل چونکہ سفر کے ذرائع بڑھ گئے ہیں، اس بنا پر لوگوں کے لئے اپنے ٹنشن کو ریلیز کرنے کا یہ آسان طریقہ نظر آتا ہے کہ یہاں سے وہاں چلے جائیں۔ چنانچہ ایسا کوئی موقع سامنے آتے ہی لوگ اپنے گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ ان اجتماعات کی حیثیت زیادہ تر آؤٹنگ کی ہے۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق، کوئی مذہبی آؤٹنگ کر رہا ہے، کوئی سیاسی آؤٹنگ، کوئی اور آؤٹنگ۔

مسٹر عبد المعبود ایم ایس سی (دہلی) سرونٹس آف پیپل آف انڈیا سے جڑے ہوئے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ یہ سوسائٹی بہت سے رفاہی ادارے (اسپتال، معذوروں کا اسکول وغیرہ) چلاتی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس طرح کے سماجی خدمت کے ادارے ہندوؤں میں بہت زیادہ ہیں۔ جب کہ مسلمانوں میں ایسے ادارے نسبتاً بہت کم ہیں۔ اور جو ہیں وہ بھی اکثر خراب حالت میں چل رہے ہیں۔ جب کہ ہندوؤں کے ادارے عام طور پر کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

عبد المعبود صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہندو اس کو پُن سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اگلے جنم میں اس کو اس کا فائدہ ملے گا۔ مگر یہاں یہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمانوں میں آخرت کا تصور اس سے زیادہ واضح شکل میں موجود ہے۔ پھر آخرت کا تصور ان کے لئے سماجی خدمت کا محرک کیوں نہیں بنتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب موجودہ مسلم رہنما ہیں۔ موجودہ مسلمانوں میں ایسے لوگ تو بہت اٹھے جنھوں نے کچھ معروف مذہبی شکلوں میں آخرت کا فائدہ بتایا۔ مگر ایسے رہنما سرے سے پیدا ہی نہیں ہوئے جو سماجی اور انسانی خدمت کو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بتائیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں مدرسہ اور مسجد جیسے کاموں کی تو خوب دھوم دکھائی دیتی ہے مگر سماجی اور انسانی خدمت والی سرگرمیاں ان کے یہاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

یکم جنوری کی صبح کو بہت سے ہندو میرے کمرہ میں آئے۔ ہر ایک نے کہا: ہپی نیو ایر، ہپی نیو ایر۔ میں نے کہا کہ آپ کے لئے بھی (same to you)۔ ایک صاحب نئے سال کی خوشی میں کاجو الا کر دینے لگے، وغیرہ۔

نئے سال کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنا یا نہ کرنا بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ نئے سال کا اس طرح استقبال کرنا آدمی کے اندر اس نفسیات کو جگاتا ہے کہ گردش زمانہ نے مجھے کام کرنے کا ایک اور سال دیا۔ اس کے برعکس نئے سال کی آمد پر اگر آپ کے احساس کی دنیا میں اس قسم کی کوئی ہلچل نہ پیدا ہو تو آپ کا

حال اس کاہل انسان کا سا ہو جائے گا جس کے اوپر رات کا اندھیرا ختم ہو کر صبح کا اجالا آئے مگر وہ آنکھ بند کئے ہوئے بدستور اپنے بستر پر پڑا سوتا رہے۔

ایک بار کھانے کی میز پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ مؤمن کا جوٹھا شفاء ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میڈیکل سائنس کی رو سے آپ اس کو کس طرح اکسپلین کریں گے۔

میں نے کہا کہ یہ سائنسی جملہ نہیں ہے بلکہ نفسیاتی جملہ ہے۔ اس کو لفظی معنی میں لینا درست نہیں۔ مخصوص صورت حال میں جب کہ گلاس ایک ہو اور پانی پینے والے ایک سے زیادہ ہوں تو وہاں کہہ دیا گیا کہ ایک ہی گلاس میں سب لوگ پی لو۔ اس کو مسئلہ نہ بناؤ۔ اس حدیث میں شفاء کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کرنے سے انسانی محبت واخوت کا جذبہ بڑھے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ چھوا چھوت کی نفسیات کو ختم کرنے کی ایک بات ہے نہ کہ طبّی معنی میں کوئی علاج معالجہ کی بات۔

راج کرن سنگھ ایک نوجوان تھے جو بارہ بنکی سے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی سمسیا یہ ہے کہ لوگوں کی مانسکتا بدلتی جارہی ہے۔ نئی پیڑھی کے اندر بھلائی اور برائی کا فرق مٹتا جارہا ہے۔ ہمارا بھارتیہ سنسکار یہ تھا کہ دوسرے کے سکھ میں اپنا سکھ۔ نیا بھوتک واد یہ سکھاتا ہے کہ اپنا سکھ تو سب کا سکھ۔ ہمیں اس کو بدلنا ہے۔ نہیں تو سارے دیش کا ناس ہو جائے گا۔

مسٹر دیو کمار یادو ایڈوکیٹ (Tel. 55294) باندہ سے آئے تھے۔ وہ وکالت کے ساتھ سماجی کام بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ سماج سدھار کے کام کے لئے نقطۂ آغاز (اسٹارٹنگ پوائنٹ) کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلا کام لوگوں میں ایکتا لانا ہے۔ جب تک مختلف فرقوں (خاص طور پر ہندو مسلم) میں ایکتا نہیں آئے گی، وکاس کا کوئی ٹھوس کام یا کوئی بڑا کام نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے سوچا کہ آج ہندستان کا ہر آدمی کسی نہ کسی الفاظ میں یہی بات کہہ رہا ہے۔ ہر ایک یہ

محسوس کرتا ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ ایکتا ملک کی ترقی کے لئے پہلی اور لازمی شرط ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایکتا کیسے آئے۔ جب بھی دو فرقوں میں نزاع کی حالت قائم ہو جائے تو اکثر لوگ یہ انتظار کرنے لگتے ہیں کہ دونوں طرف سے پہل ہو اور دوطرفہ بنیاد پر اس مقصد کو حاصل کیا جائے۔ مگر تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں دوطرفہ بنیاد پر کبھی اصلاح نہیں آتی۔ ایسے حالات میں اصلاح کا ایک ہی قابل عمل طریقہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک گروہ پہل کرکے یک طرفہ بنیاد پر جھگڑے کو ختم کر دے۔

عبد الکریم صاحب کشمیر سے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ دہلی کی حکومت کی غلطی ہے کہ اس نے کشمیر میں بلٹ کا جواب بلٹ سے دینا شروع کیا۔ اسی سے مسائل پیدا ہوئے۔ اگر مہاتما گاندھی کے طریقہ کو اختیار کیا جاتا تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔

تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ایک آئیڈیلزم تو ہو سکتی ہے مگر وہ مسئلہ کا عملی حل نہیں۔ کشمیر کے نوجوانوں نے جب پڑوس کے دشمن ملک کی مدد لے کر کشمیر میں گن کلچر کا آغاز کر دیا تو اس کے بعد عملی طور پر یہ ناممکن تھا کہ نئی دہلی کی طرف سے اس کے جواب میں پھول کلچر چلایا جائے۔ اب کشمیر کے مسئلہ کا یہ حل نہیں ہے کہ کشمیر کے لوگ دہلی سے یہ مانگ کریں کہ آپ لوگ گولی کا جواب گولی سے نہ دے کر گولی کا جواب پھول سے دیجئے۔ اس مسئلہ کا ممکن حل صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ کشمیر کے لوگ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ہتھیار پھینک دیں۔ پڑوسی ملک سے تعلق کو ختم کر دیں اور پرامن طور پر گفت و شنید کی میز پر آجائیں۔ اس کے سوا ہر دوسری بات صرف خوبصورت لفظ ہے، وہ مسئلہ کا خوبصورت حل نہیں۔

چتر کوٹ کا جلسہ ایک عوامی جلسہ تھا۔ یہاں کا اصول یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ افراد کو بولنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ پانچ منٹ، دس منٹ کے وقت میں بہت سے لوگ بولے۔ یہاں کے تجربہ اور دوسرے تجربات کو دیکھتے ہوئے میں نے مسٹر پنچم لال سے کہا کہ دنیا میں سب سے کم (rarest among the rare) جو چیز ہے وہ ایسے افراد ہیں جن کے اندر ہم آہنگ سوچ ہو۔ مجھ

کو ہر آدمی کا دماغ طرح طرح کی باتوں کا ایک ڈھیر نظر آتا ہے۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا۔

یکم جنوری ۱۹۹۶ کو ساڑھے بارہ بجے ایک صاحب منچ پر آئے۔ ان کا نام رام گاندھی تھا۔ اور ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ان کا حلیہ، ان کا لباس بالکل مہاتما گاندھی جیسا تھا۔ وہ ایک لاٹھی لئے ہوئے اور بالکل گاندھی کی طرح چلتے ہوئے منچ پر آئے۔ وہ گاندھی جیسی عینک لگائے ہوئے تھے۔ وہ گاندھی کے اتنا زیادہ مشابہہ تھے کہ وہ گاندھی کا زندہ اسٹیچو معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ دیش کے لوگوں کے لئے دو شبدوں میں آپ کا سندیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کے راستہ پر چلنے ہی سے دیش کا کلیان ہو گا۔

سومنا دیدی ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ بابا صاحب (ونوبا جی) کہا کرتے تھے کہ کل کی دنیا کو مہیلا چلائے گی۔ انھوں نے کہا کہ اس کو پورا کرنے کے لئے ہم مہیلاؤں کو تیاری کرنا چاہیے۔

یہ بات کہ فلاں گروہ دنیا کو چلائے گا، فلاں گروہ دنیا کی امامت کرے گا۔ یہ میرے نزدیک صرف سادہ لوحی کی بات ہے۔ دنیا کی امامت کون کرے، اس کا فیصلہ براہ راست خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ کوئی گروہ نہ دعویٰ کے ذریعہ دنیا کا امام بن سکتا ہے اور نہ خود ساختہ تیاری کے ذریعہ۔

ایک مقرر نے بڑے جوش کے ساتھ کہا: گاندھی نے غلامی کو ختم کیا۔ انھوں نے ہم کو آزاد ہندستان دیا۔ میں نے سوچا کہ اس قسم کی باتیں آج ہر جگہ کہی جارہی ہیں۔ پاکستان کے لوگ کہتے ہیں کہ ہندو قیادت کسی بھی طرح پاکستان بننے دینا نہیں چاہتی تھی۔ مسٹر محمد علی جناح نے اپنی بے مثال قیادت کے ذریعہ پاکستان کو بنوایا۔ اسی طرح کسی مسلم ادارہ میں جائیے تو وہاں اپنے حضرت کی قصیدہ خوانی ہو رہی ہو گی۔ اور ادارہ کی ساری ترقی حضرت کے حصہ میں ڈالی جارہی ہو گی۔

خدا کی زمین پر کوئی بھی نہیں جو خدا کی تعریف کرے۔ جس کا سینہ اس احساس سے لبریز ہو جائے کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ خدا کے دینے سے ملا ہے۔ اگر خدا نہ دیتا تو وہ کچھ بھی پا نہیں سکتا تھا۔

۳۱؍دسمبر کو آخری سیشن تھا، ۲ بجے دن میں میری تقریر تھی۔ خلاصہ یہ تھا کہ آپ کو میرا آخری سندیش صرف ایک ہے ”آشاوادی بنئے اور نراشا کو چھوڑ دیجئے“۔ میں نے کہا کہ پچھلی رات کو جب میں گیسٹ ہاؤس میں سونے گیا تو ہر طرف اندھیرا چھاچکا تھا۔ لیکن آج جب میں سو کر اٹھا تو سورج نکل آیا اور دوبارہ چاروں طرف اجالا پھیل گیا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ خدا اس طرح اپنے بندوں کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اس دنیا میں ہر اندھیرے کے بعد اجالا ہے۔ یہاں ہر نہیں میں ہے کا امکان چھپا ہوا ہے۔ یہ دنیا کبھی سمسیاؤں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ سارا سماج ویسا ہی ہو جائے جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کرنا کیا ہے۔ کرنا یہ ہے کہ سمسیاؤں میں جینا سیکھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ گلاب کے پیڑ میں جہاں پھول ہوتے ہیں۔ وہیں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ آپ کتنا ہی بلڈوزر چلائیں مگر جب بھی گلاب کی شاخیں دوبارہ نکلیں گی تو ان میں پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوں گے۔

یہ فطرت کا خاموش پیغام ہے کہ اگر پھول چاہتے ہو تو کانٹوں کو نظرانداز کرو۔ جب آپ کانٹوں سے اپنی نگاہیں ہٹالیں تو سارا باغ آپ کو پھول ہی پھول دکھائی دے گا۔ یاد رکھئے، زندگی کانٹوں سے نباہ کرنے کا نام ہے، کانٹوں کے خلاف شور کرنے کا نہیں۔ زندگی صبح کے انتظار کا نام ہے، رات کے آنے پر واویلا کرنے کا نہیں۔

مسٹر راگھو ویندر کمار سجان دو ہندی اخباروں کے کرسپانڈنٹ ہیں۔ آج (کانپور) اور نو کرم یگ پر کاشن (باندہ)۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندو مسلم مسئلہ اخباروں میں جتنا زیادہ دکھائی دیتا ہے، حقیقت میں وہ اتنا زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہت کم ہے۔

علاقہ کے تمام اخباروں میں جلسہ کی رپورٹنگ ہوئی۔ دینک جاگرن (کانپور) نے اپنے شمارہ یکم جنوری میں جو رپورٹ شائع کی، اس کا ایک حصہ یہ تھا: دہلی سے آئے ہوئے مولانا وحیدالدین نے کہا کہ ”اسلام پیار کا گرنتھ ہے، اور نمرتا اس کا پہلا سبق ہے۔ انھوں نے کہا کہ پیار

اور شانتی بھرے سینہ سے ہی دیش کو آگے لے جایا جا سکتا ہے۔ قرآن میں بتائی ہوئی کسوٹی پر کھرا اترا مسلمان شانتی کا سمر تھک ہوتا ہے"۔

یکم جنوری ۱۹۹۶ نئے سال کا پہلا دن تھا۔ صبح کو میں گیسٹ ہاؤس کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ اور خاموشی کے ساتھ اپنا احتساب کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میری عمر اب کافی ہو گئی، میں بڑھاپے کے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ اور اب تک شاید میں کچھ نہ کر سکا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عمر بے کار گزر گئی۔

میں نے دو چیزوں کو اپنی کوششوں کا نشانہ بنایا تھا۔ مسلمانوں کے اعتبار سے یہ نشانہ کہ موجودہ مسلم نسلوں کے لئے اسلام کو ان کی از سر نو دریافت (re-discovery) بناؤں۔ دوسری طرف ہندوؤں کے اعتبار سے میرا نشانہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور تناؤ ختم ہو۔ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل حالات میں اختلاط ہونے لگے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ پہلا مقصد پوری طرح حاصل ہوا اور نہ دوسرا مقصد۔

یکم جنوری ۱۹۹۶ کی شام کو واپسی کا دن تھا۔ مغرب کی نماز گیسٹ ہاؤس میں پڑھی۔ اس کے بعد پروفیسر ہاشم قریشی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔ کھانا بالکل سادہ تھا ــــــ روٹی، دال، سبزی، چاول۔ وہ بالکل میرے ذوق کے مطابق تھا۔ اس طرح کا سادہ کھانا میں شوق سے کھاتا ہوں۔ جس "پر تکلف کھانے" کو لوگ ڈٹ کر کھاتے ہیں، اس کے بارہ میں میرا احساس اکثر ان الفاظ میں ڈھل جاتا ہے:

Mere sight is horrible.

اس کے بعد ریلوے اسٹیشن کے لئے روانگی ہوئی۔ ہلکی بارش کا موسم تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں سمیلن کے دوران بارش شروع ہو گئی تو سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ مگر عجیب بات ہے کہ تین روزہ سمیلن پورے سکون کے ساتھ انجام پایا۔ اور جیسے ہی یکم جنوری کی سہ پہر کو پروگرام ختم ہوا فوراً بارش شروع ہو گئی۔

اسٹیشن پر کچھ وقت ویٹنگ روم میں گزرا۔ یہ ایک عبرت انگیز تجربہ تھا۔ اس کی تفصیل الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ البتہ ایک تجربہ کا مختصراً ذکر کروں گا۔

ریلوے اسٹیشن پر ۸۰ سال کے ایک دیہاتی شخص بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا نام رام سرن بھائی تھا۔ وہ پورنیہ کے ایک گاؤں سے سمیلن میں شرکت کے لئے آئے تھے اور اب واپس جارہے تھے۔ انھوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔ وہ جیل گئے، اور مصیبتیں اٹھائیں۔ مگر آزادی کے بعد انھیں اس کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ وہ اپنے پورے وجود سے مفلوک الحالی کی ایک زندہ تصویر تھے۔ ان کے نزدیک، وہ اسی فی صد بھارت کی نمائندگی کررہے تھے۔ ان کے تلخ تجربات نے انھیں کوی بنادیا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک دردمندانہ انداز میں اپنی کویتائیں حاضرین کو سناتے رہے۔ یہ تمام کویتائیں آزاد ہندستان میں بھرشٹاچار اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف احتجاج تھیں۔ ان کے اشعار کو میں محفوظ نہ کرسکا۔ دو الگ الگ مصرعے یہ تھے:

جب خود مانجھی پاگل ہو پتوار بدل کر کیا ہوگا

دردشا مجبور کی مجبور ہو کر دیکھئے

کویتا سناتے سناتے وہ تقریر بھی کرنے لگتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا "ہارا ہوا شکایت کرتا ہے، تم ہارے ہوئے ہو اسی لئے شکایت کررہے ہو۔"

مذکورہ کوی کا مصرعہ: 'جب خود مانجھی پاگل ہو پتوار بدل کر کیا ہوگا'، جب میں نے سنا تو مجھے خیال آیا کہ یہ شعر اس صورت حال کے لئے ہے جب کہ کشتی درست ہو لیکن اس کا ملاح ٹھیک آدمی نہ ہو۔ تاہم ایک اور صورت حال ہے جب کہ خود کشتی ہی بوسیدہ ہو کر ٹوٹ رہی ہو، ایسی حالت میں پہلا کام ملاح کو بدلنے کا نہیں ہے بلکہ کشتی کو درست کرنے کا ہے۔ اس دوسری صورت حال کے لئے زیادہ صحیح مصرعہ یہ ہوگا:

جب کشتی ٹوٹی ہو ملاح بدل کر کیا ہوگا

چترکوٹ سے دوبارہ "مہاکوشل اکسپریس" کے ذریعہ واپسی ہوئی۔ ٹرین کا یہ سفر معمول

کے مطابق تھا۔ میں اپنی برتھ پر سو گیا۔ جلد ہی نیند آگئی۔ سفر اگرچہ بارہ گھنٹے کا تھا۔ مگر وہ رات کا سفر تھا۔ اس لئے بیشتر سفر سوتے ہوئے گزر گیا۔

۲ جنوری ۱۹۹۶ کو صبح آٹھ بجے میں مہاکوشل اکسپریس میں سفر کرتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ ٹرین تیزی سے دہلی کی طرف چلی جارہی ہے۔ جب کہ نشست کے اعتبار سے میرا رخ اس کے الٹی طرف ہے۔ اس طرح کے واقعہ کو لے کر ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ٹرین کو اس کا انجن چلاتا ہے۔ ٹرین اسی طرف جائے گی جدھر اس کا انجن اسے لے جانا چاہتا ہو۔ ٹرین کے اندر بیٹھے ہوئے مسافر اگر اپنا رخ الٹی طرف کرلیں تب بھی وہ ادھر ہی جائیں گے جدھر ٹرین کا انجن بھاگا چلا جارہا ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہی مثال زندگی کی ہے۔ انسانی زندگی ایک لمبی ٹرین کے مانند ہے جس کو سیاسی اقتدار کا انجن چلاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اہل جاہلیت نے زندگی کے انجن پر قبضہ کرلیا ہے۔ چنانچہ ٹرین تمام مسافروں کو جاہلیت کی منزل کی طرف لئے چلی جارہی ہے۔ اب جو لوگ انسانیت کو بچانا چاہتے ہیں، ان کا پہلا کام ہے کہ وہ سیاسی اقتدار کے انجن پر قبضہ کریں۔

یہ نظریہ نہایت گمراہ کن ہے۔ ۱۹۴۷ میں مہاتما گاندھی نے غیر مطلوب لوگوں سے اقتدار کا انجن چھینا۔ ۱۹۷۷ میں جے پرکاش نرائن نے اقتدار کا انجن چھینا۔ اسی طرح پاکستان میں ضیاء الحق نے اقتدار کا انجن چھینا۔ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن نے ۱۹۷۱ میں اقتدار کا انجن چھینا۔ یہی واقعہ مصر اور دوسرے مسلم ملکوں میں پیش آیا۔ ہر جگہ لوگ مفروضہ غیر مطلوب افراد سے اقتدار کا انجن چھینتے رہے۔ مگر نتیجہ ہر جگہ صفر رہا۔

نئی دہلی کے اخبار قومی آواز کے شمارہ ۲ جنوری ۱۹۹۶ میں سید شہاب الدین صاحب کا ایک بیان نظر سے گزرا۔ اس میں انھوں نے ''ملی پارلیمنٹ'' کی مذمت کی تھی جو اپنے اعلان کے مطابق، خدا کے آخری رسول کی امت کو کفار و مشرکین کے سیاسی اتباع سے نجات دلانے کے لئے اٹھی ہے۔ اور ہندستانی مسلمانوں کو ایک اسلامی سیاسی رخ عطا کرنا چاہتی ہے۔

سید شہاب الدین صاحب نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ملی پارلیمنٹ کی اس قسم کی سرگرمیوں سے ہندو تنظیموں کو مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ نام نہاد ملی پارلیمنٹ کا یہ اعلان کہ اس کا مقصد ہندستان کے مسلمانوں کو مشرکین کی سیاسی غلامی سے نجات دلانا ہے، ملک کے آئین اور اس کے سیاسی ڈھانچہ سے متصادم ہے۔

سید شہاب الدین صاحب کی یہ بات بجائے خود درست ہے۔ مگر سید شہاب الدین صاحب خود بھی ۱۹۹۲ کے آخر تک اسی قسم کی ٹکراؤ والی تباہ کن سیاست کے قائد بنے رہے۔ اسی کو کہتے ہیں: خود را فضیحت دیگراں را نصیحت۔

اسی اخبار کی ایک خبر یہ تھی کہ جموں و کشمیر کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس مسٹر ایم این سبھر وال نے بتایا ہے کہ ریاست میں ۱۹۹۵ میں انتہا پسندوں نے سب ملا کر ۵۴۸ شخصوں کا اغوا کیا۔ پچھلے چھ برسوں کے اندر اغوا کئے جانے والے افراد کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔ ریاست میں اکتوبر ۱۹۸۹ میں تشدد کے آغاز کے بعد سے اب تک تقریباً سولہ سو افراد اغوا کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۰۷ کو اغواکاروں نے قتل کر دیا۔

کشمیر کی متشددانہ تحریک اسلام کے نام پر چلائی جا رہی ہے۔ حالانکہ اس طرح کا اغوا اور قتل اسلامی شریعت میں سراسر حرام ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ علماء جو مسلم پرسنل لاء کے معاملہ میں شریعت سے معمولی انحراف پر بیانات کا اور تقریروں کا طوفان برپا کرنے کے لئے اپنے حجروں سے باہر نکل آتے ہیں، اتنے بڑے غیر شرعی فعل کے بارے میں مکمل طور خاموش ہیں۔

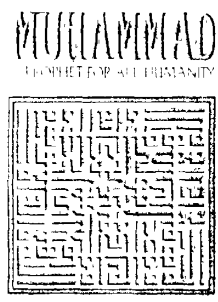
ہمارے ڈبہ میں ایک مرد اور عورت اپنے تقریباً آٹھ سالہ بچہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ایک بار میں نے سنا کہ لڑکا اپنے باپ سے پوچھ رہا ہے کہ میری ممی کہاں گئی۔ غالباً وہ ٹائلٹ میں گئی ہوئی تھی۔ باپ نے جواب میں پوچھا کہ تم کو کیا کام ہے ممی سے۔ بچہ فوراً نہایت سخت لہجہ میں بولا: آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ اور باپ بالکل خاموش رہا۔

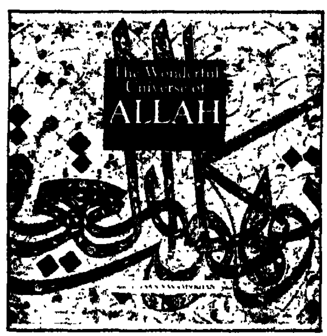
اس قسم کی باتیں بار بار دیکھنے اور سننے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہی وہ زمانہ ہے

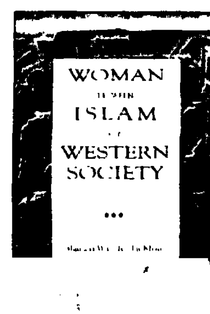
جس کی پیشین گوئی حدیث رسول میں کی گئی تھی۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کی اولاد ہی ان کا معبود ہے۔ قدیم زمانہ میں انسان مفروضہ طور پر خدا کی بیٹیوں کی پرستش کرتا تھا، آج پرستش کا یہی معاملہ لوگ خود اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے کر رہے ہیں۔

۲ جنوری ۱۹۹۶ کو ٹرین چلتی ہوئی نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ مقرر وقت کے مقابلہ میں وہ تقریباً پانچ گھنٹہ لیٹ ہو چکی تھی۔ میں باہر نکل کر پلیٹ فارم پر آیا تو ریلوے والوں کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں کو یہ پیغام دیا جارہا تھا: ''صاف صفائی کو ہم اپنا آدرش بنائیں گے۔''

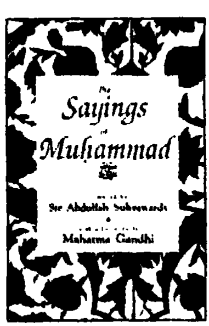
لاؤڈ اسپیکر اور پریس کے دور میں جو نئی چیزیں ظہور میں آئی ہیں، ان میں سے ایک عجیب چیز یہ ہے کہ اپنی ذاتی ذمہ داری کے اعتبار سے ہر آدمی آدرش کو نظر انداز کئے ہوئے ہے، مگر ہر آدمی دوسروں کو آدرش کا سبق دینے کا چیمپین بنا ہوا ہے۔

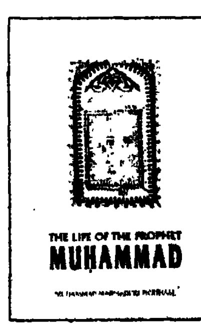














ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضہ ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو اور انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فیصد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں گے، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

	Urdu	**English**
Single Copy	Rs. 10	Rs. 12
One year	Rs. 110	Rs. 70
Two years	Rs. 200	Rs. 135
Three years	Rs. 300	Rs. 200
Five years	Rs. 480	Rs. 300

(w.e.f. January 2000)

بسم اللہ الرحمن الرحیم فروری 2000 شمارہ نمبر 280

الرسالہ
Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi

دینی تقاضے

۱۔ دین میں پہلی چیز ایمان ہے۔ ایمان خدا کی معرفت کا نام ہے۔ ایک انسان پر جب یہ حقیقت کھلتی ہے کہ خدا اس کا رب ہے اور وہ اس کا بندہ ہے اور خدا نے اس کی ہدایت کے لئے محمد بن عبداللہ کو اپنا رسول بنا کر اس کے پاس بھیجا ہے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہی ایمان ہے اور اسی کو کلمۂ اسلام کا اقرار کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایمان کی حقیقت سینہ میں اترنے کے فوراً بعد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے خالق و مالک کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام بہترین احساسات کو خدا کی طرف موڑتے ہوئے اس کا پرستار بن جاتا ہے۔ اسی کا نام شریعت میں عبادت ہے۔

۳۔ ایسے انسان کا سابقہ جب بندوں سے پڑتا ہے تو وہ عین اپنے مزاج کے تحت ہر ایک سے تواضع کے ساتھ پیش آتا ہے۔ وہ ہر ایک کا خیر خواہ بن جاتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اس سے کسی کو غیر انسانی سلوک کا تجربہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ روش ہے جس کا نام اسلامی اخلاق ہے۔

اسلامی اخلاق کے اصول پر قائم رہنے کے لئے صبر انتہائی طور پر ضروری ہے۔ جو آدمی صبر کرنے کے لئے تیار نہ ہو وہ لوگوں کے ساتھ اسلامی اخلاق برتنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جس آدمی کے اندر ایمان کی کیفیت پیدا ہو جائے وہ اپنے قریبی ماحول کے بارہ میں غیر جانبدار بن کر رہ نہیں سکتا۔ اس کا احساس مجبور کرتا ہے کہ وہ برا کرنے والوں کو برائی کرنے سے روکے اور لوگوں کو بھلائی کا طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دے۔ اسی کا نام شریعت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

۵۔ آخری چیز دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی عام انسانوں کو خدا کے تخلیقی نقشہ سے باخبر کرنا۔

محتاط روش

عن اوس بن شرحبیل انه سمع رسول الله علیه وسلم یقول: من مشی مع ظالم یقویه وهو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۲) اوسؓ بن شرحبیل کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو شخص ظالم کے ساتھ چلے تاکہ اس کو تقویت حاصل ہو، اور وہ جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے، تو ایسا شخص اسلام سے نکل گیا۔

عن ابراهیم بن میسرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی هدم الاسلام (مشکاۃ ۱/۶۶) ابراہیمؒ بن میسرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بدعت والے کی توقیر کرے تو اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

کسی آدمی کے برا آدمی ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ براہِ راست برائی میں ملوث ہو۔ مثلاً وہ خود برا کام کرے یا برا کام کرنے والے کا باقاعدہ ساتھی بن جائے۔ جو لوگ اس طرح براہ راست انداز میں ملوث ہوں ان کا برا ہونا ایک معلوم اور مسلّم بات ہے۔ تاہم اسلام کی نظر میں صرف وہی شخص برا نہیں جو ذاتی طور پر اور براہِ راست طور پر برائی میں ملوث ہو۔ اسلام کے نزدیک وہ شخص بھی یکساں طور پر برا ہے جو بالواسطہ انداز میں برائی کے عمل میں ملوث ہوتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں آدمی کا ہر عمل یا تو کسی کے موافق ہوتا ہے یا کسی کے مخالف، ہر آدمی اپنے قول و عمل سے ایک روش کی تائید کرتا ہے اور دوسری روش کی تردید، خواہ یہ تائید و تردید براہ راست ہو یا بالواسطہ۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ جب بھی وہ کسی معاملہ میں بولے یا کوئی کارروائی کرے تو بولنے یا کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ اس کے قول یا عمل کے ذریعہ کس کی حمایت ہوتی ہے اور کس کی مخالفت۔ اور وہ وہی کرے جس سے اہل حق کی حمایت ہوتی ہو۔ ہر حال میں وہ اہل باطل کی حمایت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے حتی کہ بالواسطہ حمایت سے بھی۔

سرچشمۂ اعتماد

۲۷ جنوری ۲۰۰۰ کو دہلی میں میرے ساتھ ایک جانکاہ ذاتی حادثہ پیش آیا۔ میرا ایک نوجوان پوتا سڑک کے ایک حادثہ میں اچانک وفات پا گیا۔ ۲۸ جنوری کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد اوکھلا کی مسجد میں نماز جنازہ ہوئی اور جامعہ کے قبرستان میں اس کو دفن کیا گیا۔

مرحوم خالد (فرزند ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ڈائرکٹر، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز) ایک انتہائی ذہین نوجوان تھا۔ وہ آرکٹیکچر میں زیر تعلیم تھا۔ ہر لحاظ سے وہ ایک صالح اور لائق نوجوان تھا۔ گویا کہ وہ ایک کلی تھی جس کو ابھی پھول بننا باقی تھا۔ مگر اس کے لئے مقدر تھا کہ وہ پھول بننے سے پہلے ہی موجودہ دنیا سے رخصت ہو جائے۔ جمعہ کی نماز کے بعد جب اس کی میت روانہ ہوئی اور میں نے میت کے پلنگ کو کندھا دیا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میری زبان سے نکلا: یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بوڑھا دادا نوجوان پوتے کے جنازہ کو کندھا دے رہا ہے۔

مرحوم خالد کی میت جب قبر کے اندر رکھی جا چکی اور حسب قاعدہ میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس میں مٹی ڈالتے ہوئے کہا: **منها خلقناكم وفيها نعيدكم و منها نخرجكم تارةً اخرى** ۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قبر سے مرحوم نوجوان کی پر مسرت آواز میرے کانوں میں آرہی ہے: دادا آپ رو رہے ہیں، میں تو دیکھئے، جنت کے باغوں میں کھیل رہا ہوں۔ مرحوم خالد کی وفات کے بعد اگلی رات کو میری لڑکی ڈاکٹر فریدہ نے خواب دیکھا کہ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے: ابا دیکھئے خالد تو بول رہے ہیں۔

یہ اسلام کی تعلیم کا کرشمہ تھا۔ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ معصوم بچے بلا حساب کتاب جنت میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ مرحوم خالد ابھی معصومیت کی عمر میں تھا، وہ ابھی مسؤلیت کی عمر میں نہیں پہنچا تھا۔ مزید یہ کہ مومن کے لئے حادثہ یا ہدم کی موت کو شہادت کی موت کہا گیا ہے (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب بیان الشہداء) اس بنا پر انشاء اللہ یقینی ہے کہ مرحوم کی موت اس

ے لئے جنت میں داخلہ کا دروازہ تھی۔ ہمارے لئے وہ ایک سوگواری کا دن تھا، مگر مرحوم کے لئے وہ جنت میں داخلہ کا دن۔

یہ انسان کے لئے اسلام کا ایک عظیم تحفہ ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا یہ ایک نادر پہلو ہے کہ وہ بدترین مایوسی کے وقت بھی امید کا پیغام دیتا ہے۔ بحران کے سنگین ترین لمحات میں وہ انسان کے لئے سرچشمۂ اعتماد بن جاتا ہے۔ وہ کھونے کی حالت میں بھی پانے کا راز بتاتا ہے۔ ایک غیر اسلامی ذہن جہاں محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی کا سفر محرومیوں کے ساتھ ختم ہو گیا، وہاں اسلام اپنے وفاداروں کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ نہیں، یہ تمہارے لئے خاتمہ نہیں، بلکہ یہ تمہارے لئے نئے بہتر دور کا آغاز ہے۔ یہ موت نہیں بلکہ زندگی ہے۔ مومن کے لئے محرومی کی ہر کہانی یافت کی کہانی ہے۔ زندگی کے طوفان خیز لمحات میں بھی اللہ کا اعتماد اس کے لئے اتھاہ سہارا ہوتا ہے۔

مومن کی ہر رات ایک نئی صبح کا آغاز ہے۔ مومن کے لئے اس کا ایمان ایک اتھاہ سرچشمۂ اعتماد ہے۔ مایوسی اور محرومی غیر مومن کے لئے ہو سکتی ہے مگر مومن کے لئے اس دنیا میں نہ مایوسی کا سوال ہے اور نہ محرومی کا سوال۔

یہ بات صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس طرح آئی ہے: **عجباً لأمر المؤمن ان امره كله له خير، وليس ذلك لأحد الا للمؤمن، ان اصابته سراء شكر فكان خيراً له، و ان اصابته ضراء صبر فكان خيراً له** (مشکاۃ المصابیح ۱۴۵۸/۳) یعنی مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لئے خیر کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہ چیز مومن کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اس کو خوشحالی پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے۔ اس طرح خوش حالی اس کے لئے خیر بن جاتی ہے اور اگر اس کو نقصان پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اس طرح نقصان اس کے لئے خیر بن جاتا ہے۔

زندگی ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے کا امتحان ہے، اور اسلام ہمیں وہ طاقت دیتا ہے جس کے ذریعہ ہم اس ناقابل برداشات کو برداشت کر سکیں۔

ایک حدیث

صحیح مسلم کا آغاز کتاب الایمان سے ہوتا ہے۔ اس کے ایک باب کا عنوان یہ ہے کہ جو شخص قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے اس کے لئے جہنم کی وعید ہے (**باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین فاجرة بالنار**):

عن ابی امامة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من اقتطع حق امرئ مسلم بیمینه فقد اوجب الله له النار وحرم علیه الجنة. فقال له رجل وان کان شیئاً یسیراً یا رسول الله قال: وان کان قضیباً من اراكٍ (الجامع لاحکام القرآن ۴/۱۲۰)

ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان آدمی کا مال قسم کھا کر مار لے تو اللہ اس کے لئے آگ کو واجب کر دیتا ہے۔ اور اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر چہ وہ کوئی معمولی چیز ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اگر چہ وہ پیلو کی ایک ٹہنی کیوں نہ ہو۔

دوسرے کی چیز ہڑپ کرنے کے بعد قسم کھانا دراصل اپنے آپ کو جائز ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ آدمی کبھی قسم کے ذریعہ سے اپنی تبریر کرتا ہے اور کبھی دوسرے ذریعہ سے۔ آدمی جھوٹے الفاظ بول کر انسانوں کے سامنے اپنی سرخروئی باقی رکھنا چاہتا ہے، اس لئے وہ قسم جیسی تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ آدمی اپنے آپ کو اہل دنیا کے سامنے پاکباز ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوتا ہے، اللہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے کہ اس کو جہنمی انسانوں کی فہرست میں لکھ لو۔ ناحق کسی کی چیز لینا برا ہے۔ مگر یہ اور بھی زیادہ برا ہے کہ آدمی جھوٹے الفاظ بول کر اپنی اس برائی کو بھلائی ثابت کرے۔ ایسا کرنا خدا پر جسارت ہے۔ یہ جرم پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ ایسا آدمی اپنے بارہ میں ثابت کر رہا ہے کہ وہ اخلاقی کمزوری کے ساتھ بے حسی اور ہٹ دھرمی اور خدا سے کامل بے خوفی جیسے شدید تر امراض میں مبتلا ہے۔

عمل اور نیت

صحیح البخاری کا پہلا باب اگر چہ آغاز وحی (کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ
ی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ مگر اہمیت کی بنا پر اس میں سب سے پہلی حدیث نیت سے متعلق
ج کی گئی ہے۔ امام البخاری اپنا سلسلۂ سند بتاتے ہوئے روایت کرتے ہیں کہ علقمہ بن وقاص
ٰ کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطاب کو منبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ
وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی
نے نیت کی۔ پس جس آدمی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے
تھی تو اس کی ہجرت اسی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

کوئی عمل، خواہ بظاہر وہ دینی کیوں نہ ہو، اس کا بدلہ آدمی کو اسی نیت کے اعتبار سے ملتا ہے
کے تحت اس نے وہ عمل کیا تھا۔ گویا عمل کا مدار آدمی کی اپنی حالت نفسی پر ہے نہ کہ خود عمل
ل ظاہری پر۔

مثلاً کلمہ کے الفاظ دہرا کر آدمی مومن بنتا ہے۔ مگر ایمان کا مدار محض کلمہ کے صحت تلفظ
ں ہے، بلکہ ایمان کا اقرار کرنے والے آدمی کی قلبی کیفیت پر ہے۔ نماز کا مدار اس کے
ں ظاہری کی تعمیل پر نہیں ہے بلکہ خود نمازی کے باطنی خشوع پر ہے۔ انفاق کا مدار اس کی
پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ آدمی نے اپنا انفاق خالص اللہ کے لئے کیا تھا یا اس میں کوئی اور
شامل تھا، وغیرہ۔

آدمی کی جیسی نیت ہو اسی کے لحاظ سے اس کی پسند بنتی ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور
کام کی طرف جھکتا ہے جس میں اس کی نیت پوری ہوتی ہو۔ اس کے علاوہ جو کام ہیں ان کی
اسے رغبت نہیں ہوتی۔ شہرت چاہنے والا آدمی انھیں کاموں کی طرف دوڑتا ہے جن
ئشی پہلو موجود ہو۔ ایک مادیت پسند آدمی انھیں میدانوں میں سرگرم ہوتا ہے جس میں

سے مالی فائدہ پانے کی امید ہو۔ ایک قیادت کا شائق آدمی انھیں چیزوں میں دھوم مچاتا ہے جن کے ذریعہ یہ امید ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کا قائد بن جائے گا۔

دنیا کے لئے کرنے والے کا عمل دنیا ہی میں رہ جائے گا اور جو شخص آخرت کے لئے عمل کرے وہ اپنے عمل کا انجام مزید اضافہ کے ساتھ آخرت میں پائے گا۔

قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جو آدمی صالح نیت کے ساتھ عمل کرے اسی کا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوتا ہے۔ اور جس آدمی کی نیت صالح نہ ہو اس کا بظاہر نیک عمل بھی خدا کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کرے گا۔

مثلاً ایک آدمی دکھاوے کے لئے مال خرچ کرے تو اس پر اس کے لئے کوئی ثواب نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی دکھاوے کے لئے عبادت کرے تو وہ بھی اس کو کسی ثواب کا مستحق نہیں بنائے گی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی شہرت کے لئے جہاد کرے تو ایسا جہاد بھی خدا کی نظر میں بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اس معاملہ کے دو درجے ہیں۔ ایک کو شعوری اور دوسرے کو غیر شعوری کہا جاسکتا ہے۔ شعوری درجہ یہ ہے کہ آدمی پیشگی طور پر یہ سوچ کر کوئی کام کرے کہ اس کے ذریعہ سے اس کو دنیوی فائدے حاصل ہوں گے۔ لوگوں میں اس کی عزت اور مقبولیت بڑھے گی۔

اس معاملہ کی غیر شعوری صورت یہ ہے کہ آدمی پیشگی طور پر اور بالکل سوچ سمجھ کر تو ایسا کام نہ کرے مگر اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ ایسا بن گیا ہو کہ اس کو صرف نمائشی کاموں میں دلچسپی ہو۔ غیر نمائشی کام اس کو اہم نظر نہ آئیں، اس بنا پر وہ اپنے آپ کو اس میں شریک بھی نہ کرے۔ اس کو مادی فائدے والے کاموں سے رغبت ہو اور غیر مادی قسم کے کاموں سے بے رغبتی۔ ایسا آدمی بھی وسیع تر تقسیم کے اعتبار سے مذکورہ زمرہ ہی میں شامل ہے۔

یہ فرق کیوں

یہود کا جرم قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے پچھلے پیغمبروں کو مانا لیکن انھوں نے محمد ﷺ کا انکار کر دیا۔ اس کے برعکس صحابہ کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ تمام پیغمبروں کو مانتے ہیں۔ وہ جو پہلے آئے اور وہ جو اب محمد بن عبد اللہ کی صورت میں ان کے سامنے موجود ہیں۔ یہود کا اور صحابہ کا یہ فرق محض "فہرست" کا فرق نہ تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ یہود کی فہرست انبیاء عددی معنوں میں غیر مکمل تھی اور صحابہ کی فہرست انبیاء عددی معنوں میں مکمل۔

یہ فہرست کا معاملہ نہیں تھا بلکہ حقیقت کا معاملہ تھا۔ یہود کا ماننا اندھی تقلید کی بنیاد پر ماننا تھا اور صحابہ کا ماننا جوہر شناسی کی بنیاد پر ماننا۔ جو انبیاء تاریخ کے نتیجہ میں یہود کی قومی روایات میں شامل ہو چکے تھے ان کو انھوں نے مان لیا لیکن معاصر پیغمبر جو ان کی قومی روایات میں شامل نہیں ہوا تھا اس کو وہ پہچان نہ سکے، اس لئے وہ اس کو ماننے پر بھی تیار نہیں ہوئے۔ اول الذکر نبیوں کو ماننے کے لئے تقلید آباء کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی اس لئے ان کو انھوں نے مان لیا۔ مگر دوسرے پیغمبر کو ماننے کے لئے ذاتی طور پر شعوری دریافت کی ضرورت تھی اور یہاں وہ ناکام ہو گئے۔

مذہب یہود در اصل آبائی مذہب کا دوسرا نام ہے۔ اور مذہبِ صحابہ شعوری مذہب کا دوسرا نام۔ ہوتا یہ ہے کہ ابتدائی دور میں کچھ لوگ دعوت حق سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان پر حقیقت کھلتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی علم کے تحت ایک شعوری فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کی ذات کے اندر ایک نفسیاتی انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ اس کے زیر اثر وہ ایک زندگی کو بالقصد چھوڑتے ہیں اور دوسری زندگی کو بالقصد اختیار کرتے ہیں۔

پہلا دور شعوری ایمان کا دور ہوتا ہے، جب کہ بعد کے دور کے لوگ اس لئے مومن ہوتے ہیں کہ ان کے باپ دادا مومن تھے۔ وہ قومی اور نسلی تعلق کی بنا پر مومن ہوتے ہیں نہ کہ کسی ذہنی انقلاب کے نتیجہ میں مومن بنتے ہیں۔

حضرت لبیدؓ

لبید بن ربیعہ بن مالک العامری (وفات ۴۱ھ) قدیم عرب کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کا شمار اصحاب المعلقات میں سے ہوتا ہے۔ ہجرت کے بعد انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انھوں نے شاعری چھوڑ دی۔ کہا جاتا ہے کہ قبول اسلام کے بعد انھوں نے صرف ایک شعر کہا تھا جو یہ ہے:

ما عاتب المرء الكريم كنفسه والمرء يصلحه الجليس الصالح

عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک بار حضرت لبیدؓ سے کہا کہ اپنے کچھ اشعار سنائیے۔ حضرت لبید نے جواب دیا کہ اللہ نے جب مجھ کو بقرۃ اور آل عمران جیسی سورتوں کی تعلیم دی تو اس کے بعد میرے لئے مناسب نہیں کہ میں شعر کہوں (**ماكنت لاقول شعراً بعد ان علّمني الله البقرة وآل عمران**) ابن عبد البر، الاستیعاب۔

حضرت لبید نے اپنے شعر میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ شریف آدمی احتساب غیر کے بجائے احتساب خویش کے معاملہ میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی غلطی پر گرفت کرتے ہوئے نرمی کا انداز اختیار کر سکتا ہے مگر جب معاملہ خود اپنی غلطی کا ہو تو وہ اس کے لیے بے رحم محاسب بن جاتا ہے۔

شعر کے دوسرے مصرعہ میں انھوں نے صحبت کی اہمیت بتائی ہے، آدمی اگر زیادہ دیر تک برے کی صحبت اختیار کرے تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی برا بن جائے اور جب آدمی اچھے انسان کی صحبت اختیار کرتا ہے تو اس کی صحبت کے اثر سے وہ بھی ایک اچھا آدمی بن جاتا ہے۔

یہ بات بظاہر قرآن کے مقابلہ میں ہے مگر وسیع تر معنی میں اس کا تعلق دوسری حقیقتوں سے بھی ہے۔ ابتدائی مفہوم کے اعتبار سے اس کا تعلق قرآن کے سامنے خاموشی اختیار کرنے سے ہے۔ اور وسیع تر انطباق کے لحاظ سے ہر حق کے سامنے اپنی زبان بند کر لینے سے۔

موت کی دستک

موت ہر آدمی کے گھر پر دستک دیتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ موت پہلی دستک کے بعد ہی گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور آدمی کی روح کو قبض کر لیتی ہے۔ وہ اچانک دنیا کے امتحان گاہ سے نکال کر آخرت میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے اعمال کا انجام پائے۔

اچانک موت کا یہ معاملہ مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے۔ مثلاً دل کا تیز دورہ پڑا اور فوری طور پر آدمی کی موت واقع ہو گئی۔ سڑک پر سخت حادثہ پیش آیا اور ایک لمحہ کے اندر زندہ انسان مردہ انسان میں تبدیل ہو گیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان صحت کی حالت میں رات کو سویا اور صبح ہوئی تو بستر پر صرف اس کی بے جان لاش پڑی ہوئی تھی۔ اچانک موت بلاشبہ بے حد سنگین موت ہے کیونکہ آدمی کو اس میں یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ موت سے پہلے اپنی غلطیوں کی تلافی کر سکے۔

دوسری صورت وہ ہے جب کہ موت بار بار ایک آدمی کے گھر پر دستک دیتی ہے لیکن اندر داخل ہونے سے پہلے ہی وہ لوٹ جاتی ہے۔ اس واپسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً آدمی بیمار ہو کر اچھا ہو جائے۔ سخت حادثہ پیش آجانے کے باوجود وہ موت سے بچ جائے۔ اس کے اوپر حملہ کیا جائے لیکن حملہ آور کا نشانہ خالی چلا جائے، وغیرہ۔

یہ دوسری قسم آدمی کو بار بار موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں سوچے۔ وہ اپنی زندگی پر نظر ثانی کرے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے زیادہ صحیح زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے۔ موت کا آپ کے دروازہ پر دستک دے کر چلا جانا گویا اس بات کا الارم ہے کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ جلد ہی تمہارا آخری وقت آنے والا ہے۔ اپنی اصلاح کر لو، اس سے پہلے کہ اصلاح کا وقت ہی باقی نہ رہے۔ ہر آدمی موت کی زد میں ہے۔ کوئی بھی چیز آدمی کو موت سے بچانے والی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی آج مرنے والا ہے اور کوئی وہ ہے جس پر کل کے دن موت آئے گی۔ موت کی یاد سے بہتر کوئی معلم انسان کے لئے نہیں۔

دل جیتنا

زندگی کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے کہ — جیسا دینا ویسا پانا۔ اگر آپ دوسروں کو نفرت دے رہے ہوں تو آپ کو بھی دوسروں سے نفرت ملے گی۔ اگر آپ کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے محبت کا تحفہ ہے تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو محبت کا تحفہ دیا جائے گا۔ اگر آپ اپنے سماج میں مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہوں تو پورا سماج آپ کو اپنے سردار کے روپ میں دیکھنے لگے گا۔

خدا نے خدمت اور نفع بخشی میں بے پناہ کشش رکھی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکے۔ ایسا آدمی لوگوں کے درمیان اپنے آپ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کو دوسروں سے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو وہ چاہتا تھا، کیوں کہ اس نے بھی دوسروں کو وہ سب کچھ دے دیا تھا جن کو وہ اپنے لئے چاہتے تھے۔

دوسروں کے خیر خواہ بن جایئے اور پھر آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ دسروں کے کام آیئے اور پھر آپ کا بھی کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہے گا۔

اس دنیا میں ہر آدمی مجبور ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے، یہاں کسی کے لئے بھی تنہا زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں بار بار یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ رہنے کا کامیاب طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگوں کو جھکانے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ خود جھک جایئے۔ لوگوں سے لینے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ دینے والے بنئے۔ شکایتوں کو مسئلہ نہ بنایئے بلکہ شکایتوں کو بھول جایئے۔ اختلاف کو ٹکراؤ کا موضوع نہ بنایئے بلکہ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے۔ کوئی شخص بظاہر آپ کا دشمن نظر آئے تب بھی اس سے نفرت نہ کیجئے۔ یہی دل کو جیتنے کا طریقہ ہے اور جب دل کو جیت لیا جائے تو اس کے بعد کوئی اور چیز جیتنے کے لئے باقی نہیں رہتی۔

انتظار بھی حل ہے

مختلف زبانوں میں جو مثلیں مشہور ہیں وہ دراصل لمبے انسانی تجربات کے بعد بنی ہیں۔ ان میں سے ہر مثل کامیابی کا ایک یقینی فارمولہ ہے۔ اسی طرح کی ایک انگریزی کہاوت یہ ہے۔۔۔۔ انتظار کرو اور دیکھو:

Wait and see.

امریکہ کا مشہور رائٹر ہنری ڈیوڈ تھارو (Henry David Thoreau) ۱۸۱۷ میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۲ میں اس نے وفات پائی۔ اس کا ایک قول ہے کہ ہیرو وہ ہے جو یہ جانے کہ کہاں انتظار کرنا ہے اور کہاں جلدی کرنا ہے۔ ہر بھلائی اس انسان کے حصہ میں آتی ہے جو دانش مندانہ طور پر انتظار کرے:

The hero knows how to wait as well as to make haste.
All good abides with him who waiteth wisely.

زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحے آتے ہیں جب کہ آدمی کو فوری طور پر ایک فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ تاہم اگر آدمی فوری فیصلہ کرنے میں چوک جائے تو اس کے بعد اس کے لئے جو چیز ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ گھبرا کر یا جلد بازی میں بے فائدہ کارروائیاں کرنے لگے۔ اب اس کو انتظار کرنا چاہئے۔ عقلمند وہ ہے جو اس فرق کو جانے کہ کب فوری فیصلہ لینا ہے اور کب معاملہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتظار بھی ایک عمل ہے۔ انتظار کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ انتظار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے معاملہ کو فطرت کے نظام کے حوالہ کر دیا۔ وہ خدا کے فیصلہ کا منتظر بن گیا۔

اگر وقت پر صحیح فیصلہ لینا کامیابی ہے تو ناموافق حالات میں انتظار کی پالیسی اختیار کرنا بھی کامیابی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا نتیجہ حال میں نکلتا ہے اور دوسرے کا نتیجہ مستقبل میں۔

انسانی محدودیت

امریکہ کے سفر میں مجھے ایک تاجر کے مکان پر شام کے کھانے کے لئے بلایا گیا۔ یہ ایک بڑے تاجر تھے۔ ان کا تجارتی سرمایہ ایک سو ملین ڈالر تھا۔ کھانے کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ تاجر کی اہلیہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا جہاں دو کرسیاں تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد خاتون آئیں اور وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔

یہ ایک مغربی خاتون تھیں۔ وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھی رہیں۔ میں نے رسمی گفتگو شروع کی تب بھی وہ کچھ نہ بول سکیں۔ آخر کار جو ہوا وہ یہ تھا کہ وہ بے اختیار رونے لگیں اور انگریزی میں یہ کہہ کر چلی گئیں کہ: مولانا صاحب، ہمارے لئے دعا کیجئے۔

یہ کوئی انفرادی واقعہ نہیں۔ یہی ان تمام لوگوں کی کہانی ہے جن کو خوشحال کہا جاتا ہے۔ آپ کسی بھی ایسے شخص کو لیجئے جو آپ کو مادی اعتبار سے کامیاب نظر آتا ہو اور پھر اس کو قریب سے جاننے کی کوشش کیجئے۔ آپ پائیں گے کہ بظاہر ایک پر رونق زندگی کے پیچھے صرف ایک غمناک روح چھپی ہوئی ہے۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں آدمی یہ تو کر سکتا ہے کہ وہ مادی سامان اپنے پاس اکٹھا کر لے۔ مگر وہ اپنی اس کمی کو دور نہیں کر سکتا کہ اپنی پیدائشی محدودیت کی بنا پر وہ پر لذت چیزوں سے محظوظ ہونے کی طاقت اس کے اندر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں اصل مسئلہ سامان عیش کی فراہمی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اپنے تخلیقی ضعف (النساء ۲۸) کی بنا پر انسان یہ استعداد ہی نہیں رکھتا کہ وہ سامان عیش سے انجوائے کر سکے۔

انسان اپنی ساری طاقت مادی خوشی کے حصول میں لگا دیتا ہے۔ حالانکہ موجودہ دنیا میں مادی خوشی کا حصول سرے سے ممکن ہی نہیں۔ موجودہ دنیا جنت کی پہچان (محمد ٦) کے لئے ہے، وہ جنت کی تعمیر کے لئے نہیں۔

ہرقل کا واقعہ

۲۰ اگست ۶۳۶ء کو ایک فیصلہ کن واقعہ ہوا جو تاریخ میں دریائے یرموک کی جنگ (Battle of the Yarmuk River) کے نام سے مشہور ہے۔ یرموک ایک دریا کا نام ہے جو شام اور اردن کے درمیان واقع ہے۔ مذکورہ تاریخ کو یہاں عربوں اور رومیوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ عرب فوج کے سردار خالد بن ولید تھے، اور رومی فوج کی قیادت تذارق (Theodorus) کر رہا تھا جو شہنشاہ ہرقل کا بھائی تھا۔

اس جنگ میں رومی فوج کو مکمل شکست ہوئی۔ خود تذارق قتل کر دیا گیا۔ یہ جنگ اس پورے علاقہ کے لئے فیصلہ کن تھی، چنانچہ اس کے بعد پورا شام تقریباً بلا مقابلہ عربوں کے قبضہ میں آگیا۔ یرموک کی شکست کی اس اہمیت سے شہنشاہ ہرقل بخوبی واقف تھا جو اس وقت حمص (شام) میں تھا۔ اس کے بعد وہ حمص سے روانہ ہو گیا۔ مورخ بلاذری کی روایت کے مطابق، اس وقت اس کی زبان پر یہ کلمہ تھا: **سلام عليك يا سوريا، سلاما لالقاء بعده** (اے شام، تجھ کو آخری سلام، اب تجھ سے میری ملاقات نہیں ہوگی)

ہر چیز جو انسان کو ملی ہوئی ہے وہ آخر کار اس کا ساتھ چھوڑنے والی ہے۔ موت سے پہلے یا موت کے وقت۔ مگر انسان آخر وقت تک چیز کو اپنی چیز سمجھتا ہے۔ وہ سوچ نہیں پاتا کہ کوئی چیز اس کی اپنی نہیں۔ ہر چیز خدا کی چیز ہے۔ وہ جب تک چاہے کسی کے پاس رکھے، اور جب چاہے چھین لے۔

آدمی جو کلمہ ملک چھن جانے کے بعد کہتا ہے، اگر وہی کلمہ وہ ملک چھننے سے پہلے کہے تو وہ اس کے نامۂ اعمال میں ایک قیمتی عمل کے طور پر لکھا جائے۔ مگر آدمی اس حقیقت شناسی کا ثبوت نہیں دیتا۔ ہر آدمی چھننے کے بعد کہتا ہے نہ کہ چھننے سے پہلے۔ اور چھننے کے بعد کہنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

مسئلہ اور غم

کوئی آدمی جب بھی کسی مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے تو ایسا ہمیشہ فطرت کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ کو اپنے لئے ایک غم بنالینا یہ انسان کا اپنا اضافہ ہے۔ ابتدائی طور پر کوئی مسئلہ صرف ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ مسئلہ پیش آنے پر غم میں مبتلا ہو جائیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے فطرت کے واقعہ پر اپنی طرف سے ایک غیر مطلوب اضافہ کر دیا۔

مسائل کے مقابلہ میں یہی انسان کی اصل غلطی ہے۔ یہ غلطی بے حد سنگین ہے کیونکہ وہ مسئلہ کے حل میں معاون تو نہیں بنتی، البتہ وہ اس کے حل میں ایک فیصلہ کن رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی رسی میں گرہ پڑنے کے بعد اس کو اور زیادہ کس دیا جائے۔

آدمی کو یہ بات جاننا چاہئے کہ اس دنیا میں وہ تنہا نہیں ہے یہاں بہت سے دوسرے لوگ ہیں جن کے درمیان اس کو زندگی گزارنا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی حیثیت گویا ایک بہت بڑی مشین کے اندر ایک چھوٹے پرزہ کی ہے یا وہ ایک بے حد مصروف سڑک پر ایک راہگیر ہے۔

انسانی زندگی کی یہی مخصوص نوعیت ہے جو مسائل پیدا کرتی ہے۔ یہ مسائل کبھی عالم فطرت کی طرف سے پیش آتے ہیں اور کبھی دوسرے انسانوں کی طرف سے۔ دونوں حالتوں میں مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ضبط و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کیا جائے۔ مسئلہ کو غم کا سوال بنانے کے بجائے اس کو تدبیر کا سوال بنایا جائے۔ مسئلہ پیش آجانے کے بعد اگر آپ صبر و تحمل کا ثبوت دیں تو آپ کی دلجمعی اور آپ کا ذہنی سکون باقی رہے گا۔ آپ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ آپ اپنی پوری صلاحیت کو پیش آمدہ مسئلہ کے حل کے لئے استعمال کر سکیں۔ اور اگر ایسا ہو کہ آپ مسئلہ پیش آنے کے بعد غم میں مبتلا ہو کر اس کو اپنے لئے دردسر بنالیں تو مسئلہ کے مقابلہ میں آپ اپنا ضروری حصہ ادا کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے اپنے حریف کو خود سے بلا مقابلہ جیت (unopposed victory) کا موقع دے دیا جائے۔

خطرہ کہاں ہے

ایک عربی پرچہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا عنوان تھا: **الاقليات المسلمة تواجه خطر الذوبان** ۔ یعنی مسلم اقلیتوں کو اس خطرہ کا سامنا ہے کہ وہ اکثریتی فرقہ میں گھل مل جائیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ :**الاسلام يعلو ولايعلى** (اسلام ہمیشہ غالب رہتا ہے وہ کبھی مغلوب نہیں ہوتا) فتح الباری ۳/۲۶۱۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلام کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ کی حیثیت عطا فرمائی ہے تو اس کے لیے مغلوب ہونے یا جذب ہو جانے کا خطرہ کیوں محسوس کیا جا رہا ہے۔

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں میں فرق نہ کرنا ہے۔ کوئی مسلم گروہ اپنے زوال کی بنا پر مذکورہ قسم کے خطرہ میں مبتلا ہو سکتا ہے لیکن اسلام، ایک ربانی نظریہ کی حیثیت سے اس سے ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کو کسی بھی حال میں غیر اسلامی طاقتوں سے مغلوب ہونے یا ان میں جذب ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کے لئے یہ خطرہ پیدا ہو کہ وہ کسی غیر مسلم طاقت سے مغلوب ہو جائیں گے یا اس میں جذب ہو جائیں گے تو پیشگی طور پر سمجھنا چاہئے کہ اس کی وجہ خود مسلمانوں کا اسلام میں کمزور ہونا ہے نہ کہ غیر مسلموں کا ان کے مقابلہ میں طاقتور ہو جانا۔

اس لیے جب بھی اس قسم کا خطرہ پیدا ہو تو مصلحین کو چاہئے کہ وہ خود مسلم نسلوں کو دوبارہ اسلام پر اٹھانے کی کوشش کریں۔ وہ ان کے کیس کو قومی کیس کے بجائے اسلام کا کیس بنا دیں۔ اس کے بجائے غیر مسلم طاقتوں کے خلاف قولی یا عملی ہنگامہ آرائی کرنا ایک غیر متعلق فعل ہے جس کا خدا کی اس دنیا میں کوئی فائدہ نکلنے والا نہیں۔ مسلمانوں کا ہر مسئلہ داخلی کمزوری کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کے ہر مسئلہ کو صرف داخلی استحکام کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے۔

ترقی کے مواقع

1999 کے سروے کے مطابق، ہندستان میں اس سال کا سب سے زیادہ امیر بنگلور کا ایک مسلمان تھا جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس سال اس کا سرمایہ ۷۔۱۶ بلین روپئے تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ترقی کے مواقع لامحدود ہیں۔ حتی کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اقلیتی فرقہ کا ایک فرد ترقی کر کے اکثریتی فرقہ سے آگے بڑھ جائے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ جون 1999)

ممتاز تعلیمی ادارہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (بمبئی) کے ۳۷ ویں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنے کانوکیشن ایڈریس میں جناب عظیم ہاشم نے اپنے تجربات بتائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم ہاشم کی ترقی ۲۵ سال کی لگاتار محنت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے لمبی مدت تک یہ کیا کہ ایک طرف خود اپنی صلاحیتوں کو آخری حد تک اپنے کاروبار میں لگادیا۔ دوسری طرف انھوں نے بار بار سفر کر کے ملک بھر سے اعلیٰ قابلیت کے نوجوان حاصل کئے اور ان کے ذریعہ ایک بہترین ٹیم تیار کی۔ انھوں نے اپنے اور دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کامیابی کا سب سے بڑا راز کبھی ختم نہ ہونے والی سخت محنت ہے۔ اس طرح طویل منصوبہ بند عمل کے ذریعہ انھوں نے اپنی موجودہ کامیابی حاصل کی۔ عظیم ہاشم نے کہا کہ: "مستقبل وہ نہیں ہے جو آپ کے ساتھ پیش آتا ہے بلکہ مستقبل وہ ہے جسے آپ خود بناتے ہیں۔"

اس دنیا میں ہر آدمی وہی ترقی حاصل کر سکتا ہے جو ترقی کسی دوسرے نے حاصل کی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اپنی مطلوب کامیابی کے لئے اس کے مطابق ضروری عمل کیا جائے۔

وہ عمل کیا ہے۔ وہ عمل ہے— مقصد کا واضح تصور، اس کو پانے کا عزم مصمم، اپنی پوری صلاحیت کو اس میں لگادینا، لائق افراد کے ذریعہ متحدہ کوشش کرنا، ہر چیلنج سے نیا حوصلہ لینا، اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتے رہنا، یہی اس دنیا میں کامیابی کے اصول ہیں۔ اور جو آدمی ان اصولوں کو بھرپور طور پر اپنائے اس کے لئے ترقی اتنا ہی زیادہ یقینی بن جاتی ہے جتنا کہ شام کے بعد اگلی صبح کا طلوع ہونا۔

کامیاب فارمولا

بنگلور کے ڈاکٹر احمد سلطان انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ٹیپو سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کا مزاج برعکس طور پر یہ تھا کہ محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ کو تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وہ جب بھی دہلی آتے تو مجھ سے ملتے اور اپنے ''کامیاب فارمولا'' کی سبق آموز مثالیں بیان کرتے۔ ایک بار ان کے صاحبزادے رات کے وقت گاڑی لے کر باہر نکلے۔ وہ گیارہ بجے واپس آئے تو وہ گاڑی باہر کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوئے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ ڈاکٹر احمد سلطان صاحب نے دروازہ کھولا تو دو ہندو نوجوان باہر کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے غصہ کے لہجہ میں بتایا کہ آپ کے صاحبزادہ نے ہمارے اسکوٹر کو ٹکر ماری اور پھر بھاگ آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے نرمی سے کہا کہ اندر تشریف لائیے، بیٹھ کر بات ہو گی۔ دونوں اندر آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک میز کے کنارے کرسی پر بٹھایا اور کہا کہ اس وقت سردی کا موسم ہے۔ آیئے ہم لوگ پہلے چائے پئیں پھر بات کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا غصہ ختم ہو چکا تھا، دونوں خوش خوش واپس چلے گئے۔

ایک بار ایک ہندو نوجوان ان کے پاس آیا۔ اس نے رو کر کہا کہ میں ایک بڑے مسئلہ سے دوچار ہوں۔ آپ میرا مسئلہ حل کیجئے۔ اس نے بتایا کہ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ اس کے بعد میرے باپ نے مجھ کو گھر سے نکال دیا۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں اور ابھی تک وہ راضی نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم انھیں سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ تم خاموشی سے جاؤ اور اپنے باپ کے قدموں پر سر رکھ کر کہو کہ اے باپ، میری غلطی کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ اپنے گھر گیا تو اس کے باپ نے اس کو ڈانٹا۔ بیٹا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے باپ کے

قدموں پر گر پڑا۔ اس کے بعد باپ کا جذبۂ پدری ابھر آیا۔ اس نے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ چند منٹوں کے اندر ساری بات ختم ہو گئی۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب ایک شہر میں گئے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بتایا کہ جلد ہی یہاں کٹر ہندوؤں کا ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگ زبردست تیاری کر رہے ہیں۔ وہ اپنا جلوس مسلم محلّہ سے لے جائیں گے اور کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر فساد کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ میرا ایک مشورہ مان لیجئے اور پھر یہاں کوئی فساد نہیں ہوگا۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ جس دن جلوس نکلنے والا ہو، بازار سے دو درجن پھولوں کے ہار لے آیئے۔ جب ان کا جلوس آپ کی مسجد کے سامنے پہنچے تو آپ لوگ پھولوں کا ہار لے کر باہر آئیں اور جو ہندو جلوس کے آگے آگے چل رہے ہیں ان سے کہیں کہ ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں اور پھر ان کے گلے میں ایک ایک ہار ڈال دیں۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس دن وہاں ہندو مسلم ٹکراؤ ہونے والا تھا، وہ ان کے لئے ہندو مسلم ملاپ کا دن بن گیا۔

ایک بار بنگلور میں وہ اپنے گھر کے قریب سڑک پر چل رہے تھے۔ پیچھے سے شہر کے ایک ہندو کی گاڑی آئی جو مسلمانوں کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ اس کی گاڑی ڈاکٹر صاحب سے ٹکرا گئی اور ڈاکٹر صاحب سڑک پر گر پڑے۔ ان کو کئی جگہ زخم آئے۔ مذکورہ ہندو اپنی گاڑی روک کر ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ میری گاڑی پر بیٹھ جائیں میں آپ کو لے کر اسپتال چلتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ مسلم علاقہ ہے۔ مسلمانوں نے اگر تم کو دیکھ لیا تو وہ تم کو مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے سخت اصرار کر کے اس کو وہاں سے بھیج دیا۔ اس کے بعد مذکورہ ہندو ہمیشہ کے لئے ڈاکٹر صاحب کا دوست بن گیا۔

ڈاکٹر سلطان کے دل میں کسی کے لئے نفرت نہ تھی۔ وہ ہر ایک کو پیار و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذکورہ کامیاب فارمولہ اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دنیا میں محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ مگر نادان لوگ نفرت کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھ لیتے ہیں۔

صدی کی شخصیت

عالم اسلام کی معروف شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ کو انتقال ہوگیا۔ مولانا موصوف ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت گویا سو سالہ دور کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ تاریخ میں وہ اس دور کی علامت کے طور پر دیکھے جائیں گے۔ ان کو بلاشبہہ صدی کی شخصیت (Man of the Century) کہا جاسکتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک ممتاز عالم تھے۔ دارالعلوم ندوۃ (لکھنؤ) کو ان کے زمانہ میں غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسی طرح دوسرے بہت سے اداروں کی کامیاب قیادت کی۔ بیسویں صدی میں اٹھنے والی تقریباً تمام بڑی بڑی اسلامی تحریکوں سے ان کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق تھا۔ وہ ہر حلقہ اور ہر گروہ میں یکساں طور پر عزت واعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کو بلااختلاف ایک بین اقوامی شخصیت کہا جاسکتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنی قوم میں نمائندۂ قوم کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ مولانا موصوف کو یہی حیثیت حاصل تھی۔ ایسا شخص کسی قوم کے لئے بے حد قیمتی ہے۔ اپنی اس حیثیت کی بنا پر وہ پوری قوم کے لئے شیرازۂ اتحاد بن جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور دوسری قوموں کے درمیان عملاً رابطہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کے لئے مرجعِ قوم بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا شخص جس سے پوری قوم کے معاملہ میں رجوع کیا جاسکے۔ وغیرہ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات میں یہ تمام حیثیتیں بہ تمام وکمال جمع ہوگئی تھیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے ایک بار مولانا موصوف کو "رجل موھوب" کہا تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لئے یہ خطاب لفظ بلفظ درست ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا کارنامۂ حیات تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک متحرک صدی تھے۔ صدی کی

آخری تاریخ کو یہ متحرک شخصیت خاموش ہو گئی۔ وہ انسانوں سے جدا ہو کر اپنے رب سے جا ملی۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر بیک وقت مختلف اور متنوع خصوصیات موجود تھیں۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے کہا تھا کہ یورپ میں جو کام اکادمی کرتی ہے، وہ ہمارے یہاں "اک آدمی" کرتا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس قول کا ایک زندہ نمونہ تھے۔ وہ ایک فرد تھے مگر انھوں نے کئی اداروں کے برابر کام کیا۔

مولانا موصوف نے ایک طرف دار العلوم ندوہ جیسے ادارہ کے ذریعہ مسلمانوں کو علم دین سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف مؤسسہ مطالعات و تحقیقات اسلامی لگزمبرگ جیسے اداروں کے ذریعہ لوگوں کے لئے عصری معرفت کا سامان کیا۔ ایک طرف انھوں نے اپنی موثر تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں عملی جوش کو ابھارا اور دوسری طرف انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انھیں گہرے علمی شعور سے آشنا کیا۔

ایک طرف انھوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ مسلمانوں کے ملی تحفظ کا انتظام کیا تو دوسری طرف "پیام انسانیت" کی تحریک کے ذریعہ انھیں داعی کے مقام پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف انھوں نے ردّۃ ولا ابابکر لہا جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں میں دفاع اسلام کا جذبہ ابھارا اور دوسری طرف ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین جیسی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر نو کی طرف متوجہ کیا۔ ایک طرف انھوں نے رابطہ العالم الاسلامی کے اہم رکن کی حیثیت سے عالمی مسلم اتحاد کی کوشش کی اور دوسری طرف رابطۂ ادب اسلامی کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر علم و ادب کے حصول کا شوق ابھارا۔ ایک طرف انھوں نے مدارس دینیہ کے قیام کے ذریعہ قدیم علوم کو زندہ کیا اور دوسری طرف آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سنٹر کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر جدید علوم کے ماہر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بہت سی اعلیٰ قدروں کا نمونہ بن گئی تھی۔ انھیں میں سے ایک چیز وہ ہے جس کی بابت کہا گیا ہے کہ ــــ دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ، دنیا خود تمھاری طرف دوڑ کر آئے گی۔ مولانا موصوف دنیا کی چیزوں سے بے نیاز ہو گئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا نے خود اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا۔

ایک بار ایک عرب سلطان ندوۃ (لکھنؤ) آئے۔ ان کے استقبالیہ میں جو جلسہ ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایک عرب بزرگ کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا تھا: **نعم الامیر علی باب الفقیر و بئس الفقیر علی باب الامیر**۔ مولانا موصوف ساری زندگی اہل دنیا سے بے نیاز رہے۔ مگر اہل دنیا نے خود اپنی ساری متاع ان کے سامنے پیش کر دی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ان کو بڑے بڑے ایوارڈ دئے گئے، مثلاً کنگ فیصل ایوارڈ اور اسی طرح برونائی اور عرب امارات کے خصوصی ایوارڈ وغیرہ۔

مولانا موصوف کی ذات اس حقیقت کی ایک عملی مثال تھی کہ مال، عہدہ، عزت، سب انسان کے تابع ہیں نہ کہ انسان ان چیزوں کے تابع ہے۔ انسان اگر اپنی انسانیت کو بلند کر لے تو بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ اس کو حاصل ہو جائیں گی، بغیر اس کے کہ اس نے ان چیزوں کے لئے براہ راست جد و جہد کی ہو۔

ایک شاعر نے کسی کے بارے میں کہا تھا: وہ اپنی ذات میں اک انجمن ہیں۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ اپنی ذات میں ایک عالم تھے۔ ان کی موت بلاشبہہ **موت العالِم موت العالَم** کی مصداق ہے۔ تاہم قابل اطمینان بات یہ ہے کہ مولانا موصوف نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی عظیم تعداد چھوڑی ہے۔ یقین ہے کہ مولانا موصوف کے بعد ان کی تربیت سے فیض یافتہ یہ حضرات اس عربی شعر کا مصداق ثابت ہوں گے: **إذا مات منا سيد قام سيد** (جب ہمارا ایک سردار وفات پاتا ہے تو دوسرا سردار کھڑا ہو جاتا ہے)۔

ملک کی تعمیر اور مسلمان

قومی تعمیر کا عمل ایک مسابقت کا عمل ہے۔ یہ ایک مسابقتی دوڑ ہے۔ معاملہ کے اس پہلو نے قومی تعمیر کے عمل کو ایک بے حد نازک عمل بنادیا ہے۔ قومی تعمیر کے عمل میں اگر آپ ایک دن کی بھی غفلت کریں تو اس کا خمیازہ آپ کو ایک صدی تک بھگتنا پڑے گا۔

اس کی ایک مثال دستور ہند کا مسئلہ ہے۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ملک کے اعلیٰ ترین دماغوں نے ملک کا بظاہر ایک نہایت جامع دستور بنایا۔ مگر اس میں ایک بے حد اہم پہلو جگہ پانے سے رہ گیا۔ اس میں بنیادی حقوق(fundamental rights) کی دفعات تو رکھی گئیں لیکن بنیادی فرائض(fundamental duties) کا اس میں سرے سے کوئی باب ہی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد پوری قوم نے اپنے حقوق کو تو ضرورت سے زیادہ جانا مگر اپنی ذمہ داریوں کی بقدر ضرورت بھی اسے خبر نہ ہو سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم حقوق شناس (right conscious) بن کر رہ گئی۔ وہ فریضہ شناس(duty concsious) نہ بن سکی۔

سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بعد کو اس کی تلافی کرنا چاہا اور ایک ترمیم کے ذریعہ دستور میں بنیادی ذمہ داریوں کا ایک مختصر باب شامل کیا۔ مگر اب اتنی زیادہ دیر ہو چکی تھی کہ اس ترمیم کے باوجود قومی کردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ اس غلطی کے تباہ کن نتائج آج اتنے زیادہ عام ہو چکے ہیں کہ یہاں اس کی مثال دینے کی ضرورت نہیں۔

یہی معاملہ ہندو - مسلم تعلقات کا ہے۔ ۱۹۴۷ میں جب ہندستان آزاد ہوا تو اس کے بعد ملک میں دو بڑے فرقے موجود تھے۔ ایک ہندو، دوسرے مسلمان۔ عددی اعتبار سے ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان عددی اعتبار سے اقلیت میں تھے۔ یہ تناسب بے حد اہم تھا مگر یہاں بھی بروقت صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے دونوں ہی فرقوں کا ذہن غلط رخ پر چل پڑا۔

ایک طرف ہندوؤں کا ذہن یہ بنا کہ مسلمان اس ملک میں بوجھ(liability) کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کا ذہن یہ بنا کہ ہندوان کے لئے ایک غیر ہمدرد اکثریت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح دونوں ہی فرقے ایک دوسرے کے بارے میں غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا شکار ہو گئے اور وہ مثبت تاریخی واقعہ انجام نہ پاسکا جو حالات نے دونوں کے لئے مقدر کیا تھا۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کو تاریخ کے فیصلہ کے طور پر قبول کریں اور فطرت کے اصول پر دونوں کے درمیان صحت مند مقابلہ جاری ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہندستان بلاشبہہ ایک اعلیٰ ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوتا، جیسا کہ بہت سے دوسرے ملک اسی حقیقت شناسی کی بنا پر ترقی یافتہ ملک بنے ہوئے ہیں۔

انڈونیشیا کے موجودہ صدر پروفیسر عبد الرحمٰن وحید سے چند سال پہلے میری ملاقات روم (اٹلی) میں ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انڈونیشیا اور ملیشیا دونوں مسلم ملک سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ملیشیا میں زبردست ترقی ہوئی ہے جب کہ انڈونیشیا میں کوئی قابل ذکر ترقی نہ ہو سکی۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

پروفیسر عبد الرحمٰن وحید نے جواب دیا کہ اس کا سبب بالکل ظاہر ہے۔ اصل یہ ہے کہ ملیشیا میں مسلمانوں کو ایک طاقتور اقلیت کا سامنا ہے۔ اس بنا پر وہاں مسلسل طور پر مسابقت (competition) کا ماحول قائم رہتا ہے۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہر لحہ چوکنا رہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر غفلت کی تو دوسرا گروہ آگے بڑھ جائے گا، اور وہ اس کے مقابلہ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ مسابقت کے اس ماحول نے وہاں دونوں گروہوں کو ملک کا مفید حصہ بنادیا ہے۔ مسابقت کے اس ماحول کی بنا پر دونوں ترقی کر رہے ہیں اور نتیجۃً پورا ملک ترقی کے راستہ پر گامزن ہے۔

مگر انڈونیشیا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیوں کہ انڈونیشیا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں۔ اس بنا پر ان کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ اس صورت حال نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو ایک بے

اندیشہ قوم بنادیا ہے۔ چنانچہ وہ سو رہے ہیں۔ وہ ملک میں کسی بڑے ترقیاتی عمل کا آغاز نہ کر سکے۔

ہندستان کا معاملہ بھی تقریباً یہی ہے۔ ہندستان میں ایک طرف اگر ہندو اکثریت ہے تو دوسری طرف مسلم اقلیت، جو تعداد میں اتنی زیادہ ہے کہ انڈونیشیا کے بعد وہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم ملت بن گئی ہے۔

اس صورت حال کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندستان میں دونوں کے درمیان اسی قسم کا صحت مند مقابلہ جاری ہو جس کی ایک مثال ملیشیا میں دکھائی دیتی ہے۔ مگر بد قسمتی سے دونوں ہی گروہ ایک دوسرے کے بارہ میں غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا شکار ہو گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو غیر مطلوب اقلیت سمجھا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو غیر ہمدرد اکثریت۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان بے بنیاد غلط فہمیوں کا جنگل اگ آیا۔ وہ تاریخ کے پیدا کردہ فطری ماحول میں جینے کے بجائے خود ساختہ مصنوعی ماحول میں جینے لگے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان اور انڈیا دونوں نے تقریباً ایک ساتھ اپنے نئے قومی سفر کا آغاز کیا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ جاپان صرف ۲۵ سال کی مدت میں دنیا کی ایک مضبوط اقتصادی طاقت بن گیا۔ جب کہ ہندستان پچاس سال کی مدت گزارنے کے بعد بھی کوئی قابل ذکر ترقی حاصل نہ کر سکا۔

اب ہندستان نئی صدی کے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ اب آخری وقت آگیا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے حالات کا از سر نو جائزہ لیں۔ دونوں ماضی کی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں اس کو جاری نہ رکھنے کا فیصلہ کریں۔ اور پھر ہم دیکھیں گے کہ دس سال سے زیادہ مدت نہیں گزرے گی کہ ملک ایک نئے دور ترقی میں اپنا تیز رفتار سفر شروع کر چکا ہو گا۔

کسی مفکر کا قول ہے کہ ہر ناکامی کا آغاز دماغ سے ہوتا ہے اور ہر کامیابی کا آغاز بھی دماغ سے۔ اب دونوں فریقوں کو جو کرنا ہے وہ صرف یہ کہ وہ اپنے مذکورہ نقطۂ نظر کو بدل ڈالیں۔ دونوں فرقے ایک دوسرے کو اس نظر سے دیکھنا چھوڑ دیں جس نظر سے وہ پچھلے پچاس سال کے دوران

ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ہیں۔اس کے برعکس دونوں ایک دوسرے کو قومی زندگی کے صحت مند حصہ دار کے روپ میں دیکھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے چیلنج کو صحت مند مقابلہ میں بدل دیں۔ دونوں ایک وجود کے دائیں اور بائیں بازو بن جائیں۔ دونوں قومی تعمیر کے عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ صحت مند مقابلہ کریں نہ کہ فرقہ وارانہ نفرت کے میدان میں۔ دونوں ملک کے اقتصادی عمل کی مشین میں دندانہ دار پہیہ (cog wheel) کی مانند بن جائیں۔ اور پھر دونوں خود بھی ترقی کریں گے اور ملک کو بھی اعلیٰ ترقی کے دور میں پہنچانے کا سبب بن جائیں گے۔

چیلنج زندگی کی ایک لازمی حقیقت ہے۔ یہ فطرت کا نظام ہے اور کوئی بھی سماج فطرت کے اس نظام سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک، مریضانہ مقابلہ۔ اور دوسرا، صحت مند مقابلہ۔ مریضانہ مقابلہ کا نتیجہ موت ہے اور صحت مند مقابلہ کا نتیجہ زندگی۔

مریضانہ مقابلہ یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھیں۔ وہ ایک دوسرے سے نفرت کریں۔ وہ ایک دوسرے کو مٹا کر اپنا مستقبل بنانا چاہیں۔ اس قسم کا طریقہ گویا فطرت کی تردید ہے۔ وہ تاریخ کے فیصلہ کو قبول نہ کرنا ہے۔ اور جو لوگ ایسا کریں ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

چیلنج کا صحت مند مقابلہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا شریک سفر سمجھیں۔ دونوں یسے دو بھائی بن جائیں جو دوڑ کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہوں، اس کے باوجود دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے نفرت نہ پیدا ہو۔ دونوں مقابلہ کی حالت ؛ ایک دوسرے کے لئے مہمیز سمجھیں نہ کہ مخالفت اور عداوت۔

ہندستان میں اعلیٰ ترقی کے لئے اسی قسم کے صحت مند مقابلہ کی ضرورت ہے۔ امریکہ نے اپنے یہاں اسی طرح صحت مند مقابلہ کا ماحول قائم کر کے اعلیٰ کامیابی حاصل کی ہے۔ ہمیں ی ہندستان میں اسی ماحول کو زندہ کرنا ہے۔ اسی میں ہر فرقہ کی ترقی ہے اور اسی میں خود ملک ، ترقی بھی۔

اسلام کے نام پر غیر اسلام

ایک تعلیم یافتہ مسلمان جو امریکہ میں رہتے ہیں انھوں نے ایک ملاقات کے دوران کہا کہ آج کل امریکہ میں اسلام کی تصویر اتنی خراب ہو گئی ہے کہ میں اپنے کو مسلمان بتاتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ کوئی مجھ سے میرا مذہب پوچھتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میں مذہب انسانیت کو مانتا ہوں۔ اگر میں اپنا مذہب اسلام بتاؤں تو وہ فوراً کہے گا: "پھر تو تم ایک دہشت گرد ہو":

Then you must be a terrorist

انھوں نے کہا کہ اسلام کی یہ تصویر جدید میڈیا نے بنائی ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ اسلام کی یہ تصویر خود مسلمانوں نے بنائی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان جگہ جگہ اسلام کے نام پر تشدد کی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ اسی کو میڈیا کے لوگ رپورٹ کرتے ہیں۔ مسلمان اپنی یہ تحریکیں چونکہ اسلام کے نام پر چلاتے ہیں اس لئے وہ اسلام سے منسوب ہو کر میڈیا میں آتی ہیں۔ جب مسلمان خود اس قسم کی تحریکوں کو اسلام کے نام پر چلا رہے ہوں تو میڈیا ان کو کسی اور نام سے کیسے رپورٹ کرے گا۔

انھوں نے کہا کہ اس قسم کی متشددانہ تحریکیں صرف کچھ مسلمان چلاتے ہیں نہ کہ سارے مسلمان۔ پھر ان کی بنیاد پر سارے مسلمانوں کے بارے میں منفی رائے قائم کرنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی تحریکیں تھوڑے مسلمان چلاتے ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ بقیہ مسلمان ان تحریکوں کی کھلی مذمت نہیں کرتے۔ وہ ان کے بارے میں خاموشی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے خود اسلامی اصول کے مطابق، یہ کہنا درست ہوگا کہ اسلام کے نام پر نفرت اور تشدد کی ان تحریکوں کو چلانے کے لئے اگر تھوڑے لوگ براہ راست ذمہ دار ہیں تو بقیہ لوگ اس کے بالواسطہ ذمہ دار۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ روش بے حد افسوسناک ہے۔ اسلامی حکومت اور نظام

مصطفیٰ اور اسلامی جہاد کے نام پر ایسے افعال کئے جا رہے ہیں جو سراسر اسلام کے خلاف ہیں۔ جو لوگوں کو خدا کے دین سے قریب کرنے کے بجائے انھیں اس سے دور کر رہے ہیں۔ اسی اندوہناک صورت حال کو دیکھ کر ایک شاعر نے بجا طور پر کہا ہے کہ:

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفوی جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

اسلامی نظام

موجودہ زمانہ میں اس قسم کی متشددانہ تحریکیں نظام اسلام یا نظام مصطفیٰ کے نام پر چلائی جا رہی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریکیں اسلام کے نام پر سیاسی لیڈری کرنے کے ہم معنی ہیں۔ سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے تحریکیں چلانا اسلام میں جائز ہی نہیں۔ اسلامی تحریک کا نشانہ فرد کو اسلامائز کرنا ہے نہ کہ حکومت یا اسٹیٹ کو اسلامائز کرنا۔ صوفیاء کرام نے سیکڑوں سال تک جو کام کیا وہ فرد کو اسلامائز کرنے کا کام تھا۔ یہ کام پرامن طور پر مسلسل جاری رہا، وہ کبھی نفرت اور تشدد پھیلانے کا ذریعہ نہ بن سکا۔ صوفیاء کے ذریعہ ہمیشہ امن اور انسانیت کو فروغ حاصل ہوا جب کہ موجودہ نام نہاد انقلابی تحریکیں برعکس نتیجہ ظاہر کر رہی ہیں۔

اسلام کے ساتھ نفرت اور تشدد کا وابستہ ہونا صرف موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم لیڈروں کا پیدا کردہ ہے جنھوں نے خودساختہ طور پر حکومت و اقتدار کو نشانہ بنا کر اپنی تحریکیں چلائیں۔ ان لوگوں نے اپنے عمل سے اسلام کو نفرت اور تشدد کا دین بنا دیا ہے حالانکہ خدا کا بھیجا ہوا اسلام امن اور خیر خواہی کا مذہب ہے۔ مسلمان خیر خواہِ انسانیت ہوتا ہے نہ کہ فوجدارِ انسانیت۔

اسلامی جہاد

اگر ایک شخص میدان میں کھڑا ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے یا اٹھ بیٹھ کرے اور کہے کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں تو اس کے کہنے سے اس کا یہ فعل نماز نہیں بن جائے گا۔ نماز کی کچھ متعین شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کے ساتھ جو عمل کیا جائے وہ نماز ہے، ورنہ وہ نماز نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی جہاد کا ہے۔ جہاد کی کچھ متعین شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کی پابندی کے ساتھ جو عمل کیا جائے وہ اللہ کے نزدیک جہاد ہوگا۔ اور جس عمل میں یہ شرطیں نہ پائی جائیں وہ بے معنی ہنگامہ آرائی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں جہاد۔

اسلامی جہاد وہ ہے جو اللہ کے راستہ میں کیا جائے۔ ملک یا مال جیسی دنیوی چیزوں کے لئے لڑائی چھیڑنا اور اس کو جہاد بتانا صرف فساد ہے۔ ایسے لوگوں کو کسی بھی حال میں اسلامی جہاد کا کریڈٹ نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح اسلامی شریعت کے مطابق کسی کے خلاف جنگ کا اعلان باقاعدہ طور پر قائم شدہ حکومت ہی کر سکتی ہے۔ افراد کو یہ اجازت نہیں کہ وہ بطور خود جہاد کے نام پر کسی کے خلاف لڑائی چھیڑ دیں۔ افراد کو خواہ کوئی بھی شکایت ہو مگر انھیں لازماً پر امن دائرہ میں کام کرنا ہے۔ جنگ اور تشدد کا طریقہ اختیار کرنا ان کے لئے کسی بھی حال میں جائز نہیں۔

اسی طرح جہاد (بمعنی قتال) مکمل طور پر ایک دفاعی عمل ہے۔ جارحانہ قتال اسلام میں قطعاً جائز نہیں۔ مزید یہ کہ اگر کوئی قوم جارحانہ حملہ کرے تب بھی پہلے جنگ کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ جنگ صرف اس وقت کی جائے گی جب کہ اس کو ٹالنے یا اعراض کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی ہوں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے ان کو ۸۰ سے زیادہ بار جنگ اور ٹکراؤ میں الجھانا چاہا مگر ہر بار آپ نے حسن تدبیر سے جنگ کو ٹال دیا۔ صرف تین بار (بدر، احد، حنین) کے مواقع پر آپ عملی طور پر جنگ میں شریک ہوئے جبکہ جنگ کے بغیر کوئی چارہ ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اسی طرح خود حکومت کے لئے بھی جنگ کرنا صرف اس وقت جائز ہوگا جب کہ اس نے جنگ کی ضروری تیاری کر لی ہو۔ ضروری تیاری کے بغیر جنگ میں کودنا خودکشی ہے نہ کہ اسلامی معنوں میں کوئی جہاد۔ اسلام میں صرف نتیجہ خیز اقدام کی اجازت ہے۔ جس اقدام کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے خودکشی کی ایک چھلانگ ہے نہ کہ کوئی اسلامی یا دینی عمل۔

اسلام میں جائز جنگ بھی ایک کھلے عمل کا نام ہے، خفیہ انداز کی جنگی کارروائی کرنا اسلام

میں ہر گز جائز نہیں۔ اس اصول کی بنا پر پراکسی وار (proxy war) اسلام میں ناجائز قرار پاتی ہے۔ کیوں کہ پراکسی وار میں ملوث حکومت خفیہ مدد کے ذریعہ کسی اور گروہ سے تشدد کی کارروائی کراتی ہے، وہ اعلان کے ساتھ اس میں شریک نہیں ہوتی۔

یرغمال بنانا

موجودہ زمانہ کے کچھ مسلمان اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف وہ متشددانہ کارروائیاں کر رہے ہیں جن کو ہائی جیکنگ یا یرغمال بنانا کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے تمام طریقے اسلام میں سراسر ناجائز ہیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ یقینی طور پر اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہیں، ورنہ وہ ہر گز ایسی مذموم حرکتیں نہ کریں۔ ہوائی جہاز کو ہائی جیک کرنا بے قصور انسانوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانا ہے۔ اس قسم کی بزدلانہ حرکت انسانیت کے خلاف بھی ہے اور خدا کے دین کے خلاف بھی۔

یرغمال بنانے کا غیر اسلامی ہونا دور اول کے ایک واقعہ سے ثابت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین جو مکہ میں تھے، انھوں نے یہ خلاف انسانیت حرکت کی تھی کہ کچھ مسلمانوں کو اپنے یہاں قید کر رکھا تھا۔ اس دوران پیغمبر اسلام اور آپ کے مخالفین کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جو معاہدہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس معاہدہ کے وقت پیغمبر اسلام نے مخالفین سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم لوگ ہمارے آدمیوں کو واپس کرو۔ البتہ خود یک طرفہ طور پر یہ اعلان فرمایا کہ اگر تمہارا کوئی آدمی ہمارے قبضہ میں آجائے گا تو ہم اس کو اپنے پاس نہیں روکیں گے بلکہ اس کو تمہاری طرف واپس کر دیں گے۔ اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ فریق ثانی اگر ہمارے آدمیوں کو یرغمال بنائے تب بھی ہمارے لئے جائز نہیں کہ ہم ان کے آدمیوں کو یرغمال بنانے لگیں۔

اصل ذمہ دار

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر نفرت اور تشدد کا جو طوفان برپا ہے اس کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ اس کا اصل ذمہ دار وہ مسلم نوجوان نہیں ہیں جو نفرت اور تشدد کے مذکورہ کام میں مبتلا

ہیں۔ بلکہ اس کے اصل ذمہ دار وہ نام نہاد اسلامی مفکرین ہیں جنھوں نے ان نوجوانوں کو اسلامی انقلاب کے نام پر ایک ایسا فکر دیا جو عملی طور پر یہی منفی نتیجہ پیدا کر سکتا تھا اور یہی اس نے پیدا کیا۔

اسلام کا طریقہ دعوت کا طریقہ ہے، اس کے برعکس دوسرا طریقہ سیاست کا طریقہ ہے۔ دعوت کا طریقہ امن کی بنیاد پر چلتا ہے اور سیاست کا طریقہ ٹکراؤ کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مفکرین نے اسلام کی سیاسی تعبیر کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تحریک سیاست کی تحریک بن گئی۔ اور پھر غلط طور پر اسلام کے ساتھ وہ تمام نا محمود چیزیں جڑ گئیں جو صرف سیاست اور سیاسی تحریک کا حصہ ہیں۔

دعوت اپنے فطری مزاج کی بنا پر فریق ثانی کو اپنے امکانی دوست کے روپ میں دیکھتی ہے۔ سیاست کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہل سیاست اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر فریق ثانی کو اپنے حریف اور دشمن کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتی عمل سے رحمت کلچر وجود میں آتا ہے اور سیاسی عمل سے صرف نفرت کلچر۔ جس سماج میں رحمت کلچر ہو وہاں ہر قسم کی اچھائیاں فروغ پائیں گی۔ اور جہاں نفرت کلچر ظہور میں آئے وہاں ہر قسم کی برائی اور تشدد پھیلے گا۔ نفرت کے ساتھ کبھی کوئی خوبی کی چیز جمع نہیں ہو سکتی۔

کرنے کا اصل کام

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے موجودہ قسم کی سیاسی ہنگامہ آرائی یا تشدد نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہے، بلکہ وہ انتہائی حد تک بے فائدہ بھی ہے۔ قریبی ماضی کی تاریخ اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، بیسویں صدی کے نصف اول میں بیشتر مسلم ممالک مغربی طاقتوں کے زیر اقتدار تھے، خواہ براہ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔ اس کے بعد آزادی کی تحریکیں چلیں۔ آج یہ تمام مسلم ممالک سیاسی طور پر آزاد ہیں۔ ان ملکوں کی تعداد تقریباً ۶۰ تک پہنچ چکی ہے۔ گنتی کے اعتبار سے اقوام متحدہ کے ممبروں میں سب سے زیادہ تعداد مسلم ملکوں کی ہے۔ اس

کے باوجود عالمی سیاسی نقشہ پر مسلمانوں کا کوئی وزن نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں سیاسی اقتدار ہی سب کچھ ہوا کرتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں سیاسی اقتدار کی حیثیت ثانوی بن گئی ہے۔ اب تعلیم اور سائنس اور ٹکنالوجی اور اقتصادیات کی اہمیت ہے۔ صرف سیاسی طور پر آزاد ہونا آج کی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

موجودہ مسلم ممالک چونکہ ان غیر سیاسی شعبوں میں دوسری قوموں سے پچھڑے ہوئے ہیں اس لئے عالمی نقشہ میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ ان کے عوام ابھی تک زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں وہ ابھی تک مغربی ملکوں کے محتاج ہیں۔ جدید معیار کے اعتبار سے انھیں اقتصادی ترقی حاصل نہیں۔ بظاہر سیاسی اقتدار کا مالک ہونے کے باوجود وہ زندگی کے تمام جدید شعبوں میں پچھڑے ہوئے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں حدیث کے مطابق صرف ید سفلیٰ (نچلا ہاتھ) بنے ہوئے ہیں۔ آزادی کے باوجود وہ عملاً محکومی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

مزید چشم کشا مثال یہ ہے کہ بہت سے مسلم ملک ہیں جہاں ان کے دعویٰ کے مطابق مفروضہ اسلامی انقلاب آچکا ہے۔ مثلاً مصر، پاکستان، ایران، الجزائر، سوڈان، افغانستان، وغیرہ۔ مگر اصل مسئلہ کی نسبت سے یہ نام نہاد اسلامی ممالک بھی انہیں سنگین مسائل کا شکار ہیں جن کا شکار دوسرے مسلم ممالک ہیں جن کو سیکولر کہا جاتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ علمی اور اقتصادی شعبوں میں یہ نام نہاد اسلامی ممالک بھی اتنا ہی پچھڑے ہوئے ہیں جتنا کہ دوسرے سیکولر ممالک۔ اس لئے آج کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی مسلم نسلوں کو ان غیر سیاسی شعبوں میں آگے بڑھایا جائے۔ اور بلاشبہہ یہ سب غیر سیاسی کام ہیں، ان کا سیاست اور اقتدار سے کوئی تعلق نہیں۔ مزید یہ کہ ان غیر سیاسی کاموں میں عمل کرنا خالص امن کے دائرہ میں ممکن ہے۔ ان میدانوں میں متحرک ہونے کے لئے نہ نفرت پھیلانے کی ضرورت ہے اور نہ تشدد بھڑکانے کی۔ یہ سارے مثبت نوعیت کے کام ہیں، ان کا منفی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک خط

برادر محترم و مکرم جناب یوسف نورانی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۹۹ بذریعہ فیکس ملا۔ آپ نے جس مسئلہ کی بابت تحریر فرمایا ہے اس پر میں نے کافی غور کیا۔ اس سلسلہ میں چند باتیں مختصر طور پر یہاں درج کرتا ہوں۔

۱۔ قرآن کی سورۃ الواقعہ (آیت ۸۳۔۸۵) میں بتایا گیا ہے کہ موت سے کچھ پہلے جب کہ آدمی ابھی اسی دنیا میں ہوتا ہے تو اس کا تعلق آخرت سے قائم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی جب موت کے قریب پہنچتا ہے تو اس کے مردہ رشتہ دار اس کو لینے کے لئے اس کے پاس آجاتے ہیں۔ اس طرح کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ انسانوں کا مردہ روحوں سے تعلق کسی نہ کسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے اگرچہ یہ تعلق وقتی اور جزئی قسم کا ہوتا ہے۔

۲۔ دونوں دنیاؤں کے درمیان اس ربط کا کوئی تعلق کسی قسم کی عملیات یا مشق (exercise) سے نہیں۔ وہ خود بخود اور کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ زندہ انسان کی روحانی تطہیر (spiritual purification) کتنی زیادہ ہوئی ہے۔ زندہ انسان کی جتنی زیادہ تطہیر ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ ارواح سے ربط کے قابل ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ دوسری دنیا کے پیغام کا آخذ (recipient) بنے گا۔ تاہم یہ ربط ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقاً ہوتا ہے۔

۳۔ زندہ انسان اور مردہ انسان کی روح کے درمیان یہ ربط کبھی لمحاتی طور پر عالم بیداری میں بھی ہو سکتا ہے مگر اس قسم کا ربط انتہائی نادر استثناء (rare exception) ہے۔ زیادہ تر یہ ربط خواب کی صورت میں ہوتا ہے جس کو حدیث میں نبوت کا چھیالیسواں حصہ بتایا گیا ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے زندہ لوگوں کو اس قسم کے خواب دکھائی دیئے جن کا کچھ تذکرہ ابن قیم کی کتاب الروح میں دیکھا جا سکتا ہے، خود میں نے بھی بعض ایسے خواب دیکھے ہیں جب کہ

واب میں کسی مردہ رشتہ دار سے میری ملاقات ہوئی۔ مگر اس قسم کا ربط کسی عملیاتی مشق کے ریعہ نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اتفاقی طور پر کسی کو پیش آسکتا ہے۔ مزید یہ کہ خواب کا ذریعہ صرف ئی ہے۔ وہ وحی کے مانند حقیقی نہیں۔

۴۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد کوئی عورت یا مرد فوراً ہی اپنے خروی انجام سے دو چار ہو جاتا ہے، حدیث میں آیا ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک غ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اس سے مراد معروف معنوں میں زمینی قبر کا مقام ہیں ہے۔ یعنی مرنے والے انسان کے اوپر یہ معاملہ قبر کے اندر نہیں ہوتا بلکہ آخرت میں ہوتا ہے۔ قبر عالم آخرت میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ موت اور انجامِ آخرت میں کوئی فاصلہ نہیں اہم یہ بات صرف اجمالی طور پر جانی جا سکتی ہے نہ کہ تفصیلی طور پر۔

۵۔ قرآن میں شہداء کے بارے میں آیا ہے کہ **و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم** (آل عمران ۱۷۰) اس آیت کا ترجمہ ایک فارسی مترجم نے اس طرح کیا ہے: وبمژدہ ی دہند بآنانکہ ہنوز نرسیدہ اند (صفحہ ۹۶) یعنی جنت میں پہنچنے کے بعد وہ دنیا میں باقی ہنے والے ساتھی کو خوش خبری دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندہ مومن اور وفات فتہ اہل جنت کے درمیان ایک مخفی قسم کا ارتباط (communication) باقی رہتا ہے۔ تاہم اس رتباط کی کوئی مشقی تدبیر نہیں۔ ایسا واقعہ صرف کسی نفس مطمئن (complex-free soul) کے ساتھ پیش آتا ہے۔

۶۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: "اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی ذریت بھی ان کی راہ پر یمان کے ساتھ چلی، ان کے ساتھ ہم ان کی ذریت کو بھی جمع کر دیں گے، اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے"۔ (الطور ۲۱) اس سے معلوم ہوا کہ اہل خاندان، مثلاً میاں اور یوی دونوں اگر صاحب ایمان ہیں تو آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اس طرح رحمت کا معاملہ رمائے گا کہ کم عمل والے فرد کو اپ گریڈ (upgrade) کر کے اس کو زیادہ عمل والے فرد کے رجہ میں پہنچا دے گا تاکہ دونوں ایک ساتھ جنت کی پر مسرت دنیا میں رہ سکیں۔ گویا کہ اگر دنوں میں سے ایک کا عمل دوسرے سے زیادہ ہو تو کم عمل والا زیادہ عمل والے کے ساتھ جوڑ دیا

جائے گا نہ کہ اس کے برعکس۔ واضح ہو کہ قرآن میں وسیع تر تقسیم (broad division) کے اعتبار سے جنت کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔ پھر ان کی ضمنی تقسیمات ہیں۔ چنانچہ حدیث میں دو سو جنتوں کا ذکر آیا ہے۔

۷۔ ایک مومن جوڑے میں سے اگر ایک فرد کا انتقال ہو گیا اور دوسرا باقی ہے تو زندہ رہنے والے فرد کے لئے بہترین کام یہ ہے کہ وہ اپنی بقیہ زندگی کو دونوں ہی کے لیے ایک نادر موقع سمجھے۔ وہ اپنی بقیہ زندگی کو اعلیٰ اسلامی عمل میں مصروف کردے تاکہ اس کو جب اپنے زیادہ عمل کی بنا پر زیادہ اعلیٰ جنت ملے تو اس کا جوڑا بھی مذکورہ خدائی قانون کے مطابق اپ گریڈ (upgrade) ہو کر اس کے ساتھ اس اعلیٰ جنت میں پہنچا دیا جائے۔ گویا کہ ایک اگر اکانومی کلاس میں ہے اور دوسرا فرسٹ کلاس میں تو اکانومی کلاس والا اپ گریڈ ہو کر فرسٹ کلاس میں پہنچ جائے۔

قرآن کی یہ آیت اہل ایمان کے لیے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ زندہ رہنے والا فرد اپنے مرنے والے ساتھی کے غم میں اپنے کو نڈھال نہ کرے۔ وہ اس کی یاد میں پریشان ہو کر اپنے باقی ماندہ وقت کو ضائع نہ کرے۔ بلکہ اپنے ساتھی کی موت کے بعد اس کو زندگی کا جو لمحہ ملا ہے اس کو وہ دونوں ہی کے حق میں ایک قیمتی موقع (opportunity) سمجھے۔ وہ اس ملے ہوئے وقت کو اپنی اور اپنے مرحوم ساتھی کی جنتی ترقی کے لئے استعمال (avail) کرے۔

دعا گو

وحید الدین

تاریخ: ۱۵ مارچ ۱۹۹۹

سوال

الہ (اردو) دسمبر ۱۹۹۹ کے صفحہ نمبر ۳۴ پر کچھ غیر مسلموں کے استفسار پر کہ "پیغمبر اسلام
ی پیغمبر ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے" جواب میں آپ نے ان سے کہا کہ "کوئی شخص ایسا پیدا
ا ہوا۔ جس نے یہ دعوی کیا ہو کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ یہی واقعہ اس کی تاریخی دلیل ہے۔"
پوچھنا چاہتے ہیں کہ ماضی میں جن لوگوں نے پیغمبری کا دعوی کیا تھا، ان کے اس دعوی کے
ے میں آپ کیا جواز پیش کریں گے۔ مثلاً مسیلمہ کذاب اور غلام احمد قادیانی وغیرہ وغیرہ۔ اس
ہ کی وضاحت فرمائیں۔ (عبدالقیوم شارق، مرتضیٰ پور، مہاراشٹر)

جواب

میرا کہنا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی شخص نے مستقل بالذات
ن کا دعوی نہیں کیا ہے۔ یعنی کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ رسول اللہ کے
مر مسیلمہ بن حبیب الحنفی (وفات ۶۳۳ء) نے مستقل نبوت کا دعوی نہیں کیا تھا بلکہ یہ کہا تھا
إنی قد اشرکت فی الامر معه۔ سیرۃ ابن ہشام ۴/۲۴۴۔ (یعنی میں محمدؐ کے ساتھ
ن میں شریک کیا گیا ہوں)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسیلمہ کے دعوی کے مطابق اس کی
ن کا معاملہ خود پیغمبر کی تصدیق پر منحصر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دو آدمیوں کا وفد رسول اللہ
پاس مدینہ بھیجا تاکہ اپنے بارے میں وہ آپؐ کی تصدیق حاصل کرے۔ آپ نے مسیلمہ کو
ب قرار دیا اس کے بعد اس کی نبوت کا دعوی اپنے آپ بے بنیاد ثابت ہو گیا۔ اسی طرح مرزا غلام
قادیانی (وفات ۱۹۰۸) نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس نے ظلّی نبوت ہونے کا
یٰ کیا تھا۔ یعنی میں محمدؐ کی نبوت کا سایہ ہوں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیشگی طور پر
چکے ہیں کہ: لیس بعدی نبی (صحیح البخاری، کتاب المغازی)۔ یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں۔
لئے مرزا غلام احمد کا دعوی بھی رسول اللہ کی تصدیق پر منحصر تھا اور آپ کی پیشگی تردید کی بنا
دعوی اپنے آپ باطل قرار پا گیا۔ اسی طرح ایران کے بہاء اللہ (وفات ۱۸۹۲ء) کے بارے

میں سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ انھوں نے اپنی زبان سے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ انھوں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں "مظہر الٰہی" ہوں۔ اس بنا پر وہ دعویٰ کے درجہ میں بھی اس فہرست میں نہیں آتے۔

اس سلسلہ میں مجھے ذاتی طور پر دو تجربے ہوئے ہیں۔ پہلا تجربہ نرنکاری مشن (نئی دہلی) کے گرو گربچن سنگھ (وفات ۱۹۸۰) کے بارے میں ہے۔ ۱۹۷۵ میں نرنکاری مشن کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور انہوں نے انگریزی میں چھپا ہوا ایک پمفلٹ مجھے دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ بابا گربچن سنگھ وقت کے پیغمبر (Prophet of the Time) ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ میں آپ کے سنٹر میں آؤں گا اور بابا گربچن سنگھ میرے سامنے یہ جملہ کہیں کہ 'میں وقت کا پیغمبر ہوں'۔ آپ لوگ بابا جی سے بات کر کے تاریخ اور وقت مقرر کر دیں تاکہ میں اس وقت وہاں پہنچ سکوں۔ ان لوگوں نے بابا جی سے گفتگو کر کے تاریخ اور وقت طے کیا اور پھر مجھے ٹیلیفون پر مطلع کیا۔ اس کے مطابق میں بابا جی کے یہاں پہنچا۔ میں بابا جی کے پاس ۴۵ منٹ تک رہا مگر انھوں نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ میں وقت کا پیغمبر ہوں، اس کے بجائے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، آخر کار میں واپس چلا آیا۔

میرا دوسرا تجربہ شانتی گری آشرم (تروندرم) کے گرو جی کے بارے میں ہے۔ وہ ۶ مئی ۱۹۹۹ کو اپنے آشرم میں انتقال کر گئے۔ مارچ ۱۹۹۹ میں ان کے یہاں ایک کانفرنس ہوئی۔ ان کے کچھ شاگرد دہلی آئے اور مجھ سے مل کر مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ انھوں نے شانتی گری آشرم کے تعارف پر ایک انگریزی پمفلٹ مجھے دیا جس میں یہ لکھا تھا کہ گرو جی وقت کے پیغمبر ہیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کی کانفرنس میں آؤں گا اور میرا خاص مقصد یہ ہو گا کہ میں آپ کے گرو جی سے اس دعویٰ کی بابت سوال کروں۔ وہ خوشی سے راضی ہو گئے۔ میں سفر کر کے شانتی گری آشرم پہنچا جو تریوندرم ایرپورٹ سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک سو ایکڑ رقبہ میں واقع ہے۔ یہاں میں نے دو دن قیام کیا۔ اس درمیان میں گرو جی سے میری دو بار ملاقات

ہوئی۔ایک ملاقات میں ان کی شاگردوں کے موجودگی میں باباجی سے میں نے یہ سوال کیا:

Do you claim that you are a prophet of God in the same sense in which Moses, Jesus and Mohammad claimed to be prophets of God.?

میرے اس سوال کے جواب میں باباجی نے صاف طور پر کہا کہ نہیں، (No) میں ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ یہ دوسروں کے اوپر ہے کہ وہ میرے بارے میں کیارائے قائم کرتے ہیں۔اس گفتگو کے بعد میں نے ان کے مذکورہ شاگردوں سے کہاکہ جب آپ کے باباجی پیغمبر ہونے کادعویٰ ہی نہیں کرتے تو آپ لوگ کیسے انہیں پیغمبر بتاتے ہیں۔اگر خداکسی کواپنا پیغمبر بنائے توسب سے پہلے خوداس آدمی کواپنے پیغمبر ہونے کا علم ہوگا جس کو پیغمبر بنایا گیاہے،نہ کہ اس کے سوادوسرے لوگوں کو۔

اپنے مطالعہ اور تجربہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ کہنا کہ "میں خداکا پیغمبر ہوں" ہمالیہ پہاڑ اپنے سر پر اٹھانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔اس قسم کا جملہ وہی بول سکتا ہے جو واقعۃً خداکا پیغمبر ہو۔غیر پیغمبر ایسا جملہ بولنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔

سوال

آپ اکثر الرسالہ میں لکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مواقع کھل گئے ہیں اور بلا روک ٹوک اسلامی دعوت کا کام کیا جاسکتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ہیں جو اس کے خلاف بتاتے ہیں۔ مثلاًایک مسلم حلقہ کے ایک شاعر نےاپنے حلقہ کے فکر کی ترجمانی ایک شعر میں اس طرح کی ہے:

جس نے بھی بات کی ہے نبی کے نظام کی　　سُنّی پڑی ہے طنزاسے خاص وعام کی

آخر یہ دوطرح کی بات کیوں۔دونوں میں سے کون سی بات صحیح ہے۔(ایک قاری الرسالہ،دہلی)

جواب

اس قسم کے اشعار سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ شعر تو ایک لفظی تک بندی ہوتا ہے۔اور لفظی تک بندی آپ جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں، حتی کہ متضاد انداز میں بھی۔ مثلاًمذکورہ شعر کو لفظ بدل کر اس طرح برعکس طور پر بھی کہا جاسکتا ہے:

جس نے بھی بات کی ہے نبی کے نظام کی　　اس کو ملی ہے داد خواص وعوام کی

آپ تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آئے گا۔ یہ ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کی "بات" بیان کرنے والوں میں سے سب سے بڑا گروہ محدثین کا ہے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ صحابۂ کرام کے بعد امت میں سب سے زیادہ عزت واحترام جس کو ملا ہے وہ یہی محدثین کا گروہ ہے۔ حتیٰ کہ آج بھی کسی دار العلوم کے شیخ الحدیث کو جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور کو نہیں ملتی اصل یہ ہے کہ مذکورہ شعر یا اس قسم کی بات کہنے والے دوسرے حضرات ایک مغالطہ کا شکار ہیں۔ وہ "نبی کی بات" اور "نبی کے نام پر اپنی بات" کے فرق کو نہیں جانتے۔ نبی کی بات کو کہنا یا نبی کے اصل پیغام کو پہنچانا ہمیشہ لوگوں کے درمیان پسندیدہ کام رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ "نظام مصطفیٰ" کے نام پر تحریکیں چلاتے ہیں اور ان کو مسائل کا شکار ہونا پڑتا ہے اس کا تعلق "نبی کی بات" سے نہیں ہے بلکہ نبی کے نام پر حکمرانوں کے خلاف ٹکراؤ کی سیاست چلانے سے ہے۔ اور ٹکراؤ کی سیاست ہمیشہ ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔ "نظام مصطفیٰ" کے خود ساختہ علم بردار لوگ خود اپنی غیر پیغمبرانہ سیاست کی قیمت پا رہے ہیں اور اس کو خلاف واقعہ طور پر پیغمبر سے منسوب کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ انہوں نے اپنی یہ غیر پیغمبرانہ سیاست پیغمبر کے نام پر چلائی تھی۔

سوال

مسلمان اپنے آپ کو ہندو کہلانا کیوں ناپسند کرتے ہیں۔ ہندو کوئی مذہبی شبد نہیں۔ یہ ایک جغرافی شبد ہے۔ بھارت کے جغرافیہ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب ہندو ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح جرمنی کے جغرافیہ میں رہنے والے سب جرمن ہیں۔ اس دیش میں ہندو اور مسلمان دونوں ہندو ہیں۔ مسلمان اگر اس بات کو مان لیں تو ہمارے دیش کا سارا جھگڑا ختم ہو جائے اور یہاں سماجی امن قائم ہو جائے (ایم۔ ایس۔ شرما، نئی دہلی)

جواب

جرمنی میں رہنے والے تمام لوگ اس لئے جرمن کہے جاتے ہیں کہ ان کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا لکھا ہوا ہے۔ مگر انڈیا کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا نہیں۔ اس کے مطابق اس ملک میں رہنے والے

سب لوگ انڈین یا بھارتی ہیں۔ لہذا جرمن اور ہندو کے معاملہ کو یکساں کیسے بتایا جاسکتا ہے۔

اس معاملہ کی دوسری نظریاتی بنیاد یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کی قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہو۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ویدیا پران یا گیتا میں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ اس دیش میں رہنے والے سب کے سب ہندو ہیں۔ بلکہ ہندو کا شبد تو ان کتابوں میں موجود ہی نہیں۔ پھر آخر وہ کون سی نظریاتی دلیل ہے جس کی بنیاد پر ایسا کہا جائے۔

محض کسی کا دعویٰ اس تصور کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی دعویٰ کر سکتے ہیں۔ مثلاً عیسائی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی ان کا مذہبی نام نہیں ہے۔ ان کا اپنا اختیار کردہ نام مسیحی یا کرسچین ہے۔ عیسائی دراصل ایک جغرافی شبد ہے اور اس ملک کے رہنے والے سب کے سب عیسائی ہیں۔ اگر محض دعویٰ کافی ہو تو ہر گروہ اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

جہاں تک سماجی امن کا تعلق ہے، اس کا ہندو نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ محض کسی لفظ کے ادل بدل سے سماجی جھگڑے کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ مہاتما گاندھی اور گاڈسے دونوں اپنے کو ہندو کہتے تھے، اس کے باوجود گاڈسے نے گاندھی کو مار ڈالا۔ بہار کے اونچی ذات کے ہندو اور نیچی ذات کے ہندو دونوں اپنے کو ہندو کہتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ اٹل بہاری باجپئی اور کلیان سنگھ دونوں مذکورہ معنوں میں اپنے کو ہندو بتاتے ہیں۔ اس کے باوجود دونوں میں اتنا اختلاف پیدا ہوا کہ دونوں الگ الگ ہو گئے۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس قسم کے کلچرل اختلاف کو مٹانے کے بجائے اس معاملہ میں ہر ایک کو آزادی دے دی جائے۔ گرو گولوالکر نے درست طور پر کہا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے: Nature abhors uniformity۔ اور جب خود فطرت ہی میں فرق اور تنوع موجود ہے تو اس کو مٹانا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی امن کا راز کلچرل یکسانیت میں نہیں ہے بلکہ کلچرل تنوع کو تسلیم کرنے میں ہے۔ اس مسئلہ کے حل کا درست اور قابل عمل فارمولا صرف یہ ہے: ایک کی پیروی اور سب کا احترام: .Follow one and respect all

توجیہہ یا بددیانتی

دہلی کے انگریزی اخبار پانیر (۱۷ستمبر ۱۹۹۹) میں صفحہ اول پر ایک رپورٹ چھپی۔اس کے مطابق، ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر وی این نرائنن (V. N. Narayanan) کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس کے کالم میوزنگس (Musings) میں چھپا، وہ ایک ادبی سرقہ (Plagiarism) تھا۔ یہ ایک مغربی مصنف برائن اپیل یارڈ (Bryan Appleyard) کا مضمون تھا جس کو مسٹر نرائنن نے اپنے نام کے تحت لفظ بلفظ (verbatim) شائع کر دیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد جب اس ادبی سرقہ کا چرچا ہوا تو مسٹر نرائنن نے ہندستان ٹائمس کی ادارت سے ضمیر کی بنیاد (conscience ground) پر استعفیٰ دے دیا۔ تاہم انھوں نے اپنے اس فعل کی توجیہہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ: میں خیالات کا ناقل ہوں اور جب میں کسی خیال کو کسی سے لفظ بلفظ لیتا ہوں تو میں ذاتی طور پر اس آدمی کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہوتا ہوں۔ میں مصنف کو اپنی ذات میں شامل کر لیتا ہوں۔ جب ایک خیال میڈیا میں آجائے تو وہ عوامی ملکیت بن جاتا ہے:

> I am a carrier of ideas and when I take an idea verbatim from someone, I am personally paying homage to the person who has expressed it. I personalise the author, I get into the person. Once an idea is expressed in the media it is public property.

یہ بلاشبہہ ایک جھوٹی توجیہہ ہے۔اس دنیا میں غلطی کرنا صرف غلطی ہے۔ مگر غلطی کے بعد اس کی جھوٹی توجیہہ پیش کرنا بددیانتی۔ غلطی قابل معافی ہو سکتی ہے مگر بددیانتی (dishonesty) ہرگز قابل معافی نہیں۔

۱۔ نو بھارت ٹائمس (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر اوم پرکاش تپس نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ موضوع تھا: اسلام اور تیوہار۔ بتایا گیا کہ اسلام میں عید اور عید الاضحیٰ کی ایک حیثیت مذہبی ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ سماجی میل اور انسانی تعلقات کی بہتری کا ذریعہ ہے۔

۲۔ انڈونیشیا (جکارتا) میں آنند آشرم کے نام سے میڈیٹیشن (Meditation) کے مقصد کے تحت ایک بڑا ادارہ قائم ہے جس کا پورا نام یہ ہے:

Center for Holistic Health and Meditation

اس ادارہ کے تحت ایک درجن افراد انڈیا آئے۔ وہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وفد مسٹر آنند کرشنا کی قیادت میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز سے ملا۔ وہ اسلام کے بارے میں سمجھنا چاہتے تھے۔ ان کو تفصیل کے ساتھ اسلام سے متعارف کیا گیا۔ ایک گھنٹہ کی یہ پوری بات چیت انگریزی میں ہوئی جس کو انھوں نے ریکارڈ کیا۔

۳۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۹۹ کو کیتھولک چرچ کی طرف سے کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک اجتماع کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور وہاں مختلف مذاہب کے مشترک اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس میں انھوں نے قرآن اور روحانیت کی اہمیت بتائی۔ ایک بات یہ کہی گئی کہ انسان پیدائشی طور پر امن اور روحانیت کی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسلام میں صبر کی تعلیم اس لئے دی گئی ہے کہ یہ فطرت بگڑنے نہ پائے۔

۴۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۹ کو تارا بھٹا چارجی، ممبر، کھادی اینڈ ولیج انڈسٹری کمیشن کی رہائش گاہ پنچ شیل پارک (نئی دہلی) پر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں کچھ بیرونی ملکوں کے لوگ بھی شریک تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام کی سماجی تعلیمات پر ایک تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تمام

انسانوں کو یکساں طور پر خدا کی مخلوق سمجھو۔لوگوں سے تمہیں ناخوشگواری کا تجربہ ہو تب بھی تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔دوسروں کی طرف سے منفی رویہ کا اظہار ہو تب بھی تم مثبت رویہ پر قائم رہو۔

۵۔ پوپ جان پال کی دہلی آمد پر مسٹر ٹی پی پانڈے نے IN T. V. کے لئے یکم نومبر ۱۹۹۹ کو ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام میں ہر مذاہب کے بزرگوں کے احترام کی تعلیم دی گئی ہے۔اسلام کا اصول یہ ہے کہ تم کو خواہ کسی سے مذہبی اختلاف ہو تب بھی انسان کی حیثیت سے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور بلا تفریق ہر قوم کے بڑوں کی عزت کرو۔

۶۔ پروفیسر راج موہن گاندھی کی ۳۶۴ صفحات کی کتاب(Revenge and Reconciliation) حال میں پنگوئن بکس نے چھاپی ہے۔اس سلسلہ میں ۱۲ نومبر ۱۹۹۹ کو انڈیا انٹر نیشنل سنٹر نئی دہلی میں ایک پینل ڈسکشن منعقد کیا گیا۔اس میں دلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔اس کتاب میں ساؤتھ ایشیا کی دوسری تہذیبوں کے ساتھ اسلام کے بارے میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ اس کی تاریخ میں تشدد زیادہ ہے اور صلح کم۔اس سلسلہ میں کہا گیا کہ اس معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نیچر کا اصول شاک ٹریٹمنٹ کا ہے۔دنیا میں جتنی بھی ترقیاں ہوئی ہیں وہ سب شاک ٹریٹمنٹ کے ذریعہ ہوئی ہیں۔اس لحاظ سے وہ چیز جس کو تشدد کہا گیا ہے وہ درحقیقت زحمت میں رحمت(blessing in disguise) ہے۔

۷۔ نیشنل یوتھ سنٹر (نوائڈہ) میں ۱۴ نومبر ۱۹۹۹ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔اس کی دعوت پر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور سکولرزم اور ہندستان کے موضوع پر ایک تقریر کی۔انھوں نے کہا کہ ہندستان کے لئے سکولر نظام ہی واحد صحیح نظام ہے۔اس لئے نہیں کہ اقلیتوں کے لئے اس میں تحفظ ہے بلکہ

اسی میں خود ملک کا فائدہ ہے۔ آج ساری دنیا میں سکولر اسٹیٹ کو پسند کیا جاتا ہے۔ اور مذہبی اسٹیٹ کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر ہندستان میں مذہبی اسٹیٹ بنائی جاتی تو یہ ملک عالمی برادری سے الگ ہو جاتا۔ اور عالمی سطح پر اپنا وزن کھو دیتا۔

۸۔ مولانا ابو الکلام آزاد سنٹر کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے احمد آباد کا سفر کیا۔ ۱۹۔۲۰ نومبر کو وہاں مختلف پروگرام ہوئے۔ ۲۰ نومبر کو سنٹر کے ہال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اجتماع میں تفصیلی خطاب ہوا۔ اس سفر کی روداد سفر نامہ کے تحت انشاء اللہ شائع کر دی جائے گی۔

۹۔ نور الاسلام فاؤنڈیشن (فلوریڈا) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز کا امریکہ کا سفر ہوا۔ یہ سفر ۲۳ نومبر ۱۹۹۹ کو شروع ہوا اور ۸ دسمبر ۱۹۹۹ کو واپسی ہوئی۔ اس سفر میں امریکہ کے مختلف مقامات پر دعوتی پروگرام ہوئے۔ ہر پروگرام کے موقع پر اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات کا بک اسٹال بھی لگایا گیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۰۔ جیز ز اینڈ میری کالج (نئی دہلی) میں ۱۰ دسمبر ۱۹۹۹ کو مختلف مذاہب پر ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ یہ پروگرام انگریزی میں تھا۔

۱۱۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۹ کو دوردرشن (انٹر نیشنل) کی ٹیم نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی۔ اس کا موضوع 'روزہ اور انسانیت' تھا تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ روزہ ایک اعتبار سے اللہ سے قربت کا ذریعہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ سلف کنٹرول اور اخلاقی ڈسپلن کی تربیت ہے تاکہ انسان اپنے سماج کا بہتر فرد بن کر رہ سکے۔

۱۲۔ صدر اسلامی مرکز کے سفر امریکہ کے دوران بی بی سی لندن نے ٹیلی فون پر ان کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔ یہ انٹرویو ۲۹ دسمبر ۱۹۹۹ کو بی بی سی کی صبح کی خبروں کے تحت نشر کیا گیا۔ اس

انٹرویو کا موضوع تھا: دنیا کیسے تخلیق ہوئی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے قرآن کی آیتوں کی روشنی میں بتایا کہ دنیا کی تخلیق کے بارہ میں قرآن میں کیا تصور دیا گیا ہے۔

۱۳۔ ان ٹائم ٹی وی نیوز (نئی دہلی) (In Time T. V. News) کی ٹیم نے ۳۰ دسمبر ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ اگلی شتابدی کیسی ہو گی۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ فطرت کا قانون ہمیشہ ارتقاء کی طرف جاتا ہے۔ اس لئے انسان کی تاریخ بھی اگلی صدیوں میں یقینی طور پر ارتقاء کی طرف جائے گی۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی میں اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ اس طرح حالات بتاتے ہیں کہ اگلی صدی میں روحانیت کا غلبہ اسی طرح ہو گا جس طرح بیسویں صدی میں مادیت کا غلبہ تھا۔ اور یہ قانون فطرت کے تحت ہو گا۔

۱۴۔ دوردرشن (نئی دہلی) نیوز چینل کے لئے یکم جنوری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ اس کا موضوع تھا: ہائی جیکنگ اور اسلام۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہائی جیکرس کا حکم اسلام میں وہی ہے جو قطاع الطریق (Highway robbers) کا ہے۔ اس قسم کا فعل اسلام میں بلاشبہہ جائز نہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جہاد (بمعنی قتال) صرف حکومت کا کام ہے، وہ افراد کا کام نہیں ہے۔

۱۵۔ یکم جنوری ۲۰۰۰ کو مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ یہ رمضان کی ۲۲ تاریخ تھی۔ اس نسبت سے روزہ کا حکم اور اس کے روحانی پہلو پر صدر اسلامی مرکز نے ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ روزہ سلف کنٹرول کی ایک سالانہ تربیت ہے۔ حقیقی روزہ وہی ہے جس میں اس کے فارم کے ساتھ اس کی مطلوب اسپرٹ بھی موجود ہو۔

۱۶۔ شری رام اسکول (گڑگاؤں) میں ۱۲ جنوری ۲۰۰۰ کو طلبہ اور ساتذہ کا ایک خصوصی پروگرام تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے آخر میں سوال وجواب ہوا۔ اسکول کے اس پروگرام کے تحت

مختلف مذہب کے مستند عالموں کو بلا کر انھیں یہ موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کا تعارف پیش کریں۔ چنانچہ اسلام کے تعارف کے لئے صدر اسلامی مرکز کو بلایا گیا۔

ا۔ زی ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۳ جنوری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر 'اسلام اور آتنک واد' سے تھا۔ جواب میں کہا گیا کہ آتنک واد کا کوئی بھی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے۔ اور اپنے مقصد کو صرف پرامن ذرائع سے حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

ا۔ سیرین میڈیا کے نمائندہ ڈاکٹر وائل الشیخ حسن عواد نے ۱۳ جنوری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ویڈیو انٹرویو انگریزی میں ریکارڈ کیا۔ اس کا سبجکٹ تھا: تقسیم اور ہند۔پاک تعلقات۔ اس تفصیلی انٹرویو میں جو باتیں کہی گئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہندو یا انگریز کو تقسیم کا ذمہ دار قرار دینا درست نہیں۔ جس لیڈر شپ نے تقسیم کا مطالبہ کیا وہی اس کی اصل ذمہ دار ہے۔ یہ دنیا مسابقت کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی اس انتظار میں ہے کہ آپ اپنے کسی فعل سے اس کو موقع دیں تو وہ اس کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ مسلم لیڈر شپ نے موقع فراہم کیا اور پھر دوسروں نے اس کو استعمال کیا۔ مسلم لیڈر شپ کو دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے یہ جاننا چاہئے کہ اس دنیا میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایسا کوئی فعل نہ کرے جس سے دوسروں کو اسے استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔

ا۔ بی بی سی لندن کے لئے مسٹر زبیر احمد نے ۱۳ جنوری ۲۰۰۰ کو لندن سے بذریعہ ٹیلی فون صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم۔مسیحی تعلقات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں یہ کہا گیا کہ مسیحی لوگ اگر زیادتی کریں تو مسلمانوں کو یکطرفہ طور پر اسے نظر انداز کرنا چاہئے تاکہ دعوت کا ماحول باقی رہے۔ دعوت کا عمل صرف دونوں کے درمیان نارمل تعلقات میں ہو سکتا ہے۔ اور نارمل تعلق کو باقی رکھنے کے لئے سب سے زیادہ ذمہ داری مسلمانوں کو اٹھانا چاہئے کیونکہ ان کی حیثیت داعی کی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 90	ایک سال	\$20 / £10	\$10 / £5
دو سال	Rs. 170	دو سال	\$35 / £18	\$18 / £8
تین سال	Rs. 250	تین سال	\$50 / £25	\$25 / £12
پانچ سال	Rs. 400	پانچ سال	\$80 / £40	\$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	\$100 / £50	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیرِ سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اپریل 2000 شمارہ نمبر 281

فہرست



Al-Risala
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi

رب بنانا

دورِ زوال کے یہودیوں اور عیسائیوں کاذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: انھوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنالیا اور مسیح بن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ وہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں۔ (التوبہ ۳۱)

احمد اور ترمذی نے یہ روایت کیا ہے کہ عدی بن حاتم الطائی جو جاہلیت کے زمانہ میں نصرانی ہو گئے تھے، وہ مدینہ آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ پھر انھوں نے مذکورہ آیت کی نسبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کی عبادت تو نہیں کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں۔ ان کے علماء نے حلال کو حرام کیا اور حرام کو حلال کیا تو انھوں نے اس کی پیروی کی۔ یہی ان کی اپنے علماء و مشائخ کی عبادت ہے۔ تفسیر ابن کثیر الجزء الثانی صفحہ ۳۴۸۔

ان آیات میں اتّخاذِ رب کا مطلب اکابر پرستی ہے۔ اس کا اس سیاسی نظریہ سے کوئی تعلق نہیں کہ جو لوگ زمین پر حاکم بن کر اپنا قانون چلا رہے ہوں ان سے لڑ کر انہیں ختم کرو اور زمین پر خدائی قانون کا نفاذ کرو۔ اس آیت کے اندر حال میں موجود ایک صورت کا ذکر ہے نہ کہ مستقبل کی نسبت سے سیاسی مشن کا تعین۔

اس آیت میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ کسی امت کی حالت اس کے دورِ زوال میں کیا ہوتی ہے۔ ایسے زمانہ میں امت کا زندہ تعلق خدا اور رسول کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات کا مرکز اس کے اکابر اور مشائخ بن جاتے ہیں۔ اکابر کے اقوال اور ملفوظات اس کے لئے اس کے دین کا ماخذ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مفروضہ بڑوں کی پر اسرار کہانیوں میں جینے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک حق صرف وہ ہوتا ہے جو انہیں اپنے بعد کے علماء و مشائخ سے ملا ہو۔ خدا کی کتاب ان کے لئے برکت کا ذریعہ بن جاتی ہے، وہ ان کے لئے حق و باطل میں تمیز کی کسوٹی نہیں ہوتی۔

اول دن

زکام شروع ہونے سے پہلے اس کی کچھ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں مثلاً چھینک آنا۔ زکام کی ابتدائی علامت ظاہر ہوتے ہی اگر فوری طور پر دوالی جائے تو پہلی ہی خوراک میں زکام کنٹرول میں آجائے گا لیکن اگر دیر کی جائے تو لمبی مدت تک زکام آپ کو پریشان کرتا رہے گا۔ یہی دوسری بیماریوں کا معاملہ ہے۔

زندگی کے مسائل و معاملات کی نوعیت بھی یہی ہے۔ اس بات کو فارسی زبان کی ایک مثل میں اس طرح کہا گیا ہے: گربہ کشتن روزِ اول (بلی کو پہلے ہی دن ہلاک کرو) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص سے تمہاری نزاع ہو یا اس سے دشمنی ہو جائے تو ابتداء ہی میں اس کو ختم کرنے کی کوشش کرو۔ حتی کہ فریق ثانی کی شرطوں پر اگر معاملہ ختم ہوتا ہو تب بھی اس میں دیر نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح کے معاملات میں دیر کرنے کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ معاملہ کی پیچیدگی بڑھتی چلی جائے۔ نزاعی مسئلہ ابتدائی مرحلہ میں تھوڑی قیمت پر حل ہو جاتا ہے۔ جب کہ بعد کو بھاری قیمت دے کر اسے حل کرنا پڑتا ہے۔

اس اصول پر عمل نہ کرنے کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ نزاع پیش آنے کے بعد صاحب معاملہ معتدل ذہنی حالت میں نہیں رہتا۔ اس لئے وہ بے لاگ فیصلہ کرنے میں عاجز ثابت ہوتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ معاملہ پیش آنے کے بعد لوگوں سے مشورہ کیا جائے اور جو مشورہ ملے اس پر کھلے ذہن کے ساتھ غور کیا جائے۔ مشورہ کے ذریعہ وہ درست رائے معلوم ہو جاتی ہے جس کو صاحب معاملہ اپنے متاثر ذہن کی بنا پر دریافت نہیں کر سکا تھا۔

نزاع کا جاری رہنا کسی بھی فریق کے لئے مفید نہیں۔ اگر فریق ثانی ضد کا طریقہ اختیار کرے تب بھی ایک فریق کو یک طرفہ طور پر اسے ختم کر دینا چاہئے۔ جو فریق نزاع کے خاتمہ کی پہل کرے گا آخر کار وہ کامیاب ہوگا۔

اہلِ ایمان

قرآن میں پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے، ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا، وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے۔ تاکہ ان سے کافروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ نے ان سے معافی کا اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔ (الفتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں ـــــــ یہ صرف ایک واقعہ کا بیان نہیں ہے بلکہ وہ اس کی دلیل بھی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی نے یہ اعلان کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو وہ واقعۃً اللہ کا رسول تھا۔ پیغمبر اسلام سے پہلے یا پیغمبر اسلام کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص جو اللہ کا رسول نہ ہو وہ اپنی زبان سے یہ جملہ بولے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ "میں اللہ کا رسول ہوں" اتنا زیادہ مشکل ہے کہ یہ جملہ صرف وہی شخص بولے گا جو واقعۃً اللہ کا رسول ہو گا، کوئی غیر رسول یہ جملہ بولنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔ اور نہ کبھی تاریخ میں کسی نے اس قسم کی جرأت کی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الرسالہ، مارچ ۲۰۰۰۔

یہی اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ خدا کے آخری پیغمبر تھے۔ آپ کے بعد جب کوئی شخص یہ نہ کہہ سکا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں تو آپ کا دعویٰ غیر متنازعہ طور پر اپنے آپ تاریخ میں قائم ہے۔ آپ کو خاتم الرسل ثابت کرنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

اور جو لوگ رسول کے ساتھ ہیں ـــــــ یہ بظاہر ایک سادہ جملہ ہے جو اصحابِ رسول سے متعلق ہے۔ لیکن جب اس پر غور کیا جائے کہ یہ اولین لوگ کیسے پیغمبر اسلام کے ساتھی بنے تو معلوم

ہو تا ہے کہ یہ محض ایک سادہ جملہ نہیں بلکہ اس کے اندر ایک انتہائی اہم حقیقت چھپی ہوئی ہے۔

اسلام کے دور اول میں پیغمبر کی تصویر، قرآن کے الفاظ میں صرف ایک بشر جیسی تھی۔ وہ لوگوں کو بس محمد بن عبد اللہ کے روپ میں دکھائی دیتے تھے۔ لیکن آج آپ کے نام کے ساتھ اتنی زیادہ تاریخی عظمتیں جمع ہو چکی ہیں کہ ایک غیر مسلم محقق بھی مجبور ہے کہ آپ کو تمام پیدا ہونے والے انسانوں میں سب سے بڑا انسان قرار دے۔ گویا آپ کے ابتدائی پیروؤں نے "محمد بدون تاریخ" میں آپ کے رسولِ خدا ہونے کی حقیقت کو دریافت کیا۔ جب کہ آج کا ایک شخص "محمد بشمول تاریخ" میں آپ کے رسول خدا ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے اولین پیروؤں نے آپ کے رسول خدا ہونے کو اس وقت مانا جب کہ آپ اپنی اضافی حیثیت کے بغیر مجرد روپ میں ان کے سامنے ظاہر ہوئے تھے۔ جب کوئی شخص اس طرح پیغمبر کو اس کی اضافی نسبتوں کے بغیر مجرد روپ میں جان لے تو ایسے آدمی کا ایمان ایک گہری معرفت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایک عظیم دریافت (Discovery) کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی دریافت آدمی کے پورے وجود میں ایک مکمل فکری اور روحانی انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ اس انقلاب کے بعد اس کی جو شخصیت بنتی ہے، اس کا ذکر آیت کے اگلے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

پیروان رسول کی ایک صفت یہ بتائی گئی کہ وہ منکروں پر (اشداء علی الکفار) ہیں۔ یہاں سخت یا شدید کا مطلب کڑا پن یا درشتی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیر اہل اسلام کی غیر اسلامی باتوں کا اثر قبول نہیں کرتے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: ھو شدیدٌ علیَّ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ سخت معاملہ کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرا اثر قبول نہیں کرتا۔ مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے۔ وہ بے اصول لوگوں یا مفاد پرستی کے علمبرداروں سے غیر متاثر ہو کر رہتا ہے۔ وہ خود اپنے طے کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ کبھی کسی خلاف حق رواج کا اثر قبول نہیں کرتا۔

وہ آپس میں مہربان ہیں (رحماء بینھم)۔۔۔۔۔۔لوگوں سے مہربانی کے ساتھ پیش آنا انسانیت کا اعلیٰ ترین تقاضہ ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہل ایمان اپنے لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے رحیم و شفیق ہوں۔ اور جب دوسروں سے معاملہ پیش آئے تو وہ ان کے ساتھ اس کے برعکس عمل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ رحمت و شفقت اہل ایمان کی ایک مستقل اور عمومی صفت ہے جو ایک کے مقابلہ میں ظاہر ہوتی ہے، خواہ وہ اپنا ہو یا کوئی غیر۔

آپس میں مہربان ہونے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے فرمایا کہ آپس میں مہربان ہونا نسبتاً زیادہ مشکل کام ہے۔ جو آدمی اپنوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کرے وہ غیروں کے ساتھ بھی ضرور رحمت و شفقت کا معاملہ کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کے درمیان ہمیشہ ملنا جلنا زیادہ ہوتا ہے۔ ان سے زیادہ معاملات پیش آتے ہیں۔ لین دین کی عملی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنے لوگوں سے اکثر شکایت اور نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا کہ غیروں کے مقابلہ میں شفقت کا معاملہ اگر سادہ طور پر صرف شفقت کرنے کا معاملہ ہے تو اپنوں کے مقابلہ میں شفقت کا معاملہ شکایت اور نزاع کے باوجود شفقت کا معاملہ۔ اپنوں کے مقابلہ میں رحیم ثابت ہونا زیادہ بڑی جانچ میں پورا اترنا ہے۔ اور یہ ایک فطری بات ہے کہ جو آدمی بڑی جانچ میں پورا اترے وہ چھوٹی جانچ میں بدرجہ اولیٰ پورا اترے گا۔

تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے۔۔۔۔۔۔یہ اہل ایمان کی اس کیفیت کی تصویر ہے جو ان کے اندر خدا کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان ان کے لئے خدا کی عظمت کی دریافت کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہ دریافت ان کے سینہ کو خشوع اور تواضع سے بھر دیتی ہے۔ اس کا مظاہرہ بار بار عبادت اور رکوع اور سجود کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔

وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ایمان آدمی کے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ ساری طاقتیں صرف ایک خدا کے پاس ہیں۔ وہ دینے والا ہے اور انسان اس سے پانے والا۔ یہ شعور اس کی زندگی میں اس طرح ڈھل جاتا ہے کہ وہ ہر چیز کو خدا کا

فضل سمجھنے لگتا ہے۔اس کی ہر سرگرمی خدا کی خوشنودی کی تلاش میں بدل جاتی ہے۔

ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ آدمی کی اندرونی کیفیت اس کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ آدمی اندر سے خوش ہے یا غمگین، دونوں حالتوں میں اس کا چہرہ اس کی داخلی حالت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص حقیقی معنوں میں سجدہ گزار ہو،اس کا وجود ایمان کی کیفیات سے بھر گیا ہو تو اس کے چہرے پر اس کے اثرات اس طرح ظاہر ہو جائیں گے کہ دیکھنے والا اس کے ظاہر سے اس کے باطن کو پڑھ سکے۔ یہ اہل ایمان کی انفرادی خصوصیات ہیں جن کا ذکر پیشگی طور پر تورات میں کیا گیا تھا۔ اصحاب رسول کی یہ صفت موجودہ تبدیل شدہ تورات میں قدسیوں (Saints) کے لفظ کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ (کتاب استثناء باب ۳۳)

انجیل (مرقس، باب ۴) میں اس گروہ کے اجتماعی اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔اس اجتماعی خصوصیتکو مذکورہ قرآنی آیت کے آخر میں کھیتی یازرعی فصل کی تمثیل کے ذریعہ اس طرح بتایا گیا ہے کہ سچے اہل اسلام خدا کی زمین میں درخت کی طرح اگتے اور بڑھتے ہیں۔وہ پودے سے آغاز کر کے ہرا بھرا باغ بن جاتے ہیں۔ اہل اسلام کا گروہ پودے کی صورت میں ایک ابتدائی مقام سے ابھرتا ہے۔ پھر وہ بڑھتے بڑھتے ایک طاقتور درخت بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا استحکام اس درجہ کو پہنچ جاتا ہے کہ اہل حق اس کو دیکھ کر خوش ہوں اور اہلِ باطل غیظ و حسد میں مبتلا ہو کر رہ جائیں کہ چاہنے کے باوجود وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مذکورہ انفرادی اور اجتماعی صفات میں پورے اتریں ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو مغفرت اور اجرعظیم عطا فرمائے گا۔ یہاں مغفرت سے مراد آخرت کی کامیابی ہے اور اجر عظیم سے مراد دنیا کی کامیابی۔ آخرت کی کامیابی انہیں جنت کی صورت میں ملے گی اور دنیا کی کامیابی ملّی وقار اور فکری غلبہ کی صورت میں۔

ایک خواب

میری لڑکی ام السلام (پیدائش نومبر ۱۹۵۰) نے بہت پہلے ایک خواب دیکھا۔ اس وقت وہ ناندیڑ میں تھی۔ اس نے خط کے ذریعہ ہم کو اس خواب سے مطلع کیا۔ ام السلام نے خواب میں یہ دیکھا کہ راقم الحروف کی کتاب الاسلام یتحدیٰ انڈونیشیا کے صدر نے پڑھی ہے۔

بظاہر یہ خواب بالکل ناقابل قیاس تھا۔ تاہم اپنی عادت کے مطابق میں نے اس کو اپنی خواب کی ڈائری میں درج کر لیا۔ یہ خواب ام السلام نے جون ۱۹۷۸ میں دیکھا تھا۔ عجیب بات ہے کہ ۲۰ سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد یہ خواب حیرت انگیز طور پر بالکل درست ثابت ہوا۔

جنوری ۲۰۰۰ کے آخر میں نئی دہلی میں واقع انڈونیشیا کے سفارت خانہ سے ہمارے دفتر میں ٹیلی فون آیا۔ سفارت خانہ کے ذمہ دار نے بتایا کہ انڈونیشیا کے موجودہ صدر پروفیسر عبدالرحمٰن وحید فروری میں انڈیا کے دورہ پر آنے والے ہیں۔ نئی دہلی کے قیام کے دوران وہ راقم الحروف سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ وہ باہمی دلچسپی (mutual interest) کے موضوعات پر مجھ سے بات کر سکیں۔ اس ٹیلیفون کے بعد انڈونیشی سفارت خانہ کے دو ذمہ دار مجھ سے ملے اور ملاقات کا پروگرام طے کیا۔ چنانچہ ۹ فروری کی شام کو چار بجے راشٹرپتی بھون میں میری ملاقات انڈونیشیا کے صدر پروفیسر عبدالرحمٰن وحید سے ہوئی۔

میں نے کبھی انڈونیشیا کا سفر نہیں کیا۔ چند سال پہلے تک میں پروفیسر عبدالرحمٰن وحید کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ عالمی طور پر بھی وہ زیادہ معروف نہ تھے۔ جب وہ صدر بنے تو عرصہ تک میڈیا میں ان کا نام عبدالرحمٰن واحد آتا رہا۔ ان کا صدر مملکت بننا اس لئے بھی ناقابل قیاس تھا کہ وہ ایک مدت سے اپنی دونوں آنکھوں سے تقریباً معذور ہیں۔ مگر یہ ایک انوکھی بات ہے کہ اس قسم کا ایک آدمی انڈونیشیا کا صدر بنایا گیا۔

ملاقات کے بعد معلوم ہوا کہ صدر عبد الرحمٰن وحید نے عربی کی تعلیم جامعۃ الازہر قاہرہ میں حاصل کی ہے۔ وہاں انھوں نے میری دوسری کتابوں کے ساتھ الاسلام یتحدّیٰ بھی پڑھی جس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ انگریزی زبان سے بھی بخوبی واقف ہیں۔

میری تحریروں کے مطالعہ کے ذریعہ وہ میرے خیالات سے واقف ہوئے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے حاضرین میں سے ایک شخص سے میرے بارے میں کہا کہ بابری مسجد کے اِشو پر راقم الحروف نے جو موقف اختیار کیا وہ بہت جرأت مندانہ موقف تھا جس کی کوئی دوسری مثال موجودہ علماء میں مشکل سے ملے گی۔ ان کی اس بات سے اندازہ ہوا کہ وہ ہندستان کے انگریزی اخبارات میں چھپنے والے میرے مضامین سے بھی باخبر رہے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف الاسلام یتحدی جیسی کتاب پڑھی ہے بلکہ وہ میری عام تحریروں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی علمی واقفیت کی بنا پر انھیں مجھ سے دلچسپی ہوئی۔ انڈیا میں سرکاری سفر کے دوران اپنی غیر معمولی مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے میرے لئے ملاقات کا وقت پیشگی طور پر طے کرایا جب کہ میں نے اس کی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔

۱۹۷۸ کے ایک خواب کا ناقابل قیاس طور پر ۲۲ سال بعد پورا ہونا انتہائی عجیب ہے۔ یہ خواب بلاشبہہ خدا کی طرف سے تھا۔ کیونکہ خدائے عالم الغیب ہی کو ۱۹۷۸ میں اس واقعہ کی خبر ہوسکتی تھی جو مکمل طور پر مستقبل کی تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔

حدیث کے مطابق، خواب کی تین قسمیں ہیں ـــــ تخویف الشیطان، (شیطان کا ڈراوا) حدیث النفس (دل کی بات) بشری من اللّٰہ (اللہ کی طرف سے بشارت)۔ مذکورہ خواب میں کوئی ڈراوے کی بات نہیں۔ اس لئے وہ تخویف الشیطان نہیں ہوسکتا۔ اس کو حدیث النفس بھی نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ ایک چیز جو سرے سے معلوم ہی نہ ہو وہ کسی کے دل کی بات کیسے ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خواب بلاشبہہ خدا کی ایک بشارت تھی۔ اس بات کی بشارت کہ یہ مشن عوام وخواص سب کے درمیان پھیلے گا حتی کہ وہ ملکی سرحد سے نکل کر بیرونی ملکوں تک پہنچ جائے گا۔

کردار کا کرشمہ

جناب اقبال احمد صاحب (پیدائش ۱۹۳۱) مرادآباد کے رہنے والے ہیں۔ وہ کلکٹریٹ کی سروس میں تھے۔ ۱۹۹۰ میں سینئر ایڈمنسٹریٹیو آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اب وہ مراد آباد میں مقیم ہیں۔ (فون نمبر 0598-323029)

۱۴ فروری ۲۰۰۰ کو ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کئی سبق آموز واقعات بتائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ میں گورنمنٹ سروس میں تقریباً چالیس سال رہا۔ مگر مجھے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں ہوئی جس کو عام طور پر تعصب کہا جاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم اسلامی کردار کے مطابق رہیں تو ہم ہر جگہ اور خود ہندستان میں نہایت عزت کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

مثلاً انھوں نے بتایا کہ مراد آباد کے کلکٹریٹ میں ۱۲ سال تک میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا پیش کار رہا ہوں۔ وہاں مجھے مکمل آزادی حاصل تھی۔ اس مدت میں وہاں ۱۳ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بدلے مگر میں بدستور اپنی سیٹ پر قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر ایک میرے بارے میں اچھی رپورٹ دیتا تھا، اس لئے مجھ کو ہر آنے والے افسر سے وہی عزت ملی جو مجھے جانے والے افسر سے ملی تھی۔

انھوں نے بتایا کہ میرے خلاف لوگوں کی طرف سے اکثر بے بنیاد شکایتیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس آتی تھیں۔ لیکن انھوں نے کبھی ان پر دھیان نہیں دیا۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی اور وہ جناب اقبال احمد صاحب کی کامل دیانت داری (honesty) تھی۔ سروس کی پوری مدت میں ان کا کردار اتنا اعلیٰ رہا کہ کسی کو ان کے خلاف کسی حقیقی شکایت کا موقع نہیں ملا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ کلکٹریٹ کے کچھ ملازمین نے ان کے خلاف ایک تحریک چلائی۔ ان کو شکایت تھی کہ اقبال احمد صاحب کو یہاں اتنی عزت کیوں حاصل ہے کہ عام قاعدہ کے خلاف ان کا

کبھی تبادلہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہی کرسی پر لمبی مدت سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ اس وقت کے A.D.M.(E) کے پاس آئے۔ انہوں نے ان سے کہا کہ حسب قاعدہ تین سال کے اندر ہر ایک کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے مگر اقبال صاحب اپنی کرسی پر بدستور قائم ہیں۔ کیوں ان کا تبادلہ نہیں کیا جاتا۔ اے ڈی ایم مسٹر مہیشوری نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ کا کہنا درست ہے ہم اقبال صاحب کا تبادلہ کر دیتے ہیں مگر آپ جانتے ہیں کہ ہم کو اقبال کی جگہ دوسرا اقبال چاہئے۔ وہ یہاں بیک وقت کئی آدمیوں کا کام کرتے ہیں۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے حد درجہ پابند ہیں۔ وہ روزانہ تین ٹیلیفون کو سنبھالتے ہیں۔ ہم صرف اشارہ کر دیتے ہیں اور وہ انگریزی یا ہندی میں بہترین draft بنا کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اور ہمارا کام صرف دستخط کرنا ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آپ ایک ایسا آدمی لائیے جو ان کی جگہ لے سکے۔ اس کے لئے ہم آپ کو دو دن کا وقت دیتے ہیں۔ مگر یہ شکایت کرنے والے ملازمین خود بھی اقبال صاحب کی اعلیٰ خصوصیات سے واقف تھے، چنانچہ وہ ان کی قائم مقامی کے لئے کسی اور آدمی کا نام پیش کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اور اقبال احمد صاحب اپنی سروس پر اسی عزت کے ساتھ آخر وقت تک باقی رہے۔

زندگی میں کامیابی کا راز اعلیٰ کردار ہے۔ اعلیٰ کردار کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ کوئی بھی تعصب یا سازش ایسے آدمی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی جو اعلیٰ کردار کی صفت اپنے اندر رکھتا ہو۔

اصل یہ ہے کہ ہر دفتر یا ہر ادارہ کو کارکنوں کی ضرورت ہے۔ اگر دس امیدوار ہوں اور سب کے سب برابر کی صلاحیت رکھتے ہوں تو ایسی حالت میں یہ ممکن ہے کہ انتخاب کرنے والے لوگ کسی ایک کے حق میں جانب داری کا معاملہ کریں اور نو برابر کو چھوڑ کر ایک برابر کو لے لیں۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ ان میں سے نو افراد برابر کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ایک امتیازی صلاحیت کا مالک ہو تو یقینی طور پر اسی ایک کے حق میں فیصلہ ہوگا جو امتیازی درجہ میں اپنی اہلیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ کیوں کہ یہ ہر آدمی کی اپنی ضرورت ہے کہ اس کے پاس اعلیٰ درجہ کے کارکن موجود ہوں۔

امتیاز ہر تعصب اور جانب داری کی کاٹ ہے۔ صاحب امتیاز انسان کے لئے ہر سیٹ اس کی

ہی سیٹ ہے۔وہ جب چاہے جس سیٹ پر بیٹھ جائے۔اسی حقیقت کو ایک انگریزی مقولہ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ "ٹاپ کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے": .There is always room at the top

اعلیٰ کردار کا کرشمہ صرف کچھ لوگوں کے لئے مخصوص نہیں۔ ہر آدمی یہ کرشمہ پیدا کر سکتا ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ وہ اس کی ضروری قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔

صاحب کرشمہ آدمی پیٹ سے پیدا نہیں ہوتا۔وہ اپنی ذاتی محنت سے بنتا ہے۔ محنت اور عمل اور منصوبہ بند تیاری اس کی لازمی قیمت ہے۔جو آدمی یہ قیمت ادا کرے وہ یقینی طور پر اعلیٰ کردار کا حامل انسان بن جائے گا جس کو کرشمہ ساز انسان کہا جاتا ہے۔اور ٹاپ کی جگہ ہر دن ایسے اعلیٰ افراد کا انتظار کر رہی ہے۔کریب (Crabbe) نے درست طور پر کہا ہے کہ: امتیاز ہر اس آدمی کے لئے قابل حصول ہے جو اس کے لئے کوشش کا ارادہ رکھتے ہوں:

Excellence is attainable by all who have the will to strive for it.

چند سال پہلے کی بات ہے۔ایک صاحب کا ٹیلیفون میرے پاس آیا۔انہوں نے خوشی کے لہجے میں کہا کہ آج مجھے غلامی کی زندگی سے نجات مل گئی۔مزید پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اب میں گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ آزاد زندگی گذاروں۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر سب سے طاقتور جذبہ انا (Ego) کا جذبہ ہے۔ عام زندگی میں آدمی جو کچھ کرتا ہے آزادانہ طور پر کرتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ میں کسی کا پابند نہیں۔مگر سرکاری ملازمت میں آدمی کو اپنے افسر کا اور دوسرے ملازمین کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔اس لئے ملازمت کی زندگی اس کو پابندی کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ آزاد پیشے میں اس کی انا مجروح نہیں ہوتی۔ مگر سرکاری ملازمت میں بار بار اس کو اپنی انا مجروح ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

آدمی آزاد پیشے میں بھی کام کرتا ہے اور ملازمت میں بھی۔اگر اس کا شعور اس طرح زندہ ہو کہ وہ چیزوں کو انا کا مسئلہ نہ بنائے تو ملازمت کی زندگی بھی اس کو اسی طرح باعزت زندگی نظر آئے گی جس طرح آزاد پیشہ اس کو باعزت زندگی معلوم ہوتا ہے۔

جنت کا استحقاق

جنت بے حد عظیم نعمت ہے۔ وہ بے حد مہنگی قیمت پر کسی کو ملے گی۔ بہت تھوڑے خوش نصیب لوگ ہوں گے جو جنت کی لطیف دنیا میں بسائے جانے کے قابل ٹھہریں۔

جنت میں داخلہ کا پہلا امتحان یہ ہے کہ آدمی معرفت کے درجہ میں اپنے رب کو پائے۔ افکار و خیالات کے جنگل میں وہ سچائی کو دریافت کرے۔ وہ نہ دکھائی دینے والے واقعہ کو دیکھے۔ وہ نہ محسوس ہونے والی چیز کو محسوس کرے۔ وہ ظاہری ہنگاموں سے گزر کر باطن کی دنیا کا مسافر بن جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ آدمی سرکشی کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکادے۔ خود پرست بننے کے تمام محرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سچا خداپرست بن جائے۔ کشش اور جاذبیت کے بے شمار مراکز سے منھ موڑ کر وہ ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔

اسی طرح جنت میں داخلہ صرف اس شخص کے لئے ممکن ہو گا جو منفی حالات کے درمیان ہمیشہ مثبت ذہن پر قائم رہے۔ جو اپنے سینے میں اٹھنے والے حسد اور گھمنڈ اور انتقام جیسے جذبات کو دفن کر کے یک طرفہ طور پر لوگوں کے لئے شفقت اور خیر خواہی کا پیکر بن جائے۔ جو ظلم اور بے انصافی کے مواقع کو پانے کے باوجود انہیں استعمال نہ کرے اور ہر حال میں اپنے آپ کو عدل و انصاف کا پابند بنالے۔

جنت ایک نفیس ترین خدائی کالونی ہے۔ اس نفیس کالونی میں صرف وہی روحیں داخل ہوں گی جو آخرت میں اس طرح پہنچیں کہ دنیا میں انہوں نے اپنے اوپر تطہیر کا عمل کر لیا تھا۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کثیف شخصیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔ اب ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی ذات پر خود تطہیری کا ایک مسلسل عمل شروع کرے۔ یہاں تک

کہ اس کی کثیف شخصیت پاک وصاف ہو کر لطیف شخصیت میں بدل جائے۔

جنتی انسان وہ انسان ہے جو کانٹوں کے درمیان پھول بن کر رہے۔ جو اندھیروں درمیان روشنی کا مینار بن سکے۔ جو زلزلوں اور طوفانوں کے درمیان سکون کا راز پالے۔ جو نفر کے درمیان محبت کا ثبوت دے۔ جو لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود یک طرفہ طور پر انہیں مع کردے۔ جو کھونے میں بھی پانے کا تجربہ کرے۔

جنتی انسان وہ ہے جو بظاہر خدا سے دور ہوتے ہوئے بھی خدا سے قریب ہو گیا ہو سورج کی شعاعوں میں خدا کے نور کو دیکھے۔ جو ہواؤں کے جھونکے میں لمسِ ربانی کا تجربہ کر۔ جو پہاڑوں کی بلندی میں خدا کی عظمت کا تعارف حاصل کر سکے۔ جو دریاؤں کی روانی میں خا رحمت کا مشاہدہ کرے۔ جو مخلوقات کے آئینہ میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگے۔

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ یہ بتادیا ہے کہ جنتی انسان کی صفات کیا ہوتی ہیں لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے اندر جنتی صفات پیدا کریں، وہ موت کے بعد جنت میں داخلہ مستحق قرار پائیں گے۔

جنت میں داخلہ نہ کسی سفارش کی بنیاد پر ہوگا، نہ کسی کے ساتھ نسبت کی بنیاد پر اور نہ پراسرار عملیات کی بنیاد پر۔ جنت میں داخلہ پوری طرح معلوم حقیقت پر مبنی ہے۔ اور وہ یہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنے قول و عمل کے اعتبار سے جنتی انسان بن کر رہے گا، وہ آخرت کی میں داخلہ پائے گا۔

قرآن کے مطابق، جنت اہل تزکیہ کے لئے ہے۔ تزکیہ یہ ہے کہ آدمی غفلت کی زند ترک کرے اور شعور کی زندگی کو اپنائے۔ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو حق سے ر والی ہیں۔ مصلحت کی رکاوٹ سامنے آئے تو اس کو نظر انداز کردے۔ نفس کی خواہش ابھرے اس کو کچل دے۔ ظلم اور گھمنڈ کی نفسیات جاگے تو وہ اس کو اپنے اندر دفن کردے۔

بڑا کام

امام طبرانی (۳۶۰-۲۶۰ھ) مشہور محدث ہیں۔ وہ شام میں پیدا ہوئے اور اصفہان میں وفات پائی۔ انھوں نے المعجم الکبیر میں ایک مفصل روایت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:

ثم جاء ته یعنی النبی ﷺ امرأة، فقالت انی رسول النساء الیك، وما منهن امراة علمت او لم تعلم الا وھی تھوی مخرجی الیك، الله رب الرجال والنساء والاھُهن، وانت رسول الله الی الرجال والنساء کتب اللہ الجهاد علی الرجال فان اصابوا اجروا، وان استشهدوا کانوا احیاء عند ربّھم یرزقون، فما یعدل ذالك من اعمالهم من الطاعة؟ قال طاعة ازواجهن و المعرفة بحقوقهم، وقلیل منکن من یفعله.

پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی۔ اس نے کہا کہ میں عورتوں کی طرف سے بھیجی ہوئی آپ کے پاس آئی ہوں۔ اور ہر عورت خواہ وہ جانتی ہو یا نہ جانتی ہو، وہ چاہتی ہے کہ میں آپ سے مل کر معلوم کروں۔ اللہ مردوں کا رب بھی ہے اور عورتوں کا رب بھی۔ اور آپ مردوں کے پیغمبر بھی ہیں اور عورتوں کے پیغمبر بھی۔ اللہ نے مردوں کے لئے جہاد لکھا ہے۔ اگر وہ جہاد کریں تو اجر پائیں اور اگر شہید ہو جائیں تو وہ اپنے رب کے پاس زندہ رہیں اور رزق پائیں۔ پھر عورتوں کے لئے اس عمل کے برابر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں اور ان کے حقوق کو پہچانیں۔ لیکن تم میں بہت کم عورتیں ہیں جو ایسا کرتی ہیں۔

جنگ کے میدان میں لڑنا وہ کام ہے جو آدمی کو فوراً نمایاں کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس گھر کی چہار دیواری کے اندر روزمرہ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنا ایک ایسا کام ہے جو کسی کے لئے شہرت کا باعث نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ پہلے کام کی طرف فوراً راغب ہو جاتے ہیں، مگر دوسرے

کام میں وہ اپنے آپ کو وقف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

کمزوری کی یہ قسم عورتوں میں بھی پائی جاتی ہے اور مردوں میں بھی۔ لوگ پُرعظمت کاموں کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہ اونچے اونچے منصوبوں پر تقریریں کرتے ہیں۔ مگر وہ کام جو بظاہر چھوٹے نظر آئیں، جن میں شہرت و عظمت کی چاشنی نہ ہو، ان کے بارہ میں وہ بے رغبت بنے رہتے ہیں۔ حالاں کہ اصل کام یہ ہے کہ آدمی اپنی قریبی ذمہ داری کو ادا کرے، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی معمولی کیوں نہ دکھائی دیتی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے دو بڑے محاذ ہیں۔ ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ دونوں یکساں طور پر اہم ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ کم ہے اور نہ زیادہ، نہ کوئی افضل ہے اور نہ کوئی غیر افضل۔ زندگی کی صحت مند تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ دونوں محاذوں پر حسن خوبی کے ساتھ عمل کیا جائے۔

خالق نے اسی تخلیقی نقشہ کے مطابق مرد کو خارجی کام کے لئے پیدا کیا ہے اور عورت کو داخلی کام کے لئے۔ خالق نے مرد کو وہ صفات دی ہیں جن کے ذریعہ وہ خارجی کام کو بہتر طور پر انجام دے۔ اسی طرح خالق نے عورت کو وہ مخصوص صفات دی ہیں جو داخلی کام کو بہتر طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہیں۔ جس طرح عمل میں تقسیم کا اصول ہے اسی طرح دونوں جنسوں کی فطری صلاحیت میں بھی تقسیم کے اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

عمل میں تقسیم کا یہ اصول خود خالقِ فطرت نے قائم کیا ہے۔ وہ کسی سماج کا عائد کیا ہوا نہیں۔ ایسی حالت میں تقسیم کے اس نقشہ کو توڑنا سادہ طور پر صرف کسی سماجی روایت کو توڑنا نہیں ہے۔ وہ خود فطرت کے نقشہ کو توڑنا ہے۔ اور فطرت کے نقشہ کو توڑنے کی طاقت کسی میں بھی نہیں۔

ایسی حالت میں ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فطرت کے نقشہ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے مطابق سماج کا نظام بنائیں، یعنی وہی اصول جس کو ہم نے اپنے دوسرے معاملات میں ہمیشہ سے اختیار کر رکھا ہے۔

بمبئی کا سفر

میرے بھتیجے شکیل احمد خان انجینئر دوبئی میں رہتے ہیں۔ان کے صاحبزادے جاوید میاں کی شادی ۱۷ جون ۱۹۹۵ کو بمبئی میں ہوئی۔ میں شادیوں کی تقریب میں بالکل شریک نہیں ہوتا۔ لوگ بلاتے ہیں تو خاموشی سے ان کے حق میں دعا کر دیتا ہوں اور بس۔ مگر شدید اصرار کی بنا پر مجھے اس تقریب میں شریک ہونا پڑا۔اس سفر کے دوارن جو مختلف تجربات ہوئے،ان کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۶ جون ۱۹۹۵ کو دہلی سے بمبئی کے لئے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۴۰۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔جہاز کا مقرر وقت ساڑھے پانچ بجے تھا۔ مگر جہاز پون گھنٹہ کی تاخیر سے روانہ ہوا۔

راستہ میں اس چیز کا تجربہ پیش آیا جس کو عام طور پر ایئر پاکٹ کہا جاتا ہے۔جہاز جھٹکے کے ساتھ نیچے اوپر ہونے لگا۔ایک بار ایسا محسوس ہوا جیسے کہ پورا جہاز اچانک دھم سے نیچے آگیا ہو۔ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ میں بیٹھا ہوا خاموشی کے ساتھ دعائیں پڑھتا رہا۔ چار منٹ کے بعد اعلان ہوا کہ مسافر اپنی سیفٹی بیلٹ کھول لیں۔ اس کے بعد جہاز حسب معمول پر سکون طور پر پرواز کرنے لگا۔انڈین ایر لائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (جون ۱۹۹۵) دیکھا۔اس کے صفحہ اول پر لکھنؤ کے بڑے امام باڑہ کی مسجد کی رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی۔اندر لکھنؤ کے تاریخی آثار کے بارہ میں ایک تفصیلی اور باتصویر مضمون تھا۔اس میں سب کے سب مسلم دور کے آثار تھے۔ مضمون کے آخر میں درج تھا کہ لکھنؤ ملک کے تمام بڑے شہروں سے ہوائی جہاز اور ٹرین اور روڈویز کے ذریعہ جڑا ہوا ہے۔انڈین ایر لائنز روزانہ لکھنؤ کے لئے پرواز کرتی ہے:

> Lucknow is connected by air and rail with all major Indian cities. Indian Airlines have daily flights. (p. 16)

مضمون کے آخر میں یہ جملہ سیاحوں کے اعتبار سے تھا۔ مسلم دور سلطنت کی تاریخی

یادگاروں کی حیثیت پہلے مسلم یادگار کی تھی۔ اب ان کی حیثیت سیاحوں کے مراکز کشش کی ہو گئی ہے۔

میگزین کے ہندی حصہ میں لکھنؤ کی روایتی کبوتر بازی پر بھی ایک مضمون تھا۔ اس کا عنوان تھا "شوقیہ کبوتر بازی"۔

میگزین میں ایک اور لمبا با تصویر مضمون مانڈو کے بارے میں تھا۔ یہ ۱۴۔۱۵ویں صدی میں مسلم مالوہ سلطنت کا مرکز تھا۔ یہاں مسلم عہد کی یادگاریں تقریباً پندرہ کیلو میٹر کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مانڈو میں ایک بہت بڑی مسجد ہے جو ۱۴۵۴ء میں بنائی گئی تھی۔ مضمون نگار نے اپنے مانڈو کے سفر کی روداد کے تحت لکھا تھا:

> On your right you see the Jama Masjid (1454) which is one of the biggest such medieval structures with its huge colonnades, of elegant arches and pillars and domes of different dimensions. (p. 87)

انگریزی روزنامہ ٹُڈے (۱۶ جون ۱۹۹۵) کے صفحہ اول پر ایک خبر آئیڈنٹٹی کارڈ کے بارہ میں تھی۔ اخبار مذکورہ نے ایک سینیر افسر کے حوالے سے لکھا تھا کہ دہلی کے ۲۷ لاکھ آئیڈنٹٹی کارڈوں میں گیارہ لاکھ سے اوپر ناقص تھے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے دہلی کے چیف الکٹورل افسر مسٹر ٹی جوزف نے کہا کہ ناقص کارڈوں کی تعداد ایک لاکھ سے کم تھی۔

یہ تردید مجھے غلط معلوم ہوتی ہے۔ میں خود دہلی کا رہنے والا ہوں۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے متعلقہ دفتر جا کر فارم پُر کیا اور تصویر کھنچوائی۔ مگر مہینوں گزر جانے کے باوجود اب تک ہمیں آئیڈنٹٹی کارڈ نہیں ملا۔

آئیڈنٹٹی کارڈ کا اشو کھڑا کر کے مسٹر ٹی، این سیشن (چیف الکٹورل کمشنر) ملک میں ہیرو بن گئے۔ مگر ایک سو کروڑ روپیہ خرچ کرنے کے بعد جو کارڈ تیار ہوئے ان میں زیادہ تر ناقص تھے۔ اور بہت سے تو ووٹروں کو سرے سے ملے ہی نہیں۔ جن میں سے ایک میری فیملی بھی شامل ہے۔

جہاز میں ایک معمر خاتون نے سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ کا ذکر کیا اور کہا کہ اسلام

میں عورتوں کے لئے جو قوانین ہیں وہ قابل اصلاح ہیں۔ پھر ملّا لوگ اصلاح کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ عورتیں بس کچن میں پڑی رہیں۔

میں نے کہا کہ اسلام میں عزت اور حقوق کے اعتبار سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ پلیس (مقام عمل) دونوں کا الگ الگ ہے۔ اور یہ بالکل فطری ہے۔ چنانچہ جو عورتیں آزادی کے نظریہ کے تحت گھر سے باہر آتی ہیں وہ بھی باہر آکر عملی اعتبار سے اپنے ہی دائرہ کار میں رہتی ہیں۔ آپ دیکھئے، جہاز کے اندر جو عورتیں (ایرہاسٹس) ہیں وہ یہاں آکر بھی تو کچن ہی کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ یہی حال ساری دنیا میں عورتوں کا ہے۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک کا نعرہ ہے کہ عورتو، کافی نہ بناؤ، پالیسی بناؤ۔ مگر اصلاً اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ پہلے وہ گھر کی کافی بناتی تھیں، اب جہاز کی کافی بنارہی ہیں۔ پالیسی بنانا اب بھی ساری دنیا میں مردوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔

امریکہ میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے انٹرنیشنل ایرلائن پیسنجرس اسوسی ایشن (IAPA)۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے یہ بیان دیا کہ ہندستانی پائلٹ ضروری تربیت اور ڈسپلن سے محروم ہیں جو نئے قسم کے ہوائی جہازوں کو چلانے کے لئے ضروری ہے:

Indian pilots lack necessary training and discipline to cope with the new generation aircraft's technology.

اس پر ہندستانی حلقوں میں بہت شور وغل ہوا۔ ایک صاحب نے تبصرہ کیا کہ مذکورہ ادارہ نے یہ بات محض اپنا انشورنس بزنس بڑھانے کے لئے کہی ہے۔ ایک پائلٹ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ جدید طرز کے تمام جہاز تمام تر کمپیوٹر پر ہوتے ہیں۔ ان کو چلانا تو بہت آسان ہے۔ پائلٹ کو آنکھ بند کر کے صرف کمپیوٹر کی پیروی کرنا ہوتا ہے۔ اور اگر جہاز میں کوئی پرابلم پیدا ہو جائے تو کمپیوٹر فوراً اس پرابلم کو بتاتا ہے اور وہی اس کا حل بھی تجویز کرتا ہے۔ تاہم مذکورہ ادارہ نے اپنے بیان کو واپس نہیں لیا۔

بمبئی ایرپورٹ پر میرے بھتیجے اظفر خاں کے علاوہ جناب ایم اے صدیقی، جناب اقبال احمد، جناب فاروق فیصل صاحبان موجود تھے۔ مسافروں کی اکثریت اپنے سامان کے لئے کنویر

پلیٹ کے سامنے بھیڑ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ میرے ساتھ صرف ایک دستی بیگ تھا۔ میں رکے بغیر چلتا ہوا باہر آ گیا۔ ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہو کر ہوٹل میٹرو پیلیس پہنچا۔ یہاں کمرہ نمبر ۳۰۳ میں قیام تھا۔

ہوٹل کا کمرہ مسلسل ایک اجتماع گاہ بنا رہا۔ رات اور دن ہر وقت لوگ آتے رہے اور ان سے دینی اور ملی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ہوٹل کے کچھ کارکن یہ سمجھے کہ یہاں کوئی "بزرگ" آکر ٹھہرے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ بار بار آکر یہ کہتے رہے کہ میرے لئے دعا کیجئے۔

شادی کی وجہ سے میرے اکثر رشتہ دار اور عزیز بمبئی میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ تاہم ان سے میری گفتگو خاندانی انداز کی کم اور مشن کے انداز کی زیادہ ہوئی۔ میرے بھائی عبد الحمیط خاں (ریٹائرڈ جوائنٹ ڈائرکٹر) فیض آباد سے آئے تھے۔ وہ تقریباً شروع سے الرسالہ کی ایجنسی چلاتے ہیں۔ ایک صاحب سے ان کا تعارف کراتے ہوئے میں نے کہا: یہ میرے بھائی بھی ہیں اور الرسالہ برادری کے ایک مستقل ممبر بھی۔

حسین احمد خاں صاحب پہلے مغربی طرز پر رہتے تھے اور ہمارے خاندان میں "الٹرا ماڈرن" مشہور تھے۔ ان کی والدہ صدیقہ خانم جو بہت مذہبی تھیں، ہمیشہ ان کے بارہ میں تشویش میں مبتلا رہتی تھیں۔ مگر یہاں ان کے چہرہ پر خوبصورت سفید داڑھی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اب وہ پوری طرح دین دار بن چکے ہیں۔ ایک موقع پر میں نے ان کی ترقی کی دعا کی تو انھوں نے کہا: آپ تو بس ہماری آخرت کے لئے دعا کیجئے۔

انسان ایک سوچنے والی مخلوق ہے۔ انسان کے بارہ میں کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ نہیں معلوم کہ کب اس کا ذہن بدلے اور اس کے اندر انقلاب آجائے۔

عبد الحمیط خاں انجینئر (۶۵ سال) نے اپنی تعلیم کے زمانہ کے کئی سبق آموز قصے بتائے۔ ۱۹۵۳ میں وہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں انجینیرنگ کالج کے طالب علم تھے۔ ایک روز شہر میں وہ اپنی بہن (طیبہ مرحومہ) سے ملنے کے لئے گئے۔ واپس ہوئے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

یونیورسٹی گیٹ پر چوکیدار نے انھیں روکا۔ کیوں کہ قاعدہ یہ تھا کہ طالب علم تحریری اجازت کے بغیر ۹ بجے رات سے زیادہ باہر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ بلا اجازت تاخیر کرے گا تو اس پر پچاس روپیہ جرمانہ ہوگا جو ۱۹۵۳ میں ایک طالب علم کے لئے بڑی رقم تھی۔

چوکیدار نے رپورٹ کر دی۔ اگلے دن صبح کو وہ یونیورسٹی کے پراکٹر مسٹر وی پی پانڈے کے یہاں حاضر ہوئے۔ وہ گھبرائے ہوئے تھے کہ کہیں ان کے خلاف کوئی سخت ایکشن نہ لیا جائے۔ مگر مسٹر پانڈے نے ان کے بیان کو فوراً مان لیا اور کہا کہ میں تم کو جانتا ہوں تمہارا بیان ہی ہمارے اطمینان کے لئے کافی ہے۔

عبد الحیط خاں صاحب انجینئر نے زمانہ کے فرق کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۵۰ میں میں اعظم گڈھ شبلی انٹر کالج میں پڑھتا تھا۔ میرے ایک ساتھی کا نام چندر بلی تھا۔ وہ ہندو رواج کے مطابق جنیو پہنتا تھا۔ ایک روز میں نے کہا کہ یہ کیا بے کار کا دھاگا تم لٹکائے رہتے ہو۔ یہ کہہ کر میں نے جنیو کو جھٹکے کے ساتھ کھینچا یہاں تک کہ وہ ٹوٹ گیا۔ چندر بلی نے غصہ نہیں کیا بلکہ کہا: "بھیوا، دوسرا کوئی ایسا کرتا تو آج میں اس کا خون کر دیتا" یہ مسٹر چندر بلی اب کیمیکل انجینئر ہیں اور گوالیار میں رہتے ہیں۔

یہ ۱۹۵۰ کی بات ہے۔ مگر آج کوئی مسلمان کسی ہندو کا جنیو نہیں توڑ سکتا۔ کل اور آج میں کتنا زیادہ فرق آچکا ہے۔

حسین احمد خاں صاحب پہلے بمبئی میں ایک دواساز ادارہ میں بڑے افسر تھے۔ ایک بار وہ بمبئی میں ایک مسلمان سے ملے۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا جس پر ان کا نام اس طرح چھپا ہوا تھا (Husain A. Khan)۔ یہ مسلمان خود اپنا نام مخفف صورت میں اس طرح لکھتے تھے جس سے مذہب کا اندازہ نہ ہو، (جیسے آر این باگڑ)۔ چنانچہ انھوں نے حسین صاحب کا کارڈ دیکھ کر تعجب کے ساتھ کہا: ایسا کھلا کھلا لکھ دیتے ہیں آپ، اس سے آپ کو کوئی پرابلم نہیں آتا"۔ حسین احمد صاحب نے کہا کہ نہیں، بلکہ مجھے تو اب تک اس سے فائدہ ہی ہوا ہے۔

حسین صاحب نے بتایا کہ بمبئی کی تین فرموں میں انھوں نے اچھے عہدہ پر کام کیا ہے۔ ہر جگہ انھیں ہمیشہ احترام ہی ملا ہے۔ انھوں نے اس کی کچھ تفصیلات بتائیں۔

شادی کے سلسلہ میں ایک انجینئر صاحب لکھنؤ سے آئے تھے۔ ان سے ہوٹل میں ملاقات ہوئی تو وہ سخت مشتعل ہوگئے۔ انھوں نے کہا کہ جن لوگوں کی دعوت پر آپ لکھنؤ (اپریل ۱۹۹۵) گئے تھے، آپ جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ وہ اسلام دشمن لوگ ہیں۔ ان کے بلانے پر آپ لکھنؤ پہنچ گئے اور ان کے پراگرام میں شرکت کی............

وہ نہایت غصہ کی حالت میں دیر تک زور زور سے بولتے رہے۔ آخر میں میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں اور کافروں کے پاس جاتے تھے جو کہ خدا کے اور اس کے دین کے دشمن تھے۔ اگر آپ ان کے پاس نہ جاتے تو لوگوں تک حق کا پیغام کس طرح پہنچتا۔ آپ کو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ کن لوگوں کی دعوت پر گئے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ وہاں جاکر کیا بات کہی۔

میں نے کہا کہ ان لوگوں نے لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں ۱۶ اپریل ۱۹۹۵ کو میرا پروگرام رکھا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کا حل سیرت نبوی کے آئینہ میں۔ اس کو آپ اشتہارات میں اور لکھنؤ کے روزنامہ قومی آواز (۱۵ اپریل ۱۹۹۵) میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میری تقریر کا مکمل ٹیپ بھی موجود ہے۔ ندوہ کے بہت سے طلبہ اس جلسہ میں شریک تھے، ان سے بھی آپ پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا۔

مذکورہ قسم کی سوچ صرف تنگ نظری کی پیداوار ہے۔ اس کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ حتی کہ اس کا تعلق عقل سے بھی نہیں۔

شکیل احمد خاں اور حسین احمد خاں دونوں میرے قریبی عزیز ہیں۔ وہ دبئی سے آئے تھے۔ حسین احمد صاحب نے بتایا کہ ہمارے ساتھ سونے کے زیورات تھے جن کی مالیت لاکھوں روپیہ کی تھی۔ ہم نے طے کر لیا تھا کہ ایرپورٹ پر کوئی چیز نہیں چھپائیں گے بلکہ صاف صاف بتادیں گے۔ چنانچہ انھوں نے کسٹم والوں کو بتادیا کہ ہمارے پاس فلاں فلاں زیورات ہیں۔ انھوں نے

پوچھا کہ اتنے زیادہ زیورات آپ کس لئے لائے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے لڑکے کی شادی ہے۔ اس میں دینے کے لئے ہم یہ زیورات لائے ہیں۔ اس صاف گوئی کا اثر کسٹم کے عملہ پر اتنا زیادہ ہوا کہ اس نے ان حضرات کے سامان تک نہیں کھلوائے اور کہا کہ کوئی حرج نہیں، جائیے۔ آپ کی شادی کی خوشیوں میں ہم بھی آپ کے ساتھ شریک ہیں۔

بمبئی کے اردو ہفت روزہ بلٹز نے اپنے شمارہ ۲۰ مئی ۱۹۹۵ میں میرا ایک انٹرویو شائع کیا تھا۔ ایک صاحب نے اس کا ایک نسخہ لا کر دیا۔ یہ انٹرویو مسٹر پرویز حفیظ نے کلکتہ میں لیا تھا۔ انٹرویو کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مسائل کی واحد ذمہ داری نااہل مسلم لیڈر شپ پر ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بار بار ٹکراؤ کے راستہ پر چلا کر تباہ کیا۔ ان کو خود تو لیڈری ملتی رہی۔ اور مسلمان اپنی تباہی کی صورت میں اس کی مہنگی قیمت ادا کرتے رہے۔

ڈاکٹر انصار پیش امام (ملت نگر، بمبئی) نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ اب الرسالہ کی مخالفت کہاں ہے۔ جو لوگ پہلے تنقید کرتے تھے وہ خود اب الرسالہ کی پالیسی کے مطابق، اعراض کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں (روایت جناب فاروق فیصل صاحب)

اس قسم کی باتیں کئی لوگوں نے کہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چند سالوں کے اندر مسلم نقطۂ نظر میں اتنا زیادہ فرق آچکا ہے کہ اس کو ہر جگہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بر سر عام ایسی باتیں کہی جانے لگی ہیں جو کہ پہلے نجی مجلسوں میں بھی قابل برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ بمبئی میں "قیادت" کے مسئلہ پر ایک سیمنار ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے جسٹس قاضی صاحب نے کہا کہ بابری مسجد کو کسی اور نے نہیں گرایا۔ اس کو نام نہاد مسلم قائدین نے گرایا۔ وہ خم ٹھونک کر یہ کہتے رہے کہ مسجد کو گرا کر دیکھو۔ اس طرح انھوں نے فریق ثانی کو جوش دلایا اور انھوں نے جذبات میں بھڑک کر اس کو گرا دیا۔

ایک صاحب نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ: اس قسم کے انتہائی واقعات ہمیشہ اشتعال کی حالت میں ہوئے ہیں۔ اگر لوگوں کو اشتعال نہ دلایا جائے تو ایسے واقعات کبھی نہیں ہوں گے۔

جناب ایم اے صدیقی الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ وہ مسٹر محمد علی جناح کے ساتھ رہ چکے ہیں۔ اب وہ الرسالہ سے پوری طرح اتفاق کرتے ہیں۔ جناب فاروق فیصل صاحب نے ان کا ایک تاثر انھیں کے الفاظ میں اس طرح لکھ کر مجھے دیا: "مسٹر جناح کی شخصیت کے کئی پہلو قابل اعتراض ہیں۔ لیکن یہ مولانا وحید الدین صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انھوں نے سوائے دو قومی نظریہ کے کبھی ان کے کسی اور پہلو پر اعتراض نہیں کیا"۔

الرسالہ پڑھنے والوں کے اندر کس قسم کا ذہن بنتا ہے، اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے ہوتا ہے۔ الرسالہ کے ایک سفر نامہ میں ایک بار چھپا تھا کہ جہاز میں قواعد سفر کا اعلان کرتے ہوئے اناؤنسر نے کہا کہ اس کو غور سے سنئے، اگرچہ آپ ایک مستقل مسافر ہوں:

Listen it carefully even if you are a regular traveller.

جناب فاروق فیصل صاحب نے بتایا کہ ایک روزوہ قرآن پڑھ رہے تھے۔ اس دوران اچانک انھیں مذکورہ فقرہ یاد آیا۔ انھوں نے اپنے دل میں کہا کہ اس کتاب کو احتیاط کے ساتھ پڑھو، اگرچہ تم اس کے مستقل قاری ہو:

Read it carefully even if you are a regular reader.

جسٹس قاضی صاحب کی رہائش گاہ پر کچھ لوگ جمع تھے۔ وہاں میں نے جنت کی تشریح میں کچھ باتیں کہیں۔ ایک بات یہ تھی کہ جنت میں بورڈم کبھی نہیں ہوگا۔ وہاں کی لذتوں سے آدمی پورے طور پر محظوظ ہوتا رہے گا۔

قرآن میں ہے کہ جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لئے بھلائی ہے اور زیادہ بھی (یونس ۲۶) حدیث کے مطابق زیادہ سے مراد ان کو دیکھنا ہے (النظر الی وجه الرحمٰن) القرطبی ۸/۳۳۰۔

ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ لذت کمال نو کی دریافت میں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اہل جنت ہر

قسم کی نعمتوں میں ہوں گے۔ اس کے بعد انھیں اللہ کی ایک تجلی دکھائی جائے گی۔ وہ اتنی پر مسرت ہوگی کہ اہل جنت اس کو دیکھ کر دوسری نعمتوں کو بھول جائیں گے۔ اس طرح ابدی طور پر ہوتا رہے گا (مشکاۃ المصابیح ۳؍۱۵۷۴)

اس طرح اہل جنت کو خالقِ کائنات کے لامتناہی جلوے بار بار دکھائے جاتے رہیں گے۔ یہ نئے نئے تجربات انھیں کبھی بورڈم کا احساس نہیں ہونے دیں گے۔

جسٹس قاضی کی اہلیہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ قاضی صاحب نے بتایا کہ وہ اکثر مجھ کو نصیحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ: دولت مند کوئی شخص اچانک بھی بن سکتا ہے۔ مگر صاحب علم بننا برسہابرس کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔

جسٹس قاضی نے مارک ٹوین کا ایک قول اس طرح بتایا کہ خاموشی ایک ناقابل برداشت جواب ہے:

Silence is unbearable repartee.

ایک صاحب سے الرسالہ مشن کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسٹر جناح سے لے کر مسٹر شہاب تک ہمارے لیڈروں نے جو سیاست چلائی، اس کے نتیجہ میں مسلمان اس ملک میں ایک قسم کا پروٹسٹنٹ گروپ بن گئے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ مسلمانوں کو اس ملک میں حقیقی معنوں میں کری ایٹیو گروپ کی حیثیت دے دیں۔

۱۸ جون کی شام کو ہوٹل کے کمرہ میں کچھ لوگ جمع ہوگئے۔ ان کی خواہش تھی کہ فقہی اختلاف کے مسئلہ کی وضاحت کی جائے۔ میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ تک اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی۔ لوگ مطمئن ہوگئے۔ اس گفتگو کا ٹیپ جناب فاروق فیصل صاحب کے پاس موجود ہے۔

۱۴ مئی ۱۹۹۵ کو ممبئی میں راجستھان، مہاراشٹر، گجرات اور دہلی کے چیف منسٹروں نے ایک پریس کانفرنس کی تھی۔ اس میں کیشو بھائی پٹیل منوہر جوشی اور مدن لال کھورانہ کے علاوہ

گوپی ناتھ منڈے جسونت سنگھ وغیرہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے متفقہ طور پر مرکزی حکومت پر زور دیا کہ وہ پاکستان کو سبق سکھائے تاکہ پڑوسی ملک کو اپنے کرایہ کے سپاہیوں کے ذریعہ چرار شریف طرز کی گھناؤنی کارروائیوں سے باز رکھا جاسکے۔

چار ریاست کے ان چیف منسٹروں کو شاید یہ بات معلوم نہیں کہ کشمیر کا موجودہ سنگین مسئلہ "سبق سکھانے کی سیاست" ہی کے نتیجہ کی پیداوار ہے۔ یہ مسز اندرا گاندھی کا ذہن تھا۔ چنانچہ اسی سبق سکھانے کے لئے ۱۹۷۱ میں وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بنگلہ دیش کی جنگ میں باقاعدہ شریک ہو گئیں۔ اپنے خیال سے انھوں نے پاکستان کو دو ٹکڑے کر کے اس کو سبق سکھادیا تھا۔ مگر اس کے بعد پاکستان میں از سر نو انتقام کی نفسیات جاگ اٹھیں۔ اس نے دوبارہ ہم کو سبق سکھانے کے لئے کشمیر کا محاذ کھول دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۷۱ سے پہلے پاکستانی عوام کشمیر کو تقریباً بھول چکے تھے مگر ۱۹۷۱ کے بعد ان کے اندر دوبارہ ہندستان کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے اور بنگلہ دیش کا بدلہ لینے کے لئے انہوں نے پھر سے کشمیر کا محاذ کھول دیا۔

ٹائمز آف انڈیا کے سنڈے اڈیشن (۱۸ جون ۱۹۹۵) میں ایک مضمون مسٹر عبد الرحمٰن انتولے کے بارے میں تھا۔ اس میں ان کی پوری زندگی کو علم نجوم (ایسٹرولوجی) کی روشنی میں بیان کیا گیا تھا۔

عبد الرحمٰن انتولے ۹ فروری ۱۹۲۹ کو مہاراشٹر کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ ۸۰-۱۹۷۶ میں وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنے۔ ۱۹۷۷ میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۸۲-۱۹۸۰ میں وہ مہاراشٹر کے چیف منسٹر تھے۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں مختلف اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ جون ۱۹۹۵ میں وہ مرکز میں ہیلتھ منسٹر مقرر ہوئے۔ آخر میں درج تھا:

His planets once elevated Antulay to the highest postition in life and he ruled the state like a Moghul king holding durbars.

فاروق فیصل صاحب نے بمبئی کے انگریزی روزنامہ مڈ ڈے (Mid-day) کا شمارہ ۷ جون ۱۹۹۵ دیا۔ اس میں بمبئی کے مشہور جرنلسٹ مسٹر ایم وی کامتھ کا ہفتہ وار کالم تھا۔ اس بار انھوں نے

میرے بارے میں لکھا تھا۔ اس کا پہلا پیراگراف تھا:

I have great respect for that venerable gentleman, Maulana Wahiduddin Khan. He is, or has become a syndicated columnist and I follow his writings with great interest. The Maulana is president of the Islamic centre. I have had the honour of meeting him on a couple of occasions, but I am afraid I never could really manage to have a heart -to- heart talk with him.

بمبئی کے ایک جرنلسٹ مسٹر اقبال مسعود نے ٹائمز آف انڈیا میں شائع شدہ میرے ایک مضمون پر اپنا تبصرہ انگریزی اخبار پانیر (۲۹ مئی ۱۹۹۵) میں شائع کیا تھا۔ اس کے آخر میں انھوں نے لکھا تھا کہ بمبئی کے مسلمان میرے مشورہ کے مطابق، حقیقت پسندانہ سیاست کا طریقہ اختیار کرنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں:

I think Bombay Muslims are in a mood to give Maulana Wahiduddin Khan a hearing. That is a great advance. There is room for cautious optimism, for a radical change in Muslim perception of Hindus.

اس "تبدیلی" کے مختلف مظاہر بمبئی کے اس سفر میں دیکھے۔ ان میں سے ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ بمبئی کے ایک صاحب نے یہ طے کیا ہے کہ وہ ہر مہینہ ایک بڑی رقم صرف اس لئے دیں گے کہ اس کے ذریعہ سے ماہنامہ الرسالہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ خدا کے فضل سے اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔

بمبئی سے ایک اردو ماہنامہ البلاغ کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۵ میں ایک مضمون میرے بارے میں چھپا تھا۔ مضمون نگار میرے اوپر "تبصرہ" کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جو حضرات اخبارات و رسائل میں مولانا کے انداز فکر اور طرز نگارش سے واقف ہیں ان کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ موصوف قرآن و حدیث کے احکام کو کس طرح قومی و ملی مسائل پر چسپاں کر کے (مسلمانوں کو) مجہولیت و مفعولیت کا پیغام دیتے رہے ہیں" (صفحہ ۲۶)

یہ میرے اوپر سراسر اتہام ہے کہ میں مجہولیت اور مفعولیت کا سبق دیتا ہوں۔ میں نے اس قسم کی بات کبھی بھی الرسالہ میں نہیں لکھی۔ الرسالہ کے تمام قارئین جانتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو جس چیز کا سبق دیتا ہوں وہ صبر و اعراض ہے اور صبر و اعراض بلاشبہہ قرآن و سنت کی ایک اہم تعلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام علماء صالحین ہمیشہ ملت کو صبر و اعراض کی تلقین کرتے رہے ہیں۔

الرسالہ میں صبر کو ایک اصول اسلام کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ بہت سے لوگ صبر کو ایک اصول کے طور پر اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے مگر جب حالات کا دباؤ پیش آتا ہے تو یہی لوگ اس وقت صبر کی بولی بولنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک مثال خود ماہنامہ البلاغ بھی ہے۔

ماہنامہ البلاغ (بمبئی) کے شمارہ جون ۱۹۹۵ میں ایک مضمون نظر سے گذرا۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

"(قرآن میں) ارشاد فرمایا واصبروا۔ یعنی صبر کو لازم پکڑو۔ سیاق کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نزاع اور جھگڑوں سے بچنے کا کامیاب نسخہ بتایا گیا ہے۔ دوسروں کے ساتھ چلنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے اور نظر انداز کرنے کا عادی ہو۔ اسی صفت کا دوسرا نام صبر ہے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ نزاع بہت بری چیز ہے۔ مگر اس سے بچنے کا گر یہی ہے کہ آدمی خلاف طبع امور پر صبر کرنے کا خوگر بنے"۔

ایک آٹو رکشا سڑک سے گزرا۔ اس کے پیچھے ہندی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے میرا بھارت مہان، پر قرض سے پریشان۔

حال میں ورلڈ بینک نے کہا ہے کہ ہندستان کے بڑھتے ہوئے قرضوں کی وجہ سے اس کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ سود کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۷ اجون ۱۹۹۵) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ مرکزی وزیر مالیات مسٹر من موہن سنگھ نے اقرار کیا ہے کہ سودی

قرضوں کی ادائیگی کی بڑھی ہوئی شرح کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارا خزانہ اس کی ادائیگی میں خالی ہو جاتا ہے:

The union finance minister, Mr. Manmohan Singh, has confessed that mounting interest payments are a drain on the exchequer.

ایک کشمیری مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ ان کو میں نے انگریزی اخبار دی ایشین ایج کا شمارہ ۱۹ جون دکھایا۔ اس میں مرکزی وزیر داخلہ مسٹر ایس بی چوہان کا انٹرویو تھا۔ انھوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے کہا تھا کہ لوگوں کو جاننا چاہئے کہ جموں اور کشمیر کے لوگوں نے اس وقت انڈیا سے الحاق کیا جب کہ انھیں یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ انڈیا میں ان کو خصوصی درجہ (special status) حاصل رہے گا۔ ہم اس دعویٰ سے پھر نہیں سکتے جب تک کہ خود کشمیری عوام ہی کچھ اور چاہیں (صفحہ ۴)

میں نے کہا کہ کشمیر کو چاہئے کہ وہ ہتھیار پھینک دیں اور جنگجوئی کا طریقہ چھوڑ کر گفت و شنید کی میز پر آجائیں۔ انڈین یونین کے اندر خصوصی درجہ کے اصول پر وہ ہندستانی لیڈروں سے گفتگو کریں۔ کشمیریوں کے لئے یہی واحد صحیح راستہ ہے۔

اقبال مسعود صاحب بمبئی میں رہتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۹۲ کے فساد کے وقت وہ بمبئی ہی میں موجود تھے۔ اس فساد کی بابت انھوں نے روزنامہ پانیر (۱۳ جون ۱۹۹۵) میں لکھا تھا:

On December 6, 1992, evening, an advocate, a stranger to me, rang me up from a muslim area: "Iqbal saheb, you do not know me. But here are some wild young men who want to attack police stations tomorrow." I was taken aback but agreed to talk. I heard wild uncontrolled rage. "The police kept quiet at Babri Masjid when it was demolished. Now they should not object if we attack police stations."

چند دن پہلے ٹائمس آف انڈیا (۱۵ جون ۱۹۹۵) میں مسٹر ہربنس مکھیا کا ایک مضمون میرے بارہ میں چھپا ہے۔ یہاں بہت سے لوگ اس کو پڑھ چکے تھے۔ اس میں مضمون نگار نے اعتراف کیا

ہے کہ پچھلے چند برسوں میں ہندستانی مسلمانوں کے اندر غیر معمولی تبدیلی آچکی ہے۔ یہ تبدیلی یین اس رخ پر ہے جس کے لئے میں لمبی مدت سے مسلسل کوشش کرتا رہا ہوں۔ مضمون نگار نے لکھا ہے:

> The dead silence that has followed the Supreme court's recent directive to the government regarding a uniform civil code is almost deafening in comparison with the very noisy intervention of the muslim leadership following the far more innocuous Shah Bano judgement. The community's silence also in the aftermath of the burning down of Charar-e-Sharief is voluble. And now the news of Mr A.K. Antony's victory from a predominantly Muslim constituency! What has changed the scenario of the indian Muslims?

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ آج کا اصل مسئلہ ہندو۔مسلم کشیدگی ہے۔ اسی کشیدگی نے سارے مسائل پیدا کئے ہیں۔ ۷۰ سال پہلے اقبال نے کہا تھا:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ دانائے رمز روم و تبریز است

اقبال نے فخر کے ساتھ اپنے برہمن زادہ ہونے کا ذکر کیا مگر کسی نے اس کو برا نہیں مانا۔ آج یہ حال ہے کہ اگر میں ہندوؤں کے کسی جلسہ میں شریک ہو کر وہاں اسلام کا تعارف پیش کروں تو لوگ اس کو الٹے معنوں میں لے لیتے ہیں اور میرے خلاف عیب زنی کی مہم شروع کر دیتے ہیں۔

۱۹ جون کو صبح ۸ بجے مجھے ہوٹل چھوڑ کر ایرپورٹ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی۔ دعا کرتے ہوئے خیال آیا کہ الرسالہ مشن کی کہانی کو ایک شمارہ کی صورت میں شائع کیا جائے۔ اس کا نام "روداد چمن" ہو اور اس کے نیچے یہ درج ہو:

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم   گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مسٹر ایم اے صدیقی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت ذہین آدمی ہیں وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ واپسی میں ایرپورٹ پر میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے تجربات حیات بتائیے۔ کافی اصرار کے بعد

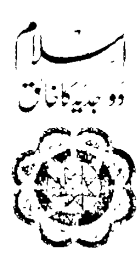
انھوں نے کاغذ پر یہ الفاظ لکھے: عمر کے اندر اس مرحلہ پر آ کر میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ زندگی کا آغاز کر رہا ہوں، یعنی مفید اور کار آمد زندگی کا۔

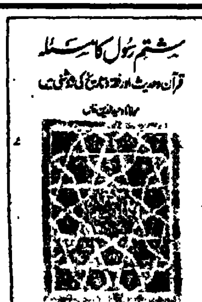
بمبئی سے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۱۸۵ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز ٹھیک مقرر وقت پر بمبئی سے روانہ ہوا۔ ۱۶ جون کی شام کو جب میں بمبئی پہنچا تھا تو اناؤنسر نے اعلان کیا تھا کہ باہر کا درجۂ حرارت ۲۸ ڈگری ہے۔ واپسی میں جب میں دہلی پہنچا تو اناؤنسر نے کہا کہ باہر کا درجہ حرارت ۳۸ ڈگری ہے۔ بمبئی اور دہلی میں دس درجہ کا فرق تھا۔

اسٹیٹسمین (۱۹ جون ۱۹۹۵) میں ایک مضمون میں بتایا گیا تھا کہ وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ کی کامیابی کا راز ان کا ٹھنڈا انداز (cool approach) ہے۔ یہ بات نہایت صحیح ہے۔ خواہ کوئی شخص ملک کا وزیر اعظم ہو یا ایک عام آدمی ہو، ہر ایک کے لئے کامیابی کا یہی واحد طریقہ ہے۔

ٹھنڈا مزاج آدمی کو بھر پور طور پر سوچنے کا موقع دیتا ہے۔ اسی طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کی پوری صلاحیت کو استعمال کر کے صحیح ترین تدبیر اختیار کرے۔ اور جو لوگ ایسا کریں انھیں کوئی بھی چیز کامیابی سے روک نہیں سکتی۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مسلمان ہوائی جہاز کی صنعت میں بھی داخل ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک بڑی ہوائی کمپنی بن چکی ہے جس کا ہیڈ کوارٹر بمبئی میں ہے۔ اسی طرح مسلم نوجوان ہوائی جہاز کی سروس میں داخل ہو رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مسٹر ابو انصاری ہیں۔ وہ پائلٹ ہیں اور بمبئی اور بھوپال کے درمیان پروازوں میں بطور ہواباز کام کر رہے ہیں۔








سوال

(۱) قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو" (بنی اسرائیل) اس آیت کو اگر اس کے سادہ معنوں میں لیا جائے تو اب تک جتنی آیات الٰہی کائنات میں ڈسکور (discover) ہوئی ہیں جو کہ پہلے لا معلوم تھیں وہ ڈسکور نہ ہوتیں۔ یا پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے۔ (۲) قرآن میں ہے: "تم میں کوئی ایسا نہیں جو جہنم پر وارد نہ ہو" (مریم ۷۱) کیا اس آیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں حتیٰ کہ پیغمبر اور صحابہ بھی۔ (عبد الشکور انجینئر، چمن ،بلوچستان)

جواب

ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہیں (بنی اسرائیل ۳۶) اس آیت کا تعلق کائنات سے نہیں ہے بلکہ انسان سے ہے۔ جہاں تک کائناتی حقیقتوں کا معاملہ ہے ان کا حکم دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے نہ کہ اس آیت سے۔ قرآن میں کثرت سے اس پر ابھارا گیا ہے کہ کائنات کی نشانیوں پر غور کرو۔ حتیٰ کہ کائنات میں غور و فکر کو ایمان کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے اور وہ اسلام میں بے حد مطلوب ہے۔ اس سے مومن کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک سورہ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت کا تعلق ہے، وہ ایک اخلاقی ہدایت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے معاملہ میں حسن ظن سے کام لو۔ بدگمانی کا شکار ہو کر غیر ضروری ٹوہ میں نہ لگو۔ یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں دوسری جگہ تجسس کہا گیا ہے اور اس کو سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے (الحجرات ۱۲)

سورہ مریم (آیت ۷۱) میں آخرت کے جس تجربہ کا ذکر ہے اس کی تشریح تذکیر القرآن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں ورود کا مطلب دخول نہیں بلکہ اس کا مطلب مرور ہے۔ یعنی تمام لوگ جہنم کے اوپر سے گزریں گے، نہ کہ وہ اس کے اندر داخل ہوں گے۔ چنانچہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس کو جسر (پُل) جیسا معاملہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک طوفانی دریا کے اوپر پل ہو اور آپ اس پل سے گزریں تو آپ دریا کی ہولناک موجوں کو دیکھیں گے لیکن آپ اس کے اوپر سے صحیح وسلامت گزر جائیں گے۔

سوال

آپ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ آج ہمارے لئے یہ موقع ہے کہ ہم آزادی کے ماحول میں اسلامی دعوت کا کام کر سکیں۔ مگر واقعات اس کے برعکس تصویر پیش کرتے ہیں۔ کوسووا، بوسنیا، سیریا، مصر، عراق، برما، کشمیر، فلسطین، امریکہ، میں کیا ہو رہا ہے۔ ہر جگہ مسلمان ظلم وزیادتی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں کی جارہی ہیں۔ پھر مذہبی آزادی کہاں ہے۔ یہ سوال ہم کو بذریعہ انٹرنیٹ مائیکل شمڈت (Michael Schimidt) کی طرف سے موصول ہوا ہے۔

جواب

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کو مذہبی زیادتی کا سامنا پیش آرہا ہے وہاں یہ مسئلہ کب سے پیدا ہوا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کی طرح ان ملکوں میں بھی مسلمانوں کو مکمل امن اور آزادی حاصل تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان کچھ ناعاقبت اندیش لیڈر اٹھے جنھوں نے جذباتی نعروں کے ذریعہ مسلمانوں کو بھڑکایا اور انھیں مقامی حکمرانوں سے ٹکرادیا۔ جب ایسا ہوا تو اس کے بعد وہ مسائل پیدا ہوئے جن کو آپ مذہبی زیادتی کے مسائل کہتے ہیں۔ مذکورہ ملکوں میں سے ہر ملک کا معاملہ یہی ہے۔ ان مقامات پر مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ ملک اور مال کے نام پر سیاسی جنگ نہ چھیڑتے۔ وہ ملی ہوئی آزادی کو استعمال کرتے ہوئے دعوتی اور تعمیری کام کرتے تو یقینی طور پر انھیں ان زیادتیوں کا شکار نہ ہونا پڑتا جن کا ذکر آپ اخباروں میں دیکھتے ہیں۔ مذکورہ سوال میں امریکہ کی مثال بھی دی گئی ہے۔ سائل کے نزدیک وہاں کے مسلمان میڈیا کے شدید مخالفانہ پروپیگنڈوں کا شکار ہو رہے ہیں:

Muslims are under a heavy media propaganda campaign.

یہ بات درست نہیں۔ جس چیز کو اسلام کے خلاف میڈیا کا پروپیگنڈہ کہا جاتا ہے۔اس کے ذمہ دار تمام تر خود مسلمان ہیں۔ میڈیا کیا ہے؟ وہ واقعات کے رپورٹ کی انڈسٹری ہے۔ مسلمان جگہ جگہ اسلام کے نام پر متشددانہ تحریکیں چلا رہے ہیں۔ میڈیا اسی کی رپورٹ کرتا ہے۔ چونکہ یہ مسلمان اپنی متشددانہ تحریکوں کو اسلام کے نام پر چلاتے ہیں اس لئے میڈیا بھی ان کو اسلام کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان جو تشدد اسلام کے نام پر کریں گے اس کی رپورٹ بھی اسلام ہی کے نام پر کی جائے گی۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ یا تو وہ اپنا یہ بے فائدہ تشدد ختم کر کے پرامن ذرائع سے کام کریں۔ یا وہ اپنی متشددانہ تحریکوں کو اسلام اور اسلامی جہاد کے نام پر نہ چلائیں۔اس کے بعد انھیں میڈیا سے یہ شکایت بھی نہ ہو گی کہ میڈیا اسلام کو بدنام کر رہا ہے۔

سوال

مذہب اور انسان کے بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ مذہب صرف ایک پہچان کی چیز ہے، یعنی یہ کہ ہم فلاں مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ کون کیا کر رہا ہے تو اس سے کوئی مطلب نہیں رکھنا چاہئے۔ البتہ ہم دوسروں کی جتنی مدد کر سکیں وہ ہم کو کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک انسان کا اصل مقصد خدمت انسانیت ہے۔ اور سب سے بڑا مذہب انسان کی خدمت کرنا ہے۔ مذہب اور انسان کے بارے میں میرے یہ نظریات ہیں۔ براہِ کرم آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ کیا میرے یہ نظریات درست ہیں۔ (محمد قاسم خاں، نئی دہلی)

جواب

سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے کہ موجودہ دنیا میں کسی مذہب کو درست مذہب قرار دینے کے لئے صحیح معیار (criterion) کیا ہے۔ وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ خالق کائنات کا تخلیقی نقشہ ہے۔ یہ تخلیقی نقشہ ہمیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ اس تخلیقی نقشہ کے مطابق، اس دنیا کے لئے ایک ہی مذہب درست مذہب ہے، اور وہ مذہب مذہبِ توحید ہے۔ یعنی ایک اللہ کو اپنے خوف اور محبت کے جذبات کا مرکز بنا کر اس کے مطابق زندگی گزارنا۔

قرآن کے مطابق، شیطان آدمی کا دشمن ہے۔ وہ مسلسل اس کوشش میں رہتا ہے کہ آدمی کو مذہب توحید سے ہٹادے۔اس مقصد کے لئے اس نے مختلف خود ساختہ مذہب بنائے۔ مثلاً مذہبِ شرک، مذہبِ الحاد، مذہبِ اشتراکیت۔ اس سلسلہ میں شیطان نے جو سب سے زیادہ خطرناک مذہب ایجاد کیاوہ یہی مذہب انسانیت ہے۔اس کو موجودہ زمانہ میں ہیومنزم کہاجاتا ہے۔ مگر سادہ طور پر یہ صرف ایک انسانی نظریہ نہیں۔وہ خدا کو تخت معبودیت سے ہٹا کر وہاں انسان کو اس کی جگہ بٹھاتا ہے۔

It is like transfering of seat from God to man.

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود، اس کا دل و دماغ، اس کے جذبات و کیفیات سب خالق کی امانت ہیں۔ انسان کا مرکز توجہ پوری طرح صرف ایک خدا کو ہونا چاہئے۔ دوسری ہر چیز، حتی کہ انسانی خدمت بھی، خدا کے تابع ہونا چاہئے نہ کہ اس سے آزاد۔

سوال

میں آپ کے ذہن ودماغ کا قائل ہوں۔ ساتھ ہی آپ کی خلوصِ نیت کا بھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمان آج بھی اپنی دیرینہ طرزِ فکر سے نکل نہیں پارہے ہیں۔اور آج بھی نام نہاد قائدین کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔ قائدین کی ان غلطیوں کو ماننا پہلے دشوار معلوم ہوتا تھا مگراب حقائق کی کثرت نےان کے تمام فارمولوں کو فیل کر دیا۔ پہلے میں آپ کی فکر میں آپ کو اکیلا تصور کر رہا تھا مگر حالات وواقعات کا بغور مطالعہ آپ کی فکر کی تائید کرتا ہے۔ آپ کی جانب سے امن کا پیغام اور مثبت طرز فکر،ان دونوں کو میں نے گانٹھ باندھ لیا ہے۔ مسائل کو نظرانداز کر کے مواقع کا استعمال نہایت ہی بہترین فارمولا ہے۔ دراصل ہمارے زیادہ تر سیاسی رہنما idealist واقع ہوئے ہیں نہ کہ realist۔ اور اول الذکر کی بنیاد پر ایک خیالی دنیا تو تعمیر ہو سکتی ہے مگر حقیقی کامیابیوں سے بھرپور دنیا نہیں۔ مجھے تعجب اس بات کا ہے کہ آخر آپ اپنے ہم عصروں کی فکر کی زد سے کیسے نکل آئے جب کہ آج بھی ان لوگوں کی فکر مسلمانوں کے اوپر حکمراں ہے۔ یہی بات

آپ کی ذہانت کی دلیل ہے۔ آپ جیسے زیرک حضرات کا آج فقدان ہے اور خدا سے دعا ہے کہ آپ جیسے لوگوں کو نوبل انعام سے نوازا جائے۔

میں علامہ اقبال کا admirer رہا ہوں اور ان کی فکر پر تنقید کو طفلانہ سمجھتا تھا مگر آپ کی بے لاگ تنقید نے علامہ کی فکر کا جائزہ لینے میں بڑی مدد کی ہے۔ میں اب بتدریج Idealism سے Realism کی طرف آرہا ہوں اور میری اس دریافت میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ (طارق اشفاق، عماد الملک روڈ، اے ایم یو، علی گڈھ)

جواب

حدیث میں آیا ہے کہ: ان الدین یسر (صحیح البخاری، کتاب الایمان) یعنی دین آسان ہے۔ اس کے مطابق، دین کو سمجھنا ہر آدمی کے لئے آسان ہونا چاہئے، اور بلاشبہہ اس کا سمجھنا آسان ہے۔ البتہ خدا کے دین کو سمجھنا اس وقت مشکل ہو جائے گا جب کہ آدمی خدا کے دین کو غیر خدا سے اخذ کرنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں یہی پیش آیا ہے۔ لوگ عام طور پر دین کو اپنے مفروضہ اکابر کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی چیز لوگوں کے لئے فہم دین میں پردہ بن گئی ہے۔ میں خدا کے فضل سے کبھی بھی اکابر پرستی کا شکار نہیں رہا۔ میں امام ابو حنیفہ کے اس قول کو مانتا ہوں کہ ھم رجال ونحن رجال۔ اس لئے میں خود براہِ راست قرآن وسنت سے دین کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس دنیا کے لئے خدا کا یہ قانون ہے کہ جو شخص صحیح راستہ سے کوشش کرے وہ ضرور اپنے مقاصد کو پائے گا۔ (مَن جَدَّ وَجَدَ)

اقبال کی مقبولیت کا سبب کیا ہے، وہ خود اقبال کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے بارے میں کہا: مرا یاراں غزل خوانے شمردند (لوگوں نے مجھے ایک غزل خواں سمجھ لیا) غالباً اقبال یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اشعار قوم کے اندر نئی سوچ لائیں گے اور لوگ تعمیر ملت کے محاذ پر سرگرم ہو جائیں گے۔ مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ اقبال کے اشعار لوگوں کے لئے ذہنی تفریح کا سامان بن گئے۔ اقبال نے اپنے مذکورہ شعر میں غالباً اسی کی شکایت کی ہے۔ مگر یہ خود

اقبال کی غلطی ہے۔ ان کا یہ سمجھنا درست نہ تھا کہ اشعار کے ذریعہ وہ قوم کے اندر کوئی حقیقی بیداری لا سکتے ہیں۔ شعر ایک لفظی آرٹ ہے۔ وہ انسان کے لئے صرف ذہنی تفریح کا سامان بن سکتا ہے۔ شعر کسی حقیقی اصلاح کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں پیغمبر اسلام کے لئے فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو شعر نہیں سکھایا اور وہ اس کے لئے مناسب نہیں (یٰس ۶۹) مصلح یا داعی نثر کی زبان میں کلام کرتا ہے۔ شعر کی زبان مصلح اور داعی کی زبان نہیں۔ لوگ عام طور پر تفریح پسند ہوتے ہیں۔ اس لئے تفریحی کلام تیزی سے لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں سنجیدہ نثر لوگوں کے درمیان بہت کم مقبول ہوتی ہے۔ مگر مذکورہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی اصلاح کا کام ہمیشہ نثر کی زبان میں ہوتا ہے نہ کہ ردیف اور قافیہ کی زبان میں۔

سوال

میں نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ آپ بھاجپا اور آر۔ ایس۔ ایس کے آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ آپ کو اپنے جلسوں میں بہت بلاتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے۔

(ایک قاری الرسالہ، دہلی)

جواب

یہ سراسر بہتان ہے۔ میرا مقصد اسلامی دعوت ہے اور اس مقصد کے لئے میں مسلمانوں کے اجتماعات کے علاوہ غیر مسلموں کے جلسوں میں بھی جاتا ہوں۔ مگر وہ صرف بھاجپا اور آر ایس ایس کے جلسے نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق ہر مذہب کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً ہندو، عیسائی، جینی، سکھ، بودھ وغیرہ۔ آپ اگر اس معاملہ میں سنجیدہ ہوں تو آپ یہ کریں کہ ماہنامہ الرسالہ میں پچھلے دس سال کا خبرنامہ پڑھیں۔ آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ میں کن لوگوں کے جلسوں میں جاتا ہوں۔ جو لوگ میرے بارے میں مذکورہ قسم کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں وہ بلاشبہہ ایک فعل حرام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ آخرت میں ان کی بہت شدید پکڑ ہو گی۔

غلط فہمی

قرآن میں ایک موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا (الاحزاب ۳۷) سبب نزول یا وقتی انطباق کے اعتبار سے اس آیت کا تعلق زینب اور زید کے معاملہ سے ہے۔ مگر توسیعی انطباق کے اعتبار سے قرآن کی یہ آیت ایک اصول حیات کو بتاتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک بات آدمی کے دل میں ہوتی ہے مگر وہ اس کو اپنی زبان سے ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں اس اصول کی ایک مثال یہ ہے کہ خلافت کے لئے آپ اپنے بعد حضرت ابو بکر صدیق کو سب سے زیادہ اہل سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے کبھی اپنی زبان سے اس کا صراحۃً اظہار نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کو یقین تھا کہ آپ کے بعد آپ کے اصحاب خود ہی اس مطلوب فیصلہ تک پہنچ جائیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق کی موجودگی میں وہ کسی اور کو اپنا امیر یا خلیفہ نہیں بنائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد جب امارت کا سوال پیدا ہوا تو صحابہ نے تقریباً اتفاق رائے سے حضرت ابو بکر صدیق کو اپنا خلیفہ چن لیا۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ اس نظیر کے باوجود خلیفہ اول نے اس معاملہ میں اجتہاد سے کام لیا۔ اپنے بعد خلیفۂ دوم کے معاملہ کو انھوں نے عمومی انتخاب کے اوپر نہیں چھوڑا۔ بلکہ صراحت کے ساتھ حضرت عمر فاروق کو اس منصب کے لئے نامزد فرمایا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں کو حضرت عمر فاروق کے بارے میں ایک سخت قسم کی غلط فہمی تھی۔ حضرت عمر فاروق کے مزاج میں شدت تھی۔ لوگ حضرت عمر فاروق کے اخلاص اور قربانی کے معترف تھے۔ مگر ان کو یہ اندیشہ تھا کہ ایک ایسا آدمی خلافت کے نازک منصب کے لئے موزوں نہیں جس کے اندر شدت اور تنقید کا مزاج پایا جائے۔ حضرت عمر فاروق کے بارے میں لوگوں کی اسی غلط فہمی کی بنا پر خلیفۂ اول کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر انہوں نے خود سے عمر فاروق کو نامزد نہیں کیا تو آپ کے بعد مسلمان شاید ان کو اپنا امیر بنانے پر اتفاق نہ کر سکیں گے اور اس طرح عین

ہی شخص مسلمانوں کا امیر بننے سے رہ جائے گا جو اپنی خصوصی اہلیت کی بنا پر مسلمانوں کی پوری جماعت
ں امیر یا خلیفہ بننے کا سب سے زیادہ اہل ہے۔

مگر یہ غلط فہمی سراسر بے بنیاد تھی۔ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق ان
تہائی نادر انسانوں میں سے تھے جن کو تاریخ ساز انسان کہا جاتا ہے۔ مگر اس غیر معمولی صفت کے
وجود بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ خلیفۂ دوم کے منصب کے لئے لوگ ان کے نام پر متفق ہو
ائیں گے۔ یہی اندیشہ تھا جس کی بنا پر خلیفۂ اول کو اس معاملہ میں پیشگی نظیر کے باوجود اجتہاد کرنا
ا۔ چنانچہ انھوں نے ذاتی مداخلت کرتے ہوئے عمر فاروق کو اپنے بعد خلافت کے لئے نامزد کر دیا۔

حضرت عمر فاروق کے بارہ میں لوگوں کی یہ رائے تمام تر غلط فہمی پر مبنی تھی۔ حضرت عمر
اروق بے حد اصول پسند انسان تھے۔ وہ حق کے معاملہ میں مصالحت کو گوارہ نہیں کرتے تھے۔
ں چیز نے ان کے مزاج میں شدت پیدا کر دی تھی۔ وہ جب بھی کس کو کوئی غلط بات کہتے ہوئے
غلط کام کرتے ہوئے دیکھتے تو وہ اس پر سخت تنبیہہ و تنقید کرتے۔ وہ جس چیز کو حق سمجھتے اس کے
علان میں وہ کبھی کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر لوگ ان سے دور رہنے لگے۔ حتیٰ کہ
سول اللہؐ نے فرمایا خدا عمر پر رحم کرے، ان کا کوئی دوست نہیں۔

مگر حضرت عمر کے بارے میں لوگوں کا یہ احساس تمام تر غلط فہمی پر مبنی تھا۔ حضرت عمر
اروق کی شدت صرف ناحق کے خلاف ہوتی تھی نہ کہ کسی انسان کے خلاف۔ وہ عین اس وقت
بھی انسان کے خلاف نفرت سے خالی ہوتے جب کہ وہ اس کی تنبیہہ کر رہے ہوتے تھے۔ ان کے
ل میں عین اس وقت بھی انسان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ ہوتا تھا جب کہ بظاہر وہ اس کے
خلاف غصہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ہر سختی میں ایک نرمی چھپی ہوتی تھی۔ ان کی ہر
تنقید کے پیچھے محبت کا جذبہ کار فرما ہوتا تھا۔

عام لوگ اس نازک فرق کو نہ سمجھ سکے۔ اس لئے انہیں حضرت عمر فاروق کے بارے
یں سخت غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ تاہم جو لوگ زیادہ باشعور تھے وہ اس راز کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب
وگوں نے حضرت عثمان سے حضرت عمر فاروق کی شکایت کی تو حضرت عثمان نے ان کے بارے

میں کہا کہ ان کا اندر ان کے باہر سے بہتر ہے۔اسی طرح حضرت ابو بکر نے لوگوں کی شکایات کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ عمر پر جب خلافت کی ذمہ داری آئے گی تو وہ اپنے آپ نرم ہو جائیں گے۔(الکامل فی التاریخ لابن الاثیر جلد ۲ صفحہ ۴۲۵)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کتنی خطرناک چیز ہے۔غلط فہمی کی بنا پر آدمی ایک شخص کے بارے میں بالکل الٹی رائے قائم کر لیتا ہے۔حالانکہ وہ شخص اس غلط رائے سے بالکل پاک ہوتا ہے۔اس قسم کی منفی رائے غلط فہمی میں مبتلا ہونے والے کے اپنے دماغ میں ہوتی ہے۔ باہر کی دنیا میں سرے سے اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔یہ غلط فہمی بلاشبہہ ایک سنگین قسم کا اخلاقی جرم ہے۔ہر آدمی پر لازم ہے کہ اس جرم سے اپنے آپ کو بچائے۔

۱۔غلط فہمی سے بچنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری تدبیر یہ ہے کہ آدمی محض سن کر کسی بات پر یقین نہ کرے۔سنی ہوئی بات اکثر غلط ہوتی ہے۔کسی معاملہ کی صحیح رپورٹ دینا بے حد مشکل کام ہے۔ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں جو کسی واقعہ کو ٹھیک ویسا ہی بیان کریں جیسا کہ وہ ہے۔اگر ایک آدمی کے دل میں دوسرے آدمی کے خلاف غلط فہمی پیدا ہوجائے تو فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ غلط فہمی میں مبتلا ہونے والا شخص اس آدمی سے ملے اور خود صاحب معاملہ سے تحقیق کرے۔براہ راست تحقیق کے بغیر کسی کے بارے میں بری رائے قائم کرنا سخت گناہ ہے۔

۲۔جو آدمی غلط فہمی میں مبتلا ہو اس کے اوپر یہ فرض ہے کہ اس نے جس طرح کسی کے بارہ میں ایک بری رائے قائم کی ہے اسی طرح وضاحت کے بعد وہ اس بری رائے کو اپنے دماغ سے نکالے اور اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ذہن کی اصلاح کر لے۔جس آدمی کے اندر غلطی کے اعتراف کا مادہ نہ ہو اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی کے بارے میں غلط رائے کو اپنے ذہن میں جگہ دے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ غلط فہمی اکثر حالات میں بے بنیاد ہوتی ہے۔آدمی یک طرفہ رپورٹ یا ناقص معلومات کی بنیاد پر ایک بری رائے قائم کر لیتا ہے۔حالانکہ اگر کھلے ذہن کے ساتھ تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں سرے سے ایسی کوئی چیز موجود ہی نہ تھی۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ یا تو اتنا باشعور بنے کہ وہ باتوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھ لے، اس کا ذہن اپنے آپ ہی غلط فہمی کو اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کر دے۔ اور اگر کوئی آدمی اتنا زیادہ باشعور نہ ہو تو انسانیت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ غلط فہمی میں پڑنے سے پہلے براہِ راست طور پر اس کی مکمل تحقیق کرے۔ وہ اس وقت تک ہرگز کسی بات کو نہ مانے جب تک وہ تحقیق کی تمام شرطوں کے ساتھ اس کا جائزہ نہ لے چکا ہو۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو ہر بری بات کو سنتے ہی اسے مان لیں۔ ایسے لوگ بلا شبہہ اسلام سے دور ہیں۔ خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو اسلام کے اعلیٰ معیار پر سمجھتے ہوں۔

۳۔ غلط فہمی دراصل ناقص معلومات کی بنیاد پر کامل رائے قائم کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی کے بارے میں ایک جزئی بات سنتا ہے اور اس سے وہ اس آدمی کی کلی تصویر بنا لیتا ہے۔ کبھی کسی کا قول اس کے سیاق سے الگ ہو کر سامنے آتا ہے اور پورے سیاق کی روشنی میں دیکھے بغیر ایک ایسی رائے قائم کر لی جاتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کبھی کسی آدمی کے ایک ظاہری پہلو کو دیکھ کر اس کے باطن کے بارے میں ایک نظریہ بنا لیا جاتا ہے۔ کبھی کسی سنی ہوئی بات کو ٹھیک ویسا ہی مان لیا جاتا ہے حالانکہ مختلف راویوں سے گزر کر وہ بات آخر کار ایک ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے علم میں ایک بات آتی ہے اور وہ خود ساختہ تعبیر کے ذریعہ اس کا ایک مفہوم متعین کر لیتا ہے حالانکہ یہ تعبیر اصل حقیقت کے بالکل خلاف ہوتی ہے۔

اس قسم کی مختلف صورتیں ہیں جو غلط فہمی کا سبب بنتی ہیں۔ غلط فہمی کا یہ معاملہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ انتہائی صالح افراد بھی اس کی زد سے مستثنیٰ نہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگوں نے کسی کے خلاف انتہائی بھیانک قسم کی رائے قائم کر لی۔ حالانکہ اس کے پیچھے بے بنیاد غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

ایسی حالت میں غلط فہمی کے گناہ سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ آدمی کسی کے خلاف رائے قائم کرنے میں سخت محتاط ہو۔ وہ مکمل تحقیق کے بغیر کبھی ایسی کوئی رائے قائم نہ کرے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ یا تو سرے سے کسی کے بارے میں کوئی رائے ہی قائم نہ کرے اور اگر رائے

قائم کرنا ضروری ہو تو اس کی تحقیق کا حق ادا کرے۔ رائے قائم نہ کرنے پر کسی کی کوئی پکڑ نہیں۔ مگر رائے قائم کرتے ہی آدمی خدا کی پکڑ کی زد میں آجاتا ہے۔ رائے قائم نہ کرنے والا معذور قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر مخالفانہ رائے قائم کرتے ہی اس کا عذر ختم ہو جاتا ہے۔ اب اس کا معاملہ یہ ہو جاتا ہے کہ یا تو وہ دوسرے کے بارے میں اپنی مخالفانہ رائے کو دلیل سے ثابت کرے، یا خود اسی چیز کا مجرم بنے جس کا الزام وہ بے بنیاد طور پر دوسرے کو دینا چاہتا تھا۔

۴۔ غلط فہمی یا بدگمانی کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ بے حد ذمہ داری کی بات ہے۔ اگر آپ کسی کے خلاف برا گمان کر لیں تو آپ اپنے کو اس خطرہ میں مبتلا کر رہے ہیں کہ اگر فریق ثانی برا نہ ہو تو خدا کی نظر میں آپ خود اسی برائی کے ذمہ دار قرار پائیں، جس کا ذمہ دار آپ دوسرے کو سمجھے ہوئے تھے۔

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یرمی رجلٌ رجلاً بالفِسق ولا یَرمیه بالکُفر اِلاّ ارتَدَّتْ علیه اِنْ لَم یکن صاحبُه کذالك (مسند احمد ۱۸۱/۵) یعنی جب کوئی شخص کسی کے اوپر فسق کا الزام لگائے یا اس کے اوپر کفر کا الزام لگائے تو اس کا الزام خود اسی کی طرف لوٹ آئے گا اگر دوسرا شخص ویسا نہ ہو۔

بے بنیاد غلط فہمی بھی بلاشبہہ ایک الزام کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کسی کے بارے میں ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا ہونا ہے جو باعتبار واقعہ درست نہیں۔ ایسی حالت میں غلط فہمی یا بدگمانی سے بچنا خود اپنے فائدے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ آدمی کا خود اپنا مسئلہ بن جاتا ہے۔ کیوں کہ فریق ثانی میں اگر وہ برائی نہ ہو تو خود بدگمانی کرنے والا اس کا مجرم قرار پائے گا۔

یہ حدیث رسول بے حد سنگین ہے۔ اس کا تقاضہ ہے کہ آدمی غلط فہمی یا بدگمانی کے معاملہ میں آخری حد تک سنجیدہ ہو جائے۔ غلط فہمی اگر سادہ نوعیت کی ہو مثلاً آپ کسی کے بارے میں یہ رائے قائم کریں کہ وہ جلد غصہ میں آجاتا ہے تو اس میں اس کے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں۔ لیکن اگر کسی کے بارے میں غلط فہمی کی بنا پر ایسی سنگین رائے قائم کر لی جائے جو اخلاقی یا شرعی جرم کی حیثیت رکھتی ہو تو ایسی صورت میں معاملہ بے حد سنگین ہو جائے گا۔ ایسی سنگین غلط فہمی گویا دو دھاری تلوار ہے، وہ اگر فریق ثانی کو نہ کاٹے تو خود آپ کی ہلاکت کا سبب بن جائے گی۔

۱۔ مسٹر جیت شمسی (انجینئر) محکمہ بجلی، بمبئی، خدا کے وجود کو نہیں مانتے تھے۔ پھر الرسالہ کے ایک قاری جناب ولی محمد انصاری (دھولیہ) نے ایک روز انگریزی کتاب گاڈ ارائزز ان کو دی۔ اس کو پڑھ کر وہ اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے کافی محنت کر کے اس کا مکمل ترجمہ اپنی مادری زبان مراٹھی میں کر ڈالا۔ اب یہ مراٹھی ترجمہ الرسالہ فورم، بمبئی کی طرف سے چھپ گیا ہے۔ یہ ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام "دھرما پڑھیل آوادھان" ہے۔ جو صاحب اس کتاب کو حاصل کرنا چاہیں وہ گاڈ ارائزز (مذہب اور جدید چیلنج) کا یہ مراٹھی ترجمہ اس پتہ سے حاصل کر سکتے ہیں: کلثوم کتاب گھر۔ مولانا بابا لین، جامع مسجد باندرہ (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۰، فون نمبر 6425201۔

۲۔ ۳ ستمبر ۱۹۹۹ کو اردو ٹائمز، بمبئی کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کے مسلمانوں کی سیاسی پالیسی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ سیاسی پالیسی اس کا نام نہیں کہ الکشن کے دوران کسی پارٹی کی حمایت میں یا کسی پارٹی کے خلاف ووٹ دیا جائے۔ عملی سیاسی پالیسی کی تشکیل سے پہلے شعوری بیداری اور فکری تربیت کی ضرورت ہے۔ ورنہ عملی سیاست بے فائدہ ہو کر رہ جائے گی۔

۳۔ ہندی اخبار دینک بھاسکر کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا ۲۵ ستمبر کو ایک انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مہاتما گاندھی سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مہاتما گاندھی نے سیاسی آزادی کو اولین ترجیح دی مگر زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ تعلیم کو اولین ترجیح دی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے باوجود ہمارے مسائل حل نہیں ہوئے۔

۴۔ پانچ جنیہ ویکلی کے نمائندہ الوک گوسوامی نے یکم اکتوبر ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام اور جہاد سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جہاد کی خاص شرطیں ہیں اور جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہوں اس کو اسلامی

جہاد نہیں کہا جا سکتا۔ موجودہ زمانہ میں مختلف ملکوں میں جہاد کے نام پر جو لڑائیاں جاری ہیں ان میں کوئی بھی ان شرطوں پر پوری نہیں اترتی۔ اس لئے ان کو قومی لڑائی کہا جائے گا نہ کہ اسلامی جہاد۔

۵۔ فادر اگنل آشرم، بمبئی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں ۲۱ جنوری ۲۰۰۰ کو آشرم کے سالانہ پروگرام میں خطاب کیا جس کا موضوع تھا: انٹر فیتھ ڈائیلاگ۔ تقریر میں بتایا گیا کہ اختلاف کے باوجود مختلف مذاہب کے لوگوں کو پرامن طور پر رہنا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ اختلاف اور فرق زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے عقیدہ پر عمل کریں اور دوسرے کا احترام کریں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بمبئی میں مسلمانوں کے مختلف اجتماعات میں بھی شرکت کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔

۶۔ انگریزی ہفت روزہ (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر سید نے ۳ فروری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان کی مسیحی اقلیت اور مسلم اقلیت سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ صحافت کو چاہئے کہ وہ واقعات کو نہ گھٹائے اور نہ بڑھائے بلکہ ٹھیک ٹھیک رپورٹ کرے۔ اس سے غلط فہمی ختم کی جا سکتی ہے۔

۷۔ جامعہ ریاض الاسلام اور جامعہ ریاض البنات کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے حیدر آباد کا سفر کیا۔ اور حیدر آباد میں کئی ملی اور دعوتی پروگرام ہوئے۔ اس سفر کے دوران محبوب نگر میں جامعہ سراج العلوم کے جلسہ میں بھی شرکت کی اور خطاب کیا۔ یہ سب پروگرام ۶ فروری تا ۸ فروری ۲۰۰۰ کے دوران ہوئے۔ اس سفر کی تفصیل انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۸۔ مسٹر اشوینی گنڈو نے ۹ فروری ۲۰۰۰ کو دوردرشن کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اسلام اور جہاد سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ جہاد سے مراد

جدوجہد ہے نہ کہ قتال۔ اسلام کے پیغمبروں کو قرآن میں رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔ اسلام کی تمام تر تعلیمات امن اور رحمت کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اسلام کا طریقہ کار پرامن طریقہ کار ہے نہ کہ متشددانہ طریق کار۔

- مسٹر اشوک کمار اوجھا اور بی ڈی ایس گوتم نے ۱۶ فروری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) کے لئے تھا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر پاپولیشن کنٹرول سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ انڈیا میں اصل مسئلہ اضافۂ آبادی کا نہیں ہے بلکہ معاشی مواقع کی کمی کا ہے۔ چنانچہ شہروں کی آبادی بڑھ رہی ہے جب کہ دیہاتوں میں برعکس نقشہ نظر آتا ہے۔ بڑھتے ہوئے کرپشن کی وجہ سے دیہاتوں میں تعمیر و ترقی کا کام نہ ہو سکا۔ چنانچہ لوگ مجبور ہو کر شہروں کی طرف رخ کر رہے ہیں۔ اضافۂ آبادی دراصل شہروں کا مسئلہ ہے نہ کہ ملک کا مسئلہ۔

- بی۔ ڈی۔ ایس گوتم اور اشوک کمار اوجھا نے ۱۶ فروری ۲۰۰۰ کو آل انڈیا ریڈیو کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانوں اور فیملی پلاننگ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ یہ ایک بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے کہ ہر مسلمان چار شادی کرتا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا گیا کہ اضافۂ آبادی کا مسئلہ زیادہ تر شہروں میں ہے نہ کہ دیہاتوں میں۔ دیہاتوں میں کام کرنے کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بھاگ بھاگ کر شہروں میں آتے ہیں۔ اگر دیہات میں کام کرنے کے مواقع ہوں جیسا کہ مغربی ملکوں میں ہے تو شہروں کی آبادی بہت کم ہو جائے گی۔

- مشہور برٹش جرنلسٹ مارک تلی (Mark Tully) اور گلین رائٹ (Gillian Wright) نے ۱۷ فروری ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ان کی زیر ترتیب کتاب Sacred Places of India کے سلسلہ میں تھا۔ اس انٹرویو میں اسلام کے مختلف پہلو تفصیل کے ساتھ زیر بحث آئے۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ انڈین اسلام یا

غیر انڈین اسلام کوئی چیز نہیں۔ اسلام وہی ہے جو قرآن اور سنت پر مبنی ہو۔

۱۲۔ ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۱۷ جنوری میں لکھتے ہیں "مجھے غصہ بہت آتا تھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب نے آپ کی کتاب "کتاب زندگی" مجھے پڑھنے کے لئے دی۔ اس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ میرا غصہ ختم ہو گیا۔ میں نے بہت سے علماء کو پڑھا ہے، سب کے سب لڑنے جھگڑنے والی باتیں کرتے ہیں۔" اس طرح کے خطوط اکثر ڈاک سے ملتے ہیں۔ یہ خط اس کی صرف ایک مثال ہے۔ (محسن علی علمانی، ٹنڈو محمد خاں، ضلع حیدر آباد، سندھ، پاکستان)

۱۳۔ الرسالہ مشن کے تحت شروع سے اس پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ ملت کا نمبر ایک مسئلہ تعلیم ہے۔ تعلیم تمام اصلاحات کی جڑ ہے۔ اب خدا کے فضل سے الرسالہ مشن سے متاثر افراد جگہ جگہ چھوٹے اور بڑے تعلیمی ادارے قائم کر رہے ہیں۔ دینی مدرسے بھی اور سیکولر اسکول بھی۔ اس کام کی اہمیت کی بنا پر ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس تعمیری کام میں مشغول ہوں۔

۱۴۔ ایک نئی کتاب تیار ہو رہی ہے۔ اس کے تین حصے ہوں گے ـــــ مطالعۂ قرآن، مطالعۂ حدیث، مطالعۂ سیرت۔ اس کا ایک حصہ مطالعۂ سیرت تیار ہو کر شائع کیا جا چکا ہے۔ اب مطالعۂ قرآن تقریباً لکھا جا چکا ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ مطالعۂ حدیث کی ترتیب عمل میں آئے گی۔ یہ تینوں اجزاء اولاً الگ الگ شائع کئے جائیں گے۔ اور پھر ان کا مجموعہ ایک مکمل کتاب کی صورت میں انشاء اللہ مطالعات اسلامی کے نام سے شائع کیا جائے گا۔

۱۵۔ امریکہ کا حلقۂ الرسالہ، خدا کے فضل سے الرسالہ مشن کو انٹرنیٹ پر لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں لوگ انٹرنیٹ کے ذریعہ الرسالہ کے مضامین پڑھ رہے ہیں۔ ان پڑھنے والوں کے تاثرات تقریباً ہر روز موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو جواب طلب ہوتے ہیں ان کا جواب بھی انٹرنیٹ کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ مقابل کے صفحہ پر دو خط کا خلاصہ دیا جا رہا ہے جو ہمیں بذریعہ انٹرنیٹ ملا ہے۔

Dear Brother,

I am very much delighted to read your publication titled, *The Mor Vision - Islamic Ethics for Success* written by Maulana Wahidudd Khan. I congratulate you for doing such a noble work. I desire get this book translated into Malayalam, so that the readers of Kera will be highly benefited and I myself can do a small service in tl path of *da'wah.*

If the proposal is agreeable to you, kindly respond along with tl guidance on the steps to be taken in this regard.

Sincerely yours,

E.T. Mohammed Basheer

Member, Kerala Legislative Assembly

Government Guest House

Room No. 301

Trivandrum

Kerala, (India)

My Dear Brothers and sisters in Islam

This greeting comes to you from Australia. I would like t congratulate you all and particularly Maulāna Wahiduddin Kha sahab for your sincere efforts to promote Islam around the worl I have found your web site very useful. Please keep it going fo the good cause.

May Allah reward you for your efforts.

Yours in Perth: Hafeez Shaikh

Tel. 618-9478 3349

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110013
Tel: 462 5454, 461 1128
Fax: 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: Islamic Vision
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

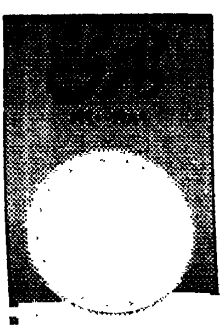
DISTRIBUTED IN USA BY
AL-Risala Forum International
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of the Islamic Centre, New Delhi, Printed at Nice Printing Press. 7/10, Parwana road, Khureji Khas, Delhi-

خصوصی شمارہ: مشاہدات دکن

نئی کتابیں





اسفار ہند

مشاہداتِ دکن

مجلس دعوت اسلامی کے ایک پروگرام کے تحت حیدر آباد دکن اور آندھرا پردیش کے بعض دوسرے علاقوں کا سفر ہوا۔ ۶ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو انڈین ائر لائنز کی فلائٹ نمبر ۹۴۰ کے ذریعہ دہلی سے روانگی ہوئی۔ پروگرام میں شرکت کے بعد ۸ فروری کی صبح کو دوبارہ انڈین ائر لائنز کی فلائٹ نمبر ۹۳۹ کے ذریعہ دہلی واپسی ہوئی۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ ٹھیک انہیں تاریخوں میں ماؤنٹ آبو میں برھما کماری مشن کی طرف سے ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ مجھے اس کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ منتظمین کا سخت اصرار تھا کہ میں اس میں شرکت کروں اور وہاں اسلام کی نمائندگی کروں۔ حتیٰ کہ سفر کے انتظامات انھوں نے میرے رفیقِ سفر کے ساتھ مکمل کر دئے تھے۔ مگر میں دونوں میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ماؤنٹ آبو کو چھوڑ کر موجودہ سفر کا انتخاب کیا۔ اس انٹر ریلجس کانفرنس میں مجھے اسلام کے نقطۂ نظر سے حسب ذیل موضوع پر بولنا تھا:

Spiritual Empowerment

میرا یقین ہے کہ سب سے بڑی طاقت روحانی طاقت ہے۔ روحانیت آدمی کو سب سے زیادہ طاقتور بناتی ہے۔ مگر روحانی طاقت سے مراد کوئی پراسرار طاقت نہیں۔ یہ ایک معلوم انسانی وصف ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ روحانی وصف پیدا ہو جائے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ تشدد کو استعمال کئے بغیر محض اپنے روحانی کلمات یا اپنے روحانی سلوک سے کسی آدمی کے دل ودماغ پر اتنا اثر ڈالے کہ وہ مسخر ہو کر رہ جائے۔

۶ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو فجر سے کچھ پہلے گھر سے روانگی ہوئی۔ ائرپورٹ روڈ دہلی کی سب سے اچھی سڑک سمجھی جاتی ہے۔ مگر ترقی یافتہ ملکوں کی سڑکوں کے مقابلہ میں وہ ایک معمولی سڑک تھی۔ آزادی (۱۹۴۷) کے بعد جو لوگ ہمارے ملک میں حکمراں بنے وہ شاید اس راز کو نہیں

جانتے تھے کہ کسی ملک کی ترقی کے لئے سب سے بڑا عامل اچھا انفراسٹرکچر (infrastructure) ہے۔ یعنی سڑکیں اور اس قسم کے دوسرے معاون وسائل کا معیاری ہونا۔ اچھا انفراسٹرکچر موجود ہو تو آدمی خود ہی ترقی کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر ہمارے پر جوش حکمراں دوسری غیر متعلق سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر پچاس سال گزر جانے کے بعد بھی ملک ابھی تک مطلوب ترقی نہ کر سکا۔

گھر سے ائرپورٹ تک سڑک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی عمارتوں کی صورت میں جدید دہلی کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیا ان جدید سرگرمیوں میں مسلمانوں کا بھی کوئی حصہ ہے، تو مجھے محسوس ہوا کہ مسلمان ان جدید سرگرمیوں میں اتنے کم ہیں کہ ان کا کوئی تناسب مقرر کرنا سخت مشکل ہے۔ عام آدمی اس کا سبب حکومت کے تعصب کو بتائے گا۔ مگر یہ سراسر غیر منصفانہ بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری تمام تر خود مسلمانوں کے نااہل لیڈروں پر ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مسلسل غیر متعلق نعروں کی طرف دوڑایا، وہ ان کو نتیجہ خیز کاموں میں مصروف نہ کر سکے۔

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ساری دنیا میں یہ عجیب و غریب منظر ہے کہ کچھ مسلم رہنماؤں کو شخصی عظمت تو خوب ملی مگر مسلمانوں کو قومی حیثیت سے عظمت نہ مل سکی۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر انھیں حکومت سے ٹکراؤ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ چنانچہ تمام ملکوں میں سطحیت پسند رہنما سو برس سے صرف اپوزیشن کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس طرح عوام پسند باتیں کر کے وہ شخصی عظمت تو حاصل کر لیتے ہیں مگر اب تک قوم کی عظمت کا سامان نہ ہو سکا۔ قوم کی پر عظمت تعمیر کے لئے ضروری تھا کہ ملک میں ایسے رہنما ابھریں جو حکومت اور اکثریت کی نظر میں اعتماد کا درجہ رکھتے ہوں۔ مگر ٹکراؤ کی سیاست کے نتیجہ میں ایسی با اعتماد قیادت کسی بھی ملک میں ابھر نہ سکی۔ تعمیر کے مواقع استعمال ہونے سے رہ گئے۔

دہلی ائرپورٹ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو مسلم جھگڑے کی جڑ یہ ہے کہ آپ لوگ صرف اپنے مذہب کو سچا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ لوگ بھی ہماری طرح یہ مان لیں کہ اسلام بھی سچا ہے اور ہندو مذہب بھی سچا تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ یہ نظریہ بہت پرانا ہے۔ اسی کو فارسی مقولہ میں اس طرح کہا گیا ہے کہ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام۔ مگر یہ ایک غیر فطری فارمولہ ہے۔ میں نے کہا کہ مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ جب آدمی ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے تو یہ سمجھ کر اس کو اختیار کرتا ہے کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے۔ اس طرح کی دریافت لازمی طور پر یقین چاہتی ہے۔ "ہر مذہب سچا ہے" کہنا خود مذہب کی نفی ہے۔ کیوں کہ سچائی صرف ایک ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا نظریہ بے یقینی پر مبنی ہے اور انسان بے یقینی کے اوپر کھڑا نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کا زیادہ درست حل یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے عقیدہ کے مطابق ایک مذہب کو سچا سمجھے اور دوسرے مذہبوں کا احترام کرے۔ یہی اس معاملہ کا فطری حل ہے۔

دہلی ائرپورٹ سے انڈین ائرلائنز کی جو بس ہم کو لے کر جہاز کی طرف چلی اس میں ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ بس کے اندر میرے قریب ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ بس کی روانگی سے دو منٹ پہلے وہ اچانک اٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ آج کل کے حالات کے لحاظ سے مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ وہ بس کے اندر کوئی بم نہ چھوڑ گیا ہو۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگا۔ میری یہ کیفیت اس وقت تک باقی رہی جب تک کہ بس ہوائی جہاز کے پاس نہ پہنچ گئی اور میں اس سے اتر کر باہر نہ آگیا۔

یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر غلط فہمی بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔ غلط فہمی پر یقین کر لینا اکثر حالات میں ایک ایسی چیز پر یقین کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے جس کا واقعہ کی دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔

۶ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو جب کہ انڈین ائرلائنز کا جہاز مجھ کو لے کر تیزی سے فضا میں

اڑ رہا تھا، ایک واقعہ گزرا جس کے بعد بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو امنڈ آئے اور فانی بدایونی کا یہ شعر میری زبان پر آگیا:

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

میری عمر اب ہجری کیلنڈر کی رو سے ۸۰ سال ہو رہی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی میں ایسا درجنوں بار ہوا کہ میں نے کسی دل پسند چیز کی طرف مڑنا چاہا مگر خدا نے مداخلت کر کے مجھے کسی بظاہر غیر پسندیدہ چیز کی طرف موڑ دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پوری عمر خدا کے فرشتے میرے ساتھ رہے ہیں تاکہ میں کسی اور موڑ کی طرف نہ مڑوں بلکہ خدا کے طے کردہ منصوبہ کے مطابق ایک ہی رخ پر چلتا رہوں۔ یہ بڑا عجیب معاملہ تھا جو میرے جیسے عاجز انسان کے ساتھ پیش آیا۔

راستہ میں جہاز کے اندر انڈین ائر لائنز کا فلائٹ میگزین سواگت (فروری ۲۰۰۰) دیکھا۔ اس میں ایک مضمون حیوانات کے بارے میں تھا جس کا عنوان یہ تھا: Wild Encounters

اس کے مضمون نگار مسٹر اندر راج اہلو والیا تھے۔ انھوں نے رنتھمبور نیشنل پارک کی سیاحت کی۔ اس اوپن پارک میں انھوں نے مختلف قسم کے جانوروں کو قدرتی ماحول میں دیکھا۔ انھوں نے اپنے ان مشاہدات کو دس صفحہ کے ایک باتصویر مضمون میں بیان کیا تھا۔

اس مضمون کا ایک حصہ شیر کے بارے میں تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ اور دوسرے ۵۰ سیاح چند گاڑیوں پر ایک راستہ سے گزر رہے تھے کہ ایک کھلے مقام پر انھیں ایک شیر ملا۔ یہ شیر راستہ کے کنارے لیٹا ہوا تھا۔ خارجی دنیا سے بے پروا وہ اپنے آپ میں مطمئن نظر آتا تھا۔ یہ ایک نر شیر تھا۔ اس نے ہمارے قافلہ کو اس طرح ٹالریٹ (tolerate) کیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا:

> And then, finally we saw him, lying full stretch just off the track, at ease with himself, a big male tiger that tolerated us more than I had imagined possible.

جہاز اپنے وقت پر حیدر آباد پہنچا۔ اس بار یہاں کے ائر پورٹ پر کچھ نئی چیزیں دکھائی دیں۔ میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ حیدر آباد کے ائر پورٹ کو ماڈرنائز کیا گیا ہے۔ اس بار اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ "ائر پورٹ" کی سطح پر انڈیا ترقی کر رہا ہے لیکن "بیل گاڑی" کی سطح پر ملک ابھی تقریباً وہیں ہے جہاں وہ پچاس سال پہلے تھا۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ انڈیا کی ۷۵ فیصد آبادی ابھی تک انہیں قدیم حالات میں رہتی ہے جہاں اب بھی زندگی کا سفر بیل گاڑیوں کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔

حیدر آباد ائر پورٹ پر کئی لوگ موجود تھے۔ حبیب بھائی حیدر آباد سے باہر تھے۔ چنانچہ ان کی نمائندگی ان کے صاحبزادہ محمد احمد صاحب نے کی۔ ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہو کر حبیب بھائی کے مکان (بیگم پٹ) پر پہنچا جو ہوائی اڈہ سے قریب ہے۔ یہاں بہت سے ساتھی اکٹھا ہو گئے اور ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

مولانا اسحاق کمال صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا میں انسان بظاہر مکمل طور پر با اختیار ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ اتنا ہی مجبور ہے جتنا کہ سورج، چاند اور دوسری مادی چیزیں۔ اس دنیا کی ہر چیز کامل عجز کے مقام پر ہے۔ انسان کو بھی اسی کا ثبوت دینا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسری چیزیں مجبورانہ عجز کے مقام پر ہیں جب کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اختیاری عجز کا ثبوت دے۔ وہ خدا کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں اپنے عجز کامل کا ادراک کرے۔ میں نے کہا کہ انسان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا (extent) بناتا ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ داعی جب دوسروں کو خطاب کرتا ہے تو گویا کہ وہ دوسرے سے یہ مطالبہ کر رہا ہوتا ہے کہ تم حق کا اعتراف کرو۔ ایسی حالت میں داعی کا عمل اسی وقت پوری طرح نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود اعتراف کا ثبوت دے چکا ہو۔ دعوت کا عمل اعتراف خویش سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد وہ اعتراف غیر تک پہنچتا ہے۔ جو داعی خود بے اعترافی

کی سطح پر جی رہا ہو اس کا دعوتی کلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کی لیڈری ہے نہ کہ دعوت الی اللہ۔

حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر لوگوں سے دیر تک اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ اب حیدر آباد کے اور پورے ملک کے مسلمان عملاً آپ ہی کے فارمولہ پر چل رہے ہیں۔ اگر چہ بہت کم لوگ ہیں جو زبان سے اس کا اعتراف کرتے ہوں۔ میں نے پوچھا کہ وہ فارمولہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خود آپ کے الفاظ میں وہ فارمولہ یہ ہے ــــ مسائل کو نظر انداز کرنا اور مواقع کو استعمال کرنا۔

ڈاکٹر محمد ظہیر احمد (پیدائش ۱۹۶۳) سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنا کوئی تجربہ بتائیے۔ انھوں نے ایک عالم کا نام لیتے ہوئے کہا کہ میں نے ان کی تقریر سنی۔ ان کی ایک بات مجھے پسند آئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے مل کر رہنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں، کیوں کہ مجھے اس قول میں بزدلی کی بو آتی ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ مل کر رہنا چاہئے مگر اس کا سبب ہندستان کے مخصوص حالات نہیں ہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہی انسانیت کا اعلیٰ اصول ہے اور یہی اسلام کا تقاضہ بھی۔ مل کر رہنے کی روش ہم کو بر بنائے اصول اختیار کرنا ہے نہ کہ بربنائے مصلحت۔

محمد عبدالرؤف صاحب (پیدائش ۱۹۴۵) الکٹری سٹی بورڈ حیدر آباد میں ملازم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بورڈ کے احاطہ میں ملازمین کی سہولت کے لئے ایک مسجد اور ایک مندر کی تعمیر کی گئی۔ ایک سال پہلے مسجد کے اوپر پلاسٹک کی شیٹ ڈالی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس پر آر سی سی کی باقاعدہ پختہ چھت بنائی گئی۔ چھت کا اصول یہ ہے کہ تعمیر کے بعد اس پر پانی ڈالنا بہت ضروری ہے، ورنہ چھت کمزور ہو جاتی ہے۔ اتفاق سے اگلا دن اتوار کا تھا، کوئی مسلمان وہاں پانی ڈالنے کے لئے نہ پہنچ سکا۔ وہاں پاس ہی مندر کا ہندو پجاری رہتا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ چھت پر پانی ڈالنے کے لئے کوئی نہیں پہنچا ہے تو وہ خود پائپ لے کر چھت کے اوپر چڑھا اور حسب قاعدہ اس نے چھت پر اپنے ہاتھ سے پانی ڈالا۔

اس واقعہ کو سن کر میں نے کہا کہ یہ ہندو اور مسلم کی بات نہیں بلکہ یہ فطرت کی بات

ہے۔حدیث کے مطابق، ہر انسان صحیح فطرت پر پیدا ہو تا ہے۔فطرت میں پیدائشی طور پر یہ بات شامل ہے کہ ایک دوسرے کی خدمت کی جائے۔یہ فطری جذبہ ہر ہندو اور ہر مسلمان کے اندر ہے۔وہ پیدائشی طور پر موجود رہتا ہے۔میں نے اپنی نوجوانی کی عمر میں دیکھا ہے کہ اس ملک کا ہندو اور مسلمان اسی فطرت پر جی رہا تھا۔ہر ایک دوسرے کے کام آکر خوش ہو تا تھا۔مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ ہندستان میں انتہائی نااہل اور ناعاقبت اندیش لیڈر اٹھے۔انھوں نے نفرت کی بولی بول کر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو فطرت سے ہٹا دیا۔۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں جو فرقہ وارانہ جھگڑے آپ دیکھ رہے ہیں وہ فطرت سے اسی انحراف کا نتیجہ ہیں۔پھر میں نے کہا کہ ان نااہل لیڈروں نے میرے نزدیک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔وہ جرم ہے — اپنی بے جا مداخلت سے خدا کے قائم کیے ہوئے فطری نظام کو بگاڑنا۔حیدر آباد سے کئی اخبار نکلتے ہیں۔ان میں سے ایک روزنامہ سیاست ہے۔سیاست کے شمارہ ۶؍فروری ۲۰۰۰ میں ایک خبر اس طرح تھی:

تو نصل جنرل عزت مآب افضل امان اللہ صاحب نے بتایا کہ امسال ایک لاکھ بیس ہزار ہندستانی حجاج کرام حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے جدہ تشریف لائیں گے۔یہ تمام حجاج کرام ہندستان کے مختلف شہروں سے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو کر جدہ انٹر نیشنل ائرپورٹ پر اتریں گے۔(صفحہ ۲)۔

اس خبر سے معلوم ہوا کہ اس سال ہندستانی حاجیوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ یعنی تقریباً اتنی ہی جتنی کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اصحاب رسول کی تعداد تھی۔تاریخ بتاتی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو یہ ہدایت کی کہ تم لوگ تمام اقوام عالم کو میری طرف سے اسلام کا پیغام پہنچادو۔میں نے سوچا کہ پیغمبر اسلام کی یہ آواز آج بھی حجاز کی فضاؤں میں گونج رہی ہے۔اگر یہ حاجی وہاں پہنچ کر اس آواز کو سن سکیں اور صحابہ کی طرح اس کی پیروی کریں تو دوبارہ جدید تاریخ میں اسلام کی توسیع واشاعت کا وہی کام انجام پانے لگے جو دور قدیم میں انجام پایا تھا۔

حیدر آباد آندھرا پردیش کی راجدھانی ہے۔یہاں کے قیام کے دوران بار بار اس کے

مختلف حصوں میں جانے کا اتفاق ہوا اور بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ شہر ہر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آیا۔ یہاں کے مسلمان بھی تقریباً سب کے سب ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر حالت میں پہنچ چکے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ۵۰ سال پہلے پیدل یا بائسکل پر چلتے تھے۔ اب ان کے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی ہوئی ہے۔ ایک مسلمان جن کے والد صاحب قدیم حیدر آباد میں صرف ایک بوسیدہ مکان میں رہتے تھے۔ آج انہوں نے پانچ منزلہ شاندار بلڈنگ کھڑی کرلی ہے۔ ایک اور مسلمان جن کے دادا صاحب نے قدیم حیدر آباد میں کرایہ کے ایک چھوٹے سے مکان میں زندگی گذاری، آج شہر میں ان کے چار بڑے بڑے مکانات ہیں۔ ایک اور مسلمان جن کے والد معمولی سروس کرتے ہوئے وفات پاگئے آج وہ ایک بڑی فیکٹری کے مالک ہیں۔ قدیم حیدر آباد میں صرف چند تعلیمی اور اسلامی ادارے تھے آج یہاں درجنوں کی تعداد میں بڑے بڑے تعلیمی اور اسلامی ادارے قائم ہیں، وغیرہ۔

میں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کے حیدر آباد کو بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ کے بعد کے حیدر آباد کو بھی۔ پچھلے سو سال کے درمیان حیدر آباد کی مسلم سیاست کا خلاصہ بیان کیا جائے تو وہ صرف ایک ہوگا ـــــ یہاں کی مسلم ریاست کو کسی نہ کسی طرح برقرار رکھنا۔ حتی کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے دور کے لئے بھی مسلمان یہی ناقابل عمل خواب دیکھتے رہے کہ وہ اس ریاست کو ایک علیحدہ مسلم ریاست کے طور پر باقی رکھ سکیں۔ جب قانون فطرت کے تحت ایسا نہیں ہوا تو مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والوں نے شکایت اور احتجاج کی زبان میں لکھنا اور بولنا شروع کر دیا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ مسلم ریاست کے دور کے مقابلہ میں آج حیدر آباد کے مسلمان سو گنا زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا سادہ سبب یہ ہے کہ مسلم ریاست کے دور میں ہر مسلمان ریاست کے اوپر تکیہ کئے ہوئے تھا۔ ہر مسلمان کی آخری خواہش یہ ہوتی تھی کہ "حضور نظام" کی حکومت میں اس کو کوئی ملازمت مل جائے۔ نئے انقلاب نے اس بھروسہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے اندر ذاتی اعتماد جاگا۔ اب ہر مسلمان ذاتی کوشش کے میدان میں سرگرم ہوگیا۔ اسی

خود اعتمادی کا نتیجہ وہ ترقی ہے جو آج یہاں کے مسلمانوں میں نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا راز خود اعتمادی ہے، نہ کہ کسی کا سیاسی یا غیر سیاسی سہارا۔

۶ فروری کو نماز ظہر کے بعد جامعہ ریاض البنات، ملک پیٹ، حیدر آباد میں خطاب ہوا۔ اس خطاب کے لئے جناب ریاض موسیٰ صاحب مالاباری نے یہ موضوع تجویز کیا تھا "ہندستان میں دعوت اسلام کی حکمت عملی"۔ اس موضوع پر تقریباً ایک گھنٹہ خطاب کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا: اس ملک میں دعوت کے مواقع اتنے ہی ہیں جتنے کہ کسی اور ملک میں۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب سے پہلے برصغیر ہند میں یہ حال تھا کہ ہر دن ہزاروں لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہ پراسس رک گیا۔ اس کی وجہ خود مسلمانوں کی تفریقی سیاست تھی۔ میں نے کہا کہ قومی تفریق کا نظریہ سراسر غیر اسلامی نظریہ ہے۔ ہمارا کام تمام لوگوں کو ایک خدا کے دین رحمت میں لانا ہے نہ کہ انہیں مختلف انسانی گروہوں میں تقسیم کرنا۔

جناب ریاض موسیٰ صاحب خالص دعوتی مزاج کے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پہلے تقریر کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں یہ کہا کہ دعوت کا خطاب سب سے پہلے قوم کے بڑوں سے ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اس واقعہ کا حوالہ دیا کہ مکی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار مکہ کے سردار عتبہ بن ربیعہ کے سامنے قرآن سے حٰم السجدہ کی ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ (سیرۃ ابن ہشام ۱/۳۱۴) یہ واقعہ بتاتے ہوئے انہوں نے حاضرین سے یہ سوال کیا کہ آج کا عتبہ کون ہے جس کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا جائے۔ ایک شخص نے بلند آواز سے کہا کہ اٹل بہاری باجپئی۔ جناب ریاض موسیٰ صاحب نے کہا کہ پھر کیا آپ نے آج کے عتبہ کو قرآن کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس پر لوگ خاموش رہے۔

میں جب اسٹیج پر آیا تو میں نے اپنی تقریر اسی بات سے شروع کی۔ میں نے کہا کہ اللہ کی توفیق سے مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی ہے کہ میں آپ کے بقول، وقت کے عتبہ کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کروں۔ میں نے بتایا کہ نئی دہلی کے فکّی آڈیٹوریم میں ایک جلسہ تھا جس میں شہر

کے تعلیم یافتہ ہندو بڑی تعداد میں شریک تھے۔ اس پروگرام میں صرف دو مقرر تھے۔ ایک، اٹل
بہاری باجپئی۔ اور دوسرا مقرر میں تھا۔ پہلے مجھ کو بولنے کا موقع دیا گیا۔ میں نے تقریباً ایک گھنٹہ
تک خالص اسلام پر تقریر کی۔ میں نے قرآن کی آیت: وما ارسلناك إلا رحمة للعالمين کو
اپنا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ اسلام ایک رحمت کلچر ہے۔ میں نے قرآن اور حدیث اور سیرت
کے حوالے سے بتایا کہ اسلام کس طرح سارے انسانوں کے لئے رحمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

میری تقریر کے بعد اٹل بہاری باجپئی اسٹیج پر آئے۔ ان کی تقریر زیادہ تر سیاسی انداز کی تھی۔ تاہم انہوں نے اپنی تقریر کے آغاز میں میری تقریر پر مختصر تبصرہ کیا۔ انہوں نے کہا: مولانا صاحب، یہ وچار منچ ہے، یہ پرچار منچ نہیں۔ اٹل بہاری باجپئی نے یہ بات اپنے مخصوص انداز میں کہی۔

اٹل بہاری باجپئی کا یہ تبصرہ بتاتا ہے کہ انہوں نے میری تقریر کو پوری طرح سنا اور سمجھا۔ انہیں اس میں واضح طور پر اسلام کی دعوت نظر آئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس تقریر کے ذریعہ میں حاضرین کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کر رہا ہوں۔ جس کو انہوں نے سادہ طور پر نہیں لیا، بلکہ اس کو پرچار (تبلیغ) کے ہم معنی سمجھا۔

جامعہ ریاض البنات میں اپنی تقریر ختم کر کے میں اسٹیج سے اترا تو ایک باریش بزرگ نے مجھے دو کتابیں پیش کیں۔ یہ دونوں کتابیں میری مخالفت میں لکھی گئی تھیں۔ میں نے ان کتابوں کو لیتے ہوئے کہا کہ میں ان کتابوں کو پڑھ چکا ہوں۔ یہ غیر علمی کتابیں ہیں۔ وہ اپنی تردید آپ ہیں۔ ان کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

ان میں سے ایک کتاب "اسلامی فکر کیا ہے" میں ہمارے مشن کو مطعون کرتے ہوئے صاحب کتاب نے لکھا تھا کہ نعوذ باللہ، ہمارا مشن "اسلام پسندی کی رَو کو روکنے کی کوشش" ہے۔

مصنف کی کتاب اور ان کے ساتھی اس قسم کی باتوں کو "تنقیدی جائزہ" سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف سبُ و شتم ہے۔ اور اس قسم کا بے دلیل سبُ و شتم کسی بھی شخص کے خلاف کیا جا سکتا

ہے۔ مثلاً مذکورہ مصنف کی مخالفانہ تحریروں کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے دعوتی مشن کی رَد کو روکنے کی ایک ناکام کوشش کر رہے ہیں۔

حیدر آباد میں میرے خطابات کی رپورٹنگ مقامی اخباروں میں ہوتی رہی، اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ انگریزی اخبار دکن کرانکل کے شمارہ ۷ فروری ۲۰۰۰ میں شائع شدہ رپورٹ کا عنوان یہ تھا:

Muslims urged to facilitate dialogue with other faiths.

اس رپورٹ کے چند جملے یہ تھے:

He described Islam as a religion with a solid historical base. Today's man relates to history and logic as never before. The religions that have their grounding in vague and unfounded references and superstitions do not have a chance to survive. If the people are allowed to make a choice on the basis of facts, Islam would win unopposed.

حیدر آباد میں وہاں کے ایک صاحب نے کہا کہ جماعت اسلامی والے آپ کی مخالفت کرتے ہیں حالانکہ اب وہ اپنے بانی کی نام نہاد سیاسی فکر کو چھوڑ چکے ہیں اور آپ ہی کے دعوتی فکر کو لے کر چل رہے ہیں۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے حیدر آباد کے روزنامہ سیاست کا شمارہ ۳ دسمبر ۱۹۹۹ مجھے دکھایا۔ اس کے پہلے صفحہ پر سنگل کالم کی فیکس سے موصول شدہ ایک خبر میں جماعت اسلامی کے موجودہ امیر کی تقریر کی رپورٹ چھپی تھی۔ اس کے مطابق جماعت کے موجودہ امیر نے ایس آئی او کے ایک تربیتی کیمپ (نئی دہلی) کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ہندستان نہ دار الحرب ہے نہ دار الکفر بلکہ یہ دار الدعوۃ ہے۔"

حیدر آباد کے جن صاحب نے مذکورہ اخبار مجھے دکھایا تھا انھوں نے کہا کہ یہ بات یقینی طور پر انھوں نے آپ سے لی ہے۔ یہ لوگ جب اپنے بانی کی فکر کو چھوڑ کر آپ ہی کی فکر کو اختیار کر چکے ہیں تو پھر وہ آپ کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو یہ ان کے اوپر آپ کا ایک فکری احسان ہے۔ ان کے بانی کی ناقابل عمل سیاسی فکر نے ان کو ایک بند گلی (impasse) میں پہنچا

دیا تھا۔ آپ نے ان کو اس بند گلی سے نکال کر عمل کی ایک کھلی شاہراہ فراہم کر دی۔

اس سوال کا جواب تو وہی لوگ دے سکتے ہیں۔ البتہ میں ایک اصولی بات کہوں گا۔ وہ یہ کہ اگر آپ کسی کے عطیہ کا اعتراف نہ کریں تو آپ نے خود اپنے کو ایک بہت بڑے گھاٹے میں مبتلا کر لیا۔

حدیث میں آیا ہے کہ : من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ (احمد، ترمذی) یعنی جو آدمی انسان کا شکر ادا نہ کرے وہ خدا کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا۔ شکر کیا ہے۔ شکر کی حقیقت قلبی اعتراف ہے۔ جس چیز کو انسانی معاملات میں اعتراف کہا جاتا ہے اسی کا نام خدائی معاملہ میں شکر ہے۔ اگر آپ کو کسی انسان سے ایک عطیہ ملے اور آپ اس کا سچا اقرار نہ کریں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا سینہ جذبۂ اعتراف سے خالی ہے اور جو سینہ ایک کے معاملہ میں اعتراف سے خالی ہو وہ یقینی طور پر دوسرے کے معاملہ میں بھی اعتراف سے خالی ہو گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شکر سب سے بڑی عبادت ہے۔ جس آدمی کے اندر شکر و اعتراف کا جذبہ نہ ہو وہ گویا اسی عبادتی حلاوت سے محروم رہ گیا جو اس دنیا میں کسی مومن کے لئے خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ تاہم شکر گہرے قلبی احساس کا نام ہے نہ کہ زبان سے کچھ الفاظ بول دینے کا۔

ایک مجلس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ جو لوگ الرسالہ مشن کے خلاف جھوٹا طوفان کھڑا کر رہے ہیں مجھے اس کی کوئی پریشانی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ الرسالہ مشن کا اعتراف خواہ آج نہ کیا جائے مگر انشاء اللہ مستقبل کا مورخ اس کا اعتراف کرے گا۔ وہ لکھے گا کہ الرسالہ مشن عمومی اندھیرے میں سچائی کا ایک چراغ تھا۔

ایسے وقت میں جب کہ پوری مسلم دنیا اسلامی عمل کا مطلب صرف یہ سمجھتی تھی کہ اسلامی نظام کے نام پر حکمرانوں سے ہلاکت خیز ٹکراؤ کیا جائے، اس وقت الرسالہ مشن نے یہ بتایا کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سیاسی ٹکراؤ سے اعراض کر کے پر امن تعمیر کے میدان میں کام کیا جائے۔ جب تمام مسلم ذہن صرف اس اعلان میں مشغول تھے کہ مغربی قومیں اسلام دشمن ہیں، ان سے لڑو، اس وقت الرسالہ مشن نے یہ نشاندہی کی کہ مغربی تہذیب نے دعوت کے نئے عظیم الشان مواقع

کھولے ہیں، ہمیں چاہئے کہ ہم ان مواقع کو استعمال کریں۔ فلپائن اور برما جیسے بہت سے ملکوں میں جب مسلم رہنما اپنا علیحدہ سیاسی جزیرہ بنانے کے نام پر مرکزی حکمرانوں سے خونی جنگ چھیڑے ہوئے تھے، اس وقت الرسالہ مشن نے بتایا کہ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ تقسیم کے بجائے توسیع کو اپنا نشانہ بنایا جائے۔ اسی طرح ہندستان میں جب تمام علماء اور دانشور اس انکشاف میں مشغول تھے کہ یہاں دوسرا اسپین بنایا جارہا ہے۔ الرسالہ مشن نے یہاں کے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اس ملک میں ان کے لئے ہر قسم کے بہترین ترقیاتی مواقع موجود ہیں۔ ۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں ظاہر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے بارہ میں جب مسلم رہنما صرف یہ جانتے تھے کہ ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کا بے فائدہ لفظی طوفان برپا کرتے رہیں، اس وقت الرسالہ مشن نے اس نکتہ سے آگاہ کیا کہ اعراض کا اصول اختیار کرو، اور پھر فسادات اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ میں نے آپ کی تحریریں پڑھی ہیں۔ آپ الجزائر میں مسلم سالویشن فرنٹ کے مسلح جہاد کو درست نہیں سمجھتے۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ الجزائر میں اسلام پسندوں کو الکشن کے ذریعہ اقتدار تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ ایسی حالت میں وہ اور کیا کر سکتے تھے کہ اپنے مقصد کے لئے تشدد کا سہارا لیں۔

I think they are more than justified. They were denied of ballots so they opted for bullets. What's wrong with this.

میں نے کہا کہ یہ تشدد کے لئے کافی جواز نہیں۔ مسلم اداروں میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص میرٹ پر قابل انتخاب ہوتا ہے مگر ادارہ کے ذمہ دار اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر اس کو رد کر دیتے ہیں۔ اس کے بجائے وہ کسی اور شخص کا تقرر کر دیتے ہیں۔ اب اگر یہ رد کیا ہوا آدمی ادارہ کے ذمہ داروں کے خلاف بندوق اٹھالے تو کیا آپ اس کو جائز قرار دیں گے۔ میں نے کہا کہ اقتدار کے حصول کو نشانہ بنا کر تحریک چلانا بذاتِ خود ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ اور جب اقتدار نہ ملنے پر تشدد شروع کر دیا جائے تو یہ مزید اضافہ کے ساتھ غیر اسلامی فعل ہوگا۔ ان اسلام

پسندوں کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ حکمرانوں سے ٹکراؤ کو چھوڑ کر غیر سیاسی میدان میں دعوت اور تعلیم وترقی کا کام کریں اور آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کے مواقع الجزائر سمیت ہر ملک میں پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ تباہ کن فتنہ اسلام کی سیاسی تفسیر کا فتنہ ہے۔اس سیاسی تفسیر نے اقتدار کو نشانہ بناکر مسلمانوں کو تخریب کے راستہ پر ڈال دیا۔اس سیاسی تفسیر نے موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان شاید پوری تاریخ میں اسلام کو نہیں پہنچا۔ قرآن کے مطابق، زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ صالح زندگی گزارنا نشانۂ عمل ہے،اور سیاسی اقتدار کا پانا نتیجۂ عمل۔

ایک مجلس میں میں نے قرآن کی کچھ آیتوں کی تشریح کی۔ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: اور ان کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں تو وہ ان سے نکل بھاگا۔ پس شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین کا ہو کر رہ گیا۔اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔ پس اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر تو اس پر بوجھ لادے تب بھی ہانپے اور اگر چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس تم یہ احوال ان کو سناؤ تاکہ وہ سوچیں (الاعراف ۷۶:۱۷۵)

سبب نزول کی روایات کے مطابق، یہ آیتیں امیہ بن ابی الصلت کے بارے میں اتریں۔ مگر توسیعی مفہوم کے لحاظ سے ان آیتوں کا تعلق ہر دور سے ہے۔ ہر زمانہ کے انسانوں میں اس قسم کا کردار پایا گیا ہے جس کا ذکر قرآن کی ان آیتوں میں ہے۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کی تعمیر کا موقع ہو مگر وہ دنیا کی تعمیر میں پھنس کر رہ جائیں،وہ اس سے اوپر نہ اٹھ سکیں۔

ایک شخص کو اقتدار ملے تو اس کے لئے یہ موقع ہے کہ وہ اقتدار کے ذریعہ عدل قائم کرے۔ مگر وہ اقتدار کو صرف ذاتی بڑائی کا ذریعہ بنالے۔ایک شخص کو مال ملے۔ مگر وہ اپنے مال کو کارِ خیر میں استعمال کرنے کے بجائے اس کو ذاتی نمائش میں استعمال کرنے لگے۔ایک شخص کو کسی

ادارہ کا ذمہ دار بنایا جائے، اس طرح اس کو یہ موقع ملے کہ وہ اس ادارہ کو بنیاد بنا کر دین وملت کی خدمت کرے۔ مگر وہ اس ادارہ کو صرف اپنے ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ بنا لے۔

اس قسم کا ہر کردار امیہ بن ابی الصلت کی مانند ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے رفعت کے بدلے پستی کا انتخاب کیا۔ اس کے لئے خدا کو راضی کرنے کا موقع تھا، مگر وہ صرف اپنی ذات کی پرستش میں لگا رہا۔ ایسے لوگ خدا کی نظر میں آج بھی بے قیمت ہیں۔ اور آخرت کے دن بھی وہ خدا کی نظر میں بے قیمت قرار پائیں گے۔ یہاں کے ایک عالم نے کہا کہ فقہ کے اختلافات پر آپ کی کتاب (تجدید دین) میں نے پڑھی۔ آپ نے اس میں فقہی اختلافات کی نہایت عمدہ توجیہہ کی ہے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ فقہ میں عبادات کی جو درجہ بندی کی گئی ہے — فرض، واجب، سنت، سنت موکدہ، نفل وغیرہ، اس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے درست طور پر لکھا ہے کہ یہ درجہ بندی یا یہ تقسیمات بعد کے فقہاء نے کی ہیں، وہ حدیث میں موجود نہیں (حجۃ اللہ البالغۃ)۔ میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ امور تعبدی میں اجتہاد نہیں ہے۔ اس لئے ان تقسیمات کی وہ اہمیت نہیں ہو سکتی جو عام طور پر لوگوں نے انہیں دے رکھی ہے۔

مزید یہ کہ اس درجہ بندی کا ایک نقصان بھی ہے۔ قرآن کے مطابق، عبادت کی اصل خشوع ہے۔ اس اعتبار سے عبادتی اعمال کی درجہ بندی کیفیت عبادت کے لحاظ سے ہونا چاہئے نہ کہ اشکال عبادت کے لحاظ سے، جیسا کہ ان تقسیمات میں کیا گیا ہے۔

میں نے حیدر آباد میں ایک صاحب کی تقریر میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ دور اول میں اسلام کی جو دعوت چلائی گئی اس کا ذریعہ کتابوں کو پڑھنا پڑھانا نہ تھا بلکہ اخلاق تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بات قرآن کے خلاف بھی ہے اور واقعہ کے خلاف بھی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اقرء باسم ربك الذی خلق ....علم بالقلم۔

قرآن خود ایک کتاب ہے آج کل کی زبان میں گویا کہ وہ ایک پیریاڈیکل (Periodical) تھا

جو ۲۳ سال کے دوران میں وقفہ وقفہ سے اترتا رہا۔ دور اول کے مسلمان اس حصۂ قرآن کو فوراً پڑھ کر یاد کر لیتے اور اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے۔ وہ روزانہ غیر مسلموں کی مجالس میں جاکر انہیں قرآن سناتے۔ مقرر نے غالباً یہ دیکھا کہ اس زمانہ میں پرنٹنگ پریس نہ تھا۔ موجودہ قسم کی مجلد کتابیں اس وقت نہیں پائی جاتی تھیں۔ پھر مطالعہ کے ذریعہ کیسے اسلام پھیلایا جاتا۔ حالانکہ مکہ اور مدینہ میں دعوت کا جو طریقہ چلایا گیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطالعۂ کتاب ہی کی حیثیت رکھتا تھا۔ صحابہ اپنے اپنے ماحول میں قرآن کی بنیاد پر گویا اسٹڈی سرکل چلا رہے تھے۔ خود قرآن کے الفاظ میں: تعلیم بالقلم (بالفاظِ دیگر تعلیم بالکتاب) دعوت کا ذریعہ ہے نہ کہ تعلیم بالاخلاق۔ اخلاق ایک شخصی عمل ہے جس کا محرک تقویٰ ہے نہ کہ دعوت۔

ریاست حیدر آباد اپنے ابتدائی دور میں مغلوں کے ماتحت رہی۔ ہندستان میں جب برٹش دور آیا تو انھوں نے برٹش ماتحتی کو قبول کر لیا۔ یہ گویا سیاسی ٹکراؤ کو avoid کر کے اپنی موجود حیثیت کو برقرار رکھنا تھا۔ حیدر آباد کے مسلم حکمرانوں کی یہ پالیسی ان کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ اس طرح وہ کئی سو سال تک شاندار طور پر اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب رہے۔ ۱۹۴۷ میں تقریباً اسی نوعیت کا معاملہ ان کے لئے تیسری بار پیش آیا۔ اب ان کے لئے موقع تھا کہ وہ نئی دہلی کی سیاسی ماتحتی کو قبول کر کے بدستور اپنے ریاستی وجود کو باقی رکھیں۔ مگر کچھ پر جوش اور بے خبر مسلم لیڈروں کی غیر حقیقت پسندانہ سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر آباد نے اپنی سابقہ حیثیت کھو دی۔ وہ خود اپنے ہی کئی سو سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ فرد کا معاملہ ہو یا حکومت کا معاملہ، اس دنیا میں ہر ایک کے لئے بہترین پالیسی یہ ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لے۔ وہ اپنے وجود سے باہر پائی جانے والی ناقابلِ تغیر حقیقتوں کو جانے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستہ ہے وہ زیادہ پانے کے نام پر تھوڑے کو بھی کھو دینا ہے۔ حاکمانہ حیثیت کو حاصل کرنے کے نام پر آخر کار محکومانہ زندگی پر راضی ہونا ہے۔

حیدر آباد میں بہت سے تاریخی آثار ہیں۔ان میں سے ایک سالار جنگ میوزیم ہے۔اس میوزیم میں ۴۰۰۰۰ قیمتی نوادر اکٹھا کیے گئے ہیں۔یہ میوزیم اپنی خصوصیات کی بنا پر عالمی شہرت رکھتا ہے۔اس کے بارے میں انسائکلو پیڈیا بریٹانیکا میں یہ الفاظ درج ہیں ـــــ نوادرات کا یہ ذخیرہ پوری مشرقی دنیا میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ شاید پوری دنیا میں:

The Collection is unique in the East and perhaps in the world.

حیدر آباد کا ایک سبق آموز واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۸ میں پولیس ایکشن کے بعد یہاں کے مسلمانوں نے اچانک پایا کہ وہ یہاں بالکل بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن جلد ہی بعد لوگوں نے دیکھا کہ یہاں کے مسلمان بڑی تعداد میں باہر کے دولت مند ملکوں میں گئے اور وہاں انھوں نے پہلے سے زیادہ ترقیاں حاصل کر لیں۔اس کا راز کیا تھا۔میں نے اس سلسلہ میں جو کچھ معلوم کیا اس کے مطابق اس کا راز یہ تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے نظام کی حکومت نے یہاں تعلیم کو بہت ترقی دی۔ حتی کہ یہاں کی بیشتر آبادی تعلیم یافتہ ہو گئی۔

نظام کی حکومت نے ۱۹۱۶ میں پرائمری ایجوکیشن کی مکمل ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔اس پالیسی کے تحت پرائمری تعلیم ہر فرد کے لئے مفت اور لازمی قرار دے دی گئی۔۱۹۴۷ کے اعداد و شمار کے مطابق حیدر آباد شہر میں ۴۰۰ پرائمری اسکول تھے۔اسکولی عمر کے تمام لڑکے اور ۹۰ فیصد لڑکیاں ان اداروں میں تعلیم پا رہی تھیں۔اس کے علاوہ ریاستی حکومت کی مدد سے کثیر تعداد میں شہر میں مڈل اسکول اور سکنڈری اسکول قائم ہو گئے۔اسی طرح کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے بھی لوگوں کو ہر قسم کے مواقع فراہم کیے گئے۔

تعلیمی اداروں کی اس کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ تک حیدر آباد کے تقریباً تمام مرد و عورت کم و بیش تعلیم یافتہ بن چکے تھے۔اس تعلیمی لیاقت نے یہاں کے لوگوں کو نیا حوصلہ دیا۔وہ بڑی تعداد میں باہر کے ملکوں میں چلے گئے۔اور پھر وہاں اپنی تعلیمی لیاقت کی بنیاد پر نیا ترقیاتی سفر شروع کر دیا۔

آج کے حیدر آباد میں آپ جدھر بھی جائیں، آپ کو یہاں کے مسلمانوں کی نئی ترقیوں

کے مناظر دکھائی دیں گے۔ قدیم حیدر آباد میں اگر "چار مینار" یہاں کی ترقی کی علامت تھا تو اب شاید چار سو سے زیادہ مینار یہاں کی ترقیوں کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس دنیا میں کوئی بھی حادثہ یا کوئی بھی سازش کسی قوم کا راستہ روکنے والی نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں مواقع اور امکانات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کا یکسر خاتمہ کرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ یہاں اگر ایک امکان کو ختم کیا جائے تو اس کے بعد ایک سو مزید امکان ابھر کر سامنے آجائیں گے۔

حیوانات کی دنیا میں ایک امیبا (amoeba) ختم ہو کر دو امیبا پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کی دنیا میں یہی امکان مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ یہ نظام خود فطرت کے اٹل قانون کے تحت قائم ہے۔ اور بلا شبہہ کوئی بھی اتنا طاقتور نہیں جو فطرت کے قانون کو بدل سکے۔

مولانا مصلح الدین قاسمی حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ انھوں نے روزنامہ منصف کے دو شمارے (۵ مارچ، ۲ اپریل ۱۹۹۹) دیئے۔ ان میں ان کا ایک مضمون دو قسطوں میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا: "مولانا وحید الدین خاں کے خلاف اعتراضات، کتنی حقیقت، کتنا فسانہ"۔

اپنے اس تفصیلی مضمون میں مولانا مصلح الدین صاحب نے صرف یہ کیا تھا کہ میرے معترضین نے میری جن عبارتوں کی قطع و برید کر کے ان پر اعتراضات وارد کئے ہیں۔ وہ عبارتیں انھوں نے اصل کتاب سے لے کر پوری پوری نقل کر دیں۔ یہ طریقہ اپنے آپ اعتراضات کا جواب بن گیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ یہ غیر ذمہ دار معترضین میری عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اس کو خود ساختہ انداز میں پیش کر رہے تھے اور اس طرح لوگوں کو غلط فہمی میں ڈال رہے تھے۔ مولانا مصلح الدین صاحب نے بتایا کہ ان کے اس مضمون کی اشاعت کے بعد لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور وہ خود معترضین کو غلط سمجھنے لگے جنھوں نے اصل عبارت میں مسخ (distortion) کے ذریعہ اپنا خود ساختہ اعتراض نکالا تھا جو کہ اصل عبارت میں سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

قیام حیدر آباد کے دوران بار بار شہر کی مختلف علاقوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ ہر طرف اقتصادی سرگرمیاں دکھائی دیں۔ ایک صاحب سے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں پیسہ کمانے کے

جو نئے نئے مواقع کھلے ہیں ان کے بعد کسی کو ہمارے خلاف دشمنی کرنے کی فرصت نہیں۔ ہر آدمی اتنا زیادہ مشغول ہے کہ اگر آپ اس کو نہ چھیڑیں تو وہ کبھی آپ کے لئے خطرہ نہیں بنے گا۔ موجودہ زمانہ لوگوں کے لئے شدید معاشی مصروفیت کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کے شر سے بچنے کی سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ انہیں اپنے اقتصادی کاموں میں مشغول رہنے دیا جائے۔

۶ فروری کو دوسرا خطاب منالی گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ یہ شام کو مغرب کی نماز کے بعد تھا۔ اس کا موضوع تھا: اسلام کی دعوت ۲۱ویں صدی میں۔

میں نے اپنی مفصل تقریر میں کہا کہ دور جدید اپنے امکانات کے اعتبار سے دور اسلام ہے۔ زمانہ نے فیصلہ کی جو نئی بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ دعوت کے جدید امکانات کو بتایا۔

۷ فروری کی شام کو منالی گیسٹ ہاؤس میں پریس کانفرنس ہوئی۔ اکثر اخبارات کے نمائندے اس میں موجود تھے۔ زیادہ تر سوالات مسلم مسائل کے بارے میں کئے گئے۔ جن کا جواب میں نے قرآن وسنت کی روشنی میں دیا۔

ایک اخبار نویس نے کہا کہ آپ اکثر مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر یہ صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ یہ سوال اتنا ہی غیر مناسب ہے جتنا کہ یہ سوال کہ نماز کب تک یا روزہ کب تک۔ ظاہر ہے کہ نماز اور روزہ خدا کی طرف سے انسان کے اوپر عبادتی فریضہ ہے، اس لئے اس میں "کب تک" کا سوال نہیں۔ جب تک آپ اس دنیا میں ہیں اس وقت تک آپ کو نماز و روزہ کا فریضہ انجام دینا ہے۔

یہی معاملہ صبر کا بھی ہے۔ صبر کوئی مجبورانہ روش نہیں۔ وہ خدا کی ایک عبادت ہے۔ بلکہ صبر سب سے بڑی عبادت ہے۔ کیوں کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والے بلا حساب اجر پائیں گے۔ (الزمر ۳۹) ایسی حالت میں ہم کو زیادہ سے زیادہ صبر کرنا ہے تا کہ ہم زیادہ سے زیادہ انعام پائیں۔

اصل یہ ہے کہ خدا کو یہ مطلوب ہے کہ انسان فتنوں سے بھری اس دنیا میں مثبت نفسیات

کے ساتھ رہے، وہ کبھی منفی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ جو سینہ منفی نفسیات سے خالی ہو اسی سینہ کے اندر اعلیٰ ربانی کیفیات پرورش پاتی ہیں۔ ایسا ہی شخص عبادت اور اخلاق کے معاملہ میں اعلیٰ درجہ کا عمل کر سکتا ہے۔ ایسا ہی شخص وہ ربانی انسان بنتا ہے جس کو جنت میں جگہ دی جائے۔ صبر کا لمحہ ہمارے لئے رحمت خداوندی کے حصول کا لمحہ ہے، وہ کوئی نامطلوب چیز نہیں۔

حبیب بھائی حیدر آباد کے ایک تاجر ہیں انھوں نے ایک ملاقات میں کہا کہ "اسلامی حکومت قائم کرو" یہ سراسر غیر اسلامی بات ہے۔ اصل کام اسلام کے نظریہ کو قائم کرنا ہے نہ کہ کسی حکومت کو قائم کرنا۔ سارا فساد اس لئے ہے کہ لوگوں نے مکمل دین کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ ہمارا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ حالانکہ اصل مقصد اسلامی نظریہ کی صداقت کو قائم کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے بہت صحیح بات کہی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اسلام آج کل تشدد کے ہم معنی بن گیا ہے۔ جب کہ اسلام سراسر رحمت اور سلامتی کا دین ہے۔

حیدر آباد میں میرا قیام حبیب بھائی کے مکان پر تھا۔ پروگرام میں شرکت کے لئے میں ان کے گھر سے روانہ ہوا۔ گاڑی حیدر آباد کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک مقام پر رکی۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک پر شکوہ چھ منزلہ عمارت تکمیل کے آخری مرحلہ میں تھی۔ یہ جامعہ ریاض البنات کی نئی عمارت تھی جو مولانا سید اکبر الدین قاسمی کی کوششوں سے بن رہی ہے۔

۱۹۹۷ سے پہلے اس جگہ اس قسم کی کوئی عمارت موجود نہ تھی۔ یہ صرف حال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ اسی عمارت کے کشادہ ہال میں وہ دو روزہ پروگرام ہوا جس میں شرکت کے لئے میں یہاں آیا تھا۔

جامعہ ریاض البنات کی یہ شاندار ملٹی اسٹوری بلڈنگ گویا نئے حیدر آباد کی ایک علامت ہے۔ آج کے حیدر آباد کے مسلمانوں میں مختلف قسم کی تعمیری سرگرمیاں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہیں۔ افراد اور جماعتیں بہت بڑے پیمانہ پر ترقی یافتہ حیدر آباد کی تعمیر میں مشغول ہیں۔

جامعہ ریاض البنات کو دیکھ کر میرے ذہن میں حیدر آباد کی سو سال کی تاریخ گھومنے لگی۔

حیدر آباد کے مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مدت میں ان کی ساری کوششیں حیدر آباد کی مسلم ریاست کے ساتھ وابستہ رہیں۔ تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ بس یہ لکھنے اور بولنے میں مشغول تھے کہ حیدر آباد کی مسلم ریاست باقی رہے۔ ان کے نزدیک اسی ریاست کے ساتھ ان کے دینی اور ملی وجود کا بقا منحصر تھا، حتی کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے نتیجہ میں جب تاریخ نے حیدر آباد کو انڈین یونین کا ایک لازمی جغرافی حصہ بنادیا، اس وقت بھی یہاں کے مسلم رہنما نا قابلِ فہم طور پر اسی سوچ میں مبتلا رہے کہ حیدر آباد کسی نہ کسی طرح ایک مسلم سیاسی جزیرہ کے طور پر باقی رہے۔

لیکن اگر حقیقی حالات کو دیکھا جائے تو مسلم لیڈروں کی یہ کوشش اتنی زیادہ بے معنی معلوم ہوگی کہ اس کو کوئی عنوان دینا ہی ناممکن نظر آئے گا۔

حیدر آباد کی مسلم ریاست کے زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کا حال کیا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کی سوچ بس یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ ریاست کے اندر کوئی ملازمت حاصل کر لیں۔ اس زمانہ میں یہاں کے تمام لوگ صرف ریاست کی اصطلاح میں سوچتے تھے۔ ریاست کے تقریباً تمام مسلمان بس ریاستی ملازمین کا ایک گروہ بن کر رہ گئے۔ ۱۹۴۸ میں جب حیدر آباد میں پولیس ایکشن ہوا اور ریاست کا خاتمہ ہو گیا تو یہاں کے مسلمانوں نے سمجھا کہ ان کے وجودِ ملی کا ستون گر گیا اور اب یہاں مسلمانوں کے لئے کسی زندگی اور ترقی کا کوئی امکان نہیں۔

لیکن آج کے حیدر آباد کا سروے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حیدر آباد کے مسلمان آج ۱۹۴۷ سے پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر حالت میں ہیں، معاشی اعتبار سے بھی اور ملی اور دینی اعتبار سے بھی۔

آج حیدر آباد کے مسلمانوں کے پاس ہر قسم کے ترقیاتی سامان وافر مقدار میں موجود ہیں۔ کار اور ٹیلی فون، پختہ مکانات، بچوں کی اعلیٰ تعلیم، سامان راحت، غرض اقتصادی ترقی کے تمام اسباب یہاں ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مسجدیں اور مدرسے اور اسلامی ادارے

بہت بڑی تعداد میں سارے حیدر آباد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ریاستی دور کے مقابلہ میں آج کے مسلمان کیوں زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ اس کے سبب پر غور کیجئے تو ایک نہایت اہم حقیقت سامنے آئے گی۔ اصل یہ ہے کہ ریاست کے دور میں مسلمانوں کا ذہن تمام تر ریاست کے اوپر اٹکا ہوا تھا۔ اس ذہنی اٹکاؤ کی بنا پر ان کی فکری صلاحیتیں دبی ہوئی تھیں۔ ان کی خداداد صلاحیتیں ابھرنے نہیں پاتی تھیں۔ جب ریاست ختم ہو گئی تو وہ ایک شاک سے دو چار ہوئے۔ ریاست کا خاتمہ ان کے لئے ایک شاک ٹریٹمینٹ (Shock Treatment) کے ہم معنی تھا۔

اب ہر آدمی دوڑ بھاگ کرنے لگا۔ کچھ لوگ حیدر آباد سے نکل کر باہر کے ملکوں میں چلے گئے اور وہاں تعلیمی اور اقتصادی جدوجہد شروع کردی۔ بقیہ لوگ حیدر آباد کے اندر کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح ان کی وہ تمام صلاحیتیں جاگ اٹھیں جو ریاست پر انحصار کی وجہ سے ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست پر انحصار نے یہاں کے مسلمانوں کو زیرو بنا رکھا تھا۔ مگر جب ریاست کا سہارا ختم ہوا اور انھیں اپنے آپ پر اعتماد کرنا پڑا تو اس کے بعد ایک ایک مسلمان ہیرو بن گیا۔

یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں انحصار (dependence) سے صلاحتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور خود اعتمادی سے صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ غیر پر اعتماد آدمی کو ترقی سے روک دیتا ہے اور اپنے آپ پر اعتماد اس کے لئے ترقی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

حیدر آباد کے اس اجتماع میں باہر سے بھی کئی لوگ آئے تھے۔ یہ سب الرسالہ کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ مثلاً بھوپال سے ڈاکٹر حمید اللہ ندوی، جناب بلال الدین صاحب۔ اسی طرح ناندیڑ سے جناب کشن راؤ پاٹل وغیرہ۔

۱۹۷۶ میں جب ماہنامہ الرسالہ جاری ہوا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ساری دنیا میں میں اکیلا ہی اس مشن کے ساتھ ہوں۔ اس وقت یہ ایک اکیلے انسان کا سفر معلوم ہوتا تھا جو اس نے

تاریکیوں کی لامتناہی فضا میں شروع کیا تھا۔ ہر آدمی اس کو دیوانگی کا ایک اقدام سمجھتا تھا۔ اس وقت غالباً کوئی بھی شخص نہ تھا جو یہ سمجھتا کہ الرسالہ چلے گا اور وہ ایک عالمی مشن کی صورت اختیار کرے گا۔ مگر آج خدا کے فضل سے نہ صرف ہندستان میں بلکہ تقریباً ساری دنیا میں اس سے وابستہ افراد موجود ہیں اور اب یہ مشن خدا کے فضل سے انٹرنیٹ پر بھی آچکا ہے۔

مولانا اکبر الدین قاسمی صاحب نے اپنی ایک تقریر میں درست طور پر کہا کہ الرسالہ مشن کو پھیلانے میں اس کے دوستوں سے زیادہ اس کے مخالفین کا ہاتھ شامل رہا ہے۔ لوگوں نے اتنی زیادہ اس کی مخالفتیں کیں اور دنیا بھر میں اس کے خلاف اتنا زیادہ پروپیگنڈا کیا کہ جو لوگ الرسالہ کا نام بھی نہ جانتے تھے وہ بھی اس سے واقف ہوگئے۔ مخالفین کے ذریعہ متعارف ہونے والے ان لوگوں میں ہزاروں آدمیوں کو صرف ان مخالفین نے الرسالہ کا قاری اور حامی بنا دیا۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کی مخالفتوں کے بعد الرسالہ کو پڑھنا شروع کیا اور پھر وہ ہمارے دل کی آواز بن گیا۔

حیدر آباد میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک مجلس میں میں نے پوچھا کہ آپ میں سے کوئی صاحب یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کو ایک ایسی چیز کی معرفت ہوئی جو اسلام کی پوری تاریخ میں کسی کو نہیں ہوئی۔ میرا یہ سوال لوگوں کو عجیب معلوم ہوا۔ میں نے کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے (لا تنقضی عجائبہ)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور میں لوگ قرآن میں نئے نئے حقائق دریافت کرتے رہیں گے۔

پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو لوگ ایمان لائے ان کو یہ ایمان درجۂ معرفت میں ملا تھا، اسی قسم کا ایمان بعد والوں سے بھی مطلوب ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا (البقرة ۱۳۷)۔ معرفت یا ڈسکوری کے درجہ میں ایمان کو پانا بلاشبہہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ خدا کی رحمتِ عام سے یہ بعید ہے کہ وہ امت کے ابتدائی لوگوں کو تو اعلیٰ درجہ کا ایمان دے اور بعد والوں کے لئے صرف کم تر درجہ کا ایمان

مقدر کرے۔ جب کہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **مثل امتی مثل المطر لا یدری اولہ خیر أو آخرہ** (مسند احمد ۳/ ۱۴۳) یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے۔ نہیں معلوم کہ اس کا پہلا حصہ زیادہ بہتر ہوگا یا اس کا آخری حصہ۔

حیدر آباد کے اس قیام کے دوران جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک ڈاکٹر عبدالرشید صاحب تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ شکر کی بیماری، دل کی بیماری اور بلڈ پریشر وغیرہ اکثر ذہنی ٹنشن سے پیدا ہوتی ہیں۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ میں مسلسل طور پر سخت قسم کے ذہنی ٹنشن میں رہتا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ میری یہ کیفیت سپر ٹنشن تک پہنچ چکی ہے۔ بلکہ میرا ذاتی احساس تو کبھی یہ ہوتا ہے کہ شاید کوئی بھی دوسرا شخص اتنے شدید ذہنی ٹنشن میں نہ جیتا ہوگا۔ اس کے باوجود خدا کے فضل سے میرا بلڈ پریشر بالکل نارمل ہے۔ شکر کی بیماری یا دل کی بیماری بھی مجھ کو نہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کے دل کو یہ اطمینان حاصل ہے کہ آپ نے سچائی کو پایا ہے۔ آپ کا ذہنی تناؤ اور ٹنشن صرف اوپری سطح کا ہے ورنہ حقیقۃً یہ ہے کہ قلب کی گہرائیوں میں آپ کے اندر حق پر ہونے کا سکون اور اطمینان موجود ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ **الا بذکر اللہ تطمئن القلوب**۔ اور یہی اطمینانِ قلب آپ کی ظاہری جسمانی صحت کا راز ہے۔

جناب محمد حسین صاحب (۵۲ سال) سے مغل پورہ میں ملاقات ہوئی۔ آج کل انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح دعوت کے میدان میں وقف کر دیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں ۱۹۹۳ سے برابر الرسالہ ۵ عدد ہر ماہ منگاتا ہوں۔ اور اس کو خاص طور سے علماء کے درمیان پھیلاتا ہوں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ماشاء اللہ الرسالہ کے ذریعہ لوگوں کو بہت فائدہ ہو رہا ہے اور لوگوں کے خیالات وسیع ہو رہے ہیں۔ پڑھنے والوں کا مشترک احساس یہ ہے کہ الرسالہ میں اعراض کا قرآنی اصول، جس کی بار بار تشریح کی جاتی ہے، بے حد اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے لوگ جو آپ کے معترض تھے الحمد للہ میں نے ان کو معترف بنا دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ الرسالہ میں

ہم کو غیر مسلموں میں کام کرنے کے لئے بہترین مواد ملتا ہے۔

حبیب بھائی کا ایک فارم کیرالا میں ہے۔ ان کے صاحبزادہ محمد احمد صاحب اس کا انتظام دیکھتے ہیں۔ محمد احمد صاحب نے بتایا کہ وہ کار کے ذریعہ سفر کرکے وہاں جاتے ہیں۔ یہ مسلسل ۲۴ گھنٹہ کا سفر ہوتا ہے۔ مگر وہ ر کے بغیر سفر کرکے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جب آدمی کے سامنے ایک متعین نشانہ ہو تو وہ ہیرو بن جاتا ہے۔ کوئی معلوم نشانہ نہ ہو تو آدمی مسلسل اتنا لمبا سفر نہ کر سکے۔

حیدرآباد میں قیام کے دوران ہم لوگ مدرسہ ریاض البنات (اندرون تالاب کہنہ) گئے۔ یہاں مولانا سید اکبر الدین قاسمی کے بچوں کا قرآن شروع کرانے کی تقریب میں شرکت کی۔

کشن جے ونت راؤ پاٹل (ناندیڑ) اس پروگرام میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد میں دعوت وتربیت کے عنوان سے جو پروگرام ہوا اس میں میں شریک تھا۔ انہوں نے اپنا تاثر ایک صاحب سے بتاتے ہوئے کہا کہ — مولانا نے جو بات کہی وہ اس بارے میں تھی کہ قرآن کا مطلوب انسان کون ہے اور یہ کہ ایسا انسان کیوں کر بنتا ہے۔ یہ بات انہوں نے بہت ہی اچھے ڈھنگ سے پیش کی۔ مولانا کا جو سمجھانے کا طریقہ ہے اس سے ہر انسان کی سمجھ میں بات آ جاتی ہے۔ مولانا کی تحریک انسانوں کی بھلائی کی ہے۔ دیگر علماء کی سرگرمی مسلمانوں کے لئے ہوتی ہے اور مولانا کی سرگرمی انسانوں کے لئے ہے۔ یہی بات مجھے ان سے قریب لائی ہے"۔

۷ فروری کو ہم لوگ شہر سے روانہ ہو کر اپل پہنچے۔ یہاں ہماری گاڑی ایک زیر تعمیر بلڈنگ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ چند سال پہلے جب میں آیا تھا تو یہاں ایک صحرائی ماحول تھا بلا تشبیہ، گویا کہ یہ مقام ملت کے اجڑے ہوئے چمن کی ایک علامت بنا ہوا تھا۔ آج یہاں ایک عظیم اور خوبصورت عمارت ابھرتی ہوئی دکھائی دی، ٹھیک ویسے ہی جیسے پانی کے اندر سے کنول پھول برآمد ہوتا ہے۔ یہ شاندار عمارت جامعہ ریاض الاسلام کی تھی جو مولانا سید اکبر الدین قاسمی اور ان کے ساتھیوں کی کوششوں سے وجود میں آئی ہے۔ اور گویا کہ وہ نئے دور میں احیاء ملت

ایک پر امید علامت ہے۔

گفتگو کے دوران میں نے پوچھا کہ یہاں پانی کا کیسا انتظام ہے۔ جامعہ کے ذمہ داروں نے بتایا کہ ہم نے بورنگ کر کے یہاں پانی نکالا ہے۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب بورنگ شروع کی گئی تو معلوم ہوا کہ نیچے سب پتھر ہی پتھر ہے۔ نیچے پچاس فٹ تک یہی حال تھا۔ بورنگ کرنے والے یہ دیکھ کر مایوس ہو گئے۔ مولانا سید اکبر الدین صاحب نے لا تقنطوا من رحمة الله کے اصول پر کہا کہ آپ لوگ بورنگ جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ جب وہ لوگ ساٹھ فٹ تک پہنچے تو صاف شفاف پانی کا فوارہ ابل پڑا۔ اب یہاں اتنا زیادہ پانی نکلتا ہے کہ وہ نہ صرف مدرسہ والوں کی ضرورت کے لئے کافی ہے بلکہ آس پاس کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس جامعہ ریاض الاسلام کی زیر تعمیر عمارت کے سامنے ایک وسیع اور شاندار گیٹ بن رہا ہے۔ میں نے تجویز کیا کہ اس گیٹ کا نام زمزم گیٹ رکھا جائے۔ میں نے کہا کہ "زمزم" ایک علامتی نام ہے جو یاد دلاتا ہے کہ کس طرح ایک صحرائی دنیا میں اسلام کا ایک شاندار باغ اگا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں کے اس صحرا میں بھی اسلام کا ایک باغ اگے گا جو اسلام کی روشنی سے آج کی دنیا کو منور کرے گا۔

اس کے بعد ہم لوگ مدرسہ تحفیظ القرآن پہنچے۔ یہاں کچھ دیر قیام رہا۔ اور بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر میر محمود علی خالد (پیدائش ۱۹۴۲) تھے وہ "الرسالہ" کے ایک پرانے قاری ہیں اور "الرسالہ" کے نقطۂ نظر سے پورا اتفاق رکھتے ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ الرسالہ مشن کے بارے میں آپ اپنا تاثر بتائیے۔ انھوں نے جواب دیا "آج سارے لوگ الرسالہ کی بات تو مانتے ہیں مگر وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ میں نے دوبارہ پوچھا، اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ذہنی طور پر اب تمام لوگ اس کو صحیح مانتے ہیں لیکن ماحول کے خوف سے اس کے اظہار کی ہمت نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے کہ اظہار نہ کرنے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اس کو غلط سمجھتے ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے

اندر اعتراف حق کی جرأت نہیں۔

۷ فروری کی شام کو ہمارا قافلہ حیدر آباد سے چل کر محبوب نگر پہنچا۔ یہاں دینی تعلیم سے منسلک علماء اور دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور دیر تک علمی اور دینی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں محبوب نگر میں پڑھی گئیں۔

محبوب نگر جاتے ہوئے ہم چند ساتھی ایک گاڑی میں سوار تھے۔ ہر ایک اپنی زندگی کے انوکھے تجربات بتا رہا تھا۔ ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے کہا کہ میں نے ایک نظم سنی تھی جس کا ایک مصرعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ تھا: لمحوں میں صدیاں جی آیا۔ حبیب بھائی نے کہا کہ میں ایک مجلس میں شریک ہوا۔ وہاں ایک شاعر نے ایک نظم سنائی اس کا ایک مصرعہ یہ تھا: میں نے جس کو جیون سمجھا وہ تو بس ایک پل نکلا۔ مولانا سید اکبر الدین قاسمی صاحب نے بتایا کہ میں ایک بس میں سفر کر رہا تھا۔ اس میں کنڈکٹر کی سیٹ پر یہ بامعنی شعر لکھا ہوا تھا:

اک تبسم ہزار شکووں کا کتنا پیارا جواب ہوتا ہے

محبوب نگر میں سب سے پہلے ہمارا قیام محمد عبد القادر صاحب کے مکان پر تھا۔ وہیں سب کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہم لوگوں کو جسمانی غذا سے زیادہ روحانی غذا کی فکر کرنی چاہئے۔ آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اس لئے کماتے ہیں کہ دنیا کے لذیذ کھانوں کو اپنے دستر خوان پر جمع کر سکیں اور اس کو کھا کر اور کھلا کر خوش ہوں۔

خدا نے اپنی دنیا میں دو قسم کی غذائیں پیدا کی ہیں ــــــ جسمانی غذا اور روحانی غذا۔ عام لوگ صرف جسمانی غذا کی لذتوں سے آشنا ہیں۔ اس سے ہزاروں گنا بڑی لذت وہ ہے جو ٹھیک اسی دنیا میں ہمارے خدا نے ہمارے لئے فراہم کی ہے۔ کم تر غذا پر ٹوٹنا اور برتر غذا کو نظر انداز کرنا، میرے نزدیک خدا کی تخلیق کی ناقدری ہے۔ جسمانی غذا صرف ہمارے مادی وجود کے بقا کے لئے ہے جب کہ روحانی غذا ہماری ابدی حیات کا سرمایہ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہم کو کھانے کا شوق نہیں بلکہ کھلانے کا شوق ہے۔ میں نے جواب

ا کہ یہ شوق اچھا ہے مگر آپ کو چاہئے کہ مادی کھانا کھلانے کے بجائے لوگوں کو روحانی کھانا لائیں۔ مثلاً لوگوں کو اسلام کا لٹریچر پڑھانا۔ لوگوں تک اسلام کا بابرکت پیغام پہنچانا، لوگوں کو بے موری کے اندھیرے سے نکال کر شعور کے اجالے میں لانا، وغیرہ۔

محبوب نگر میں جناب عبدالحکیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پندرہ سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے مطالعہ سے یہ سمجھا ہے کہ اس دنیا کا ہر معاملہ پر امن کوشش یا بات چیت کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ تشدد کا طریقہ صرف مسائل میں اضافہ کرتا ہے، وہ مسائل کو حل نہیں کرتا۔ مجھے الرسالہ کے اس نظریہ سے پورا اتفاق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر موجودہ زمانہ کے مسلمان صرف اس یک اصول کو پکڑ لیں تو ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں۔ ترقی کی دوڑ میں وہ بھی دوسری قوموں ی طرح آگے بڑھ جائیں۔

۷ فروری کی شام کو محبوب نگر میں الفرقان ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا۔ الفرقان ایجوکیشنل سوسائٹی یہاں کے کچھ تعمیر پسند لوگوں نے قائم کی ہے۔ میں نے کہا کہ ایجوکیشن بلاشبہ ایک بنیادی کام ہے۔ مسلمانوں کو اس میدان میں زیادہ سے زیادہ سرگرم ہونا چاہئے۔ میں نے مزید کہا کہ ایجوکیشنل کام کے دو شعبے ہیں۔ ایک ہے لوگوں کی تعلیم کا نتظام کرنا۔ اور دوسرا کام ہے لوگوں کے اندر صحیح فکر و شعور پیدا کرنا۔ اور یہ دونوں ہی کام یکساں طور پر اہم ہیں۔

اس اجتماع میں محبوب نگر کے تعلیم یافتہ افراد بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس میں مجھے خطاب کرنے کا موقعہ ملا۔ اس خطاب کا موضوع تھا: اسلام دور جدید میں۔ اس موضوع کی نسبت سے ایک تفصیلی تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ نئے دور کا مطلب ہے بدلا ہوا دور۔ ہر بار جب حالات بدلتے ہیں تو وہ کسی نظریہ کے لئے ایک امتحان (ٹسٹ) ہوتا ہے۔ یعنی یہ سوال کے بدلے ہوئے حالات اس کی حقانیت کی تصدیق کرتے ہیں یا تردید۔

میں نے مختلف مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ اسلام اس ٹسٹ پر مکمل طور پر پورا اترتا ہے۔ نیا بدلا ہوا دور اسلام کی صداقت کو از سر نو ثابت شدہ بنا رہا ہے۔ اس بات کو مختلف علمی اور تاریخی مثالوں کے ذریعہ واضح کیا۔

محبوب نگر میں پہلے جامعہ سراج العلوم کے نام سے لڑکوں کی دینی تعلیم کا ایک مدرسہ تھا۔ یہ خدا کے فضل سے کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اب اس کے ذمہ دار مولانا امیر اللہ خاں قاسمی اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے لڑکیوں کی دینی تعلیم کا بھی ایک بڑا ادارہ قائم ہو گیا ہے جس کا نام جامعہ سراج البنات ہے۔ اس کی شاندار عمارت میں نے دیکھی۔ میں نے کہا کہ آج کل مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے مدرسے جگہ جگہ قائم ہو رہے ہیں۔ یہ ملت کے لئے نئے روشن مستقبل کی علامت ہے۔ محبوب نگر کے اس جامعہ سراج البنات کے لئے جو زمین خریدی گئی وہ ایک ہندو کی تھی۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ یہ زمین لڑکیوں کی تعلیم کے لئے خریدی جارہی ہے تو اس ہندو نے مزید تین سو گز زمین بلا قیمت دے دی۔ اس نے کہا کہ یہ ہماری طرف سے آپ کے تعلیمی ادارہ کے لئے عطیہ ہے۔ تعمیری کام میں اتنی کشش ہے کہ لوگ اپنے آپ اس کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

حیدر آباد اور محبوب نگر کے پروگرام کے آخر میں بھوپال یونیورسٹی کے ڈاکٹر حمید اللہ ندوی نے اپنا آخری تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ حیدر آباد کے اس پروگرام میں شرکت کے بعد میرا یہ احساس ہے کہ حیدر آباد میں حلقۂ الرسالہ نئی طاقت کے ساتھ ابھرا ہے۔ حلقۂ الرسالہ کے افراد نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ مشن کو لے کر میدان میں آئے ہیں۔

مولانا سید اکبر الدین قاسمی صاحب نے یہاں کے پروگرام کے بارے میں اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ پروگرام مجموعی اعتبار سے بہت کامیاب، مفید اور موثر ثابت ہوئے۔ خاص طور پر اہل علم اور سنجیدہ حضرات نے بڑے ذوق و شوق سے اس میں حصہ لیا اور خطابات کو دلچسپی کے ساتھ سنا۔

حبیب بھائی نے حیدر آباد کے ان پروگراموں کے بارہ میں اپنا تاثر ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ سارے پروگرام ممتاز (excellent) رہے اور ایسا لگتا ہے کہ آپ کے خلاف جو غلط پروپگنڈا ہوا تھا وہ ان پروگراموں کے بعد بڑی حد تک دور ہو گیا۔

بھوپال سے ان پروگراموں میں شرکت کے لئے بلال الدین صاحب آئے تھے۔ حیدر آباد کے ان پروگراموں کے بارے میں انھوں نے اپنا یہ تاثر بتایا کہ میں شروع سے الرسالہ کو پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں اور آپ کی سب کتابیں بھی پڑھی ہیں مگر یہاں آکر ایسا محسوس ہوا کہ میں پھر سے الرسالہ مشن کا تعارف حاصل کر رہا ہوں۔

۷ فروری کی شام کو انگریزی روزنامہ دکن کرانیکل کے نمائندہ میر ایوب علی خاں صاحب نے تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو حبیب بھائی کی رہائش گاہ پر لیا گیا۔ انٹرویور نے مختلف قسم کے سوالات کئے۔ میری ذات کے بارے میں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا: موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے لمبی مدت تک ہمالیائی کوششیں کیں۔ مگر نتیجہ صفر رہا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان کی یہ کوششیں رد عمل کے تحت وجود میں آئیں۔ وہ کسی مثبت فکر کا نتیجہ نہ تھیں۔ اس دنیا کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ مثبت فکر کے تحت وجود میں آنے والا عمل نتیجہ خیز ہو اور رد عمل کے تحت وجود میں آنے والا عمل بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔ یہ قانون ہر قوم کے لئے ہے، اس میں کسی کا استثناء نہیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ جن لوگوں سے میرا اختلاف ہے وہ شخصی نہیں ہے بلکہ صرف نظریاتی ہے۔ آپ میری تحریروں کو پڑھیں آپ پائیں گے کہ میں کبھی کسی کی شخصی عیب جوئی نہیں کرتا بلکہ صرف اس کے مسلمہ فکر پر تنقید کرتا ہوں۔ میرے نزدیک شخصی عیب جوئی حرام ہے۔ اور نظریاتی تنقید و تجزیہ عین جائز بلکہ ضروری ہے۔ یہ انٹرویو مفصل طور پر دکن کرانیکل ۱۳ فروری ۲۰۰۰ میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو کا کچھ حصہ اخبار سے لے کر اگلے صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

'People will follow money not RSS'

Maulana Waheeduddin Khan is a renowned scholar of Islam. The Maulana believes that a person can be pious and modern in outlook at the same time since, according to him, there is no clash between science and faith. Having a command over Arabic, Persian, English and Urdu the Maulana has been writing and speaking about peace between communities. He has written numerous books explaining various aspects of Islam to Muslims as well as non-Muslims. MIR AYOOB ALI KHAN met the Maulana during his visit to Hyderabad last week and made him speak his mind.

Q. *In your discourses and writings you take the support of science to reinforce religious beliefs. Religion and science are two different things. How can science that is based on reason support religion that is a matter of belief?*

A. The difference of approach between science and religion has disappeared with time. Earlier, science used to say that for an argument to be valid, it should be demonstrative. With the splitting of atom science is no more in a position to say that. It is talking about unseen things. That is what religion has always spoken about. Let us say that science follows the system of developing a hypothesis goes over to observation and comes up with verification. Religion also follows the same methodology to establish a statement. For example, let's say that the Quran is the book of God is a hypothesis. The statement in the Quran that God has saved the body of Pharoah who lived in the period of Prophet Moses was made 1300 years ago before it was discovered that his body actually had been preserved in a pyramid. This observation verifies that the Quran is the book of God.

Q. *According to many scholars, Muslims are taking to confrontation because their reconciliatory approach has failed; dawah work has failed.*

A. Peaceful methods never fail. Why should there be confrontation? Look at the stars in the sky. There are millions of them and they have always co-existed peacefully. Dawah work never fails, it is the violent activism that has failed.

Q. *There are people who believe that violence is an integral part of Islam. What do you think?*

A. I would reject this charge outright. Islam is a religion for all time. If it preached violence, no one would be left on this earth. And when there are no people, what would Islam do? One should always remember Islam preaches peace and harmony, not destruction and chaos.

Q. *What is your stand on the question of Babri Masjid now?*

A. Before the demolition of Babri Masjid I had advised Muslims to carry out their struggle peacefully; not to take it to the streets. After the demolition I say that the reconstruction of the Babri Masjid would mean destruction of the makeshift Ram Mandir, which is very difficult. Therefore, the Muslims should leave the question of Babri Masjid to the conscience of the nation. The agitation should end.

Q. *Government has given permission to its employees for attending RSS camps. What is your comment?*

A. The permission will not have any effect. The romantic era of the RSS when people wanted to attend its camps is gone. It is an era of MNCs where everybody is interested in making money. Not many people would be interested in wasting their time with the RSS meetings.

—*Deccan Chronicle, Hyderabad,* February 13, 2000

اجتماعات کے علاوہ یہاں مجلس کی صورت میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لوگوں سے اظہار خیال کا موقع ملا۔ یہ سب شہر کے تعلیم یافتہ مسلمان ہوتے تھے۔ ایک مجلس میں میں نے کہا کہ جدید حیدر آباد میں مسلمانوں کی تعمیری سرگرمیاں بہت قابلِ قدر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا سنگل پوائنٹ فار مولا ایجوکیشن ہے۔ سر سید احمد خاں نے غالباً سب سے پہلے تعلیم کی اہمیت کو محسوس کیا۔ سر سید کا نقطۂ نظر ان کے ترجمان الطاف حسین حالی کے اس شعر میں ملتا ہے:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے　　کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

موجودہ زمانہ میں نہ صرف ہندستان میں بلکہ پوری مسلم دنیا میں سیکڑوں کی تعداد میں بڑے بڑے رہنما اٹھے۔ مگر سر سید کے سوا شاید کوئی نہیں جس نے حصول علم کو اشو بنا کر باقاعدہ تحریک چلائی ہو۔ لوگ دوسرے دوسرے عنوانات پر مسلم عوام کو ابھارتے رہے۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی نے نو آبادیاتی نظام کے خلاف مہم چلائی۔ محمد علی جوہر نے ترک خلافت کے تحفظ کا ہنگامہ کھڑا کیا۔ سید قطب مصری نے سیاسی اقتدار کی تبدیلی کو سب سے بڑا کام سمجھا۔ آیت اللہ خمینی نے شاہ ایران کو اپنی تحریک کا نشانہ بنایا۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی نے ایوب اور بھٹو کے خلاف تقریر اور تحریر کا غوغا برپا کیا، وغیرہ۔ حتیٰ کہ ان مسلم رہنماؤں نے مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے کی کوشش کی۔ مثلاً اکبر الٰہ آبادی اور سید ابو الاعلیٰ مودودی نے انتہائی بے شعوری کے تحت کالج اور یونیورسٹی کو قتل گاہ بتایا۔ اب مسلمانوں نے تعلیم حاصل کرنا شروع کیا ہے مگر یہ ان کے رہنماؤں کی رہنمائی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ وہ نئے حالات کی بنا پر ہے۔

ایک مجلس میں میرے خلاف اس تصویری فتنہ کی بابت سوال کیا گیا جس کی وضاحت ایک سال پہلے الرسالہ کے چند شماروں میں آچکی ہے۔ ہندستان کے قدیم اور مستند ادارہ دار العلوم دیوبند نے واضح طور پر میری موافقت میں فتویٰ دیا جو الرسالہ اکتوبر ۱۹۹۹ میں چھپ چکا ہے۔

میں نے کہا اس فتنہ میں الذی تولی کبرہ (النور) کا کردار ایک نام نہاد اسلامی جماعت نے ادا کیا تھا۔ میرے جوابات اور مذکورہ فتویٰ کی اشاعت کے بعد یہ لوگ چپ ہو گئے۔ حالانکہ

اس طرح کے معاملہ میں چپ رہنا بھی جرم ہے۔ ان لوگوں کے اوپر فرض تھا کہ معاملہ کی وضاحت کے بعد وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرتے۔ جس طرح انھوں نے جھوٹی تصویر کے معاملہ کی اشاعت کی تھی اسی طرح وہ اپنی مجرمانہ غلطی کے اعتراف کی بھی مکمل اشاعت کرتے۔ اس طرح کے معاملہ میں خاموشی بجائے خود ایک جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

وہ فتنہ یہ تھا کہ ایک بدنام ہندی اخبار ہے جس کا کام مشہور شخصیتوں کا کیریکچر (caricature) بنانا اور اپنے سطحی قارئین کو تماشہ کی چیزیں پڑھنے کے لئے دینا ہے۔ اس اخبار نے میرے بارے میں ایک لغو تصویر چھاپی۔ مذکورہ اسلامی جماعت نے اس بیہودہ تصویر کو لے کر اپنے نام نہاد میڈیا میں چھاپا اور اس کی فوٹو کاپی تیار کر کے نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں پھیلا دیا۔

پچھلے سال جب بھی میں کسی مشرقی یا مغربی ملک میں گیا وہاں میں نے دیکھا کہ تصویر کا یہ فتنہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام کی تاریخ میں شاید یہ پہلا انٹرنیشنل کرائم تھا۔ پچھلی صدیوں میں جب کہ تیز رفتار میڈیا موجود نہ تھا، کسی جھوٹ کو عالمی سطح پر پھیلانا بھی ممکن نہ تھا۔ جدید دور کے میڈیا نے پہلی بار اس کو ممکن بنایا ہے کہ کوئی شخص یا جماعت اس قسم کا انٹر نیشنل کرائم کر سکے۔ عجیب بات ہے کہ اس انٹر نیشنل کرائم کا کارنامہ اس جماعت نے انجام دیا جس نے "بر عکس نہند نام زنگی کافور" کے اصول پر اپنا نام اسلامی جماعت رکھا ہے۔

میں نے کہا کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ میں اس جھوٹے الزام سے مکمل طور پر بری ہوں۔ مگر جہاں تک مذکورہ اسلامی جماعت کا تعلق ہے وہ مبینہ طور پر ایک سنگین جرم کا ارتکاب کر چکی ہے۔ مذکورہ نام نہاد اسلامی جماعت نے بلاشبہہ اپنے اس مکروہ فعل سے اپنے آپ کو اکسپوز کر دیا ہے۔ یہ جماعت بزعم خود "مکمل اسلام" کے نفاذ کی علم بردار ہے۔ مگر اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مکمل اسلام قائم کرنے کے یہ علم بردار بظاہر جزئی اسلام پر بھی قائم نہیں۔

۷ فروری کی شام کو محبوب نگر سے واپس ہو کر ہم لوگ حیدر آباد میں داخل ہوئے تو رات کے ایک بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس وقت سڑکوں کی صفائی ہو رہی ہے۔

جب کہ دہلی کے صفائی کرمچاری صبح کو دیر سے اس وقت صفائی کا کام شروع کرتے ہیں جب لوگوں کی آمد ورفت سڑکوں پر شروع ہو جاتی ہے۔ حیدر آباد میں اس طرح کی بہت سی قابلِ ستائش چیزیں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ پہلے ایسا نہ تھا۔ یہ نئی گورنمنٹ کے زمانہ میں ہوا ہے۔ یہاں میں جن لوگوں سے ملا سب نے موجودہ ریاستی حکومت کی حسنِ کارکردگی کا اعتراف کیا۔

یہاں کچھ لوگ میری قیام گاہ (بیگم پٹ) پر آئے اور بتایا کہ وہ احمدی جماعت (قادیانی جماعت) سے تعلق رکھتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے بارہ میں جو دعویٰ کیا اس کی بنیاد دو میں سے کسی ایک ذریعہ علم پر ہو سکتی ہے ــــــ سائنس یا قرآن۔ میں نے کہا کہ سائنس سرے سے اس کو نہیں مانتی کہ کوئی زندہ خدا ہے جو انسان کے اوپر الہام کرتا ہے۔ اس لئے سائنس آپ کے دعویٰ کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دعویٰ کی بنیاد قرآن ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کا اعلان کر چکا ہے۔ اس لئے قرآن کی بنیاد پر اس قسم کے دعوے کی سرے سے گنجائش نہیں۔ انھوں نے قرآن کی کچھ آیتیں (مثلاً تتنزل علیهم الملائكة) پیش کیں۔ میں نے کہا ان آیتوں سے مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کی تائید نکالنا ایسا ہی ہے جیسے کچھ لوگ قرآن سے لفظ وِدًّا (مریم ۹۶) لے کر کہتے ہیں کہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ وید بھی قرآن کی طرح ایک آسمانی کتاب ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی باتیں استدلال نہیں بلکہ صرف اپنی بے علمی کا اشتہار ہیں۔

کچھ لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ سماجی کام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ سماجی یا انسانی خدمت کے نام پر ایک کام شروع کریں اور غیر لوگوں سے تعاون کی اپیل کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ کسی سے کوئی اپیل نہ کریں۔ آپ صرف یہ کریں کہ جو مفید انسانیت کام آپ کے ذہن میں ہے اس کو اللہ کا نام لے کر شروع کر دیں اور اخلاص و دیانت کے ساتھ اس کی تکمیل میں لگ جائیں۔ اس کے بعد یہ یقینی ہے کہ لوگوں کا تعاون آپ کو حاصل ہونے لگے گا۔

ایک کام وہ ہے جس کے اچھا ہونے کا آپ اعلان کریں۔ دوسرا کام وہ ہے جس کا اچھا ہونا خود دوسروں کو دکھائی دیتا ہو۔ پہلی نوعیت کے کام میں بھی اگرچہ دوسروں کا تعاون ملتا ہے مگر دوسری نوعیت کے کام میں جو تعاون ملتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

حیدر آباد سے ایک انگریزی میگزین نکلتا ہے جس کا نام بھارتیہ پرجنا (Bharatiya Pragna) ہے۔ یہ آر ایس ایس گروپ کا میگزین ہے۔ یہاں میں نے اس کا شمارہ فروری ۲۰۰۰ دیکھا۔ اس کے صفحہ ۳۹ پر انڈیا کے بارے میں حقائق (Facts about India) کے عنوان کے تحت کئی باتیں درج تھیں۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ ستر ہویں صدی عیسوی میں انگریزوں کے حملہ سے پہلے انڈیا دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک تھا:

India was the richest country in the world till the time of the British Invasion in the early 17th century (p.39)

الفاظ کو بدل دیا جائے تو اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے حملہ سے پہلے مسلم عہد میں ہندستان دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک تھا۔

اس سفرنامہ میں اسی قسم کا ایک اور حوالہ میں نے درج کیا ہے جس میں یہ اقرار کیا گیا ہے کہ آزادی سے پہلے برٹش دور میں ہندستان دنیا کا ایک اعلیٰ ترقی یافتہ ملک تھا۔ مگر آزادی کے بعد پچاس سال تک ملکی حکمرانوں کے ہاتھ میں رہنے کے بعد اب انڈیا کا یہ حال ہے کہ وہ اقتصادی اعتبار سے دنیا کے ملکوں میں ۷۷ اویں نمبر پر ہے (ملاحظہ ہو زیر نظر الرسالہ کا صفحہ ۴۲)

جناب عبد الرحمٰن خاں صاحب (پیدائش ۱۹۵۸) الٰہ آباد بینک میں منیجر ہیں۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ سیاحت کے لئے حیدر آباد گئے۔ ۱۲ فروری ۲۰۰۰ کو وہ حیدر آباد پہنچے اور تین دن وہاں رہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ حیدر آباد کے بارہ میں اپنا کچھ تاثر بتائیے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے تجربہ میں ایسا محسوس ہوا کہ حیدر آباد کے لوگوں میں نسبتاً انسانی اوصاف زیادہ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حیدر آباد ایئرپورٹ پر ہم اترے تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے ٹیکسی کی ڈکی میں اپنا سامان رکھا اور پھر ہم لوگ ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور نے ایک

پٹرول پمپ پر ٹیکسی کھڑی کی تو میں نے کہا کہ مجھے ڈکّی سے کچھ نکالنا ہے۔اس وقت میری زبان سے یہ نکلا کہ میں نے غلطی سے اپنا پرس ڈکی میں رکھ دیا ہے۔ اس پر ڈرائیور بولا کہ جناب، یہ حیدر آباد ہے، یہ دہلی نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے بیٹھئے۔ آپ کا سامان محفوظ ہے۔

اس کے بعد جب میں حیدر آباد پہنچ کر وہاں گھوما اور وہاں کے مختلف طبقات کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ ڈرائیور نے درست کہا تھا۔ یہاں کے لوگوں میں واقعۃً انسانیت ہے۔ استثناء (exception) تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ اور یقیناً یہاں بھی ہوگا۔ مگر یہاں کے لوگوں کو میں نے عام طور پر دوسروں سے بہتر پایا۔

حیدر آباد کے مسلمانوں میں تعلیمی سرگرمیاں بھی دوسرے مقامات سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ یہاں کا مولوی طبقہ اور مسٹر طبقہ دونوں کثرت سے تعلیمی ادارے قائم کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانے میں مشغول ہیں۔

حیدر آباد میں ایک اور خاص چیز ہے جو شاید ہندستان کے کسی دوسرے شہر میں موجود نہیں۔ یہ صحافت ہے۔ حیدر آباد شہر ہندستان کا واحد شہر ہے جس کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی ایک باقاعدہ صحافت ہے۔ یہاں کئی اچھے اخبارات نکلتے ہیں جو شہر کے بیشتر مسلم گھروں میں پہنچتے ہیں۔ یہ اخبارات حیدر آباد کے مسلمانوں کے درمیان مسلسل رابطہ کا کام کرتے ہیں۔ ان اخباروں کے ذریعہ یہاں کے مسلمان ہر روز ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے واقف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے یہاں کے مختلف اخبارات دیکھے۔ ہر اخبار میں کسی نہ کسی صورت میں یہاں کے مسلمانوں کی دینی اور تعمیری سرگرمیوں کا تذکرہ تھا۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں حیدر آباد میں اردو زبان کا بہت چرچا تھا۔ ۱۹۱۹ میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی۔ اس کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ تمام مضامین بشمول سائنس یہاں اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ آج جامعہ عثمانیہ کو دیکھئے تو اس کا منظر بالکل مختلف دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد یہاں اردو زبان کو تنزل کا شکار ہونا پڑا۔ ۱۹۵۶ میں سنجیوا ریڈی آندھرا پردیش

کے پہلے چیف منسٹر بنے تو انھوں نے اردو کو ریاست کی دوسری زبان بنانے کا اعلان کیا۔ تاہم اس کے بعد بھی عملی طور پر اردو کو سرکاری سرپرستی بہت کم حاصل ہوئی۔

مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ اردو زبان حیدر آباد میں آج پوری طرح زندہ ہے۔ اردو کو یہ زندگی سرکاری سرپرستی کے ذریعہ نہیں ملی بلکہ یہ خود اہل اردو کا کارنامہ ہے جو نامساعد حالات کے باوجود اردو کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

حیدر آباد کی اہمیت کا ایک اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امریکی صدر بل کلنٹن نے ہندستان کا دورہ (۱۹۔۲۵ مارچ ۲۰۰۰) کیا تو دہلی اور بمبئی کے ساتھ وہ حیدر آباد بھی گئے۔ عجیب بات ہے کہ ۷ فروری کو جب کہ میں حیدر آباد میں تھا اس وقت ہندستان کی پوری حکومت اور ملک کے دانشوروں کا پورا طبقہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کلنٹن پاکستان نہ جائیں۔ نئی دہلی کی سرکاری شخصیتیں مسلسل واشنگٹن پہنچ رہی تھیں۔ حتی کہ نئی دہلی نے امریکہ کی ایک لابی کرنے والی کمپنی کو بہت بڑی رقم دے کر ہائر کیا تھا کہ وہ کلنٹن کو پاکستان جانے سے روکے۔ اس کوشش میں ہندستان نے کثیر رقم خرچ کی۔ ۷ فروری کو حیدر آباد میں بعض ساتھیوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ امریکی صدر پاکستان نہ جائیں۔ میں جانتا تھا کہ اس قسم کی چیزوں کا تعلق لابینگ سے نہیں ہوتا بلکہ نیشنل انٹرسٹ سے ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ ہندستان کے لیڈر اور دانشور جو خود بھی ہمیشہ اپنے انٹرسٹ پر چلتے ہیں وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر رہے کہ امریکہ بھی اس معاملہ میں اپنے نیشنل انٹرسٹ کی بنیاد پر فیصلہ کرے گا اور اپنے دورہ میں پاکستان کو ضرور شامل کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور بل کلنٹن نے ۲۵ فروری ۲۰۰۰ کو اسلام آباد کا دورہ کیا۔

۸ فروری ۲۰۰۰ کی صبح کو حیدر آباد سے واپس دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ حبیب بھائی کی رہائش گاہ سے روانہ ہو کر ہم لوگ ایئر پورٹ جا رہے تھے۔ حیدر آباد کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے راستہ میں ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اس دنیا میں کسی انسان کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ اس کا دل دوسروں کے لئے کھلا ہوا ہو۔ لوگوں کے لئے اس کے

دل میں شفقت اور خیر خواہی کا جذبہ ہو۔ وہ فیاضی کے ساتھ لوگوں کے کام آتا ہو۔ صرف انہیں لوگوں کے ساتھ نہیں جن سے اس کو ریٹرن کی امید ہو بلکہ ہر ایک کے ساتھ۔ مثلاً ایک آدمی اسکوٹر رکشا پر بیٹھے اور ایک کیلو میٹر تک جاکر اتر جائے پھر اس کے میٹر پر بحث کئے بغیر اس غریب رکشہ والے کو سو روپیہ کا نوٹ دے دے تو اس قسم کا فیاضانہ سلوک اس کی طرف اسی دنیا میں بہت زیادہ اضافہ کے ساتھ لوٹتا ہے۔ بے غرضی، سادگی، سخاوت، انسانی خیر خواہی، کھلے دل کے ساتھ سلوک، حق سے زیادہ اپنی ڈیوٹی کا احساس، اس قسم کے اوصاف اعلیٰ ترین انسانی اوصاف ہیں اور جس آدمی کے اندر یہ اوصاف ہوں، اس کی کامیابی میں کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

۸ر فروری کی صبح کو جہاز حیدر آباد سے آدھ گھنٹہ کی تاخیر کے ساتھ روانہ ہوا۔ جہاز کے اندر پڑھنے کے لئے مختلف اخبارات موجود تھے۔ دکن کرانیکل کا شمارہ ۸ فروری ۲۰۰۰ دیکھا۔ مشہور صنعت کار مسٹر وجے پت سنگھانیا کے قلم سے ایک مضمون تھا جس کا عنوان یہ تھا ــــــ کامیابی ہندستان میں غیر مقیم ہے:

Success is non-resident in India.

اس مضمون میں چند مثالوں کے ذریعہ دکھایا گیا تھا کہ ایک ہندستانی ہندستان میں ناکام رہتا ہے اور وہی ہندستانی باہر کے ملک میں جاکر بڑی بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ اس کا سبب مضمون میں یہ بتایا گیا تھا کہ آزادی کے بعد ہندستان میں بے شمار سوشلسٹ قوانین بنائے گئے۔ ان قوانین کے ذریعہ ایسی مصنوعی پابندیاں ملک میں رائج کی گئیں جو حوصلہ مند ہندستانیوں کے لئے پاؤں کی زنجیر بن گئیں۔

اس معاملہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا تھا کہ آزادی کے وقت ہندستان تمام نو آبادیاتی ملکوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔ اور اس کا مستقبل بہت روشن تھا۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ جی این پی کے اعتبار سے ہندستان دنیا کے ۲۰۹ ملکوں میں ۷۷ اویں نمبر پر ہے۔

At Independence, India was among the most advanced of all the

colonies with brilliant prospects for the future. Today with a GNP per head of US $370, it occupies a lowly 177th position among 209 countries of the world.

اس پچھڑے پن کا واحد سبب یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن لیڈروں کے ہاتھ میں انڈیا کی قسمت آئی انھوں نے اس کو غلط رخ پر چلادیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہندستانی لیڈر اگر کچھ نہ کرتے اور آزادی سے پہلے والے نظام کو بدستور ملک میں باقی رکھتے تو یقینی ہے کہ ملک کا حال آج اس سے بہت بہتر ہوتا جو اس وقت نظر آرہا ہے۔

دکن کرانیکل کے اسی شمارہ (۸ فروری) میں لیٹرس کے کالم میں ایک ہندو کا ایک خط Outmoded Religion کے عنوان سے چھپا تھا۔ یہ خط یہاں بلا تبصرہ نقل کیا جاتا ہے:

This is with reference to Mohan Guruswamy's article "Who will bell the Hindu cat?" I agree with the writer that Hinduism is entrapped in meaningless rituals and is divorced from the needs of modern day living. Unless we have the courage to weed out these outmoded practices, India will not be able to progress. (A B Prakash, Hyderabad)

دو گھنٹہ کی پرواز کے بعد جہاز جب دہلی کے اوپر پہنچا تو کمانڈر نے اعلان کیا کہ جہاز کے اترنے میں کچھ دیر لگے گی:

There will be some delay in landing.

جہاز دہلی کے اوپر گولائی میں تقریباً پینتالیس منٹ تک پرواز کرتا رہا۔ بتایا گیا کہ ایرپورٹ پر گہرے کہر کی وجہ سے رویت (visibility) بہت کم ہے۔ اس لئے جہاز وہاں اتر نہیں سکتا۔ آخر کار پائلٹ نے اعلان کیا کہ دہلی میں اس وقت اترنا ممکن نہیں۔ اس لئے اب جہاز یہاں سے بمبئی جارہا ہے۔ اس وقت جہاز کے چاروں طرف سورج چمک رہا تھا۔ جہاز کے چاروں طرف مکمل روشنی تھی۔ اگر آدمی نہ جانے کہ کہر نیچے زمین کی سطح پر ہے اور ہم اس کے اوپر ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہے ہیں، تو وہ سمجھے گا کہ پائلٹ غلط بیانی کر رہا ہے۔ کسی معاملہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ کافی نہیں کہ آپ اپنی قریبی دنیا کو دیکھ رہے ہوں۔ آپ کو گردوپیش سے باہر کی دنیا کو بھی

جانا ہوگا جو آپ کے قریب کی دنیا سے بالکل مختلف مگر حقیقی طور پر موجود ہے۔

یہ میرے لئے ایک وحشت خیز تجربہ تھا۔ مگر اس مسئلہ پر سوچتے ہوئے ایک اہم حقیقت میری سمجھ میں آئی۔ میں نے سوچا کہ دہلی ائرپورٹ پر گہرے کہر کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ وہاں کے لوگوں کو کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ جبکہ عین اسی وقت اوپر کی فضا میں ہر چیز پوری طرح روشن ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں افکار و نظریات کی کثرت نے ایسی حالت پیدا کر دی ہے جس کو ذہنی کہر آلودگی (Befogging of the mind) کہا جا سکتا ہے۔ لوگ دماغ رکھتے ہوئے کچھ نہیں سوچ پاتے۔ ذہنی کہر آلودگی کے اس مسئلہ نے لوگوں کو حقیقت کے معاملہ میں اندھا اور بہرہ بنا دیا ہے۔

اس "کہر" سے بچنے کی واحد صورت یہ ہے کہ آدمی اپنی فکری سطح کو بلند کرلے۔ وہ کہر سے اوپر اٹھ کر وہاں پہنچ جائے جہاں ہر چیز روشن ہے۔ اسی کو اسلام میں زہد کہا گیا ہے۔ زہد آدمی کو مادیات سے اٹھا کر اس بلند فکری اور روحانی سطح پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ ذہنی کہر آلودگی سے بچ کر بے آمیز روپ میں سوچ سکے۔ اور حقیقتوں کو غیر مشتبہ انداز میں دریافت کرلے۔

جہاز دہلی سے روانہ ہو کر دو گھنٹہ بعد بمبئی پہنچا۔ بمبئی ائرپورٹ پر جہاز تقریباً ایک گھنٹہ ٹھہرا۔ تمام مسافر جہاز کے اندر بیٹھے رہے۔ جہاز نے یہاں سے دوبارہ پرواز کی اور پھر دوبارہ دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ بمبئی سے دہلی تک کی پرواز دو گھنٹہ میں پوری ہوئی۔ ۸ فروری ۲۰۰۰ کو شام چار بجے جہاز دہلی پہنچ گیا۔

جہاز کا حیدر آباد سے دہلی پہنچ کر وہاں نہ اتر سکنا، کچھ دیر فضا میں منڈلانے کے بعد اس کا بمبئی آنا اور پھر یہاں سے دوبارہ دہلی جانا، یہ گویا ایک بحران کا واقعہ تھا۔ مجھے ایک قول یاد آیا کہ آدمی کی صلاحیت بحران میں پہچانی جاتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں کمیونی کیشن نے بحران سے نمٹنے کے معاملہ کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ ہوائی جہاز کے مسافروں میں سے اکثر کے پاس موبائیل ٹیلی فون تھا۔ انھوں نے جہاز کے اندر

سے ٹیلی فون کر کے اپنے گھروں سے ربط قائم کیا۔ اسی قسم کا ایک تاریخی واقعہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ کو کراچی ائرپورٹ پر پیش آیا۔ جنرل پرویز مشرف کولمبو سے کراچی آرہے تھے۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، پاکستانی وزیر اعظم نواز شریف نے کراچی ائرپورٹ پر احکام بھیج دئے کہ جہاز وہاں اترنے نہ پائے۔

جنرل پرویز مشرف کے لئے یہ ایک بحران کی حالت تھی۔ مگر موبائیل ٹیلی فون ان کے کام آیا۔ انھوں نے فضا سے موبائیل ٹیلی فون کے ذریعہ کراچی کے اعلیٰ فوجی افسر سے ربط قائم کیا۔

رپورٹ کے مطابق، کراچی کے فوجی افسران فوراً حرکت میں آگئے۔ انہوں نے کراچی ائرپورٹ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اس کے بعد وہ ائرپورٹ کے کنٹرول روم میں پہنچے۔ اس وقت جنرل پرویز مشرف کا جہاز فضا میں منڈلا رہا تھا۔ افسروں نے دوبارہ ربط قائم کر کے جہاز کے پائلٹ سے کہا کہ تم اپنا جہاز کراچی کے ائرپورٹ پر اتارو۔ ایک طرف کراچی میں یہ ڈرامہ ہوا اور دوسری طرف اسلام آباد میں فوج نے تیزی سے حرکت کر کے وزیر اعظم کی رہائش گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ اور نواز شریف کو گرفتار کر کے انہیں نظر بند کر دیا۔ یہ ساری تیز رفتار کارروائی جدید کمیونیکیشن کے ذریعہ ممکن ہوئی۔

۸ فروری ۲۰۰۰ کو میں کسی قدر تاخیر کے ساتھ دہلی پہنچا۔ میں نے سوچا کہ اس سفر میں میرے ساتھ کئی ناموافق واقعات پیش آئے۔ تاہم آخر کار میں سفر سے واپس ہو کر اپنے گھر آگیا۔ مگر زندگی کا ایک اور سفر ہے جس میں واپسی ممکن نہیں۔ یہ موت کا سفر ہے۔ موت کے سفر کا سب سے زیادہ بھیانک پہلو یہ ہے کہ اس میں صرف جانا ہے، اس میں لوٹنا نہیں ہے۔ کیسا عجیب لمحہ ہوگا جب انسان پر یہ کھلے گا کہ اس نے زندگی کے پچھلے دور میں ایسی کوتاہیاں کی ہیں جن کا بھیانک انجام اسے لازمی طور پر زندگی کے اگلے دور میں بھگتنا ہے۔ مگر اب یہ موقع نہیں کہ وہ دوبارہ پچھلی زندگی میں جائے۔ اور مطلوب عمل کر کے آخرت میں پہنچے۔ دنیا میں کسی انسان کے لئے سب سے زیادہ غم کی بات یہ ہوتی ہے کہ ایک موقع اس کے سامنے آیا مگر وہ اس کو

استعمال نہ کر سکا۔ یہی غم زیادہ شدید انداز میں آخرت میں انسان کو لاحق ہوگا۔ کھوئے ہوئے مواقع (missed opportunities) کی تلخ یاد موجودہ دنیا میں بھی آدمی سے اس کا سکون چھین لیتی ہے پھر آخرت میں کھوئے ہوئے مواقع کی تلخ ترپاد آدمی کو کتنا زیادہ بے چین کرے گی اس کا اندازہ کرنا آج کے حالات میں ممکن نہیں۔

حیدر آباد سے واپسی کے بعد وہاں کے ایک صاحب نے حیدر آباد کے روزنامہ منصف (۱۱ر فروری ۲۰۰۰) میں چھپا ہوا ایک مراسلہ بھیجا۔ اس کے مراسلہ نگار صفدر حسین (اکبر باغ) تھے۔ اس مطبوعہ مراسلہ کا ایک اقتباس یہ ہے ــــ "ہمارے خیال میں مولانا وحید الدین جیسا پایہ کا عالم ڈھونڈے سے بھی ہندوپاک میں نہیں ملے گا۔ حال ہی میں مولانا نے حیدر آباد میں ایک خطاب کیا جس کا عنوان یہ تھا: اکیسویں صدی میں اسلام۔ مولانا موصوف نے اپنے فکر انگیز خطبے میں جہاں بہت سی اچھی باتیں بتائیں وہیں سب سے اچھی اور کارگر بات یہ کہی کہ ہندستان کے مسلمانوں کو غیر مسلم اکثریت سے نمٹنے کے لئے "یک طرفہ صبر" کی پالیسی اختیار کرنا چاہئے۔ اس کو اگر پھیلائیں تو بات قدم بوسی تک پہنچتی ہے۔ ہمارے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے اس یک طرف صبر کی وضاحت فرمائیں تو ہم چین کی نیند سو سکیں گے"۔

یہ شک وشبہہ تمام تر غلط فہمی کی بنا پر ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں جو بات کہی تھی وہ صبر برائے صبر نہیں تھی بلکہ صبر برائے استخدام فُرَص (استعمالِ مواقع) تھی۔ میں جب صبر کی بات کرتا ہوں تو وہ کسی کے آگے جھکنے کے لئے نہیں بلکہ مواقع دعوت کو استعمال کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ آپ کسی بھی امکان کو اس حکمت کے بغیر اپنے حق میں استعمال نہیں کر سکتے۔ مزید یہ کہ دعوتی کام کے لئے صبر کی ضرورت صرف ہندستان میں نہیں بلکہ تمام ملکوں میں ہے، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک۔ حکیمانہ صبر کے اسی اصول کو استعمال کر کے تبلیغی جماعت اور تمام اسلامی ادارے ترقی کر رہے ہیں۔ حتی کہ ہر مسلمان جو اپنے ذاتی معاملات میں کامیاب ہے وہ اسی حکمتِ صبر کو استعمال کرنے کی وجہ سے کامیاب ہے۔ صبر فطرت کا ایک اصول ہے۔ اس اصول کو

استعمال کئے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

میں نے اپنے خطاب میں غیر مسلموں سے "نمٹنے" کی بات نہیں کہی تھی بلکہ موجود مواقع کو استعمال کرنے کی بات کہی تھی۔ میں اس نظریہ کو بالکل بے بنیاد سمجھتا ہوں کہ ہندستان یا دوسرے ملکوں کے غیر مسلم لوگ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور ہمارے لئے یہ مسئلہ ہے کہ ہم ان کی دشمنی اور سازش سے کس طرح نپٹیں۔ میرے نزدیک موجودہ دنیا فکر و عمل کی آزادی کی دنیا ہے۔ آج کی دنیا میں ہمیں جس چیلنج کا سامنا ہے وہ اپنی نوعیت میں عملی نہیں ہے بلکہ فکری ہے۔ ہمارے لئے کسی کی طرف سے عملی زیادتی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ فکری چیلنج کا مسئلہ ہے۔ دور سائنس میں پیدا ہونے والے افکار اسلامی عقائد کو چیلنج کر رہے ہیں۔ یہ ایک فکری اور نظریاتی چیلنج ہے اور ہمیں فکری اور نظریاتی سطح پر اس کا جواب دینا ہے۔ میری کتاب مذہب اور جدید چیلنج اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے مختلف مقامات پر غیر مسلم قوموں کی طرف سے جن "زیادتیوں" کا مسئلہ ہے وہ نااہل مسلم لیڈروں کی نادانیوں کی بنا پر پیدا ہوا ہے نہ کہ غیر مسلموں کی طرف سے کسی مفروضہ دشمنی کی بنا پر۔ اگر یہ مسلم لیڈر ملک و مال کے لئے چلائی جانے والی اپنی سطحی سیاست کو چھوڑ دیں اور دعوت کو اپنا میدان عمل بنالیں تو اس قسم کی زیادتیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں گی۔

میں حیدر آباد سے واپس ہو کر دہلی پہنچا تو ڈاک میں جو خطوط ملے ان میں سے ایک خط آندھرا پردیش کے چیف منسٹر چندرا بابو نائیڈو کا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ چندرا بابو نائیڈو میری تحریریں پڑھتے رہے ہیں اور میرے تعمیری مشن کی قدر کرتے ہیں۔ ان کا یہ خط یہاں اگلے صفحہ پر نقل کیا جارہا ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ہندوستان کی مسلم تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اب تک اس ملک میں یہ حال تھا کہ یہاں کے ہندو لوگ مسلم علماء یا مسلم رہنماؤں کے نام سے جن

NARA CHANDRA BABU NAIDU

HYDERABAD

Dt: 27-1-2000

CHIEF MINISTER
ANDHRA PRADESH

Dear Sri Moulana Waheeduddin Khan ji,

I am happy to know that you have been bestowed with the honour of Padma Bhushan on the Republic Day in recognition of your attainment of excellence in your field and services to the society and the nation. I take this opportunity to convey my best wishes and congratulate you on achieving the honour.

We, in Andhra Pradesh are striving continuously for excellence in all fields and develop the State as Swarna Andhra Pradesh, a State guided by excellence, powered by knowledge and driven by wisdom.

I am sure you will continue to contribute for the progress and prosperity of the nation.

With regards,

Yours sincerely,

(N.CHANDRABABU NAIDU)

Maulana Wahiduddin Khan,
C-29, Nizamuddin West,
New Delhi - 110 013

مسلمانوں کو جانتے تھے ان کی پہچان ان کے نزدیک صرف یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے وکیل ہیں وہ مسلمانوں کے ملی مفادات پر لکھتے اور بولتے ہیں نہ کہ تمام لوگوں کے مفادات پر۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ انہوں نے راقم الحروف کی صورت میں غالباً پہلی بار ایک ایسے مسلم عالم یا مسلم رہنما کو دریافت کیا ہے جس کی پہچان ان کی نظر میں غیر فرقہ وارانہ ہے۔ جس کی سوچ پورے ملک اور پوری انسانیت پر مبنی ہے۔ جو ان کے نزدیک ہندوؤں کا بھی اتنا ہی خیر خواہ ہے جتنا کہ مسلمانوں کا۔

میں پچھلے بیس سال سے برابر حیدر آباد جاتا رہا ہوں۔ اور وہاں کے مختلف پروگراموں میں شرکت کرتا رہا ہوں۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ میرے جلسوں میں کچھ پرجوش نوجوان میری باتوں پر اعتراض کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یا وہاں کے مسلم اخباروں اور رسالوں میں میرے خلاف مراسلے اور مضامین چھپتے تھے۔ مگر موجودہ سفر میں اس قسم کی کوئی منفی مثال سامنے نہیں آئی۔ عام طور پر میرے خیالات کی تائید کی گئی، افراد کی طرف سے بھی اور پریس کی طرف سے بھی۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پہلے میری جو بات لوگوں کو صرف ایک خیالی نظریہ معلوم ہوتی تھی وہ اب ایک عملی واقعہ بن چکی ہے۔ آزادی کے بعد کے زمانے میں ملک کے تمام لکھنے اور بولنے والے مسلمان صرف یہ لکھنا اور بولنا جانتے تھے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے کوئی اسکوپ نہیں۔ جب کہ میں یہ کہتا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کا اسکوپ مکمل طور پر موجود ہے۔ چنانچہ الفاظ کے جنگل میں اس وقت میری بات لوگوں کو اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب دو اور دو چار کی طرح لوگوں کو دکھائی دے رہا ہے کہ میں جو بات کہتا تھا وہی درست بات تھی۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے بارے میں یہ بات میں ۱۹۴۷ کے بعد سے ہی کہتا رہا ہوں۔ اگر نااہل رہنماؤں اور دانشوروں کی لفظی غوغا آرائی نے مسلمانوں کو گمراہ نہ کیا ہوتا تو آج وہ اپنی موجودہ حالت سے کئی گنا زیادہ ترقی کر چکے ہوتے۔

معروف صحافی مسٹر سعید سہروردی کا ایک مضمون حال میں چھپا ہے جس کا عنوان ہے: کھنڈروں کے بیچ چند مینار۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں کئی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ ہندستان

کے مسلمان غیر معمولی ترقی کر رہے ہیں۔ مثلاً عظیم ہاشم پریم جی، یوسف خواجہ حمید، ہابیل الیف خوراکی والا، شہناز حسین، ارشاد مرزا، وغیرہ۔ اس کے بعد مسٹر سعید سہر وردی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: "اس تجزیہ سے مولانا وحید الدین کی اس رائے کی تائید ہوتی ہے کہ جو مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں، تعصب اور امتیاز ان کی راہ کا پتھر نہیں بن سکتے" (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی ۱۰ جنوری ۲۰۰۰)

یہ چند مسلم نام وہ ہیں جنھوں نے حالیہ برسوں میں امتیازی ترقی کی ہے۔ تاہم جیسا کہ میں بار بار کہتا رہا ہوں یہ اقتصادی انفجار (economic explosion) کا زمانہ ہے۔ آج کی دنیا میں اقتصادی مواقع کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ چنانچہ اپنی کوشش کے بقدر ان ترقیاتی مواقع میں ہر مسلمان اپنا حصہ پا رہا ہے۔ ۱۹۴۷ کی حالت سے تقابل کیا جائے تو آج یہاں کا ہر مسلم خاندان پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آئے گا۔

بر صغیر ہند میں سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت سے مسلم رہنما اور دانشور لوگ مسلمانوں کو ایک ہی سبق دے رہے تھے۔ وہ یہ کہ فلاں فلاں رکاوٹ جب تک دور نہ ہو جائے اس وقت تک یہاں کے مسلمانوں کے لئے ترقی کے مواقع نہیں۔ انگریزوں کا سیاسی اقتدار، ہندو اکثریت کا تعصب، آر ایس ایس جیسی تنظیموں کی مسلم دشمنی، فرقہ پرستوں کی طرف سے دوسرا اسپین بنانے کا منصوبہ، وقت کے ابولہب اور ابوجہل کی تخریبی سازشیں، وغیرہ۔

مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے سو سال سے بھی زیادہ مدت سے مسلمانوں کو یہی سبق دے رہے تھے۔ مگر اب واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ سب بے دانشی اور بے خبری کی آوازیں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اپنی دنیا میں مواقع اور امکانات اتنے زیادہ رکھے ہیں کہ کوئی دشمن یا غیر دشمن کسی کا راستہ روک نہیں سکتا۔

اس معاملہ کی ایک چشم کشا مثال یہ ہے کہ نہ صرف بر صغیر ہند میں بلکہ پوری مسلم دنیا میں آج سب سے زیادہ دولتمند شخص ہندستان کا ایک مسلمان ہے۔ وہی ہندستان جس کے بارے

میں ہمارے علماء اور دانشور مسلسل یہ انکشاف کر رہے تھے کہ یہاں مسلم ملت کا وجود مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں۔ یہ ہندستانی مسلمان، ۵۵ سالہ مسٹر عظیم ہاشم پریم جی ہیں۔ ان کے بارے میں میڈیا میں بہت سی رپورٹیں آچکی ہیں۔ نئی دہلی کے انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (۱۹ فروری ۲۰۰۰) میں ان کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی ہے جس کا عنوان ہے دنیا کا دوسرا سب سے زیادہ دولتمند آدمی: The second richest man in the world

اس رپورٹ کے کچھ الفاظ یہ ہیں ـــــ بادشاہ، ملکہ، سلطان، عرب شیخ، سب راستہ سے ہٹ جاؤ۔ خوش آمدید، ہاشم پریم جی، دنیا کا دوسرا سب سے زیادہ امیر آدمی، ولیم گیٹ کے بعد، عظیم ہاشم پریم جی اس وقت 35.30 بلین ڈالر کے مالک ہیں۔

Move over, Kings, Queens, Sultans, and Oil Shaykhs. Welcome, Azim Hashim Premji, The second richest man in the world after William Gates. Premji is now worth $ 35.30 billion.

عظیم ہاشم پریم جی کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ اس کی تفصیل نئی دہلی کے پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے (India Today) کے شمارہ ۶ مارچ ۲۰۰۰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس شمارہ کی ۸ صفحہ کی کور اسٹوری عظیم ہاشم پریم جی کی بارہ میں ہے۔ اس میں ایک مفصل انٹرویو بھی شامل ہے جس میں عظیم ہاشم پریم جی اپنا نقطۂ نظر بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں دو چیزیں سب سے زیادہ اہم ہیں: مدبرانہ بصیرت اور اخلاقی اقدار۔

Vision is like a lighthouse which shows the way.
If vision gives direction, values set boundaries.

☆ ☆ ☆

یہ سفرنامہ (مشاہدات دکن) علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ زیادہ تعداد میں خریدنے کی صورت میں خصوصی رعایت۔ تفصیل کے لئے دفتر سے خط و کتابت کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583[illegible]
e-mail: kaleem@alrisala[illegible]

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Kh[illegible] Khas, Delhi- 110 059.

ذکرِ خداوندی

انسان کی کامیابی کیا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کو خدا کی قربت نصیب ہو۔ دنیا میں یہ قربت "ذکر" کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں یہ قربت "جنت" کی صورت میں خدا کے ذاکر بندوں کو ملے گی۔

ذکر دراصل خدا سے حیاتی قربت کا دوسرا نام ہے۔ آدمی کے شعور اور احساس پر جب خدا کا تصور غالب آتا ہے تو اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کے دل پر خدا کا خیال چھایا رہتا ہے۔ ہر تجربہ اور مشاہدہ میں اس کو خدا کا جمال و کمال دکھائی دیتا ہے۔ اسی یاد خداوندی کا نام ذکر ہے۔

جب آدمی پر یاد کی یہ کیفیت غالب آتی ہے تو اس وقت اس کی زبان سے تسبیح و تحمید کے کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ یہ کلمات رٹے ہوئے الفاظ نہیں ہوتے۔ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار کو "ذکر" کہنا ذکر کی تصغیر ہے۔ ذکر اس سے زیادہ لطیف حقیقت ہے کہ وہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار میں سما سکے۔ ذکر دراصل اپنے آپ کو اللہ میں گم کر دینے کی ایک حالت ہے، یہ بندہ اور خدا کا وہ آخری ملاپ ہے جو موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے۔

جنت خدا کی نعمتوں کا ابدی باغ ہے۔ یہاں خدا کی نعمتیں اپنی آخری اور معیاری صورت میں ظاہر ہوں گی۔ یہ جنت انہیں لوگوں کا حصہ ہے جن کو اللہ کے سچے ذکر کی توفیق حاصل ہوئی۔

ذکر خدا کی معرفت میں جینے کا نام ہے۔ اور خدا کی معرفت میں جینے سے زیادہ عظیم کوئی زندگی موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ یہ ذکر کسی آدمی کو کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ قرآن میں غور و فکر بتایا گیا ہے۔ جب ایک انسان کے اندر ربانی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ ہر چیز کو خدائی زاویہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی پوری کائنات میں خدا کے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر چیز اس کے لئے خدا کا تعارف بن جاتی ہے۔ ان لطیف تجربات کے دوران اس کی زبان سے جو کلمات حمد نکلتے ہیں انہیں کا نام قرآنی اصطلاح میں ذکر ہے۔

دیرپا عمل

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری (كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل) کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ان احب الاعمال الى الله ادومها و إن قلّ (اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو دیرپا ہو، اگرچہ وہ کم ہو) فتح الباری ۱۱/۳۰۰

اس قول رسول کا ایک تعلق عبادات سے ہے۔ مثلاً نفل نماز یا نفل روزہ میں آدمی کو ایسی مقدار کو اپنا معمول بنانا چاہئے جس کو وہ ہمیشہ جاری رکھ سکتا ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تھوڑے دن تو بہت زیادہ نوافل کا اہتمام کرے اور اس کے بعد وہ کم پر بھی قائم نہ رہے۔

یہ ایک مستقل اصول حیات ہے۔ اور اس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے، دوسرے لفظوں میں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی شروع کرو اس کو ایسی صورت میں شروع کرو جو برابر جاری رہنے والی (sustainable) ہو۔ یہ منصوبہ بند عمل کا اہم ترین اصول ہے۔ اس دنیا میں ہر بڑا نتیجہ منصوبہ بند عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اور نتیجہ خیز منصوبہ وہی ہے جو شروع کرنے کے بعد دیر تک جاری رہ سکے۔

اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ ہمیشہ دیر میں نکلتا ہے۔ تھوڑے وقت میں کوئی بڑا نتیجہ پالینا موجودہ دنیا کے نظام میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں نتیجہ خیز عمل وہی ہو سکتا ہے جو دیرپا عمل ہو۔ جو عمل دیر تک جاری نہ رہے اس کے متعلق پیشگی طور پر جان لینا چاہئے کہ وہ اس دنیا میں بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گا۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ جو کام شروع کرے اس کو مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے۔ اور جس عمل کو مسلسل جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہ ہو اس کو وہ شروع ہی نہ کرے۔ کیوں کہ ایسے آغاز کا کوئی انجام اس دنیا میں ہرگز نکلنے والا نہیں۔

قولِ خیر

روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ بہتر بات بولے ورنہ چپ رہے۔ من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیقل خیرا او لیصمت (فتح الباری ۱۰/۴۶۰)

ابن حجر العسقلانی نے اس کی شرح کے تحت لکھا ہے کہ یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ کیونکہ وہ خیر وشر کے تمام پہلوؤں کے بارہ میں نہایت جامع رہنمائی دے رہی ہے (صفحہ ۴۶۱) اس حدیث رسول پر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس سے کلام کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ معاملہ کے صرف مثبت پہلو کو بیان کیا جائے تاکہ لوگوں کو حوصلہ ملے۔

۲۔ منفی پہلو کا ذکر ہو تو اسی کے ساتھ مثبت پہلو کی نشان دہی بھی ضرور کی جائے۔

۳۔ جس آدمی کے پاس کہنے کے لئے صرف منفی پہلو ہو اس کو خاموشی اختیار کرنا چاہئے۔

اللہ پر ایمان آدمی سے کبر کا جذبہ چھین لیتا ہے۔ وہ سراپا تواضع میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ خدا ہی سب کچھ ہے اس کے مقابلہ میں میری کچھ حیثیت نہیں۔ اس طرح آخرت پر ایمان اس کے اندر محاسبۂ خویش کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ موت سے پہلے خود ہی اپنے قول وعمل کی نگرانی کرنے لگتا ہے تاکہ وہ موت کے بعد کی سخت تر پکڑ سے بچ سکے۔

اللہ اور آخرت پر ایمان آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ اور جو اپنی فکر میں پوری طرح سنجیدہ ہو جائے تو وہ بولے گا تو درست بات بولے گا ورنہ خاموش رہے گا۔

جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ قول اگر ایک عمل ہے تو خاموشی بھی اسی طرح یکساں درجہ کا ایک عمل ہے۔ سچا انسان وہ ہے جو یہ جانے کہ کب بولنا ہے اور وہ کون سا موقع ہے جب کہ اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان بند کر لے۔ جو آدمی اس فرق کو نہ جانے وہ یا تو غیر سنجیدہ ہے یا غیر دانش مند۔

عالم کون

فارسی کا ایک قطعہ ہے کہ ــــــ وہ شخص جو نہیں جانتا مگر جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے وہ ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے مگر جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا وہ ایک لنگڑا گدھا ہے جو منزل پر پہنچ جائے گا:

آن کس کہ نداند و بداند کہ بداند　　در جہل مرکب ابد الدھر بماند

و آں کس کہ بداند و بداند کہ نہ داند　　او نیز خر لنگ بہ منزل برساند

عالم ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ آدمی کو اپنی بے علمی کا احساس ہونے لگے۔ علم یا معلومات کا دائرہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ کوئی بھی شخص اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایک بے علم یا جاہل آدمی تو سمجھ سکتا ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ مگر جو آدمی علم کے سمندر میں داخل ہو وہ وہاں سے صرف یہ احساس حاصل کرے گا کہ میں تو کچھ نہیں جانتا۔ اس کا ہر علمی اضافہ صرف اس کے احساس بے علمی کو بڑھائے گا۔

علم کی اسی نوعیت کی بنا پر یہاں ایسا ہوتا ہے کہ جو آدمی علم کی وسیع دنیا سے بے خبر ہو وہ اپنی بے خبری کی بنا پر اس بے بنیاد احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ "میں سب کچھ جانتا ہوں"۔ ایسا آدمی ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ بے خبر جیتا ہے اور بے خبر ہی مر جاتا ہے۔

حقائق کی دنیا نا قابل بیان حد تک وسیع ہے۔ قیامت تک لوگ اس کو دریافت کرتے رہیں گے مگر کبھی بھی یہ حقائق ختم نہ ہوں گے۔ ایسی حالت میں جو آدمی یہ سمجھ لے کہ میں عالم ہو گیا اس نے گویا اپنے لئے نئی معلومات کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے برعکس جس کا احساس یہ ہو کہ ابھی میں نے نہیں جانا وہ ہر دن اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے گا۔ اس کا بے علمی کا احساس اس بات کی ضمانت بن جائے گا کہ اس کی دریافتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ ہر روز نئی حقیقتوں سے وہ اپنے علمی خزانہ میں اضافہ کرتا رہے۔

شریف، کمینہ

قال العتبی سمعت اعرابیا یقول:	عتبی کا قول ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو یہ کہتے ہوئے سنا
اسوأ ما فی الکریم ان یکف عنک	کہ شریف آدمی کے لئے سب سے بری چیز یہ ہے کہ وہ اپنا
خیرہ وخیر مافی اللئیم ان یکف	خیر تم سے روک دے اور کمینہ آدمی کے لئے سب سے
عنک شرہ (الامالی للقالی)	بہتر چیز یہ ہے کہ وہ اپنے شر سے تم کو بچائے۔

شریف آدمی وہ ہے جو دوسروں کے لئے نفع بخش ہو۔ جو بولے تو انصاف اور خیر خواہی کی بات بولے۔ اس کے مال اور اس کے اثاثہ میں دوسروں کا حصہ ہو۔ وہ صرف اپنے لئے نہ جئے بلکہ یہ سمجھ کر زندگی گزارے کہ اس کے اوپر دوسروں کا بھی حق ہے۔

جو شخص شریف ہو یا لوگوں کی نظر میں شریف سمجھا جائے، اس کے لئے یہ بات اسی کی شرافت کے خلاف ہو گی کہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنا بند ہو جائے۔ یہ بات اس کے لئے ازالۂ حیثیت عرفی کے ہم معنی ہے کہ اس کا قول اور اس کا عمل دوسروں کے لئے اپنی افادیت کھو دے۔

اس کے بر عکس کمینہ آدمی وہ ہے جس کے اندر نفع بخشی کی صلاحیت نہ رہے۔ اس کی زبان لوگوں کی برائی میں کھلے۔ وہ بولے تو بے انصافی اور بد خواہی کی بات بولے۔ وہ صرف لینا جانتا ہو، اس کے یہاں دینے کا کوئی خانہ نہ ہو۔ وہ اپنی ذات کے لئے جی رہا ہو۔ دوسروں سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔

ایسا آدمی دوسروں کے لئے سراپا شر ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا آخری احسان یہ ہے کہ وہ اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ رکھے۔ اس کی کثافت اس کی اپنی ذات تک محدود رہے۔ اس کی کثافت دوسروں تک نہ پہنچنے پائے۔

شریف آدمی خدا کے باغ کا پھول ہے اور کمینہ آدمی خدا کے باغ کا کانٹا۔ شریف آدمی سے لوگوں کو مہک ملتی ہے اور کمینہ آدمی سے صرف تلخی اور اذیت۔

محرومی پر راضی ہونا

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک وہ جو "پانے" کو اپنا مقصد بناتے ہیں۔دوسرے لوگ وہ ہیں جو اس حوصلہ کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ "دینے" کو اپنا مقصد بنائیں گے۔ پہلی قسم کے لوگ اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ دنیا میں انقلاب لاتے ہیں، وہ نئی تاریخ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں اس قربانی کا سب بڑا نمونہ وہ گروہ ہے جس کو انصار کہا جاتا ہے۔ یعنی قدیم مدینہ کے وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کے بعد رسول اور اصحاب رسول کا ساتھ دے کر خدا کے دین کو دعوت کے مرحلہ سے نکال کر انقلاب کے مرحلہ میں پہنچادیا۔

انصاریت کیا ہے۔ انصاریت دینے پر راضی ہونا ہے۔ مکہ کے مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انصار اس پر راضی ہوئے کہ وہ اپنے گھروں کو اور اپنی جائدادوں کو تقسیم کر دیں۔ ان کا آدھا حصہ خود لیں، اور بقیہ آدھا مہاجرین کو دینے پر راضی ہو جائیں۔ انصار اس یکطرفہ تقسیم پر راضی ہوئے۔ غزوۂ حنین میں بہت بڑی مقدار میں غنائم حاصل ہوئے۔ دوبارہ انصار اس پر راضی ہوئے کہ غنائم سب کے سب مکہ کے لوگوں کو دے دئے جائیں اور انصار کا ان غنائم میں کوئی حصہ نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب خلیفہ مقرر کرنے کا سوال ہوا تو انصار اس پر راضی ہوئے کہ خلافت پورے طور پر قریش کو دے دی جائے۔ اور انصار کا کوئی آدمی خلیفہ نہ بنایا جائے۔ انصار اس پر راضی ہو گئے کہ خلافت قریش کے لئے ہو گی۔ ان کا کوئی حصہ خلافت میں نہ ہو گا۔

اس دنیا میں لوگ پانے کی بنیاد پر راضی ہوتے ہیں۔ انصار وہ لوگ تھے جو نہ پانے کی بنیاد پر راضی ہوئے۔ یہ قربانی کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ یہ لڑنے مرنے کی قربانی سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی ہے۔ یہ قربانی وہ ہے جو تاریخ بناتی ہے۔ تاریخ سازی کا منصوبہ صرف اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ کچھ لوگ اس عظیم قربانی کو دینے پر راضی ہو جائیں۔

سکون مطلوب نہیں

ایک کہاوت ہے کہ جہاز بندرگاہ میں زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ مگر جہاز اس لئے نہیں بنائے گئے کہ وہ بندرگاہ میں کھڑے رہیں:

Ships are safer in the harbour, but
they are not meant for that purpose.

انسان اگر اپنے ٹھکانے پر بیٹھا رہے، وہ نہ سفر کرے، نہ کوئی کام شروع کرے، نہ کسی سے معاملہ کرے، تو ایسا آدمی بظاہر محفوظ اور پر سکون ہوگا۔ مگر انسان کو پیدا کرنے والے نے اس کو اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ پر سکون طور پر ایک جگہ رہے اور پھر وہ مرکر قبر میں چلا جائے۔

انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ کام کرے۔ وہ دنیا میں ایک زندگی کی تعمیر کرے۔ اس مقصد کے لئے اس کو دنیا کے ہنگاموں میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہ ہارنے اور جیتنے کے تجربات اٹھائے گا۔ اس کو کبھی نقصان ہوگا اور کبھی فائدہ۔ اس قسم کے واقعات کا پیش آنا عین فطری ہے۔ اور ایسے واقعات و حوادث کا اندیشہ ہونے کے باوجود انسان کے لئے یہ مطلوب ہے کہ وہ زندگی کے سمندر میں داخل ہو اور اپنی جد و جہد میں کمی نہ کرے۔

مزید یہ کہ پر سکون زندگی کوئی مطلوب زندگی نہیں۔ کیوں کہ جو آدمی مستقل طور پر سکون کی حالت میں ہو اس کا ارتقاء رک جائے گا۔ ایسے آدمی کے امکانات بیدار نہیں ہوں گے۔ ایسے آدمی کی فطرت میں چھپے ہوئے خزانے باہر آنے کا موقع نہ پا سکیں گے۔

اس کے برعکس ایک آدمی جب زندگی کے طوفان میں داخل ہوتا ہے تو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ ایک چھوٹا سا بیج تھا تو اب وہ ایک عظیم الشان درخت بن جاتا ہے۔

زندگی جد و جہد کا نام ہے۔ زندگی یہ ہے کہ آدمی مقابلہ کرکے آگے بڑھے۔ زندگی وہ ہے جو سیلاب بن جائے نہ کہ وہ جو ساحل پر ٹھہری رہے۔

زیادہ بڑی گود

ہندستانی روایات میں ایک کہانی اس طرح ہے کہ ایک راجہ کے یہاں دو رانیاں تھیں۔ دونوں رانی کے یہاں ایک ایک بچہ تھا۔ دونوں کے درمیان رقابت رہتی تھی۔ ایک دن ایک رانی کا بچہ راجہ کی گود میں آکر بیٹھ گیا۔ دوسری رانی نے اس منظر کو دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر آئی اور دوسری رانی کے بیٹے کو ہٹا کر اپنے بیٹے کو راجہ کی گود میں بٹھادیا۔

بچہ روتا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا اور پورا قصہ بتایا۔ ماں نے کہا کہ اے میرے بیٹے، تم پرم پتا کی گود میں بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد تمہیں ان باتوں کی شکایت نہ ہوگی۔

یہ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ تاہم اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ انسان عام طور پر مختلف قسم کی شکایتیں لئے رہتا ہے۔ اس کو اپنے گھر والوں کی طرف سے اور سماج کے لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے ناپسندیدہ تجربات پیش آتے رہتے ہیں جو شکایت بن کر اس کے سینہ میں بس جاتے ہیں۔ مگر یہ سب بہت چھوٹی باتیں ہیں۔ زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ آدمی خدا کی یادوں میں جینے والا بنے۔ وہ اپنا سارا بھروسہ خدا پر قائم کرے۔ وہ خدا کی دی ہوئی چیزوں کی عظمت میں اس طرح گم ہو کہ اس کو یاد ہی نہ رہے کہ کسی اور نے اس کو کیا دیا اور کیا نہیں دیا۔

انسانوں سے شکایت دراصل خدا سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ خدا کی طرف سے انسان کو جو بے شمار نعمتیں ملی ہوئی ہیں وہ ایک اتھاہ سمندر کی مانند ہیں اور انسانوں کی طرف سے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں ایک قطرہ سے بھی کم ہے۔ عطیات الٰہی کے اس سمندر میں اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ایک قطرہ اور ڈال دے تو سمندر میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس سمندر سے ایک قطرہ نکال لے تب بھی اس میں کوئی کمی واقع ہونے والی نہیں۔

ہر آدمی "پرم پتا" کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس واقعہ کا شعوری ادراک اگر پوری طرح حاصل ہو جائے تو آدمی بڑی سے بڑی شکایت کو اس طرح نظر انداز کردے گا جیسے کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

قدرتی ڈھال

چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں وحشی تاتاری قبائل کی فوج لے کر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں داخل ہوا اور اس کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے بعد عرصہ تک وہ لوگ مسلم دنیا کو اپنی تخریب کاری کا نشانہ بناتے رہے۔ امام ابن تیمیہ (۱۳۲۸-۱۲۶۳ء) کا زمانہ وہی ہے جو اس تاتاری فتنہ کا زمانہ ہے۔

دمشق میں ایک بار ابن تیمیہ ایک مقام سے گزر رہے تھے۔ اس مقام پر تاتاریوں کا ایک گروہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت وہ لوگ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ ابن تیمیہ کے بعض ساتھیوں نے چاہا کہ ان کے پاس جائیں اور ان کو شراب پینے سے روکیں۔ ابن تیمیہ نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جب تک یہ لوگ نشہ کی حالت میں رہیں گے، مسلمان ان کی جارحیت سے محفوظ رہیں گے۔ ان کی ہوش کی حالت کے مقابلہ میں ان کی مدہوشی کی حالت زیادہ بہتر ہے (سکرھم خیر من صحوھم)

موجودہ دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کی لئے یہ ایک قیمتی اصول ہے۔ لوگوں کو ان کی دلچسپیوں میں مشغول رہنے دیجئے، آپ ان کے فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

یہ اصول دور جدید کے "تاتاریوں" پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ صنعتی دور کے تاتاری اس سے بھی زیادہ بڑے نشے میں مبتلا ہیں۔ یہ دولت کمانے کا نشہ ہے۔ جدید صنعتی انقلاب نے دولت کمانے کے بے حساب نئے مواقع کھول دئے ہیں۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے میں لگائے ہوئے ہے۔ برادرانِ وطن میں یہ کیفیت اور بھی زیادہ ہے۔ کیوں کہ وہ دولت کو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔

ایسی حالت میں لوگوں کے شر سے بچنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ وہ جس "نشہ" میں مشغول ہیں انھیں اسی نشہ میں مشغول رہنے دیا جائے۔ دولت پرستی خود ان پرستاروں کے لئے بری چیز ہے۔ مگر دوسروں کے لئے وہ ان کے مقابلہ میں ایک قدرتی ڈھال بن جاتی ہے۔

سچائی کی طاقت

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲۷ فروری ۲۰۰۰ میں لکھتے ہیں: مراد آباد میں ہماری ایک پرچون کی دکان (General Store) ہے۔ ہم دکان پر اخبار اور کاپی کی رڈی بھی خریدتے ہیں۔ ایک بار 'الرسالہ' کے کچھ پرانے شمارے مجھے رڈی میں ملے اور میں انھیں گھر لے آیا۔ جب ان کو پڑھ کر دیکھا تو مجھے آپ کے مضامین بہت اچھے لگے۔ پھر میں نے حریم بک ہاؤس (جو کہ محلہ مغلپورہ مراد آباد میں واقع ہے) سے اکتوبر ۱۹۹۸ کا الرسالہ لیا اور اس کے بعد جنوری ۱۹۹۹ سے ہر مہینہ کا الرسالہ لے کر پڑھتا ہوں۔ الرسالہ کو میں ایک نصیحت نامہ سمجھتا ہوں۔ (ارشد علی، محلہ پیرزادہ، مراد آباد)

یہ چھوٹا سا واقعہ ایک بہت بڑی حقیقت کو بتاتا ہے۔ وہ یہ کہ سچائی اپنے اندر لامحدود طاقت رکھتی ہے۔ سچائی ایک ایسا سیلاب ہے جس کو روکنا کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں۔

سچائی کو اگر کوئی شخص ناقدری کرتے ہوئے اسے "رڈی" میں فروخت کردے تب بھی اس کا یہ فعل سچائی کو اس کے قدرداں تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔ سچائی کے خلاف اگر کوئی پروپیگنڈے کی مہم چلائے تو اس قسم کی مہم صرف سچائی کی اشاعت میں اضافہ کرے گی۔ سچائی کو اگر کوئی شخص اس کے وطن سے نکال دے تو عملاً صرف یہ ہوگا کہ سچائی ملکی دائرے سے نکل کر بین اقوامی دائرہ میں داخل ہوجائے۔ غرض سچائی کے خلاف ہر کارروائی سچائی کے حق میں ایک نیا دروازہ کھولنے کے ہم معنی ثابت ہوگی۔

سچائی اپنے آپ میں طاقت ہے۔ سچائی جب بھی کھڑی ہوتی ہے فطرت کے تمام قوانین اس کی حمایت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے تمام عوامل اس کے حق میں جمع ہونے لگتے ہیں۔ سچائی ایک ایسی ابدی حقیقت ہے جو مغلوب ہو کر بھی غالب رہتی ہے۔ سچائی اگر بظاہر خاکستر دکھائی دے تب بھی اس کے اندر ایک ایسا شعلہ موجود رہتا ہے جو بھڑک کر ساری دنیا کو روشن کردے۔

مسلسل کوشش

سید فرید الوحیدی (پیدائش ۱۹۳۰) مشہور مجاہد آزادی مولانا وحید احمد مدنی (وفات ۱۹۳۸) کے صاحبزادے ہیں۔ مولانا مرحوم برٹش دور میں ان علماء کے ساتھ تھے جن کو مالٹا میں نظر بند (۲۰۔۱۹۱۸) کیا گیا تھا۔ جناب سید فرید الوحیدی صاحب نے ابتدائی تعلیم دار العلوم دیوبند میں حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے عربی میں ایم اے کیا۔ اس کے علاوہ بی ایڈ بھی کیا۔ ان کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ اپنی بی ایڈ کی ڈگری کو استعمال کر کے کسی اسکول یا کالج میں ملازمت حاصل کر لیں۔ یہ ان کے لئے سہولت کی زندگی ہوتی۔ مگر سہولت کو ترک کر کے انھوں نے محنت کا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے ملازمت کے بجائے تجارت کو اپنی جدوجہد کا میدان بنایا۔ اب وہ اس حدیث رسول کی ایک زندہ تفسیر ہیں کہ: تسعة اعشار الرزق فی التجارة (رزق کا ۹۰ فیصد حصہ تجارت میں ہے)۔

تاہم اپنے حالات کے اعتبار سے تجارت کو اختیار کرنا ان کے لئے آسان راستہ کو چھوڑ کر مشکل راستہ کو اختیار کرنا تھا۔ کیونکہ تجارت کے لئے سرمایہ درکار تھا۔ اور ان کے پاس سرمایہ موجود نہ تھا۔ مگر انھوں نے اپنے عمل سے اس مشہور مقولہ کی صداقت کو ثابت کر دیا کہ ـــــ محنت ہر چیز کا بدل ہے۔

جب ان کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی، انھوں نے سرمہ سے اپنی تجارت کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کے پاس کوئی رقم نہ تھی۔ انھوں نے کسی سے دس روپیہ بطور قرض حاصل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے سرمہ کی ڈلیاں خریدیں۔ کسی سے عاریۃً کھرل حاصل کیا۔ اور رات دن کی محنت سے ڈلیوں کو پیس کر سرمہ بنایا۔ پھر اس کو شیشیوں میں بھرا۔ انھوں نے اپنے سرمہ کا نام سرمہ نور رکھا۔ اس وقت کوئی دکان دار ان کے غیر مشہور سرمہ کو اپنی دکان پر رکھنے کے لئے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ وہ ایک دن دیوبند ریلوے اسٹیشن پر ٹرین میں سوار ہو گئے اور

مسافروں کے سامنے اپنے سرمہ کا تعارف کرانا شروع کیا۔ جب انھوں نے سرمہ کا تعارف کراتے ہوئے خوش آوازی کے ساتھ یہ شعر پڑھا: لگالو پیاری آنکھوں میں یہ ڈنڈو شاہ کا سرمہ۔ تو تمام مسافران کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور پہلے ہی دن ان کے سرمہ کی تمام شیشیاں فروخت ہو گئیں۔

سرمہ کے کاروبار میں زیادہ گنجائش نہ دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں کوئی دوسرا کام کرنا چاہئے۔ اب انہوں نے دیوبند میں کتابوں کی ایک دکان کھولی۔ اس کا نام انہوں نے قومی کتاب گھر رکھا۔ یہاں وہ کتاب فروخت کرنے لگے۔ مگر کتابوں کا کام محنت کے باوجود زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ انہیں نظر آیا کہ اس کام میں ان کے لئے موجودہ حالت میں زیادہ ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ انہوں نے سیرت رسول اور تاریخ اسلام پر کئی نصابی کتابیں لکھیں جو اتنی زیادہ مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

انہوں نے محسوس کیا کہ یہ کام بھی ان کے اقتصادی حوصلوں کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۱ میں وہ ہندستان سے ایک عرب ملک میں چلے گئے۔ ابتداء میں وہاں انہوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک شہر میں ایک تجارتی کام کا آغاز کیا۔ یہ الدعایۃ والاعلان (ایڈورٹائزنگ) کا کام تھا۔ انہوں نے اپنے اس کام میں پورا اہتمام کیا کہ گاہکوں کو جو سامان سپلائی کیا جائے وہ اعلیٰ معیار کا ہو۔ یہاں تک کہ اعلیٰ معیار ان کی کمپنی الوحیدی کی پہچان بن گیا۔ ان کی کمپنی الوحیدی کے نام سے مشہور ہے۔ اب اس کے دفاتر وہاں کے تین بڑے شہروں میں ہیں۔ ۲۰ سال کی مسلسل محنت کے بعد ان کا کام اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ اب ایڈورٹائزنگ بزنس میں عرب دنیا میں ان کی کمپنی کا درجہ تیسرے نمبر پر ہے۔

ایک شخص جس نے ۱۹۵۰ میں دس روپیہ بطور قرض حاصل کر کے اپنی چھوٹی سی تجارت شروع کی تھی، وہ ۲۰۰۰ء میں اس حیثیت کو پہنچ چکا ہے کہ اب اس کے تجارتی ادارے میں ساٹھ آدمی کام کر رہے ہیں۔ ان کو وہ ہر مہینہ ایک لاکھ ریال تنخواہ دیتا ہے۔ یہ رقم ہندستانی سکہ کے اعتبار سے ۱۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہوتی ہے۔

سید فرید الوحیدی صاحب کو کامیابی اس طرح نہیں ملی کہ ان کو اچانک چھپر پھاڑ کر کوئی خزانہ مل گیا۔ بلکہ ان کی کامیابی تمام تر محنت اور مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے نوجوانی کی عمر میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں پڑھیں۔ ان سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کے یہ اشعار ان کی زندگی کے لئے رہنما ثابت ہوئے:

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہو گے اگر تم یونہی مستقل تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل
کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

سید فرید الوحیدی صاحب جب زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوئے تو ابتداءً تقریباً بیس سال تک انہیں مختلف قسم کے معمولی کام کرنے پڑے۔ اس زمانہ میں وہ صبح سے شام تک اکیلے محنت کرتے تھے۔ محنت کے ساتھ انہوں نے دیانت داری (honesty) کو اپنا لازمی اصول بنالیا۔ انہوں نے خود نقصان اٹھایا مگر کبھی کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ بیس سال کے بعد وہ وقت آیا جب کہ ان کا کام بڑھا اور انہوں نے مزید کارکن رکھ کر کمپنی کی صورت میں کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے شہر کی سڑکوں پر پیدل چل کر اپنے کام کا آغاز کیا تھا، اب وہ اس پوزیشن میں ہو چکے ہیں کہ جدید ترین کمیونی کیشن استعمال کر کے انٹر نیشنل بزنس کر سکیں۔

۵ فروری ۲۰۰۰ کو دہلی میں سید فرید الوحیدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے جو اقتصادی ترقی حاصل کی اس کا راز کیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مختصر طور پر میری ترقی کا راز یہ تھا ـــــ سادہ زندگی اور بلند سوچ:

Simple living, high thinking

انہوں نے کہا کہ کسی بھی کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد لازمی شرط ہے اور سادہ زندگی اور بلند سوچ آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ آپ اپنے مقصد کے لئے وہ مطلوب عمل کر سکیں جس کو مسلسل جدوجہد کہا جاتا ہے۔

تخلیقی منصوبہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان جیسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے اس کو سن کر کہا: اتجعل فیها من یفسد فیها و یسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك و نقدس لك قال انی اعلم مالا تعلمون (البقرہ ۳۰) یعنی کیا تو زمین میں ایسی مخلوق بسائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

انسانی تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ فرشتوں کا یہ اندیشہ بالکل درست تھا کہ انسان جیسی آزاد مخلوق یہی کرے گی کہ وہ زمین پر فساد برپا کرے اور خون بہائے۔ اسی کے ساتھ فرشتوں کا یہ کہنا بھی درست تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوقات سے جو چیز مطلوب ہے وہ حمد و تقدیس ہی ہے جو عملاً ساری کائنات میں ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود اللہ نے انسان جیسی مخلوق کو کیوں پیدا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کائنات خدا کی مجبورانہ تسبیح و تقدیس کر رہی ہے۔ اب خدا کو مطلوب تھا کہ ایک ایسی مخلوق ہو جو خدا کی اختیارانہ تسبیح و تقدیس کرے۔ اور یہ مقصد انسان جیسی با اختیار مخلوق کی پیدائش ہی کے ذریعہ ممکن تھا۔

خدا کے تخلیقی منصوبہ کی نسبت سے اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ انسان فساد اور خونریزی کرتا ہے۔ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اسی طرح کے پرخطر ماحول میں ان روحوں کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جو خدا کی معیاری جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ کسی اور ماحول میں ایسے قیمتی افراد کی پیدائش ممکن نہیں۔

خدا کو اپنی جنت میں بسانے کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو اختیاری تسبیح و تقدیس کا ثبوت دیں۔ اہل دماغ اپنے دماغ کے غلط استعمال سے دنیا کو افکار کا اندھیرا جنگل بنادیں پھر بھی ایک طالب حق اس کے اندر سچائی کو دریافت کرے اور اس کو اپنا لے۔ حالات کی کشاکش میں کوئی

شخص آخری حد تک غیر محفوظ (vulnerable) ہو جائے۔ مگر ایک اللہ کا بندہ اس پر قابو پانے کے باوجود اس کی غیر محفوظیت کو استعمال نہ کرے۔ عملی حالات کسی کو اقتدار اعلیٰ کا مالک بنادیں مگر وہ اپنے اقتدار کا غلط استعمال نہ کرے۔ آزاد اقتصادی عمل کے دوران کسی کے پاس دولت کا ڈھیر جمع ہو جائے۔ مگر وہ اس دولت کو بھلائی کے راستوں میں فیاضی کے ساتھ خرچ کرے وغیرہ۔

ملائکہ کی پیدائش سے یہ مقصود تھا کہ ایک ایسی مخلوق وجود میں آئے جو تسبیح و تقدیس کے لئے پیدا کی گئی ہو اور وہ مکمل طور پر اور بلا انحراف تسبیح و تقدیس کے اسی عمل میں مصروف رہے۔ اس کے برعکس انسان کے بارے میں خدا کا تخلیقی منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسی مخلوق وجود میں آئے جس کو خونریزی اور ہر قسم کے فساد کا مکمل اختیار حاصل ہو، اس کے باوجود وہ پوری طرح خونریزی اور فساد سے بچے اور اپنے آزادانہ اختیار کے تحت تسبیح میں مشغول ہو جائے۔

جنت کیا ہے۔ جنت خدا کی بنائی ہوئی معیاری دنیا ہے۔ وہاں ہر قسم کے سامان حیات اپنی نفیس ترین صورت میں مہیا کئے گئے ہیں۔ وہاں نہ کسی قسم کا غم ہے اور نہ کسی قسم کا اندیشہ۔ وہ ہر قسم کی محدودیتوں سے کامل طور پر پاک ہے۔ مزید یہ کہ وہاں انسان کے لئے ممکن ہو گا کہ وہ بلا روک ٹوک اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کر سکے۔

ایسی نفیس دنیا صرف نفیس روحوں کے لئے مقدر ہے اور یہ نفیس روحیں وہی ہیں جو ناموافق اسباب کا پردہ پھاڑ کر خدا کی معرفت حاصل کریں۔ جو ہر قسم کی سرکشی کو چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کی تابعداری میں دے دیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بولنے کی آزادی تھی مگر وہ خدا کے خوف سے نہیں بولے۔ جن کو دوسروں کے اوپر دست درازی کا موقع تھا مگر انہوں نے اپنے ہاتھوں کو روک لیا۔ جو دوسروں کو بے عزت کر سکتے تھے مگر وہ جہنم کے اندیشے سے ایسی کارروائی سے باز رہے۔ جو دوسروں کی چیز کو اپنی چیز بنا سکتے تھے مگر آخرت کی پکڑ نے انہیں ایسا کرنے نہیں دیا۔ جن کی انا حقیقت کے اعتراف میں مانع تھی مگر انہوں نے اپنی انا کو کچل کر حقیقت کا کھلا اعتراف کیا۔

ایمان ایک معرفت

قرآن میں کچھ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: **قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم** (الحجرات ۱۴) یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

دوسری طرف قرآن میں کچھ اور مسلمانوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کر لے۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلہ میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا۔ (المائدہ ۸۳-۸۵)

ان دونوں آیتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جن کے ایمان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل ہوگی اور وہ ابدی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے، جہاں وہ کبھی نہ ختم ہونے والی خوشیوں اور راحتوں میں زندگی گزاریں گے۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا مطلوب ایمان وہ ہے جو داخل القلب ایمان (الحجرات ۱۴) ہو، صرف زبان سے ایمان کے کلمات ادا کر دینا وہ چیز نہیں جس کی بنا پر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں مومن یا صاحب ایمان شمار کیا جائے۔ زبان سے جو کلمۂ ایمان ادا کیا جاتا ہے وہ در حقیقت آدمی کی طرف سے قبولیتِ ایمان کا ایک لفظی اظہار ہے۔ اصل مطلوب ایمان یہ ہے کہ ایمان کی

حقیقت دل کی گہرائیوں میں داخل ہو جائے، وہ آدمی کے شعور کا سب سے زیادہ اہم حصہ بن جائے، اسی کے ذریعہ آدمی کی شخصیت کی تعمیر ہونے لگے۔

۲۔ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان معرفت حق کا دوسرا نام ہے۔ آدمی جب اپنے آپ کو اور خالق کو صحیح طور پر پہچانے اور شعور کی گہرائیوں کے ساتھ یہ جان لے کہ وہ صرف ایک عاجز بندہ ہے اور ہر قسم کی بڑائیاں اور تمام قسم کے کمالات صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں، پھر یہ علم اس کو اس حد تک متاثر کرے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے، تو اسی گہرے ایمانی تجربہ کا نام معرفت ہے، اور یہ معرفت ایمان کا آغاز ہے۔ ایمان جب تک حق کی گہری معرفت نہ بنے اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

۳۔ اس عارفانہ ایمان کی ایک علامت یہ ہے کہ ایک آدمی کو اس کا تجربہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب بہہ پڑتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی اندرونی شخصیت میں ایک زلزلہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک زبردست قسم کی روحانی ہلچل برپا ہو جاتی ہے۔ یہی گہرے آنسو گویا اس کے اندر برپا ہونے والے اس داخلی انقلاب کی تصدیق ہوتے ہیں۔ جس معرفت حق کے ساتھ آنسوؤں کی یہ تصدیق شامل نہ ہو، وہ معرفت حق اللہ تعالیٰ کے یہاں معتبر نہیں۔

۴۔ یہ ایمان کوئی سادہ بات نہیں، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک کائناتی شہادت ہے۔ یہ حقائق خداوندی کو دیکھنے سے پہلے گویا اس کا مشاہدہ کر لینا ہے۔ یہ مجبورانہ اعتراف کا وقت آنے سے پہلے اس کا اختیارانہ اعتراف کرنا ہے۔ یہ اس خداوند ذوالجلال کے حق میں اپنی گواہی درج کرنا ہے جس کی گواہی ہر لمحہ خدا کے مقدس فرشتے انجام دے رہے ہیں۔

۵۔ ایمان دراصل دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینے کا فیصلہ ہے۔ یہ دنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کا طالب بننا ہے، جو لوگ اپنے سارے دل اور اپنے سارے دماغ کے ساتھ اس طلب کا ثبوت دیں وہی وہ روحیں ہیں جن کو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے باہر آنے کی تمنا نہ کریں گے۔

فطری حل

ہندستان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان اکثریتی فرقہ کی طرف سے تعصب اور زیادتی کا شکار ہیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے یہ مواقع نہیں کہ وہ پر امن طور پر یہاں رہیں اور تعمیر و ترقی کے راستہ میں سرگرم ہوں۔ مگر یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کا سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو تباہ کیا جارہا ہے اس سے پوچھئے کہ تم خود کیوں تباہی سے بچے ہوئے ہو۔ اسی طرح جو مسلم اخبار اس قسم کی باتیں چھاپے اس کے بارے میں تحقیق کیجئے کہ اس اخبار کا مالک تباہی کا شکار ہے یا ترقی کر رہا ہے۔ تقریباً یقینی ہے کہ ہر بار تحقیق سے یہی معلوم ہوگا کہ جو لوگ مسلمانوں کو اس قسم کی خبریں سناتے ہیں وہ خود اس ملک میں زبردست ترقی کئے ہوئے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دوسرے ملک کی طرح ہندستان میں بھی بعض استثنائی واقعات ہوتے ہیں۔ اب لکھنے اور بولنے والے لوگ یہ کرتے ہیں کہ انہی استثنائی واقعات کو بڑھا چڑھا کر چھاپتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں ہندستان کی ایک ایسی تصویر بنتی ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں۔ وہ استثناء کو عموم سمجھ لیتے ہیں حالانکہ اس قسم کا استثناء ہمیشہ اور ہر سوسائٹی میں موجود رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منفی واقعات اگر ایک فیصد ہیں تو مثبت واقعات ۹۹ فیصد۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک مثبت واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مشتاق احمد صاحب (پیدائش ۱۹۳۲ء) سے ۱۷ فروری ۲۰۰۰ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ حج کے لئے جاتے ہوئے دہلی میں ٹھہرے تھے۔ وہ شیو گنج (راجستھان) کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب میں حج کے ارادہ سے شیو گنج سے روانہ ہوا تو وہاں کے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی زبردست خوشی کا اظہار کیا۔ ہر ایک نے مجھے ہار پہنایا۔ تقریباً ڈیڑھ سو آدمی پہنچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن آئے۔ ان میں کافی تعداد ہندوؤں کی

تھی۔ ہر ایک نے کہا کہ وہاں پہنچ کر ہمارے لئے دعا کیجئے گا۔

انہوں نے بتایا کہ شیوگنج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ شر پسند افراد یہاں آتے ہیں مگر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک کٹر ہندو لیڈر ۱۹۹۲ء میں آئے۔ انہوں نے رات کے جلسہ میں نہایت زہریلی تقریر کی۔ انہوں نے ہندوؤں سے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کا مکمل بائیکاٹ کرو اور ان سے لین دین نہ کرو اور کوئی دکان انہیں کرایہ پر نہ دو۔ اگر دیا ہو تو زبردستی خالی کرالو، وغیرہ۔ واضح ہو کہ شیوگنج کی تجارت تقریباً ۹۹ فی صد ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔

مشتاق صاحب نے یہ قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ شیوگنج میں مسلمان صرف پانچ فی صد ہیں۔ رات کی اس زہریلی تقریر کے بعد ہم لوگ یہ سوچنے لگے کہ دیکھیں صبح کو کیا ہوتا ہے۔ تاہم مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج یا مظاہرہ نہیں کیا، نہ جلسہ کے اندر اور نہ جلسہ کے باہر۔

اس انتہائی دل آزار تقریر کے باوجود شیوگنج کے مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاجی کارروائی نہیں کی۔ صرف یہ ہوا کہ جناب محمد امین صاحب جو شیوگنج کے ایک مسلم تاجر ہیں وہ وہاں کے ایک ہندو پنڈت پکھراج شریمالی سے ملے۔ وہ وشو ہندو پریشد کے مقامی لیڈر ہیں۔ محمد امین صاحب نے ان سے پوچھا کہ رات کو جو تقریر مہاراج نے کی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا آپ اس کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ پنڈت پکھراج شریمالی صاحب نے جواب دیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ شیوگنج میں ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے آئے ہیں اسی طرح رہیں گے۔ یہاں اس کا کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ چنانچہ خود یہاں کے ہندوؤں نے مذکورہ تقریر کی بھرپور بھرشنا (مذمت) کی اور شیوگنج کے ماحول میں اس کا کوئی عملی اثر نہیں ہوا۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت امن کو پسند کرتی ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر معتدل ماحول چاہتا ہے کیوں کہ معتدل ماحول میں ہر ایک کا فائدہ ہے۔ جب شیوگنج کے مسلمانوں نے اپنی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی تو گویا کہ انہوں نے انسانی فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع

دیا۔ اور انسانی فطرت اپنا وزن ہمیشہ امن کے حق میں ڈالتی ہے۔ اس کے خلاف صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ کوئی نادان لیڈر کھڑا ہو اور جوابی اشتعال انگیزی کر کے معاملہ کو غیر ضروری طور پر اس طرح بڑھائے کہ فطرت کے لئے اپنا کام کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

فطرت کا ایک اصول

زمین پر چھوٹے بڑے بے شمار حیوانات ہیں۔ وہ ہر لمحہ اپنے اندر سے گندگی نکالتے رہتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زمین بدستور صاف ستھری حالت میں موجود رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ حیوانی غلاظت سے بھر جائے۔

اس کا سبب فطرت کا ایک قانون ہے۔ جب بھی کوئی حیوان غلاظت خارج کرتا ہے تو عین اسی وقت بے شمار چھوٹے چھوٹے ناقابلِ مرئی کیڑے (bacteria) اس پر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کو ڈیکمپوز (decompose) کر کے گیس کی صورت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ گیس اوپر اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

یہ فطرت کا ایک عام قانون ہے۔ وہ جس طرح بقیہ دنیا میں جاری ہے اسی طرح وہ انسانی دنیا میں بھی جاری ہے۔ جب بھی انسانی دنیا میں کوئی برائی پیدا ہوتی ہے تو عین اسی وقت قدرت کا قانون عمل میں آجاتا ہے۔ وہ اس برائی کو ختم کر کے دوبارہ اس کو معتدل حالت میں قائم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ناخوشگوار صورت حال پیش آنے کے بعد اگر ہم خود اقدام نہ کریں تو فطرت اپنے آپ اس کے خلاف سرگرم ہو جائے گی۔ اور ناخوشگوار صورت حال کو دوبارہ خوش گوار صورتِ حال میں تبدیل کر دے گی۔ انسان کی مداخلت کا انجام یقینی نہیں مگر فطرت کی مداخلت کا انجام یقینی ہے، فطرت خدا کے قانون کا نام ہے۔ اور خدا کا قانون جب عمل میں آجائے تو اس کو انجام تک پہنچنے سے کوئی روکنے والا نہیں۔

مطالعۂ قرآن

ایک آسمانی کتاب کا کسی انسان پر اترنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ قدیم عرب میں یہ غیر معمولی واقعہ ہوا۔ اللہ تعالی نے فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ قرآن کو مکہ کے محمد بن عبد المطلب کے اوپر اتارا۔ قرآن کا یہ نزول تقریباً تئیس سال میں پورا ہوا۔ اس کا ابتدائی حصہ ۶۱۰ء میں مکہ میں اترا اور اس کا آخری حصہ ۶۳۲ء میں مدینہ میں نازل ہوا۔

۲ دلائل قرآن

یہ قرآن کس طرح پیغمبر اسلام پر اترا۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: **وإنه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين، بلسان عربي مبين، وإنه لفي زبر الاولين**، (الشعراء ۱۹۲۔۱۹۶) یعنی اور بے شک یہ خداوند عالم کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تمہارے دل پر تاکہ تم ڈرانے والوں میں سے بنو۔ صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر اگلے لوگوں کی کتابوں میں ہے۔

نزول وحی (روح) کی مزید تفصیلات حدیث میں آئی ہیں۔ وحی کی حقیقت کے بارے میں عرب میں سوال کیا گیا تو قرآن میں اس کا جواب اس طرح دیا گیا: **ويسئلونك عن الروح، قل الروح من أمر ربي و ما اوتيتم من العلم الا قليلاً** (بنی اسرائیل ۸۵) یعنی اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے سلسلہ میں اصل مسئلہ اس کا براہ راست جواب دینے کا نہیں ہے بلکہ خود سائل کی اپنی محدودیت کا ہے۔ کیوں کہ سائل اپنی فطری محدودیت کی بنا پر اس مسئلہ کو صرف جزئی طور پر ہی سمجھ سکتا ہے، وہ کلی معنی میں اس کی نوعیت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ جواب عین سائنٹفک ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں کے مطالعہ کے لئے سائنس میں عین یہی

طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ خود سائنسی تحقیق نے بتایا ہے کہ انسان اپنی پیدائشی محدودیت کی بنا پر کسی علم کا کلی احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے سائنس میں جزئی واقفیت ہی کی بنیاد پر تمام نظریات قائم کئے گئے ہیں۔ یہی سائنسی طریقہ وحی کے بارے میں بھی انسان کو اختیار کرنا چاہئے۔

قرآن خدا کا کلام ہے، وہ پیغمبر اسلام کا اپنا کلام نہیں۔ اس کا ایک سادہ ثبوت قرآن و حدیث کی زبان کا فرق ہے۔ حدیث خود پیغمبر اسلام کا اپنا کلام ہے اور قرآن وہ کلام ہے جس کو پیغمبر اسلام نے خدا کا کلام بتا کر پیش کیا۔ جب دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کے درمیان واضح اور نمایاں فرق ہے۔ حدیث اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک "بشر" کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن اپنے غیر معمولی اسلوب کی بنا پر ایک برتر شاہانہ کلام دکھائی دیتا ہے۔ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کا یہ فرق اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ کوئی بھی عربی داں جو دونوں کو تقابلی طور پر پڑھے، وہ اس فرق کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دونوں کا یہ فرق اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے نہ کہ خود رسول کا کلام۔

دوسری چیز یہ کہ قرآن کے کلام میں معنوی اعتبار سے ایسے مختلف استثنائی پہلو ہیں جو کسی بھی انسان کے کلام میں پائے نہیں جاتے۔ ان میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن میں فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، ارضیات، نباتات، حیوانات، اور تاریخ، وغیرہ کے بارے میں ایسے بیانات ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کسی بھی انسان کو معلوم نہ تھے جب کہ قرآن نازل ہوا۔ یہ حقائق پہلی بار صرف انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں انسان کے علم میں آئے۔ ان حوالوں کا استثنائی طور پر قرآن میں موجود ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم الغیب کا کلام ہے۔ کوئی انسان اس قسم کی پیشگی اطلاع پر قادر نہیں ہو سکتا۔

اس نوعیت کی بہت سی مثالیں راقم الحروف نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، عظمتِ قرآن، مذہب اور جدید چیلنج کا متعلق حصہ۔ اپنی تفسیر تذکیر القرآن میں

بھی بعض آیات کی تشریح کے تحت راقم الحروف نے اس طرح کے کچھ حوالے شامل کئے ہیں۔

فرانس کے ڈاکٹر موریس بکائی (Maurice Bucaille) نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی ہے۔ اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا ہے۔ عربی ترجمہ کا نام یہ ہے: القرآن الکریم والتوراۃ الانجیل والعلم (صفحات ۲۹۰) انگریزی ترجمہ کا ٹائٹل یہ ہے:

The Bible The Qur'an and Science.

اس کتاب میں قرآن کے قدیم بیانات کا تقابل جدید سائنسی دریافتوں سے کیا گیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ دونوں کے درمیان استثنائی طور پر کامل مطابقت کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کی جا سکتی کہ قرآن کو خدا کا کلام مانا جائے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے مصنف نے آخر میں لکھا ہے کہ:

> In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconceivable that many of the statements in the Qur'an which are connected with science could have been the work of a man. It is, moreover, perfectly legitimate, not only to regard the Qur'an as the expression of a Revelation but also to award it a very special place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presence in it of scientific statements which, when studied today, appear as a challenge to explanation in human terms.

جمع و تدوین

قرآن پرنٹنگ پریس سے پہلے کے زمانہ میں نازل ہوا۔ مگر اس کی حفاظت کے لئے غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی کاتب وحی رہتا تھا تاکہ جب بھی جبرئیل قرآن کا کوئی حصہ لے کر اتریں تو فوراً اس کو لکھ لیا جائے۔ یہ کتاب اس زمانے کے مستعمل کاغذوں پر ہوتی تھی۔ مثلاً جھلّی وغیرہ۔ کتابت کا یہ اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ ہجرت کے موقع پر پیغمبر اسلام اپنے صحابی ابوبکر صدیق کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو اگرچہ یہ انتہائی ہنگامی سفر تھا لیکن اس کے باوجود حضرت ابوبکر صدیق جو ایک کاتب وحی بھی تھے،

اپنے ساتھ کاغذ اور قلم بھی لئے ہوئے تھے تاکہ سفر کے دوران اگر قرآن کا کوئی حصہ اترے تو اس کو فوراً لکھ لیا جائے۔

قرآن کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام بیک وقت دو طریقوں سے جاری تھا۔ ایک، نزول کے بعد فوراً اس کو لکھ لینا۔ دوسرے، اس کو باقاعدہ یاد کر لینا۔ اس طرح ایک طرف تقریباً دو درجن کاتب وحی کتابت کے عمل میں معروف رہتے تھے۔ اور دوسری طرف ہزاروں کی تعداد میں آپ کے ایسے اصحاب تھے جو قرآن کو لفظ بلفظ یاد کر لیتے تھے۔ واضح ہو کہ دور پریس سے پہلے دنیا بھر میں چیزوں کو یاد رکھنے کا رواج تھا اس لئے کثرت استعمال کی بنا پر اس زمانہ کے لوگوں کے حافظے بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر قدیم عرب میں ایسے ہزاروں لوگ تھے جن کو لمبے لمبے نسب نامے اور بڑے بڑے قصیدے زبانی یاد تھے۔ اور وہ ان کو اپنے حافظہ کی مدد سے مجلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔

اس طرح قرآن حسب موقع اترتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں جب کہ قرآن کے تمام حصے اتر چکے تھے، خدا کے حکم سے جبرئیلؑ آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے قرآن کے تمام نازل شدہ حصوں کو موجودہ مصحف کے مطابق ترتیب دیا۔ اور پھر مکمل قرآن سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ الناس تک سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔ اور پھر اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کو سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔ اس طرح جبرئیلؑ کے سامنے مکمل طور پر پڑھنے کا واقعہ دو بار ہوا۔ پہلے کو عرضِ اولیٰ کہا جاتا ہے اور دوسری بار پڑھے جانے کو عرضۂ اخیرہ۔

۶۳۲ء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت قرآن ہر اعتبار سے محفوظ اور مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ وہ ایک مجلد کتاب کی صورت میں اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ یہ آخری کام خلیفۂ اول ابوبکر صدیق کی ہدایت کے تحت انجام پایا۔ خلیفۂ اول نے اس مقصد کے لئے زید بن ثابت انصاری کو مقرر کیا جو اس خاص کام کے لئے صحابہ میں سب سے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت نے اس کام کے لئے وہ آخری اہتمام کیا جو کسی انسان کے لئے ممکن ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ لوگوں کے پاس قرآن کے لکھے ہوئے جتنے اجزاء ہیں وہ سب کے سب لائے جائیں۔ چنانچہ سب کے سب کتابت شدہ اجزاء حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے حوالے کردئے گئے۔ وہ خود قرآن کے مکمل حافظ تھے۔ تاہم انہوں نے مزید احتیاط کے لئے کچھ اور حفاظ کو اپنی مدد کے لئے مقرر کیا۔

اب وہ عمل شروع ہوا جس کو ایک مستشرق نے بجا طور پر چیکنگ کا دہرا طریقہ (double checking system) کا نام دیا ہے۔ یعنی ایک طرف قاری قرآن کے حصے پڑھتا تھا اور دوسری طرف اس پڑھے ہوئے حصے کی مطابقت تحریری ذخیرہ سے کی جاتی تھی۔ اور جب تحریر اور حافظہ دونوں ایک دوسرے کے مطابق ثابت ہو جاتے تھے تو اس کو اس زمانہ کے دستیاب کاغذ پر لکھ لیا جاتا تھا۔ اس طرح دہرا چیکنگ کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے پورے قرآن کو از اول تا آخر ترتیب کے ساتھ اس زمانہ کے قابل حصول کاغذ پر لکھا گیا۔ اور پھر اس کی سلائی کر کے اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت دی گئی۔ چونکہ پہلا مصحف چوکور تھا اس لئے وہ رَبعہ کہا جانے لگا۔

اس رَبعہ (مصحفِ اول) کو خلیفہ ابو بکر صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت حفصہ بن عمر کے پاس رکھوا دیا۔ یہ مصحف اول اسی حالت میں حضرت حفصہ کے پاس محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس مصحفِ اول کو حضرت حفصہ کے پاس سے منگوایا اور سرکاری اہتمام کے تحت اس کی متعدد نقلیں تیار کرائیں۔ اور پھر ان تیار شدہ سرکاری نسخوں کو مسلم دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بھیج دیا اور یہ حکم دیا کہ یہ مصاحف شہر کی جامع مسجدوں میں رکھے جائیں تاکہ لوگ اس سے استفادہ کرسکیں۔ اس کے بعد ہر شہر میں لوگ ان مصاحف کی مزید نقلیں تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ قرآن کے ہزاروں صحیح نسخے ایشیاء سے لے کر افریقہ تک ہر ملک میں پھیل گئے۔

قرآن کی حفاظت اور اشاعت کی یہ تاریخ آگے بڑھتی رہی۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے نسل در نسل لوگ حصہ لیتے رہے۔ مثال کے طور پر بنو امیہ کے حاکم حجاج بن یوسف الثقفی (وفات ۹۵ھ ر ۷۱۴ء) کے زمانے تک قرآن میں اعراب نہیں ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے غیر عالم اس کو پڑھنے میں غلطی کرتے تھے۔ حجاج نے یہ کیا کہ پورے قرآن پر اعراب لگوائے۔ اس کے نتیجہ میں یہ امکان ختم ہو گیا کہ کوئی شخص قرآن کو پڑھنے میں ادائیگی کی غلطی کرے۔

اسی طرح قرآن کے قدیم نسخے ابتدائی خط میں لکھے جاتے تھے۔ اس خط کا اسلوب بالکل سادہ تھا۔ اس میں موجودہ تحریری حسن موجود نہ تھا۔ اس کمی کو عباسی دور کے خطاط ابن مقلہ (وفات ۹۴۰ء) نے پورا کیا۔ ابن مقلہ خطاطی کا خصوصی ذوق رکھتا تھا۔ اس نے لمبی مدت کے مشق اور تجربہ کے بعد وہ خوبصورت عربی خط ایجاد کیا جس کو خطِ کوفی کہا جاتا ہے۔ موجودہ عربی خط اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس طرح ابن مقلہ کی کوششوں نے قرآن کو حسن خط کے دور میں داخل کر دیا۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل مسلسل صدیوں تک جاری رہا۔ کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کی نقلیں تیار کرتے اور اسی طرح کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کو حفظ کرتے۔ کتابت اور حفظ کو ایک دوسرے سے چیک کرنے کا عمل بھی صدیوں تک جاری رہا۔ جب بھی کوئی شخص قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر تیار کرتا تو کسی مستند حافظ کو پڑھوا کر وہ اس کو چیک کرتا۔ اسی طرح جب کوئی شخص قرآن کا حفظ کرتا تو اس کے حفظ کو لکھے ہوئے قرآن سے چیک کیا جاتا۔ یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ کچھ لوگوں نے فن قرأت ایجاد کیا۔ اس کے بعد ہر نسل میں ہزاروں لوگ اس عمل میں مشغول ہو گئے کہ وہ پیغمبر اور آپ کے اصحاب کے لہجہ اور قرأت کو اس کی سابقہ حالت میں محفوظ رکھیں۔

حفاظت قرأت کا یہ اہتمام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ آج جب ایک تربیت یافتہ قاری قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو سننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دورِ رسول اور اصحابِ رسول

کی قرأت کو سن رہے ہیں۔ اس طرح رسول اور اصحاب رسول کی قرأت تاریخ کے دوش پر سوار ہو کر نسل در نسل سفر کرتی رہی تا کہ ہر زمانہ کے لوگوں کو اس کی گونج اپنی اصل آواز میں سنائی دیتی رہے۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ وہ پریس کے دور میں اور ریکارڈنگ کے دور میں پہنچ گیا۔ جس کے بعد کسی تبدیلی یا ضیاع کا کوئی سوال نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کی انسانی حفاظت کے ساتھ اب اس کی پشت پر مشینی حفاظت کا اہتمام بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس اہتمامِ مزید نے اب متنِ قرآن میں کسی بھی قسم کے بگاڑ کو عملاً ناممکن بنادیا ہے۔

عربی زبان

قرآن کی حفاظت کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ قرآن کی زبان عربی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ یہ کام بھی امت کے علماء نے بہت بڑے پیانہ پر انجام دیا۔ عربی زبان قرآن کے نزول کے وقت ہی ایک اعلیٰ زبان کی حیثیت رکھتی تھی تاہم فنی اعتبار سے اس کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں بہت لوگ اٹھے جنھوں نے نحو اور صَرف اور لغت کے میدان میں غیر معمولی کام کیا۔ اور عربی زبان کو ایک مدون لغت کی حیثیت دے دی۔ قرآن کی زبان عربی کی حفاظت کا یہ کام اتنے بڑے پیانہ پر ہوا کہ عربی زبان استثنائی طور پر آج بھی ابتدائی حالت میں زندہ ہے جس طرح وہ قرآن کے نزول کے وقت تھی۔ چودہ سو سال کی طویل مدت کے باوجود اس کے اندر کوئی لغوی تبدیلی نہ ہو سکی۔ جب کہ اس مدت میں دنیا کی تمام زبانیں بالکل بدل چکی ہیں۔

مثال کے طور پر جیفرے چاسر (Geoffrey Chaucer) انگریزی زبان کا مشہور شاعر ہے۔ چاسر ۱۳۴۲ء میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۰ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا زمانہ آج سے پانچ سو سال پہلے کا ہے۔ لیکن اس کی زبان موجودہ انگریزی زبان سے اتنی زیادہ مختلف ہے کہ آج

کوئی عام انگریزی داں اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کو صرف ڈکشنری اور مخصوص ماہرین کی شرح ی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر قرآن کی زبان عربی کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ آج لکھی جانے والی عربی زبان عین وہی ہے جو نزول قرآن کے زمانہ میں تھی۔ قرآن اور حدیث اور صحابہ ی زبان کو سمجھنا آج کے ایک عربی داں کے لئے اتنا ہی آسان ہے جتنا آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک عربی داں کے لئے ممکن اور آسان تھا۔

عربی زبان کا اس طرح استثنائی طور پر اپنی اصل ابتدائی حالت پر باقی اور زندہ رہنا محض تفاقا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہزاروں لوگ حفاظتِ زبان کے اس عمل میں لگے رہے۔ نھوں نے نحو اور صرف اور لغت اور دوسرے متعلق فنون میں غیر معمولی محنتیں کیں یہاں تک کہ یک غیر مدون زبان کامل معنوں میں ایک مدون علمی زبان بن گئی۔ حفاظت قرآن کی یہ محنت کتنے ڑے پیمانہ پر کی گئی، اس کی صرف ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ابو سعید الاصمعی ایک مشہور نحوی تھا۔ وہ ۱۲۲ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا اور بصرہ ہی میں ۲۱۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ الاصمعی کو س بات کی دھن تھی کہ وہ عربی الفاظ کے وہ معانی دریافت کرے جو اصلی عرب باشندوں کے ہن میں ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ لمبی مدت تک عرب کے صحراؤں میں گھومتا رہا تاکہ عرب بدوؤں سے عربی کے بارے میں لسانی معلومات حاصل کرے۔ کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ عرب بدوؤں میں عربی زبان اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔

قرآن کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: فدمدم علیهم ربهم بذنبهم فسواها (الشمس ۱۴) الاصمعی کو یہ فکر ہوئی کہ خالص عرب کس خاص مفہوم اور کس خاص موقع پر "دمدم" کا لفظ بولتے ہیں۔ اس دھن میں وہ عرب کے ایک بدو قبیلہ کے پاس گیا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ کسی بدو سے پوچھتا کہ تم لوگ دمدم کا لفظ کس موقع پر بولتے ہو مگر اس نے اس پر قناعت نہیں کی۔ اس نے چاہا نہ کوئی ایسا موقع آئے جب کہ ایک بدو بے ساختہ طور پر دمدم کا لفظ بول پڑے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک خانہ بدوش بدو خاندان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

تقریباً چھ مہینے گزر گئے لیکن بدو کی زبان سے دمدم کا لفظ اسے سنائی نہیں دیا۔ آخر کار ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مقام پر خیمہ لگا ہوا تھا۔ اور وہاں دن کے کھانے کے لئے سالن پک رہا تھا۔ بدو مرد خیمے کے اندر تھا اور اس کی عورت باہر کچھ کام کر رہی تھی۔ الاصمعی بدو کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سالن پکتے پکتے جب وہ لمحہ آیا کہ اس کی حرارت سوڈگری پر پہنچ گئی اور برتن کے اوپر رکھا ہوا ڈھکن بھاپ کے جوش سے اچھل پڑا تو بدو نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دیتے ہوئے کہا: دمدمت۔ یہ سنتے ہی الاصمعی خیمے سے نکل کر یہ کہتا ہوا بھاگا کہ:

واللہ وجدتُ واللہ وجدتُ، "خدا کی قسم میں پا گیا خدا کی قسم میں پا گیا۔"

اس طرح کئی سو سال تک ہزاروں اہل علم محنت کرتے رہے۔ وہ مختلف پہلوؤں سے عربی زبان کی حفاظت اور تدوین میں مصروف رہے۔ اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح قرآن کامل طور پر محفوظ ہے اسی طرح اس کی زبان عربی بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ زبان وادب کی تاریخ میں یہ ایک انتہائی نادر استثناء ہے، اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج قرآن کو سمجھنا عالم لوگوں کے لئے اسی طرح ناممکن ہو جاتا جس طرح دوسری مذہبی کتابوں کے ابتدائی نسخوں کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے ناممکن ہو چکا ہے۔ دوسری تمام مذہبی کتابیں ترجموں کی مدد سے پڑھی جاتی ہیں۔ جب کہ قرآن کا مطالعہ اس کی اصل زبان میں کیا جاتا ہے۔

تفسیر قرآن

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور اس سے ہدایت حاصل کریں: کتب انزلنہ الیک مبرک لیدبروا آیتہ ولیتذکر اولوا الالباب (ص ۲۹) یعنی یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کو پڑھنے کے دو طریقے ہیں۔ایک ہے سادہ طور پر اس کی قرأت کرنا۔اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کی آیتوں میں غور وفکر کر کے اس کو پڑھا جائے۔ قرآن کی قرأت سے ایک شخص کو اس کے سادہ معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔اور اس طرح قرآن کو سادہ طور پر سمجھنا بھی بلا شبہہ مفید ہے۔ لیکن قرآن کے گہرے معانی صرف اس وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جب کہ اس کی آیتوں پر غور وفکر کیا جائے۔ایک صحابی کے متعلق روایت میں آیا ہے کہ انھوں نے سورہ البقرہ کا مطالعہ غور وفکر کے ساتھ کیا تو اس میں انھیں تین سال کا وقت لگ گیا۔

قرآن کی سادہ قرأت کیا ہے،اس کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ ہر آدمی جو عربی زبان جانتا ہے وہ سادہ قرأت کے ذریعہ قرآن کے معانی کو سمجھ سکتا ہے اور جو شخص عربی زبان نہیں جانتا وہ اپنی معلوم زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس اعتبار سے قرآن ایک آسان کتاب ہے (القمر ۱۷) جس آدمی کے اندر نصیحت لینے کا ذہن ہو اور وہ نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ ہو تو قرآن کی سادہ قرأت یا اس کا ترجمہ پڑھنا بھی اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ وہ سادہ قرأت کے ذریعہ بھی ایسی تذکیری باتیں پالے گا جو اس کی زندگی کو سدھارنے والی ہوں اور اس کے لئے اسلامی زندگی گزارنے میں مددگار بن جائیں۔

لیکن قرآن میں تدبر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سادہ قرأت اور تدبر کے ساتھ قرأت کے فرق کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "**أنزل القرآن على سبعة احرف، لكل آية منها ظهر وبطن، ولك حد مطلع**" (مشکاۃ المصابیح ۱ر۲۳۸) قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا۔اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔اور ہر حد کا ایک مطلع ہے۔

مطلع عربی زبان میں دیکھنے یا جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں اگر آپ زمین پر کھڑے ہو کر آس پاس کی چیزوں کو دیکھ رہے ہوں تو آپ کی حد نظر کم ہوگی اور آپ بہت تھوڑی چیزوں کو دیکھ پائیں گے۔ لیکن اگر آپ ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے اوپر کی چھت پر کھڑے ہوں تو بلند مطلع کی وجہ سے آپ کی حد نظر بہت بڑھ جائے گی۔اور آپ زیادہ دور تک کی چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

اس حدیث میں مطلع کے فرق کی مثال سے بتایا گیا ہے کہ قرآن کو اس کے ظاہری الفاظ کے اعتبار سے پڑھنے میں اور اس کے معنی پر غور کر کے پڑھنے میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جو آدمی صرف ظاہری الفاظ کے دائرے میں قرآن کو پڑھ رہا ہو وہ گویا نیچے کے مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ ایسا آدمی قرآن کے صرف سادہ مفہوم تک پہنچ سکے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی معانی پر غور کرتے ہوئے قرآن کو پڑھے وہ گویا بلند مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دوسرا آدمی قرآن کی گہرائیوں تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کے مطالعہ کی ان دو مختلف قسموں کو علمی زبان میں اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک قرآن کی سطور (lines) کا مطالعہ ہے اور دوسرا قرآن کی بین السطور (between the lines) کا مطالعہ۔ مطالعہ کی ان دونوں قسموں میں جو فرق ہے اس کو اہل علم بخوبی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن کے سطور کو پڑھنا اور قرآن کے بین السطور کا مطالعہ کرنا، دونوں میں جو فرق ہے اس کو یہاں مثال کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تھے تو وہاں ایسا ہوا کہ آپ کی مجلس میں بعض لوگ زور زور سے بولنے لگے۔ یہ اسلامی آداب کے خلاف تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی ممانعت کے لئے یہ آیت اتری:

اے ایمان والو، تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط (برباد) ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں وہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ ان کے لئے معافی ہے اور بڑا ثواب ہے۔ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تم خود ان کے پاس نکل کر آجاؤ تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات ۲-۵)

قرآن کی ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر محض الفاظ کی سطح پر پڑھے گا وہ اس کے ظاہری مفہوم کو لے کر اس سے صرف ذاتی تقدس کا مسئلہ نکالے گا۔ وہ سمجھے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بہت زیادہ مقدس تھی اس لئے جو لوگ آپ کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ تقدس اور احترام کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے پاس بیٹھیں۔ ایسا آدمی صرف قدیم مدینہ کے کچھ لوگوں کو اس کا مخاطب سمجھے گا۔ خود اپنی ذات کے لئے یا دوسروں کے لئے اس کے نزدیک اس میں کوئی ہدایت نہ ہوگی۔

اس کے برعکس جو آدمی آیتوں پر غور کرے گا اور زیادہ گہرے معانی تک پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ ان آیتوں میں ایک عمومی اور ابدی مسئلہ دریافت کر لے گا۔ وہ سمجھے گا کہ زمانۂ رسالت میں اگر اس کا تعلق ذاتِ رسول سے تھا تو اب اس کا تعلق پیغام رسول سے ہو گیا ہے۔ جس طرح پیغمبر اسلام کی زندگی میں آپ کی آواز پر آواز بلند کرنا جائز نہیں تھا، اسی طرح آج یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی آدمی پیغمبر اسلام کی دی ہوئی تعلیمات کے خلاف غیر ضروری بحثیں نکالے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کا مظاہرہ کرے۔

ایسے آدمی کو آیتوں کا پورا مطالعہ بتائے گا کہ ان آیات میں جس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کی ایک روش وہ ہے جو ایمان اور تقویٰ اور صبر کے مطابق ہے۔ اور دوسری روش وہ ہے جو نفاق اور بے خوفی اور بے صبری کی علامت ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر لحہ اپنا احتساب کرے۔ وہ اپنے اندر ایمان والی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے اور نفاق والی صفتوں سے اپنے آپ کو آخری حد تک بچائے۔

اس معاملہ کی دوسری مثال لیجئے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ قحط کے زمانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی غلہ لینے کے لئے ان کے پاس مصر میں آئے۔ جب ان کو غلہ دیا جا چکا تو اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

پھر جب ان کا سامان تیار کرادیا تو اس نے پینے کا پیالہ (سقایہ) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو، تم لوگ چور ہو، انھوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا، تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم شاہی پیانہ (صواع) نہیں پارہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لئے ایک بارِ شتر غلہ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے کے لئے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور رہے۔ انھوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو اس چوری کرنے والے کی سزا کیا ہے۔ انھوں نے کہا، اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے۔ ہم لوگ ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اس نے اس کے (چھوٹے) بھائی سے پہلے ان کے تھیلوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ پھر اس کے بھائی کے تھیلے سے اس کو برآمد کرلیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے بلند کرنا چاہتے ہیں بلند کردیتے ہیں اور ہر علم سے بالاتر ایک علم والا ہے (یوسف ۷۶)

ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر صرف الفاظ کی سطح پر پڑھے وہ اس کا مطلب یہ سمجھے گا کہ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ جب ان کا سگا بھائی بن یامین آیا تو انھوں نے چاہا کہ اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیں۔ مگر وہ سوتیلے بھائیوں پر اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے حضرت یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامان میں شاہی دربار کا ایک برتن رکھوادیا۔ اور اس کے بعد درباریوں کو اس میں شریک کرکے بن یامین کو چوری میں پکڑوا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس قسم کا معاملہ بلاشبہہ ایک پیغمبر کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن جو آدمی صرف لفظی سطح پر قرآن کا مطالعہ کرے وہ ان آیتوں کا یہی مطلب لے گا۔ لیکن جو آدمی قرآن کی سطور سے گزر کر بین السطور تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور گہرائی میں اتر کر اس کا مفہوم جاننا چاہے گا وہ مذکورہ تفسیر کے برعکس ایک اور تفسیر تک پہنچ جائے گا جو پیغمبر کی شان کے عین مطابق ہے۔

ایسا آدمی جب قرآن کی ان آیتوں پر غور کرے گا تو اس کا ذہن ایک مقام پر پہنچ کر رک جائے گا۔ وہ دیکھے گا کہ شاہی دربار کے کارکن جو چیز تلاش کر رہے تھے وہ صواع (یوسف ۷۲) تھا جو عربی میں قاعدے کے مطابق مذکر ہے اور اس کے لئے ضمیر مذکر (ہٗ) آنا چاہئے۔ لیکن شاہی دربار کے کارکن جب اونٹوں کے سامان کی تلاشی لیتے ہیں تو سامان میں جو چیز ان کو ملتی ہے اس کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) استعمال ہوئی ہے (۷۶)

اب غور کرنے والا آدمی جب ضمیر کے اس فرق کو دیکھے گا تو وہ پائے گا کہ معاملہ کی اصل تصویر اس سے بالکل مختلف ہے جو ظاہری الفاظ میں دکھائی دیتی ہے۔ اس سراغ کی روشنی میں جب وہ مزید غور کرے گا تو اس پر منکشف ہوگا کہ معاملہ کی اصل تصویر یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو پہچان کر اپنا پانی پینے کا پیالہ (سقایہ) از راہِ شفقت اس کے سامان میں رکھ دیا۔ سقایہ کا لفظ عربی قاعدے کے مطابق مؤنث ہے۔

دربار میں ناپ کے لئے ایک شاہی پیانہ (صُواع) تھا جو غالباً چاندی کا تھا۔ عربی قاعدے کے مطابق صواع کا لفظ مذکر ہے۔ اتفاق سے یہ صواع غلہ کے ڈھیر میں دب کر کہیں چھپ گیا۔ یعنی وہی واقعہ ہوا جس کو انگریزی میں مس پلیس (misplace) ہونا کہتے ہیں۔ قافلے کے جانے کے بعد جب دربار کے کارکنوں نے صواع کو نہیں دیکھا تو ان کو قافلہ والوں پر شبہہ ہوا جو ابھی ابھی دربار سے نکلے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قافلہ والوں کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی لی۔ اس تلاشی میں صواع تو ان کے سامان سے بر آمد نہیں ہوا البتہ سقایہ (پینے کا پیالہ) بر آمد ہو گیا۔ یہ بات اس طرح سے معلوم ہوتی ہے کہ تلاشی کے دوران جو چیز بر آمد ہوئی اس کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) آئی ہے۔ حالانکہ اگر صواع بر آمد ہوتا تو اس کے لئے قرآن میں مذکر کی ضمیر (ہ) آنی چاہئے تھی۔

یہ سقایہ حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کے سامان سے نکلا تھا کیوں کہ برادرانہ محبت کے تحت حضرت یوسف نے اس کو اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا تھا۔ اب یہ ہوا

کہ دربار کے کارکنوں نے جب بن یامین کے سامان سے سقایہ نکالا تو انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ تم نے اگرچہ صواع کی چوری تو نہیں کی ہے، لیکن تم نے ہمارے دربار کے ایک اور سامان سقایہ کو چرلیا ہے اس لئے خود تمہارے قانون کے مطابق ہم تمہارے بھائی کو روک لیں گے اور اس کو تمہارے ساتھ جانے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد وہ بن یامین کو اپنے ساتھ لائے اور ان کو حضرت یوسف کے حوالے کردیا۔

قرآن فہمی کے لئے بہت سے علوم ضروری ہیں جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ قرآن کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے فنی مطالعہ، اور دوسرا مطالعہ وہ ہے جو قرآن سے نصیحت لینے کے لئے کیا جائے۔ جہاں تک قرآن کے فنی مطالعہ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں بہت سے علوم کی ضرورت ہو سکتی ہے، حتی کہ ان علوم سے بھی زیادہ جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اگر اس حدیث کو سامنے رکھا جائے: لا تنقضی عجائبه (قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے) تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان علوم کی فہرست ہر دور میں بڑھتی رہے گی اور وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔

مگر جہاں تک نصیحت کے مقصد سے قرآن کے مطالعہ کا تعلق ہے اس کے لئے عربی زبان سے واقفیت کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ تقویٰ اور خشیت ہے۔ اس کی تصدیق خود قرآن سے ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا الله ویعلمکم الله۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ خود علوم ربانی کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ اگر آدمی کے اندر گہرا تقویٰ موجود ہو تو قرآن کے معانی کو سمجھنے میں وہ اپنے آپ آدمی کے لئے رہنما بن جائے گا۔

ایک خط

برادر محترم جناب جسٹس قاضی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

برادرم جناب عبدالسلام اکبانی صاحب نے ٹیلی فون پر یہ خبر دی کہ ۲۶ مارچ ۲۰۰۰ کو آپ کی صاحبزادی کا بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ آپ کے اس غم میں میں پوری طرح شریک ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو مرحومہ کے حق میں واقعہ بنائے جو قرآن میں ایک نیک بخت خاتون کی زبان سے ان الفاظ میں آئی ہے: رب ابن لی عندك بيتاً فی الجنة (التحریم ۱۱)

موت کے موقع پر مسلمان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: انا لله و انا اليه راجعون (البقرہ ۱۵۶) اس قرآنی آیت کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے اس کے پاس لازمی طور پر ایک ریٹرن ٹکٹ ہوتا ہے۔ ایک مقرر تاریخ کو بہر حال اس کو اس دنیا سے نکل کر آخرت کی دنیا میں چلے جانا ہے۔ موت کا ہر واقعہ گویا قدرت کے اس قانون کی یاددہانی ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو یاد رکھے تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔ وہ مکمل طور پر آخرت رخی زندگی (Akhirat- oriented life) گزارنے لگے۔

اس حادثہ کی خبر سن کر مجھے ایک حدیث یاد آئی جو صحیح مسلم میں ان الفاظ میں آئی ہے:
عجباً لأمر المؤمن ! إنّ امره كله له خير، وليس ذلك لاحد الا للمؤمن، إن اصابته سراءُ شكرَ فكان خيراً له، وإن اصابته ضراءُ صبرَ فكان خيراً له (مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کے لئے اس کے ہر معاملہ میں بھلائی ہے۔ اور یہ مومن کے سوا کسی اور کے لئے نہیں۔ اگر اس کو کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے پھر وہ اس کے لئے بھلائی بن جاتا ہے۔ اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے پھر وہ اس کے لئے بھلائی بن جاتا ہے)۔

غیر مومنانہ روش یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کو خوشی ملے تو وہ اس پر فخر کرے۔ اور اگر اس کو تکلیف پہنچے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جائے۔ یہ دونوں حالتیں یکساں طور پر برائی کی حالتیں ہیں۔ اس

کے برعکس مومنانہ روش یہ ہے کہ آدمی کو خوشی ملے تو اس کا سینہ شکر کے جذبہ سے بھر جائے۔ اور اگر اس کو تکلیف کا تجربہ ہو تو وہ اس کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر اس پر راضی رہے۔ اور یہ دونوں حالتیں بلاشبہہ بھلائی کی حالتیں ہیں۔

اسلام میں جنازہ کی نماز کے لئے جو دعا سکھائی گئی ہے وہ اس کی ایک مثال ہے۔ چنانچہ بچی کے انتقال پر اس کی نماز جنازہ میں جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کا ایک جزء یہ ہے: اللهم اجعلها لي عندك ذخراً (الترمذی، کتاب الدعوات) یعنی اے اللہ تو اس کو میرے لئے اپنے پاس ذخیرہ بنادے۔

یہ سادہ طور پر ایک دعا نہیں بلکہ وہ ایک خوش خبری ہے۔ یہ گویا اس فیصلۂ الٰہی کا اعلان ہے کہ کسی مومن کا بچہ یا بچی کم عمری میں وفات پاجائے اور وہ اس پر مطلوب صابرانہ رسپانس دے تو اس کا بچہ خدا کے پاس ذخیرہ (store) رہتا ہے اور آخرت میں پہنچ کر وہ ماں باپ کو زیادہ بہتر حالت میں مل جاتا ہے۔

خدا کا یہ قانون آدمی کے لئے کتنا تسکین بخش تصور ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی اعتبار سے کھونے کا تجربہ کرتا ہے۔ اس دنیا میں ہر یافت کے ساتھ ایک محرومی لگی ہوئی ہے۔ جس طرح گلاب کے درخت میں پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں اسی طرح انسانی زندگی میں یہاں ہر آدمی کے لئے آرام کے ساتھ تکلیف اور خوشی کے ساتھ غم بھی لگا ہوا ہے۔ عام آدمی کے لئے اس دنیا میں غم کا تجربہ صرف غم کا تجربہ ہے۔ مگر وہ انسان جس کے اندر ایمانی شعور بیدار ہو چکا ہے وہ اپنی ربانی فکر کی بنا پر ہر نہیں میں ہے کا راز پالیتا ہے۔ وہ اپنی محرومی کو ہر بار ایک نئی یافت میں تبدیل کرلیتا ہے۔

یہ ایک قسم کے تحول یا تبدیلی کا معاملہ ہے۔ مومن اپنے غم کو دنیا میں صبر میں بدلتا ہے اور خدا اس کے صبر کو آخرت میں جنت کی صورت میں بدل دے گا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس انعام کے مستحق ٹھہریں۔

۳ اپریل ۲۰۰۰ دعاگو وحید الدین

سوال

قرآن کی آیت هدیً للمتقین (۲:۲) میں لفظ متقین اپنے اصطلاحی معنی میں ہے یا لغوی
یں۔اصطلاحی معنی میں لیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ قرآن متقین بالفاظ دیگر مسلمین
لئے تو ہدایت ہے، وہ غیر مسلمین کے لئے ہدایت نہیں اور اگر لغوی معنی میں لیں تو اگلی
میں متقین کی جو تعریف بیان کی ہے کہ وہ لوگ ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ نماز ادا کرتے ہیں
یفات غیر مسلمین پر کیسے صادق آسکتی ہیں۔ کیا ایمان بالغیب اور اقامۃ صلوۃ اور انفاق کو بھی
معنی میں لیکر اس مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ (ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

قرآن عام طرز کی ایک مجرد تصنیف نہیں۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کے مختلف
حالات کی نسبت سے نازل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تقریباً ۲۳ سال میں اس کی تکمیل
۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک بے حد اہم نکتہ ہے۔ اس بنا پر ایسا ہے کہ قرآن کی ہر
کا ایک مصداق خاص ہے جو سبب نزول کے اعتبار سے ہے۔ اور دوسرا اس کا مصداق عام، جو
کے توسیعی انطباق سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی ایک مثال سورہ النور کی یہ آیت ہے۔ والذی تولیٰ کبرہ منہم (النور ۱۱) سبب
کے اعتبار سے اس آیت کا ابتدائی مصداق قدیم مدینہ کا عبد اللہ بن ابی تھا۔ اور آیت کے
ی انطباق کے اعتبار سے اس میں ہر وہ آدمی شامل سمجھا جائے گا جو کسی کو بدنام کرنے کے لئے
بی جیسا پست کردار ادا کرے، خواہ وہ کسی بھی زمانے سے تعلق رکھتا ہو۔

اب سورہ البقرہ کی ابتدائی آیتوں کو لیجئے۔ اس کی آیت نمبر ایک سے لے کر آیت نمبر ۷
کا خطاب رسول اللہ کے معاصر یہود سے ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۸ سے لے کر آیت نمبر
ک کا تعلق قدیم مدینہ کے منافقین سے ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۲۱ سے لے کر آیت نمبر
تک عام انسانیت سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۲۵ سے اہلِ ایمان کا تذکرہ

شروع ہوتا ہے۔ سبب نزول کے اعتبار سے ان میں سے ہر آیت کا کوئی وقتی مصداق ہو سکتا ہے مگر اسی کے ساتھ ہر آیت کا ایک توسیعی انطباق بھی ہے جو ہر دور کے انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔

ذالک الکتاب میں الف، لام عہد کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہی معہود کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ یہود و نصاریٰ پر جو آسمانی کتابیں بھیجی گئیں ان میں ایک آخری آسمانی کتاب کی بشارت موجود تھی۔ قرآن وہی آخری اور محفوظ کتاب ہے۔ مگر اس سے ہدایت اسی کو ملے گی جو اس کی ضروری شرطوں کو پورا کرے۔

مدینہ میں اس وقت جو یہود آباد تھے وہ اپنے آپ کو اپنے نبیوں کی تعلیمات کا حامل بتاتے تھے۔ ان کے یہاں ایمان، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کا وجود بھی پایا جاتا تھا۔ مگر ان کے یہاں اس کی اصل روح غائب ہو چکی تھی۔ فرمایا کہ قرآن اگرچہ سراپا کتاب ہدایت ہے مگر اس کے ذریعہ صرف اس شخص کو ہدایت ملے گی جس کے اندر حقیقی معنوں میں متقیانہ مزاج پایا جاتا ہو۔ الذین یؤمنون بالغیب جو غیبی حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار ہو، جس کے اندر عبادت الٰہی کی روح موجود ہو، نمائشی راستے کے بجائے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، جو اپنی مذہبی عصبیت میں جتلانہ ہو۔ جو لوگ اس قسم کی صفات رکھتے ہوں وہ بہت جلد قرآن اور صاحب قرآن کو پہچان لیں گے اور اس سے ہدایت حاصل کریں گے۔

اس کے بعد ان آیتوں کا ایک عمومی اور توسیعی پہلو ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنی ذات میں بلاشبہ ہدایت ہے مگر اس دنیا میں کسی کتاب سے ہدایت لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہدایت لینے والا ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو۔

متقی کا اصلی اور لغوی مفہوم محتاط (cautious) ہے۔ انسان کی یہی صفت ہے جو اس کو حق کے معاملہ میں سنجیدہ بناتی ہے اور وہ اس کا سچا متلاشی بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی اصل معرفت ہے اور معرفت صرف اس کو ملتی ہے جو دلیل سے ثابت ہو جانے کے بعد اس کو مان لینے کا مزاج رکھتا ہو۔ صلاۃ کی شرط سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے اندر تسلیم ورضا (submission) کی

نت موجود ہو۔ زکوۃ کی اصل حقیقت اپنی ذات میں دوسرے کا حق تسلیم کرنا ہے۔ ہر منزل
ناب پر ایمان لانے کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی گروہی تعصبات سے پاک ہو، وہ اپنے مانوس اکابر
کے باہر ظہور میں آنے والے داعیانِ حق کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

مصداقِ عام کے اعتبار سے یہ پانچ بنیادی صفتیں ہیں، یہ صفتیں ہر انسان کی فطرت میں
یدائشی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ جو شخص اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھے وہ گویا قرآن سے
رایت لینے کے لئے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہے۔ جب بھی وہ کھلے ذہن کے ساتھ
ز آن کو پڑھے گا تو وہ اس کے لئے معرفت حق کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا وہی حال ہوگا جس کا
کر قرآن کی سورہ المائدہ آیت نمبر ۸۳ میں کیا گیا ہے۔

سوال

انٹرنیٹ پر جو سوالات ہم کو موصول ہوتے ہیں ان کا جواب عام طور پر انٹرنٹ کے ذریعہ
یا جاتا ہے۔ انٹرنٹ کے ذریعہ موصول شدہ ایک عمومی سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان
ختلف مقامات پر جو جہاد کر رہے ہیں مغربی میڈیا اس کو فنا ٹسزم کہہ کر بدنام کر رہا ہے۔ مگر یہ درست
نہیں۔ مسلمانوں کی لڑائی عدل (justice) کے حصول کے لئے ہے۔ جب مسلمانوں کو عدل نہ ملے تو
ن کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ لڑ کر عدل کو حاصل کریں۔ اگر ان کی لڑائی سے
من برہم ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Mahmood H. M. Daya, P.O. Box 14757, Arusha, Tanzania.

جواب

عدل کے حصول کا کوئی تعلق جنگ سے نہیں۔ عدل جب بھی کسی کو ملتا ہے، پر امن
تعمیری جدوجہد کے ذریعہ ملتا ہے نہ کہ متشددانہ جنگ کے ذریعہ۔ جنگ کے ذریعہ عدل حاصل
کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے معاش کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی شخص خودکشی کر لے۔

اسلام کے دور اول میں اہل اسلام کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ تھی کہ ان کو مسجد

حرام تک پہنچنے سے روک دیا گیا تھا۔ مگر اس بے انصافی کو ختم کرنے کے لئے رسول اللہ نے جنگ نہیں کی بلکہ صلح اور امن کا معاہدہ کر لیا۔ صلح کے نتیجہ میں وہ پر امن حالات ملے جس میں استحکام کی کوشش کی جاسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پر امن کوششوں کے ذریعہ اسلام اتنا مستحکم ہو گیا کہ کسی لڑائی کے بغیر مسجد حرام اور مکہ اہل اسلام کے قبضہ میں آگیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اگر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے تو انھیں جاننا چاہئے کہ اس ناانصافی کا اصل سبب خود مسلمانوں کا داخلی ضعف ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ امن کے حالات پیدا کر کے وہ تعمیری عمل کریں جس سے ان کی داخلی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ اس کے بعد اپنے آپ انھیں انصاف مل جائے گا۔

سوال

میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ فطرت کے تمام قوانین کو ایک جملہ میں جاننا چاہتا ہوں تاکہ زندگی کے ہر معاملہ میں اس جملہ کو بنیادی نقطۂ نظر بنا سکوں۔ (سید عبدالحفیظ، جلگاؤں)

جواب

فطرت کے قوانین کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے —— حقیقت پسندی۔ عام طور پر لوگوں کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ میرے موافق ہے وہ درست ہے۔ اور جو میرے خلاف ہے وہ نادرست۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ جو حقیقت واقعہ ہو اس کو صحیح اور درست مانا جائے۔ اس دنیا میں جب بھی کوئی شخص ناکام ہوتا ہے تو وہ قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنے کی بنا پر ناکام ہوتا ہے، خواہ وہ بطور خود دوسروں کی سازش کو اس کا ذمہ دار بتاتا رہے۔

سوال

دہلی کے ایک ہفتہ وار ہندی اخبار پنچ جنیہ کے حوالہ سے آپ کے خلاف کچھ باتیں اردو اخبارات و رسائل میں چھپی ہیں۔ مثلاً ماہنامہ البلاغ (بمبئی) کے شمارہ فروری ۱۹۹۹ میں یہ چھپا ہے کہ مولانا وحید الدین خاں نے فرمایا کہ "قرآن مجید میں لگ بھگ ۰۰ اودوسری زبانوں کے الفاظ ہیں

جن میں سنسکرت خاص ہے اور یہ کہ محمد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جن چار زبانوں پر عبور حاصل تھا ان میں سنسکرت بھی ایک تھی۔" (صفحہ ۴۶) اس طرح کی باتیں اور بھی کئی پرچوں میں چھپی ہیں۔ مثلاً دہلی کے روزنامہ قومی آواز کے شمارہ ۹ جنوری ۱۹۹۹ میں مراسلہ کے کالم میں آپ کی ایک تقریر کے حوالہ سے آپ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ "قرآن کریم میں ایک سو الفاظ غیر عربی کے شامل ہیں جن میں بڑی تعداد سنسکرت کے الفاظ کی ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم چار زبانوں کے عالم تھے جن میں سے ایک سنسکرت زبان ہے۔" (صفحہ ۳) یہ بڑی عجیب باتیں ہیں۔ ان کو لے کر کچھ مسلم اخبارات ورسائل میں آپ کے خلاف سخت باتیں چھپی ہیں۔ براہِ کرم بتائیں کہ اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے (عبدالرحمٰن، نئی دہلی)

جواب

یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں جو غیر ذمہ دارانہ صحافت کی پیداوار ہیں۔ اس صحافت کا شکار ہر وہ شخص ہو تا رہا ہے جو "نیوز" میں آجائے۔ چنانچہ میرے خلاف بھی کچھ مسلم اخبارات ورسائل میں ایسے خطوط اور مضامین چھپتے رہے ہیں جو سراسر لغو اور بے بنیاد ہیں۔ میں ان کے بارے میں عام طور پر خاموشی کا رویہ اختیار کرتا ہوں اور مراسلہ نگاروں کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

اس سے پہلے ایک بار قومی آواز میں میرے خلاف ایک بے بنیاد بات چھپی۔ اس کی تردید میں میں نے ایک مراسلہ بھیجا جو قومی آواز (۵ مارچ ۱۹۹۵) میں چھپا۔ میرے جوابی مراسلہ کو دیکھ کر تبلیغی جماعت کے معروف بزرگ مولانا اظہار الحسن صاحب مرحوم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس میں مجھے خاموشی کے اصول پر برقرار رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر درج کیا تھا:

سئے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے　　اشارتاً بھی نہ قصے بیاں کئے ہوتے

سوال

آج کل دستور ہند میں تبدیلی کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ کوئی تبدیلی کی موافقت میں رائے دیتا ہے اور کوئی اس کی مخالفت میں۔ اس معاملہ میں آپ کی رائے کیا ہے،

براہ کرم مطلع فرمائیں۔ (وددود ساجد، نئی دہلی)

جواب

دستور ہند میں تبدیلی کی بحث میں ایک رائے یہ سامنے آرہی ہے کہ دستور میں تبدیلی ہونی چاہئے۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ دستور میں تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ایک تیسری رائے کا بھی امکان ہے۔ اور وہ یہ کہ دستور ہند میں تبدیلی بے فائدہ ہے۔

اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ہے کہ دستور ہند میں تبدیلی کیوں؟ ۱۹۴۷ کے بعد جب یہ دستور بنا تو اس وقت ملک کے انتہائی اعلیٰ ذہن دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ انھوں نے لمبی بحث اور گفتگو کے بعد یہ دستور بنایا۔ اب کیا ان سے زیادہ بہتر دماغ ہمیں حاصل ہو گئے ہیں جو اس سے اچھا دستور بنا سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص ایسا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ پھر تبدیلی کس لئے۔

دوسری بات یہ کہ دستور میں تبدیلی ہمارے قومی مسائل کا حل ہے، اس کا دعویٰ کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ اگر دستور کی ترمیم سے مسئلہ حل ہوتا ہو تو اب تک اس کو حل ہو جانا چاہئے تھا، کیوں کہ پچھلے پچاس سال کے دوران اس میں ستر بار سے زیادہ ترمیمات ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ پھر ایک اور ترمیم سے یہ مسئلہ کیسے حل ہو جائے گا۔

تیسری صورت ترمیم برائے ترمیم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اور بھی زیادہ بے معنی ہے۔ کوئی بھی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ ترمیم ایک مسلسل عمل ہے جس کو ہر حال میں جاری رہنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اصل سوال یہ نہیں ہے کہ دستور میں ترمیم کی ضرورت ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ ترمیم کے باوجود یہ ضرورت کیوں باقی ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ ترمیم کے باوجود ہمارے مسائل حل نہیں ہوئے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ ہے تعلیم میں ملک کا پچھڑا پن۔ تعلیم انسان کو باشعور بناتی ہے۔ اور اس کے اندر اصلاح کی قبولیت پیدا کرتی ہے۔ جب تک یہ ابتدائی کام نہ ہو، کوئی دوسری تدبیر ہمارے مسائل کو حل کرنے والی نہیں۔

فروری ۲۰۰۰ میں نئی دہلی میں بڑے پیانہ پر کتابوں کی نمائش (ورلڈ بک فیر) منعقد ہوئی۔ اس موقع پر الرسالہ مشن کا بک اسٹال بھی لگایا گیا۔ کافی لوگوں نے کتابیں دیکھیں اور حاصل کیں۔ بک اسٹال پر آنے والوں اور کتاب حاصل کرنے والوں میں مشہور سائنس داں ڈاکٹر عبدالکلام بھی تھے۔

- یونائیٹڈ ریلیجس انی شیٹیو (United Religious Initiative) کی طرف سے ۱۱ مارچ ۲۰۰۰ کو انڈیا انٹر نیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں انٹر فیتھ ڈائیلاگ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی ہم آہنگی کا ذریعہ یہ نہیں کہ تمام مذہبوں کو ایک مان لیا جائے۔ بلکہ اس کا ذریعہ یہ ہے کہ لوگوں میں باہمی احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے۔
- قاہرہ کے عربی جریدہ الجمہوریہ کے فارن افیرس رپورٹر السید ھانی نے ۱۶ مارچ ۲۰۰۰ کو دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کے معاملات و مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسائل کا تعلق انڈیا سے نہیں۔ وہ فطرت کا حصہ ہیں۔ چنانچہ یہ مسائل ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مگر ان مسائل کے باوجود انڈیا میں مسلمانوں کے لئے عمل کے غیر معمولی مواقع ہیں۔ ان مواقع کو استعمال کر کے مسلمان ہر شعبہ میں ترقی کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج مسلمانوں کی حالت ہر اعتبار سے ۱۰۰ گنا زیادہ بہتر ہے۔
- ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی (منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، نئی دہلی) کے تحت ۱۴ مارچ ۲۰۰۰ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں ڈائرکٹوریٹ کے تمام لوگ تقریباً ایک سو کی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور نیشنل انٹگریشن کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس دنیا میں فطرت

کا ایک نظام ہے اور اس نظام کی پیروی کر کے ہی یہاں کوئی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

۵۔ آندھرا پردیش کا سفر نامہ ماہ مئی کے شمارہ میں چھپ چکا ہے۔ خصوصی اہمیت کی بنا پر اس کو مزید علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کا نام مشاہدات دکن ہے۔ جو لوگ اس کو منگانا چاہیں وہ اس سلسلہ میں دفتر سے خط و کتابت کریں۔

۶۔ معلوم ہوا ہے کہ ساؤتھ افریقہ کے بعض دینی مدارس میں مذہب اور جدید چیلنج کا انگریزی ایڈیشن گاڈ ارائزز باقاعدہ نصاب میں داخل ہے۔ واضح ہو کہ ان مدارس میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ یہاں کے طلبہ پہلے اپنی درسیات کے تحت گاڈ ارائزز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ الرسالہ (انگریزی) اور دوسری مطبوعات کو حاصل کرتے ہیں اور الرسالہ مشن کا زیادہ تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح کی خبریں بعض دوسرے بیرونی ملکوں سے بھی ملی ہیں۔

۷۔ تین کتابوں کا ایک سٹ تیار ہو رہا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: مطالعۂ قرآن، مطالعۂ حدیث، مطالعۂ سیرت۔ ان میں سے مطالعۂ سیرت چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ مطالعۂ قرآن لکھی جا چکی ہے، اور زیر طبع ہے۔ مطالعۂ حدیث کی ترتیب کا کام شروع ہو گیا ہے۔ یہ تیسری کتاب نسبتاً زیادہ ضخیم کتاب ہو گی۔

۸۔ الرسالہ مشن کی انگریزی کتابوں کی مانگ مختلف ملکوں میں کافی بڑھی ہے۔ لوگوں کے تقاضہ کے تحت آج کل مطالعۂ سیرت کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جا رہا ہے۔ جلد ہی انشاء اللہ مکمل ہو کر شائع ہو گا۔

۹۔ خبر نامہ کے تحت زیادہ تر مرکز دہلی کی خبریں آتی ہیں۔ حالانکہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت سے مقامات پر الرسالہ مشن سے وابستہ افراد اس کام میں مشغول ہیں۔ گزارش ہے کہ دوسرے مقامات کے لوگ اپنی سرگرمیوں کے بارے میں تحریر فرمائیں تاکہ انھیں خبر نامہ میں شامل کیا جا سکے۔

۱۰۔ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگ جگہ جگہ اسکول اور مدرسے قائم کر رہے ہیں۔ یہ بہت خوش آئند بات ہے۔ لوگوں کو ہر جگہ اس قسم کے تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہئے۔ یہ ایک بنیادی کام ہے اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔

۱۱۔ ڈائری کی مزید کئی جلدیں کتابت ہو کر تیار ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع کی جائیں گی۔ ان میں سے ہر جلد دو سال کی ڈائری پر مشتمل ہو گی۔ ڈائری کا یہ سلسلہ ۱۹۸۳ سے شروع ہوا اور اس کے بعد خدا کے فضل سے یہ مسلسل جاری ہے۔

۱۲۔ الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ کے قارئین خدا کے فضل سے دنیا کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان قارئین کے تاثرات ڈاک، ٹیلیفون، فیکس اور انٹرنیٹ کے ذریعہ برابر ملتے رہتے ہیں۔ مگر طوالت کے خوف سے ان کو خبر نامہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان میں الرسالہ کے افکار تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ یہاں ایک خط بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔ ایک پاکستانی نوجوان اپنے خط مورخہ ۲۵ مارچ ۲۰۰۰ میں لکھتے ہیں: ہم چند نوجوان ایک گاؤں میں رہتے ہیں اور آپ کا الرسالہ اور دیگر کتابیں تقریباً دس سال سے پڑھ رہے ہیں۔ اور آپ کے فکر سے کافی متاثر ہیں۔ ہم آپ کے بہت شکرگذار ہیں اور رب تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کو صحت مند اور توانا رکھے آمین۔ اس سے پہلے بھی ہم نے آپ کو چار پانچ خط لکھے ہیں جن میں سے آپ نے پہلے خط کا جواب بھی لکھا تھا۔ بعد میں آپ کا کوئی خط نہ ملا۔ شاید ہم نوجوان کچھ جذباتی ہیں۔ کیا کریں آپ سے والہانہ محبت اور عقیدت ہے۔ الرسالہ پڑھنے سے پہلے ہم کچھ بھی نہ تھے اور بے قیمت اور جانور جیسی زندگی گذار رہے تھے اور دنیوی مقصد کے سوا کوئی اور مقصد ہی نہ تھا۔ لیکن الرسالہ کے بعد ایسی تبدیلی آئی کہ اب ہم آخرت کے لئے فکرمند رہتے ہیں، اور آپ کے طرز کی زندگی گذارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بس آپ سے التجا ہے کہ تہجد کے وقت رات کو جب آپ اٹھیں تو ہمارے لئے دعا کریں کہ اللہ ہمیں ثابت قدم رکھے اور عمل کی توفیق دے، آمین۔ (زاہد علی، عبدالمنان، معشوق علی اور خیر محمد، پاکستان)

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £[illegible]	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ [illegible]/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel: 462 5454, 461 1128 Fax: 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: Islamic Vision
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-Risala Forum International
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of the Islamic Centre, New Delhi, Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana road, Khureji Khas, Delhi- 110 051

الرسالہ، جولائی، 2000

فہرست

آخرت کی یاد

موجودہ دنیا اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ آدمی کے لئے آخرت کی پیشگی یاددہانی بنے۔ دنیا کا ہر نقصان اس لئے ہے کہ آدمی آخرت کو یاد کرے اور یہ کہے کہ خدایا تو آخرت میں میرے نقصان کی تلافی فرما۔ دنیا کا آرام اس لئے ہے کہ آدمی آخرت کو یاد کر کے یہ کہہ سکے کہ خدایا، دنیا کا آرام وقتی ہے، تو مجھے آخرت کے ابدی آرام سے سرفراز فرما۔ دنیا اس لئے نہیں ہے کہ آدمی اس کو اپنا سب کچھ سمجھ لے۔ بلکہ دنیا اس لئے ہے کہ وہ آدمی کے لئے ایک ربانی تجربہ گاہ بن جائے۔ وہ تخلیق کے ہر مشاہدہ میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگے۔ انسانوں کے ساتھ ہر معاملہ اس کے سینہ میں داخل ہو کر روحانی تجربہ میں ڈھل جائے۔ دنیا اس کے لئے ایک ایسی گزرگاہ بن جائے جہاں اس کا ہر قدم اس کو آخرت کی منزل کی طرف لے جا رہا ہو۔

انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں بظاہر آخرت کا کوئی نشان نہیں۔ مگر انسان کو فہم و بصیرت کی طاقت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ محسوس دنیا میں غیر محسوس آخرت کا مشاہدہ کرے۔ دنیا کے تجربات کو وہ آخرت کے تجربات میں تبدیل کرتا رہے۔ دنیا کی تکلیف میں وہ جہنم کا ادراک کرے۔ دنیا کی راحت اس کے لئے جنت کا ابتدائی تعارف بن جائے۔

آخرت کی کامیابی کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی کلمہ کو صحت تلفظ کے ساتھ دہرا دے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ عقیدہ اس کے لئے ذاتی دریافت بن جائے۔ وہ اس کے شعور کی گہرائیوں میں تیر جائے۔ وہ اس کے لئے مشاہدہ اور تجربہ کا درجہ حاصل کر لے۔

اس دنیا میں آدمی کو نہ دکھائی دینے والی حقیقت کو دیکھنا ہے۔ اس کو نہ سنائی دینے والی آوازوں کو سننا ہے۔ اندھیروں میں چھپی ہوئی حقیقت کو غیر مشتبہ یقین کی صورت میں پالینا ہے۔ ایسا ہی انسان وہ انسان ہے جس نے خدا کو پایا اور یہی وہ انسان ہے جس کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

اعتراف عجز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں ایک شخص پیدا ہوا۔ اس کا نام عبد اللہ بن جدعان تھا۔ وہ نہایت شریف اور سخی آدمی تھا۔ کثرت سے لوگوں کو کھلاتا تھا اور لوگوں کی مدد کرتا تھا۔

عبد اللہ بن جدعان کے بارہ میں ایک روایت صحیح مسلم میں آئی ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

عن عائشة قالت يا رسول الله ان ابن جدعان كان يطعم الطعام ويقرى الضيف، فهل ينفعه ذالك يوم القيامة. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا، انه لم يقل يوماً رب اغفرلي خطيئتي يوم الدين.

حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول، عبد اللہ بن جدعان لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا اور مہمانوں کی عزت کرتا تھا۔ کیا اس کا یہ عمل قیامت کے دن اس کو فائدہ پہنچائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، کیوں کہ اس نے کسی دن یہ نہ کہا کہ اے میرے رب، جزا کے دن میرے گناہ کو بخش دے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ کیا ہے۔ وہ اعتراف ہے۔ بندہ جب اپنی بندگی اور خدا کی خدائی کی پہچان حاصل کرتا ہے تو اس کے اندر شدید طور پر اپنی عاجزی کا احساس طاری ہوتا ہے۔ خدا کی عظمت اور کمال کے سامنے اس کو اپنا وجود سراپا تقصیر نظر آنے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے آگے گر پڑے۔ وہ خدا سے رحمت اور بخشش کی التجا کرنے لگے۔

"خدایا مجھے بخش دے" عجز کا کلمہ ہے۔ اور عجز کا کلمہ ہی جنت کی آخری قیمت ہے۔ جس آدمی کے پاس نہ عمل ہو اور نہ اعتراف بے عملی تو اس کو جنت آخر کس بنیاد پر دی جائے گی۔

آواز بلند کرنا

اکبر الہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کے انداز میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

ظلم سے اکبر بتوں کے، چپ نہ رہنا چاہئے اور کچھ نہ بن پڑے تو شعر کہنا چاہئے

یہ شعر ان انسانوں پر صادق آتا ہے جن کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالف حالات کو بدل سکیں، تو ایسے لوگ لفظی چیخ پکار میں مشغول ہو جاتے ہیں جس کو وہ بطور خود "ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا" کہتے ہیں۔

اس قسم کا لفظی شور و غل یقینی طور پر بے معنی ہے۔ وہ سراسر بے فائدہ ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے جو بے فائدہ کاموں سے بچنے والا ہو۔

ناموافق حالات میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ تعمیر واستحکام کے ذریعہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنایا جائے کہ مخالفوں کے مخالفانہ منصوبے بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ ایسی حالت میں جب بے نتیجہ شور و غل کو کام سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد ایسا ہوگا کہ لوگوں کی توجہ اصل کام سے ہٹ جائے گی۔ وہ سمجھیں گے کہ حالات کے مقابلہ میں ہم کو جو کچھ کرنا چاہئے وہ ہم کر رہے ہیں۔ یہ کوتاہ فہمی ان کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائے گی۔

عمل وہی ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جس عمل کا کوئی حقیقی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو وہ کوئی عمل بھی نہیں۔ ایسی حالت میں "ظلم کے خلاف چیخ و پکار" مضر بھی ہے اور بے فائدہ بھی۔ وہ ایک نقصان کے بعد اپنے آپ کو دوسرے نقصان میں ڈالنا ہے۔

اس دنیا میں اس سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز نہیں کہ نہ کرنے کو، کرنا سمجھ لیا جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں لغو سے پرہیز کرنا کہا گیا ہے۔

پانچ اصول

اصول فقہ کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ بیشتر قاعدے پانچ بنیادی اصولوں میں منحصر ہیں(ان اعظم القواعد الفقهية تنحصر في خمس)ان پانچ سے سیکڑوں ضابطے نکلتے ہیں جو بیشتر امور کو اپنے دائرہ میں لے لیتے ہیں۔ یہ پانچ اصول(القواعد الخمس الذهبية) یہ ہیں:

۱۔ **الامور بمقاصدها** — معاملات کا انحصار نیت اور قصد پر ہے۔

۲۔ **اليقين لا يزال بالشك** — یقین کبھی شک سے زائل نہیں ہوتا۔

۳۔ **الضرر يزال** — نقصان کو دور کیا جائے گا۔

۴۔ **المشقة تجلب التيسير** — مشقت آسانی لے آتی ہے۔

۵۔ **العادة محكمة** — عرف اور رواج قابل لحاظ ہیں۔

آدمی جب بھی کوئی کام کرے یا کوئی قدم اٹھائے تو سب سے پہلے اس کی نیت دیکھی جائے گی۔ اگر اس کی نیت درست ہے تو اس کا اقدام درست ہے اور اگر نیت درست نہیں تو اس کا اقدام بھی درست نہیں۔

ایک شخص کے عام حالات اگر اس یقین کی طرف لے جا رہے ہوں کہ وہ صحیح آدمی ہے تو محض ایک شک کی بنیاد پر اس کو غلط آدمی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اگر ایک شخص تکلیف میں مبتلا ہے یا کوئی نقصان کی صورت پیدا ہو گئی ہے تو ہر حال میں اس کا ازالہ کیا جائے گا، خواہ وہ کسی کا بھی معاملہ ہو۔

بعض فیصلے بظاہر کسی شخص یا گروہ کو مشقت میں ڈالنے والے ہوتے ہیں، لیکن اگر فیصلہ صحیح ہے تو باعتبار انجام اس سے آسانی ظاہر ہو گی۔

جو چیزیں لوگوں کے درمیان پسندیدہ رواج کی حیثیت حاصل کر لیں، ان کی حیثیت بھی ایک قانون کی ہے۔ امکانی حد تک ان پر عمل کیا جائے گا۔

غیر ضروری ٹکراؤ

موجودہ زمانہ میں مذہب اور سائنس کے درمیان جو نظریاتی ٹکراؤ ہوا وہ اکثر غیر ضروری تھا۔ جن چیزوں کو مذہب کے خلاف فرض کرلیا گیا ان کا تعلق نہ مذہب کی مخالفت سے تھا اور نہ موافقت سے۔ اس کی ایک مثالی ارتقاء کا نظریہ ہے۔

مگر خالص علمی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نظریۂ ارتقاء بالفرض صحیح ہو، تب بھی مذہب کے ساتھ اس کا کوئی واقعی ٹکراؤ نہیں ہے۔ کیوں کہ نظریۂ ارتقاء جس چیز سے بحث کرتا ہے وہ خدا کا وجود یا عدم وجود نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہ ذی حیات اشیاء کا نشوو ارتقاء کیسے ہوا۔ وہ خالق کے مسئلہ کا جواب نہیں بلکہ طریق تخلیق کے مسئلہ کا جواب ہے، خواہ خالق کوئی بھی ہو۔ چنانچہ مسلم محققین جو عیسائی علماء کی طرح غلط عقائد کی پیچیدگی میں مبتلا نہیں تھے، انھوں نے بروقت اس نکتہ کو محسوس کیا اور اس کی صراحت کی۔ مثال کے طور پر طرابلس کے شیخ حسین الجسر (۱۹۰۹-۱۸۴۵) کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی میں جبکہ عیسائی علماء نظریہ ارتقاء کو مذہب دشمن قرار دے کر سائنس دانوں سے لڑ رہے تھے، شیخ جسر نے اپنی کتاب "الرسالة الحميدية في حقيقة الديانة الاسلامية" میں نشاندہی کی کہ نظریہ ارتقاء کا مذہب سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ کیونکہ بالفرض وہ صحیح ہو تب بھی وہ صرف خدا کے طریق تخلیق پر روشنی ڈالتا ہے، نہ کہ خدا کے وجود کی نفی کرتا ہے، جیسا کہ خود ڈارون نے اس کو یہی حیثیت دی ہے۔ ڈارون کے نزدیک ارتقاء سے خدا کے وجود کی نفی نہیں ہوتی بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق (Creator) کا طریقِ تخلیق (process of creation) کیا تھا۔

اہل مذہب کو اس معاملہ میں فتوی اور مناظرہ کا انداز چھوڑ کر یہ کہنا چاہئے تھا کہ ارتقاء کے حق میں سائنٹفک دلائل پیش کرو۔ اس کے بعد انھیں معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے حق میں کوئی حقیقی سائنٹفک دلیل موجود ہی نہیں۔

مخلص، غیر مخلص

دو لکڑی بظاہر ایک سائز کی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی قسم کا رنگ لگا ہوا ہے۔ مگر ان میں سے ایک اندر سے دیمک زدہ ہے، اور دوسری پوری طرح پختہ اور سالم ہے۔ اوپر سے دیکھنے میں دونوں بظاہر یکساں معلوم ہوں گی۔ لیکن استعمال کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہوں گی۔ دیمک زدہ لکڑی پر جب کوئی بوجھ رکھا جائے گا تو وہ فوراً ہی ٹوٹ جائے گی۔ اس کے برعکس پختہ لکڑی ہر بوجھ اٹھائے گی، وہ ہر استعمال میں مضبوط اور قابل اعتماد ثابت ہوگی۔

اس مثال سے مخلص انسان اور غیر مخلص انسان کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مخلص انسان ہر آزمائش میں پختہ لکڑی ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر مخلص انسان پر جب کسی آزمائش کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دیمک زدہ لکڑی تھا۔ وہ باہر سے کچھ تھا اور اندر سے کچھ۔

مخلص انسان جو لفظ بولتا ہے وہ عمل کے وقت ٹھیک ویسا ہی کردار ادا کرتا ہے۔ وہ جب کسی سے وعدہ کرتا ہے تو ٹھیک اپنے وعدہ کے مطابق اس کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کو جب کوئی امانت سونپی جاتی ہے تو تجربہ کے وقت وہ پوری طرح امین ثابت ہوتا ہے۔ اس کے اوپر جب کسی کا حق آتا ہے تو وہ کسی عذر کے بغیر صاحب حق کو اس کا حق ادا کر دیتا ہے۔ خواہش اور انانیت اس کو سرکش نہیں بناتی۔ دنیوی مفادات اس کو حق کے راستہ سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

غیر مخلص انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ کو عمل کے وقت یاد نہیں رکھتا۔ وہ زور و شور کے ساتھ لوگوں سے وعدہ کرتا ہے مگر وہ اپنے وعدہ کو کبھی پورا نہیں کرتا۔ اس کو جب کسی چیز کا امانت دار بنایا جائے تو وہ پہلے ہی موقع پر خیانت پر اتر آتا ہے۔

مخلص اور غیر مخلص کا یہی فرق کسی انسان کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔ موجودہ دنیا کی تمام حقیقی کامیابیاں صرف اس انسان کے لئے ہیں جو فی الواقع ایک مخلص انسان ہو۔ یہی وہ انسان ہے جو موت کے بعد کی زندگی میں ابدی سعادتوں سے نوازا جائے گا۔

نیوٹن اور مذہب

مشہور سائنس داں نیوٹن نے مسیحی مذہب کے بارہ میں دو کتابیں چھوڑیں جو اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔ سترہویں صدی کے آخر میں اس نے جان لاک کو ایک مسودہ بھیجا جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بائبل میں تثلیث کی جو آیتیں ہیں وہ اصل متن میں شامل نہ تھیں۔ وہ بعد کا اضافہ ہیں۔

> **In the early 1690s he had sent Locke a copy of a manuscript attempting to prove that Trinitarian passages in the Bible were latter-day corruptions of the original text. (13/20)**

نیوٹن ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم ٹرینیٹی کالج (کیمبرج) میں ہوئی۔ حتی کہ وہ ٹرینٹی کالج کے اسٹاف میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھا۔ مگر اس کا عقلی غور و فکر کا مزاج رواجی مسیحیت سے ٹکرا گیا۔ وہ ٹرینیٹی (تثلیث) کا مخالف ہو گیا جس کے اوپر مسیحی مذہب کی بنیاد ہے۔

مسیحیت کے عقیدۂ تثلیث کے مطابق باپ، بیٹا، روح القدس، تینوں بالکل برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ تینوں یکساں طور پر مقدس ہیں، اور تینوں ناقابل تفریق تثلیث کے تین ارکان ہیں۔ مگر نیوٹن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بیٹا، باپ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بیٹا مخلوق ہے اور باپ خالق۔ بیٹا پہلے دنیا میں غیر موجود تھا، پھر وہ وجود میں آیا۔ لیکن باپ ہمیشہ سے ہے اور وہ ہمیشہ رہے گا۔ جس ہستی کو ہمیشگی حاصل ہے، اور جس ہستی کو ہمیشگی حاصل نہیں، دونوں ہستیاں کس طرح برابر ہو سکتی ہیں۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ اسلام کے سوا جو مذاہب ہیں، وہ کتنی کمزور بنیاد پر قائم ہیں۔ دوسرے مذاہب کی اس کمزوری نے اسلام کو یہ حیثیت دے دی ہے کہ وہ اپنے آپ پھیلے، وہ اپنے آپ لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالے۔

پرامن زندگی کاراز

نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب چھپی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں پر سکون زندگی گزارنے کا راز کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار پارک شائر (برطانیہ) سے 1970ء میں چھپی ہے۔ ۲۷۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

Thomas A Harris MD, I AM OK- YOU ARE OK

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی جب سماج میں زندگی گزارتا ہے تو دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کی چار حالتیں ہو سکتی ہیں۔ انہیں کے الفاظ میں وہ چار حالتیں یہ ہیں:

1. I AM NOT OK — YOU ARE OK
2. I AM NOT OK — YOU ARE NOT OK
3. I AM OK — YOU ARE NOT OK
4. I AM OK — YOU ARE OK

یعنی پہلی حالت یہ ہے کہ میں ٹھیک نہیں اور تم ٹھیک ہو دوسری حالت یہ کہ میں بھی ٹھیک نہیں اور تم بھی ٹھیک نہیں۔ تیسری حالت یہ ہے کہ میں ٹھیک ہوں اور تم ٹھیک نہیں اور چوتھی حالت یہ ہے کہ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک۔ (p. 42)

کتاب کے مصنف کے نزدیک صرف آخری اور چوتھی حالت ہی درست حالت ہے۔ ابتدائی تین حالتیں درست نہیں۔ ابتدائی تین حالتوں میں آدمی کو ذہنی سکون (peace of mind) نہیں ہو سکتا، جب کہ آخری حالت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آدمی کو پوری طرح ذہنی سکون حاصل ہو جائے گا۔

مگر پر سکون زندگی کا یہ فارمولا کوئی درست فارمولا نہیں۔ یہ اس نظریہ پر مبنی ہے جس کو فلسفہ میں نظریہ افادیت (utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ نظریہ افادیت کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ ـــــ یہ اصول کہ کسی چیز کی قدر و قیمت تمام تر اس کی عملی افادیت سے متعین ہوتی ہے:

The doctrine that the worth or value of anything is determined solely by its utility. (Webster's Dictionary)

نظریہ افادیت کو اگر درست مان لیا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ حیوان کے اندر جبلی طور پر خیر وشر کے درمیان کوئی تمیز نہیں۔ حیوان اس فرق کو نہیں جانتا کہ اپنے مالک کے کھیت میں چارہ کھانا صحیح ہے اور غیر کے کھیت میں گھس کر اس کی فصل کھانا غلط۔ مگر انسان کی فطرت میں حق اور باطل کا فرق رکھا گیا ہے۔ وہ فطری طور پر ایک موقف کو درست اور دوسرے موقف کو غلط سمجھتا ہے۔

ایسی حالت میں انسان جیسی مخلوق کے لئے یہ نظریہ درست نہیں ہو سکتا کہ وہ سیاہ اور سفید دونوں کو ایک کہے۔ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک، جیسا نظریہ کوئی شخص مصنوعی طور پر تو اختیار کر سکتا ہے مگر حقیقی طور پر نہیں۔ ایک آدمی اگر دیانتدار (honest) ہے تو وہ اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ ایک حالت کو ٹھیک سمجھے اور اس کے برعکس حالت کے بارے میں اس کی رائے یہ ہو کہ وہ ٹھیک نہیں۔ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک کا نظریہ ایک تاجر کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے مگر ایک بااصول انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس قسم کے نظریہ کو اپنے دماغ میں جگہ دے۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں جہاں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق واختلاف پایا جاتا ہے۔ وہاں ٹکراؤ سے کیسے بچا جائے اور پرسکون زندگی کیسے حاصل کی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا درست فارمولا یہ ہے —— میں اپنے کو حق پر سمجھتا ہوں اور تم کو ناحق پر، مگر میں تمہارا مکمل احترام کروں گا۔ اس فارمولے میں پوری طرح پرامن زندگی حاصل ہو جاتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی فطری حقیقت مجروح ہوئی ہو۔

انسان کو مکمل انسانی زندگی گذارنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یقین (conviction) ہے اور اس یقین کے بغیر ایک انسان کی مثال اس درخت کی سی ہے جو اپنی جڑ سے اکھڑ گیا ہو۔ اور اس یقین کو حاصل کرنے کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اس احساس پر کھڑا

ہوا ہو کہ میں حق پر ہوں، میں نے سچائی کو پالیا ہے۔ یہی یقین اعلیٰ انسانیت کا سر چشمہ ہے اور "میں بھی ٹھیک تم بھی ٹھیک" عین اسی احساس سے انسان کو محروم کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو "میں بھی ٹھیک، تم بھی ٹھیک" کا نظریہ انسان کے لئے ذہنی موت کے ہم معنی ہے۔

اپنے آپ کو حق پر سمجھنا، یا یہ سمجھنا کہ میں نے سچائی کو پالیا ہے کسی بھی درجہ میں دوسروں کے خلاف نفرت یا حقارت کا سبب نہیں۔ بلکہ برعکس طور پر وہ محبت انسانی کا ذریعہ ہے۔ اس معاملہ میں نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ کسی آدمی کے لئے سچائی کی دریافت عین اسی وقت خود اپنے لئے فروتنی (modesty) کی دریافت ہوتی ہے۔ سچائی صرف ایک ایسی چیز ہو سکتی ہے جو آدمی سے بلند تر ہو۔ جو چیز آدمی سے بلند نہ ہو وہ سچائی بھی نہیں۔ ایسی حالت میں جو آدمی حقیقی طور پر سچائی کو دریافت کرے اس نے گویا ایک ایسی عظمت کو دریافت کیا جس کے مقابلہ میں وہ خود غیر عظیم تھا۔ سچائی نہ آدمی کے برابر ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کم۔ سچائی لازمی طور پر آدمی سے عظیم تر ہو گی۔

ایسی حالت میں سچائی کی دریافت کا سب سے بڑا معیار (criterion) صرف ایک ہے اور وہ فروتنی ہے۔ جو آدمی یہ دعویٰ کرے کہ اس نے سچائی کو دریافت کیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے اندر گھمنڈ یا برتری کا احساس ہو تو یقینی طور پر وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے جس چیز کو پایا ہے وہ خود اس کی اپنی ذات ہے نہ کہ برتر سچائی۔

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سچائی کی تلاش کرنے والا ایک حیوان ہے:

Man is a truth-seeking animal

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایک نامکمل مخلوق ہے۔ انسان کی فطرت ہر لمحہ اس کو کسی چیز کی دریافت کرنے پر اکساتی رہتی ہے جو اس سے برتر ہو، جس کے ذریعہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کر سکے۔ یہ کہنا کہ انسان متلاشی حق ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ انسان اپنے سے برتر ایک ایسی چیز تلاش کر رہا ہے جس کے مقابلہ میں وہ اپنی حیثیت

واقعی کا تعین کر سکے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا درست ہو گا کہ سچائی کو پانا دوسرے لفظوں میں گویا اپنی فروتنی (modesty) کو پانا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کبر (arrogance) تمام برے جذبات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں تواضع ہر قسم کی اعلیٰ کیفیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسی حالت میں جب ایک آدمی سچائی کو دریافت کرتا ہے تو ایک طرف وہ اپنی ذات کے لئے یقین کو دریافت کرتا ہے اور دوسروں کی نسبت سے وہ ایک ایسی چیز دریافت کرتا ہے جس کی بنا پر وہ ان کے حق میں شفقت اور خیر خواہی کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لئے احترام کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔

پر امن سماجی زندگی بجائے خود ایک ضروری چیز ہے مگر پر امن سماجی زندگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ چیزوں کے درمیان فرق کو جانتے ہوئے بھی پر امن زندگی کا حصول ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پر امن زندگی کا تعلق پختگی (maturity) سے ہے نہ کہ "میں بھی ٹھیک، تم بھی ٹھیک" جیسے مصنوعی فارمولے سے۔

ہر آدمی اپنی ماں سے محبت کرتا ہے۔ ماں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ مگر اپنی ماں سے محبت کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی دوسرے کی ماں سے نفرت کرے۔ اپنی ماں سے گہری محبت کرتے ہوئے بھی آدمی دوسرے کی ماں کا مکمل احترام کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس نے دوسرے کی ماں کو بھی اپنی ماں کے طور پر تسلیم کیا ہو۔ انسان کے اندر فطری طور پر اتنی زیادہ وسعت ہے کہ وہ بظاہر مختلف چیزوں کو بیک وقت اپنے سینہ میں جگہ دے سکے۔ اسی بات کو ایک مغربی مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

I am large enough to contain all these contradictions.

سماجی ہم آہنگی کے معاملہ میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اختلاف (difference) کو کیسے ختم کیا جائے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اختلاف کے ہوتے ہوئے کس طرح سماجی ہم آہنگی کے

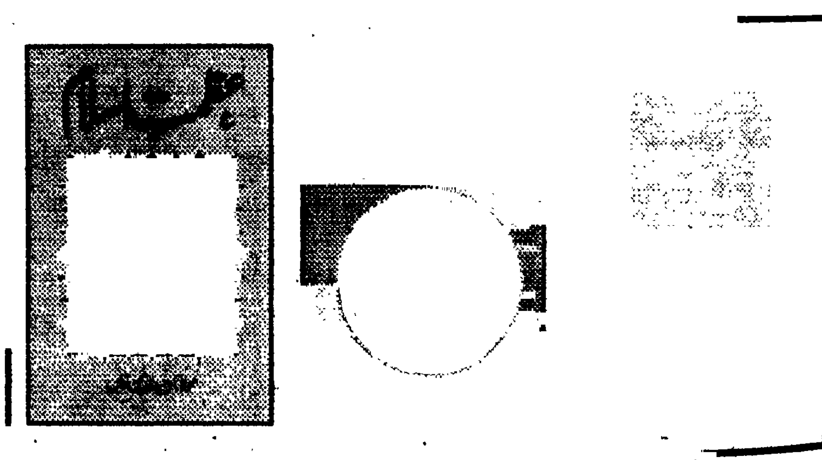
مقصد کو حاصل کیا جائے۔ کیوں کہ اختلاف اور فرق خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اختلاف اور فرق کو ختم کرنا اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

ایسی حالت میں سماجی ہم آہنگی کا درست فارمولا باہمی اعتراف (mutual recognition) نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) ہے۔ اس معاملہ میں اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس تعمیری شعور کو بیدار کیا جائے کہ وہ اختلاف اور فرق کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے زندگی گزار سکیں۔

دنیا میں فرق یا اختلاف کا ہونا کوئی برائی (evil) نہیں۔ بلکہ وہ ایک خوبی ہے جو انسانی ترقی کا زینہ ہے۔ فرق و اختلاف والے ماحول ہی میں لوگ اس اعلیٰ انسانی صفت کی تربیت پاتے ہیں جس کو وسعت قلب اور فراخ حوصلگی کہا جاتا ہے اور جو ہر بڑی کامیابی کی لازمی شرط ہے۔

فرق و اختلاف کے ماحول ہی میں فکری چیلنج ظہور میں آتے ہیں جو انسان کے لئے ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہیں۔ فرق و اختلاف ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسانی ترقی کا سفر محدود نہ ہو کر وسیع الاطراف ہو جائے، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ "میں بھی ٹھیک تم بھی ٹھیک" کا طریقہ کچھ پروفیشنل قسم کے لوگوں کے لئے محدود طور پر مفید ہو سکتا ہے، مگر وہ عام انسانیت کے لئے وسیع تر معنوں میں مفید نہیں۔



فطرت کا قانون

قدیم رومن امپائر کو بننے میں ۷۰۰ سال لگ گئے تھے۔ اسلام نے ۱۰۰ سال سے بھی کم عرصہ میں اس سے بھی زیادہ بڑا امپائر قائم کر لیا جس کی حدود ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندستان کے ایک مشہور ہندو اسکالر ایم این رائے (M. N. Roy) نے اپنی کتاب اسلام کا تاریخی رول (The Historical Role of Islam) میں اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ اسلام کی تیز رفتار توسیع تمام معجزوں سے زیادہ بڑا معجزہ تھا۔

The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles (p. 4)

اسلام کی یہ توسیع سادہ طور پر صرف مذہبی یا سیاسی معنوں میں نہ تھی۔ اسلام کی یہ توسیع در حقیقت ایک عظیم انسانی انقلاب تھا جس نے تاریخ میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جن کا اس سے پہلے مشاہدہ نہیں کیا گیا تھا۔ مورخین نے اس حقیقت کا اعتراف کھلے لفظوں میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مورخ ہنری پرین (Henri Pirenne) نے لکھا ہے کہ اسلام نے کرۂ ارض کی صورت بدل دی۔ تاریخ کا روایتی ڈھانچہ اکھاڑ کر پھینک دیا گیا:

> Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown.

اسی طرح ایک امریکی انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کے اس غیر معمولی رول کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

> Its advent changed the course of human history.

اسلام نے پوری انسانی دنیا میں جو انقلابی تبدیلی پیدا کی اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کے علمی پہلو کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق" میں کیا ہے۔ یہاں میں اس پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو پچھلی صدیوں میں بہت زیادہ نزاعی رہا ہے، یعنی اسلام کا عسکری یا شمشیری رول۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام اس وقت کی بیشتر آباد دنیا میں داخل ہو گیا۔ اس کا یہ داخلہ معروف معنوں میں کوئی شمشیری داخلہ نہ تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ فطرت کا ایک آپریشن تھا۔ اس وقت ساری دنیا پر جمود کی حالت طاری تھی۔ سیاسی اعتبار سے ہر ملک میں جبر کی خاموشی چھائی ہوئی تھی، مذہبی دائرہ میں کلرجی یا مذہبی پیشواؤں نے انسانی سوچ کو محدود خول میں بند کر دیا تھا۔ کلچر کے نام سے اس زمانہ میں جو چیز پائی جاتی تھی وہ صرف توہماتی روایات کا ایک ڈھانچہ تھا جس کا عقل انسانی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عام انسان جہالت کے اندھیرے میں زندگی گزار رہے تھے۔ نسل در نسل انسانیت کا حال یہ تھا کہ لوگ پیدا ہوتے تھے صرف اس لئے کہ وہ اس طرح مر جائیں کہ تاریخ میں ان کی کوئی خبر بھی درج نہ ہو۔ اس قبرستانی سناٹے سے انسانیت کو نکالنے کے لئے ایک عظیم ٹھوکر درکار تھی۔ یہ ٹھوکر بظاہر کسی قوم کے ذریعہ دی جانے والی تھی مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ فطرت کی ایک ٹھوکر تھی۔ جس طرح زلزلہ فطرت کے زور پر آتا ہے اسی طرح یہ ٹھوکر بھی براہِ راست طور پر فطری قانون کے زور پر وجود میں آئی۔ اس ٹھوکر کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ دنیا جامد دور سے نکل کر زندہ اور متحرک دور میں داخل ہو۔ اہل اسلام کے ذریعہ دنیا کو یہی تعمیری ٹھوکر دی گئی۔ یہ زیادہ بڑے پیمانہ پر ویسی ہی ایک ٹھوکر تھی جو کیرم بورڈ پر پیش آتی ہے۔ ایک کھلاڑی اپنے ماسٹر اسٹروک کے ذریعہ بورڈ کی تمام گوٹوں کو متحرک کر دیتا ہے، وہ ان کے سمٹاؤ کو حرکت اور سفر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اہل اسلام جب عرب سے نکل کر وسیع تر دنیا میں داخل ہوئے تو ان کا یہ داخلہ گویا فطرت کا ایک سیلاب تھا جس نے زندگی کی تمام سرگرمیوں کو یک لخت بدل دیا۔ سیاسی نقشے ٹوٹ گئے۔ مذہبی روایتیں ڈھہ پڑیں۔ تجارت وزراعت کے تمام شعبوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔ انسانوں کا فکری جمود ٹوٹ کر فکری انقلاب میں تبدیل ہو گیا۔

اس دنیا میں ہر بڑی تبدیلی کے لئے فطرت کا ایک ہی عالمگیر اصول ہے اور وہ شاک ٹریٹمینٹ کا اصول ہے۔ اس دنیا کی تمام اہم تبدیلیاں اسی اصول کے تحت وقوع میں آتی ہیں۔

مسلمانوں کے لئے عرب کے مشرکین کا سخت جارحانہ رویہ اسی قسم کا ایک شاک ٹریٹمنٹ تھا۔ کروسیڈس(Crusades) کی دوسو سالہ جنگ یورپ کی مسیحی قوموں کے لئے اسی قسم کا ایک شاک ٹریٹمنٹ تھا جو انھیں مسلمانوں کے ذریعہ دیا گیا۔ اسی شاک ٹریٹمنٹ کے نتیجہ میں اس نئے یورپ کا جنم ہوا جس کو نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ اسی طرح جاپان کے لئے ایک شاک ٹریٹمنٹ کے ہم معنیٰ تھی جس سے وہ نیا جاپان ابھرا جو ایک عالمی اقتصادی طاقت بن گیا۔ اسی طرح اب مغربی دنیا کا معاملہ مسلمانوں کے حق میں ایک شاک ٹریٹمنٹ کے ہم معنیٰ ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، یہ یقینی ہے کہ اس شاک ٹریٹمنٹ کے بطن سے مسلمانوں کا ایک نیا دور شروع ہو اور ان کو دوبارہ ایک عالمی طاقت بنانے کا ذریعہ ثابت ہو۔

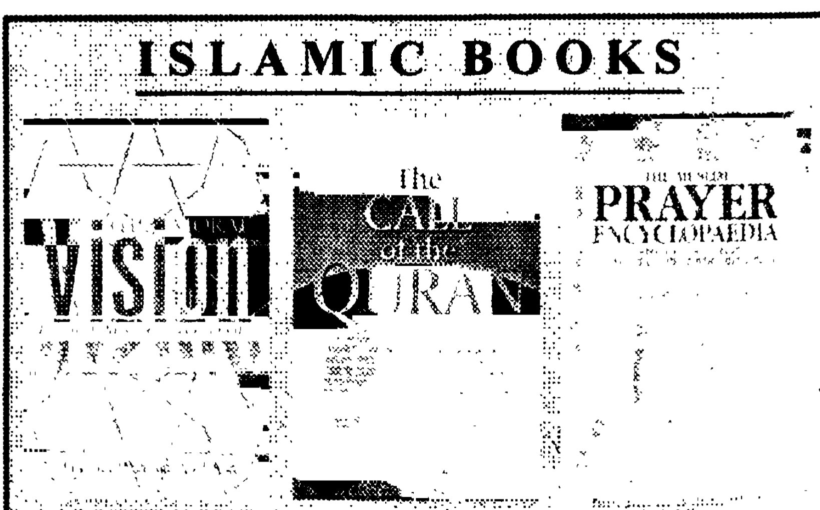
مسلمان اس طرح اپنی ابتدائی صدیوں میں ساری دنیا کے لئے ایک شاک ٹریٹمنٹ دینے والے بن گئے۔ ان کے فاتحانہ اقدامات نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کی تقریباً تمام قوموں کو ہلا دیا۔ اس نے ان قوموں کو لمبی نیند سے جگا کر متحرک اور بیدار کر دیا۔ مسلمانوں کا بدنام شمشیری رول درحقیقت مثبت سرجری کا ایک رول تھا۔ اس نے ان کی چھپی ہوئی فطری صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ اس نے بیمار قوموں کو دوبارہ صحت مند بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس نے جہل اور توہمات کی سیاہ چادر کو پھاڑ کر انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ فطرت کے روشن سورج سے اپنے آپ کو منور کر سکیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ ایک قوم پر دوسری قوم کا حملہ نہ تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ فطرت کا ایک ناگزیر آپریشن تھا۔ یہ کام مسلمانوں سے لیا گیا، کیوں کہ اس وقت کی تمام قوموں میں وہی اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ اہل تھے۔ وہ ایک تازہ دم گروہ تھے۔ ان میں اعلیٰ انسانی صفات پوری طرح موجود تھیں۔ ان کے پاس زندگی کا ایک پیغام تھا۔ وہ رائج الوقت نظاموں کے مقابلہ میں ایک بہتر آئیڈیالوجی رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ ان کے پاس جہاد کا نظریہ تھا جو انسان کو قریبی مفاد سے اوپر اٹھ کر برتر اور اعلیٰ تر مقصد کے لئے متحرک کرتا ہے اور اس کو قربانی کی حد تک جا کر جدو

جہد کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی یہی صفات تھیں جس نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ فطرت کے ایک عالمی انقلابی رول کو ادا کرنے کے لئے چن لئے جائیں۔

فطرت کے اس قانون کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جائے۔ (البقرہ ۲۵۱)

فطرت کے اس قانون کو مذکورہ آیت میں قانونِ دفع کہا گیا ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک قوم سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام قوموں سے ہے۔ ہر قوم کچھ مدت کے بعد اس قانون کی زد میں آجاتی ہے مثال کے طور پر عرب مسلمانوں کے ذریعہ پہلے دوسری قوموں کو "ٹھوکر" دی گئی۔ اس کے بعد منگولوں اور سلجوقیوں کے ذریعہ عربوں کو اس ٹھوکر کا سابقہ پیش آیا۔ اس کے بعد جب مغل اور سلجوق حکمراں جمود کا شکار ہوئے تو دوبارہ انہیں مغربی قوموں کے ذریعہ ٹھوکر لگادی گئی۔ موجودہ مسلمان اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ دفع اقوام کا یہ معاملہ، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، فطرت کا ایک آپریشن ہوتا ہے۔ قوموں کو چاہئے کہ وہ اس معاملہ کو اسی نظر سے دیکھیں تاکہ ان کے اندر مثبت ذہن پیدا ہو۔ ایسے موقع پر منفی ذہن تباہی میں اضافہ کرتا ہے، اور مثبت ذہن ان کو دوبارہ زیادہ بہتر تعمیر کے قابل بنادیتا ہے۔



قاتل انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایاکم والحسد، فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب. (ابو داؤد، کتاب الادب، باب الحسد، ابن ماجہ، کتاب الذہد) یعنی تم حسد سے بچو، کیوں کہ حسد اسی طرح نیکیوں کو کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: لا یجتمعان فی قلب عبدٍ الایمان والحسد (النسائی، کتاب الجہاد) یعنی کسی بندے کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہو سکتے۔

حسد قاتلِ ایمان اور قاتل انسانیت ہے۔ حسد کا نقصان یہ ہے کہ وہ آدمی سے اعلیٰ ایمانی کیفیات کو چھین لیتا ہے۔ حسد اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ آدمی کے سینہ میں وہ دینی جذبات پرورش پائیں جو اس کو اللہ کے قریب کرنے والے ہیں اور جس کا انعام اس کو جنت کی صورت میں ملے گا۔

موجودہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک شخص بظاہر بڑا ہو جاتا ہے اور دوسرا شخص بظاہر چھوٹا۔ یہ امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ اس فرق کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اسے قبول کر لیا جائے مگر جب آدمی بڑے کی بڑائی کا اعتراف نہ کرے اور اس کو چھوٹا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے تو گویا کہ وہ خدا کے فیصلہ کو بدلنا چاہتا ہے۔ ایسا آدمی خدا کی قربت کی لذتوں سے محروم رہے گا۔

حقوق العباد کے سلسلہ میں سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی کے دل میں دوسرے انسانوں کے لئے شفقت اور ہمدردی کا جذبہ ہو مگر حسد آدمی کے اندر سے انسانی ہمدردی کا جذبہ ختم کر دیتا ہے۔ اس کا نقصان اس کو اس بدترین صورت میں ملتا ہے کہ وہ اس حدیث کا مصداق بن جاتا ہے: لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس (البخاری، کتاب التوحید) یعنی اللہ اس آدمی پر رحم نہیں کرے گا جو انسانوں پر رحم نہ کرے۔

قرآن میں تقویٰ کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ کسی سے دشمنی ہو تب بھی آدمی اس کے بارے میں عدل وانصاف کی بات کہے (المائدہ ۸)۔ مگر جس آدمی کے دل میں کسی کے خلاف حسد اور جلن ہو اس کے بارے میں انصاف کی بات کہنا اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ حسد کا جذبہ اس کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے محسود کے بارے میں وہ بات کہے جس میں اس کے دل کو تسکین ملتی ہو نہ کہ وہ بات جو بطور واقعہ درست ہو۔ اس طرح حسد آدمی کو خدا کی نظر میں ظلم اور بے انصافی کا مجرم بنادے گا۔

انسانیت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر موضوعیت (objectivity) ہو۔ وہ لوگوں کے بارے میں غیر جانبدارانہ رائے قائم کرے۔ وہ معاملات کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھ سکے۔ اس قسم کی حقیقت پسندی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ مگر حسد آدمی کے لئے اس میں مانع بن جاتا ہے کہ وہ بے آمیز رائے قائم کر سکے۔ حسد آدمی کے اندر متاثر ذہن پیدا کر دیتا ہے، اور متاثر ذہن کے ساتھ آدمی کبھی کوئی بڑی ترقی نہیں کر سکتا۔ حسد بلاشبہہ خود حاسد کے لئے سب سے بڑی محرومی ہے۔

قرآن وحدیث کے مطابق صدقہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ اس صدقہ کا تعلق صرف مال سے نہیں ہے بلکہ دل اور زبان سے بھی ہے۔ یہ بھی ایک عظیم صدقہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے انسان کے بارے میں اچھی رائے رکھے۔ وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ وہ اچھے الفاظ میں اس کا تذکرہ کرے۔ وہ اس کے حق میں نیک دعائیں کرے۔ مگر جب ایک آدمی کے دل میں دوسرے انسان کے لئے حسد کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ اس عظیم نیکی سے محروم ہو جائے گا۔ اس کی زبان دوسرے انسان کے لئے کھلے گی تو اس کی برائی کے لئے کھلے گی نہ کہ اس کی بھلائی کے لئے۔ اس کا سینہ ایسے انسان کے خلاف نفرت سے بھر جائے گا۔ اس طرح حسد ایک آدمی کو اس آخری نیکی سے بھی محروم کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے حق میں کلمۂ خیر بول سکے۔ یہ ایک ایسی محرومی ہے جس سے بڑی محرومی شاید کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

فہم دین: ایک اصول

عربی زبان میں کہا جاتا ہے لا یضربنك زید۔ لفظی ترجمہ کے اعتبار سے بظاہر اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زید تم کو ہر گز نہ مارے۔ مگر باعتبار حقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ زید تم کو مارنے نہ پائے۔ تم ایسی کارروائی نہ کرو جس کے بعد زید کو تمہیں مارنے کا موقع مل جائے۔ گویا اس جملہ میں خطاب کا رخ ضارب کی طرف نہیں ہے بلکہ مضروب کی طرف ہے۔

۱۔ عربی زبان کا یہ اسلوب قرآن میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فلا ینازعنك فی الامر وادع الیٰ ربك (الحج ٦٧) اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ پس وہ ہر گز تم سے جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے رب کی طرف دعوت دو۔ مگر یہاں بھی وہی اسلوب ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی بظاہر آیت کا رخ مدعو کی طرف ہے مگر حقیقۃً اس کا رخ داعی کی طرف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مدعو کو نزاع برپا کرنے کا موقع نہ دو۔ نزاع سے اعراض کرتے ہوئے اپنی ساری توجہ دعوت کے اوپر لگائے رہو۔

یہ بلاغتِ کلام کا ایک اہم اصول ہے۔ بعض مواقع پر بظاہر خطاب کا رخ ایک چیز کی طرف ہوتا ہے مگر حقیقۃً کلام کے اعتبار سے اس کا رخ کسی اور چیز کی طرف ہوتا ہے۔ یہ نکتہ کلام کے موقع و محل کے مطالعہ سے سمجھ میں آتا ہے۔

۲۔ قرآن میں اس اسلوب کی ایک مثال سورہ نمبر ۸۰ میں پائی جاتی ہے۔ اس سورہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ اندھا اس کے پاس آیا۔ اور تم کو کیا خبر کہ وہ سدھر جائے یا نصیحت کو سنے تو نصیحت اس کے کام آئے۔ جو شخص بے پروائی برتتا ہے، تم اس کی فکر میں پڑتے ہو، حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ نہ سدھریں۔ (عبس ۷)

ان آیات میں بظاہر رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نابینا صحابی عبد اللہ بن ام مکتوم سے اعراض کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ پر بطور عتاب یہ سورہ نازل

فرمائی (تفسیر القرطبی ۱۹/ ۲۱۰) مگر یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی بلاغت کا وہی اصول اختیار کیا گیا ہے جس کے مطابق بظاہر خطاب کسی ایک سے کیا جاتا ہے مگر اصل مقصود کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی خطاب کا اصل رخ اشراف قریش کی طرف ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اشراف قریش پر اپنا عتاب ظاہر فرمایا ہے جو حق کے مقابلہ میں سرکشی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شریف آدمی کا بیٹا گھر سے باہر جائے۔ وہاں محلہ کا ایک شریر لڑکا اس سے الجھ جائے۔ اس کے بعد باپ گھر سے باہر آئے۔ وہ شریر لڑکے کی طرف نہ دیکھے بلکہ اپنے بیٹے کو تنبیہ کرتے ہوئے کہے کہ تم کو یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی۔ تم کو اپنے گھر میں ہوم ورک کرنا چاہئے تھا۔ نہ کہ تم ان لڑکوں کے پاس آکر ان کے ساتھ بیٹھو۔ اس کلام میں باپ کا خطاب بظاہر اپنے بیٹے کی طرف ہے مگر حقیقۃً وہ شریر لڑکے کے خلاف بیزاری کا اظہار ہے۔

۳۔ اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اپنی دعوتِ رسالت پیش کی تو فرعون نے اپنے درباریوں کو خطاب کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کے بارے میں کہا کہ: یرید ان یخرجکم من ارضکم (الاعراف ۱۱۰) یعنی موسیٰ یہ چاہتے ہیں کہ وہ تم لوگوں کو تمہاری زمین سے نکال دیں۔ اس آیت کو کچھ لوگوں نے ظاہر معنیٰ میں لے لیا۔ مثلاً سید قطب مصری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ فرعون نے درباریوں سے کہا کہ: انها الخروج من الارض......انها ذهاب السلطان (فی ظلال القرآن ۳/ ۱۳۴۸) یعنی فرعون نے کہا کہ یہ ہمارے لئے ملکِ مصر سے نکل جانا ہے اور یہ ہمارے اقتدار کا چھن جانا ہے۔ سورۃ الشعراء کی ایک آیت کی تشریح کے تحت بھی سید قطب نے یہی بات لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو فی ظلال القرآن ۵/ ۲۵۹۴۔ (مگر یہ تشریح درست نہیں)

فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ کی پوری تقریر کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پیغمبر نے جو بات کہی تھی وہ فرعون کے قول کے بالکل برعکس تھی۔ فرعون حضرت موسیٰ کے

خلاف یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال کر اس کے اوپر خود سیاسی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نے برعکس طور پر فرعون سے یہ کہا تھا کہ : فارسل معی بنی اسرائیل (الاعراف ۱۰۵) یعنی مجھ کو اجازت دے کہ میں اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر ملکِ مصر سے باہر چلا جاؤں۔ گویا حضرت موسیٰ تو خود اپنے لئے مصر سے نکلنے کی بات کر رہے تھے۔ لیکن فرعون نے اس کو الٹ کر کہا کہ موسیٰ ہم لوگوں کو ہمارے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ فرعون نے جب یہ بات اپنے درباریوں سے کہی تو اس کا مقصد حضرت موسیٰ کے مشن کو بتانا نہیں تھا بلکہ خود اپنے لوگوں کو موسیٰ کے خلاف بھڑکانا تھا۔ چنانچہ اس نے غلط بیانی کر کے حضرت موسیٰ کی طرف وہ بات منسوب کر دی جو انہوں نے کبھی نہیں کہی تھی۔ فرعون کے کلام کا رخ موسیٰ کی طرف نہ تھا بلکہ خود اپنے درباریوں کی طرف تھا۔

مذکورہ تفسیر کی غلطی یہ ہے کہ اس میں موسیٰ کے مشن کو فرعون کے کلام سے نکالا جا رہا ہے جب کہ موسیٰ کا مشن خود موسیٰ کے کلام سے نکلے گا نہ کہ ان کے دشمن فرعون کے کلام سے۔

حدیث کی مثال

کلام کا یہ اسلوب حدیث میں بھی پایا جاتا ہے۔ حدیث کے ذخیرے میں بہت سی روایتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لئے اس نکتہ کو جاننا ضروری ہے۔ ورنہ حدیث کی اصل روح کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔

۴۔ مثال کے طور پر بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ : الصلوۃ المکتوبۃ واجبۃ خلف کل مسلم ، برا کان اوفاجراً (سنن ابی داؤد ۱/۱۵۹) یعنی مکتوب نمازوں کی ادائیگی ہر مسلم امام کے پیچھے واجب ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد ہو۔ اس حدیث میں خطاب کا رخ بظاہر امام کی طرف ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد ماموم یا مقتدی ہے۔ اس حدیث کا مقصود امام کے مسئلہ کو بتانا نہیں ہے بلکہ مقتدی کے مسئلہ کو بتانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی کی نظر میں اس کی مسجد کا امام خواہ بظاہر نیک ہو یا بد، اگر وہ مسجد کا باضابطہ امام ہے تو مقتدی کو

ہر حال میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی خود اپنی نماز پڑھتا ہے نہ کہ امام کی نماز۔ حدیث میں آیا ہے کہ: لکل امریٔ ما نوی (صحیح البخاری) یعنی ہر آدمی کے لئے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ مسجد میں امام مقرر کرنے کا مقصد نماز باجماعت کی تنظیم ہے۔ امام اگر اچھا ہو تب بھی اس کی وجہ سے مقتدی کی نماز اچھی نہیں ہو جائے گی اور اگر بالفرض امام برا ہو تب بھی اس کی وجہ سے مقتدی کی نماز بری نہیں ہو جائے گی۔ مذکورہ حدیث کا مقصد مسجد کے ماحول کو انتشار و افتراق سے بچانا ہے نہ کہ کسی مقتدی کی نماز کا حکم بتانا۔

۵۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: اذا وضع الطعام فاخلعو نعالکم فانه اروح لاقدامکم (الدارمی، کتاب الاطعمۃ) یعنی جب کھانا رکھا جائے تو اپنے جوتے کو اتار دو۔ کیوں کہ اس میں تمہارے پیروں کے لئے زیادہ راحت ہے۔

یہ حدیث بھی اسی اسلوب کلام پر ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ چنانچہ اس حدیث میں حقیقۃً یہ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے کہ کھانے کے وقت جوتا اتار دو بلکہ اس میں راحت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جب کھانا کھانا ہو تو جوتے اتار کر سکون کے ساتھ بیٹھو اور شکر الٰہی کے جذبہ کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ تاہم اگر سردی کا موسم ہو اور جوتا اتارنا راحت کے خلاف ہو تو اس وقت حدیث کا مدعا یہ ہو گا کہ پاؤں کی راحت کی خاطر جوتا پہنے ہوئے کھانا کھایا جائے تاکہ آدمی کی دلجمعی میں فرق نہ آئے اور وہ پوری طرح احساس شکر کے ساتھ کھانا کھا سکے۔

۶۔ اسی طرح حدیث میں متعدد روایتیں آئی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا کھانا پسند تھا۔ مثال کے طور پر حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھانے میں شہد اور میٹھا پسند فرماتے تھے۔ اس کو لے کر کچھ لوگوں نے یہ مسئلہ نکال لیا کہ حلوہ کھانا سنت ہے، حلوہ کھانا باعث ثواب ہے۔ مگر ان احادیث کا یہ مطلب نہیں۔

کھانے کے سلسلہ میں جو روایتیں آئی ہیں وہ تقریباً سب کی سب مدنی دور سے متعلق ہیں۔

یعنی ان روایتوں کا تعلق اس دور سے ہے جب کہ مسلمانوں کے لئے سنگین معاشی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ پسندیدہ غذا کیا ہے۔ بلکہ اصل یہ تھا کہ جو کچھ ملے اس کو شکر اور قناعت کے جذبہ کے تحت کھا لیا جائے۔ کھانے کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے پسندیدگی کے کلمات کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

اس وقت مدینہ میں جن کھانوں کا رواج تھا ان سب کا نام ان احادیث میں آیا ہے۔ ان حدیثوں کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مدینہ کے تمام ہی کھانے رسول اللہ ﷺ کی پسند کے مطابق تھے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا تو درست ہو سکتا ہے کہ مدینہ میں پائے جانے والے تمام کھانے رسول اللہ ﷺ کو پسند تھے۔ مگر یہ بات درست نہیں کہ آدمی ان میں سے کسی ایک روایت کو لے لے اور اس کی بنیاد پر کہے کہ فلاں چیز رسول اللہ ﷺ کو پسند تھی اور اس کو سنت کا نام دے دے۔ سنت ہر چیز کو پسندیدگی کے ساتھ کھانے کا نام ہے نہ کہ کسی ایک چیز کو۔

اسلام کے دور اول میں مدینہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کے معاشی ذرائع محدود تھے۔ جب ہجرت ہوئی اور اچانک مدینہ کی آبادی تقریباً دگنا ہو گئی تو فطری طور پر وہاں معاشی مسائل پیدا ہو گئے۔ مزید یہ کہ ہجرت کے بعد غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور مدینہ کے معاشی وسائل کا بڑا حصہ مستقل طور پر دفاعی ضرورتوں میں صرف ہونے لگا۔ ان اسباب سے مدینہ میں معاشی تنگی کی صورت پیدا ہو گئی۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور اکثر اصحاب کو روزانہ وقت پر کھانا نہیں ملتا تھا۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آ جاتی تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: توفی رسول اللہ وما شبعنا من الاسودین (البخاری، مسلم) یعنی مدینہ میں رسول اللہ کی وفات ہو گئی اور ہم کبھی دو چیز سے شکم سیر نہ ہو سکے (کھجور اور پانی)

ان حالات میں بار بار ایسے مواقع پیش آتے تھے کہ ایک انصاری کو یہ خبر ملتی کہ رسول اللہ نے ایک یا دو وقت سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ وہ دوڑ کر آپ کے پاس آتا اور آپ کو اپنے گھر لے

جاتا۔ اس کے بعد بغیر کسی تیاری کے گھر میں جو کچھ ہوتا وہ اس کو آپ کے سامنے پیش کر دیتا۔ یہ زیادہ تر ایسا معمولی کھانا ہوتا تھا کہ انصاری کو اسے رسول اللہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ (ماعاب رسول الله ﷺ طعاما قط)۔

مزید یہ کہ آپ تمام شریفوں سے زیادہ شریف انسان تھے۔ جب کوئی انصاری آپ کے سامنے شرمندگی کے ساتھ ایک معمولی کھانا رکھتا تو آپ یہ کہہ کر کھانا شروع کر دیتے کہ یہ تو بہترین کھانا ہے۔ اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں، خواہ یہ کھانا سوکھی روٹی اور سرکہ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا یہ قول بظاہر کھانے کے بارے میں ہوتا تھا مگر حقیقۃً اس کا رخ میزبان کی طرف ہوتا تھا۔ آپ میزبان کی شرمندگی مٹانے کے لئے یا اس کی عزت رکھنے کے لئے ایسا کہتے تھے نہ کہ کھانے کی لذت بتانے کے لئے۔ گویا کلام کا رخ اگرچہ بظاہر دستر خوان کی طرف ہوتا تھا مگر اس کا حقیقی رخ میزبان کی طرف ہوتا تھا جو شرمندگی کا احساس لئے ہوئے وہاں موجود ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں، ان کو اگر ظاہر معنیٰ میں لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ کو متضاد قسم کے کھانے پسند تھے۔ میٹھا بھی اور نمکین بھی، گوشت بھی اور سبزی بھی، حتیٰ کہ سالن بھی اور بے سالن بھی۔ اصل یہ ہے کہ مومن کے سامنے جب کوئی کھانا آتا ہے تو وہ اس کو نعمت خداوندی کی نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ لذت زبان کی نظر سے۔ اس لئے مومن کو ہر کھانا خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رزق معلوم ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ ہر کھانے کو خوش ہو کر کھا لیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: **ان الله ليرضى عن العبد ان يأكل الاكلة فيحمده عليها، آو يشرب الشربة فيحمده عليها** (صحیح مسلم) یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ بندہ جب کوئی چیز کھائے تو اس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ یا کوئی چیز پئے تو اس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مومن شکر کی کیفیت کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں کمال درجہ پر تھے۔ اور جو آدمی کھانا کھاتے وقت شکر کی کیفیت سے لبریز ہو اس کو خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی لگے گی۔ وہ ہر چیز کو یکساں طور پر خدا کی نعمت سمجھے گا۔ وہ ہر جائز خوراک کو یکساں پسندیدگی کے ساتھ کھائے گا۔۔۔ کھانے کی کسی چیز کو پسند نہ کرنا، اسے لگے گا جیسے کہ وہ خدا کی ایک نعمت کی ناقدری کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان میں قدیم عرب کے تقریباً تمام قابلِ حصول کھانوں کا ذکر ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جو بھی کھانا آیا اس کو آپ نے پسندیدگی کی نظر سے کھایا۔ اگر آپ کے سامنے روٹی اور نمک لایا گیا تو آپ نے اس کو بھی شوق سے کھایا اور آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: سید ادامکم الملح (ابن ماجہ، ابواب الاطعمۃ) کیوں کہ آپ جو کچھ کھاتے تھے جذبۂ شکر کے ساتھ کھاتے تھے، نہ کہ جذبۂ لذت کے ساتھ۔

آپ نے فرمایا کہ اگر کسی کے پاس روٹی کا ٹکڑا اور پانی (جلف الخبز والماء) ہو تو گویا کہ اس کو دنیا کی بہترین نعمت کھانے کے لئے مل گئی۔

یہاں ہم کھانے کی ان چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو سنن ابن ماجہ (ابواب الاطعمہ) اور مشکاۃ المصابیح (کتاب الاطعمہ) میں منقول ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

الثرید (شوربے میں تر کی ہوئی روٹی) القرع (کدو) اللحم (گوشت) الملح (نمک) الخل (سرکہ) الزیت (زیتون کا تیل) اللبن (دودھ) الحلواء (میٹھی چیز) العسل (شہد) البطیخ (تربوز۔ خربوز) التمر (کھجور) الذبد (مکھن) المرقۃ (شوربۃ) الشعیر (جو) القثاء (ککڑی) الثفل (تلچھٹ)، وغیرہ۔

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم عرب قبائل میں جو کھانے رائج تھے، ان سب کے بارے میں آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ خواہ وہ انتہائی معمولی قسم کا کھانا کیوں نہ ہو۔ ایسی حالت میں کوئی شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ آپ کو تمام کھانے پسند تھے مگر کوئی سنجیدہ آدمی ایسا

یں کر سکتا کہ وہ ان میں سے کسی ایک چیز کو لے کر یہ دعویٰ کرے کہ رسول اللہ ﷺ کو فلاں
ا نا پسند تھا۔ ان روایتوں کے مطالعہ کے بعد جائز طور پر صرف دو بات کہی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ
کھانے کو آپ خدائی رزق کے طور پر دیکھتے تھے۔ اس لئے ہر کھانے کو آپ شکر اور پسندیدگی
ے جذبہ سے تناول فرماتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کبھی ایسا ہوتا کہ آپ ایک غریب میزبان کے
ں کئے ہوئے معمولی کھانے کی اس طرح تعریف فرماتے تھے جیسے کہ وہ بہترین کھانا ہو، یہ
ریف غریب میزبان کی عزت افزائی کے لئے ہوتی تھی نہ کہ اپنی تعریف کے اظہار کے لئے۔

۷۔ قرآن میں ہدایت پائے ہوئے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **الذین ستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ اولئک ھم اولوا الالباب** (لزمر ۱۸) یعنی تم میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دو جو میری بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں عقل والے ہیں۔

اس آیت کو اگر محض لفظی اعتبار سے دیکھا جائے تو بظاہر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ رآن یا پیغمبر کے کلام میں احسن پہلو بھی ہو سکتا ہے اور غیر احسن پہلو بھی۔ مگر اس کا یہ طلب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قول کا غیر احسن پہلو صرف سننے والے کے دماغ میں ہوتا ہے کہ خود قول میں۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس لئے اگر کوئی آدمی چاہے تو وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے ایک سیدھی بات کا بھی ٹا مفہوم نکال سکتا ہے۔

اس غلطی سے بچنے کا راز صرف یہ ہے کہ آدمی کے سامنے جب کوئی بات آئے تو وہ کامل نجیدگی کے ساتھ اسے دیکھے۔ وہ پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کوشش کرے کہ مجھے قول کا وہی فہوم لینا ہے جو صاحب قول کی اصل مراد ہے۔ نہ کہ وہ مفہوم جو میرے اپنے دماغ میں ہے۔ آدمی ا نجیدگی اور دیانت داری اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ تعبیر یا غلط تشریح سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

امتحان کا پرچہ

ایک آدمی کے سامنے گلاب کا ایک درخت ہے۔ وہ اس کا خوبصورت پھول توڑنا چاہتا ہے۔ اگر وہ تیزی کرے اور جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پھول توڑے تو عین ممکن ہے کہ اس کا ہاتھ زخمی ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ گلاب کے درخت کی شکایت کرے یا باغ کے مالی سے الجھ جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ مسئلہ باغ کے مالی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ وہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ مذکورہ شخص کی غلطی یہ ہے کہ وہ بے صبری کر کے فطرت سے ٹکرا گیا۔ حالانکہ فطرت سے ٹکرا کر کوئی بھی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ صرف گلاب کے پودے کا معاملہ نہیں بلکہ یہی پوری دنیا کا معاملہ ہے۔ جس طرح گلاب کے پیڑ میں پھول بھی ہیں اور اسی کے ساتھ کانٹے بھی، اسی طرح دنیا میں ہر طرف مسائل بھی ہیں اور مواقع بھی۔ جو لوگ مسائل میں اپنے آپ کو الجھائیں ان کی مثال اس نادان شخص کی سی ہے جو گلاب کے پیڑ میں کانٹے کو دیکھے اور اس سے الجھ جائے۔ اس کے برعکس جو لوگ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کریں وہ اس دانش مند کی طرح ہیں جو اپنے آپ کو کانٹوں سے بچائے اور احتیاط کے ساتھ پھول کو حاصل کر لے۔

دنیا کی یہ صورت حال اتفاقی نہیں ہے۔ یہ خود اللہ کے منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔ اللہ نے انسان کو آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ پوری دنیا اسی کے مطابق بنائی گئی ہے۔ دنیا میں پھول کے ساتھ کانٹے ہونا یا مواقع کے ساتھ مسائل کا پایا جانا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ انسان کے لئے آزمائش کا پرچہ ہے۔ انسان کا خالق یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو اپنے آپ کو منفی جذبات سے بچاتا ہے اور اپنے اندر مثبت نفسیات کی پرورش کرتا ہے۔ خدا کا مطلوب انسان وہ ہے جو منفی حالات میں بھی مثبت طرز فکر کا ثبوت دے، جو اشتعال والے حالات میں بھی مشتعل ہوئے بغیر رہ سکے۔

مذہب اور سائنس

انسانیات (anthropology) کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مذہب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنا کہ انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اسی وقت سے مذہب بھی یہاں موجود رہا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا انسانی معاشرہ دریافت نہیں ہوا ہے جس کے اندر مذہب نہ پایا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ موجودہ زمانہ جس کو کچھ پر جوش لوگ لامذہبیت کا زمانہ سمجھتے ہیں وہ بھی یقینی طور پر مذہب سے خالی نہیں ہے۔ آج بھی مذہب اتنا ہی زندہ ہے جتنا کہ وہ اس سے پہلے زندہ تھا۔

موجودہ زمانہ میں روایتی مذہبی طبقہ کے علاوہ اہل علم کا جو نیا طبقہ پیدا ہوا، جس کو عام طور پر ماڈرن طبقہ کہا جاتا ہے، وہ وسیع تر تقسیم میں دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اپنے دعویٰ کے مطابق خدا اور مذہب کا منکر ہے۔ اس قسم کے افراد کو عام طور پر ملحد (Atheist) کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اگرچہ مذہب کے روایتی فارم سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرتا، تاہم وہ خود اپنی تشریح کے مطابق، اپنے آپ کو خدا اور مذہب کا ماننے والا بتاتا ہے۔ پہلے گروہ کی ایک ممتاز شخصیت کے اعتبار سے انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل (1872-1970) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے گروہ کی ایک مثال مشہور جرمن سائنس داں البرٹ آئنسٹین (1879-1955) ہے۔

پہلا گروہ: برٹرینڈ رسل

برٹرینڈ رسل ایک غیر معمولی ذہین آدمی تھا۔ اس کو لمبی عمر ملی۔ وہ اپنی نوجوانی کے زمانے سے لے کر بڑھاپے کی عمر تک مسلسل مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی سوانح عمری اور اس کی دوسری کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی عمر میں اس کو سب سے زیادہ جس چیز سے دلچسپی ہوئی وہ یقینیت (certainty) تھی۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے علم کا طالب تھا مگر وہ اس علم کو حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے واقعہ ہونے پر وہ یقین کر سکے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر اس کو سب سے پہلے میتھ میٹکس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں میرا احساس یہ تھا کہ

میں نے اپنے لئے مذہب کا ایک قابل اعتماد بدل پالیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو نظر آیا کہ میتھ میٹکس میں منطقی تیقن (logical certainty) موجود ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں نے میتھ میٹکس کی صورت میں اس علم کو پالیا ہے جس کو میرا ذہن تلاش کر رہا تھا۔ اس کے مقابلہ میں مذہب برٹرینڈ رسل کو توہمات (superstition) کا مجموعہ نظر آیا۔ چنانچہ اس نے مروجہ مذہب کو رد کر کے میتھ میٹکس کو اپنے دین کے طور پر اختیار کر لیا۔

مگر بعد کو جب برٹرینڈ رسل نے زیادہ تفصیلی مطالعہ کیا تو اس کا یہ یقین متزلزل ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا یہ یقین حقائق کے سرسری مطالعہ پر مبنی تھا، حقائق کا زیادہ گہرا مطالعہ اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

برٹرینڈ رسل کے بعد کے مطالعہ کے نتائج کو اس کی کتاب انسانی علم (Human Knowledge) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں برٹرینڈ رسل نے قطعی دلائل کے ذریعہ دکھایا ہے کہ موجودہ دنیا میں انسانی مطالعہ کبھی بھی کسی کو یقینی علم تک نہیں پہنچا سکتا۔ ایک طرف انسانی محدودیتیں اور دوسری طرف کائنات کی پراسرار نوعیت (mysterious nature) فیصلہ کن طور پر یقینی علم کی راہ میں حائل ہیں۔ انسان کا مطالعہ آخر کار جہاں اس کو پہنچاتا ہے وہ تیقن (certainty) نہیں ہے بلکہ صرف قرینہ یا احتمال (probability) ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہم حقیقت (reality) کو براہِ راست دریافت نہیں کر سکتے۔ ہم صرف یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ احتمالی طور پر یہاں فلاں حقیقت موجود ہے، اگرچہ وہ براہِ راست ہمارے تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رسل کو اس کے تمام عمر کے مطالعہ نے جہاں پہنچایا وہ ایک ایسا مقام تھا جہاں وہ حقیقی مذہب کے عین قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر اسلامی الفاظ استعمال کئے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لاالٰہ کی منزل تک پہنچ چکا تھا، مگر اس کے بعد وہ اِلا اللہ کی منزل طے نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اس کی موت ہو گئی۔

برٹرینڈ رسل کی یہ بات کہ انسانی علم ہم کو صرف قرینہ یا احتمال (probability) تک پہنچاتا ہے، یہ اس کی ذاتی بات نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام علماءِ سائنس کا موقف ہے۔ یہ اصول اب جدید علم کا ایک ایسا مسلّمہ بن چکا ہے جس سے کسی بھی صاحب علم کو اختلاف نہیں۔

علمی تحقیقات کا اس حقیقت تک پہنچنا کہ اس دنیا میں، خالص علمی طور پر، ہم صرف قرینہ یا احتمال تک پہنچ سکتے ہیں، بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم موجودہ علم کے مطابق، سائنس اور مذہب کے درمیان وہ فرق ختم ہو چکا ہے جو قدیم زمانہ میں فرض کر لیا گیا تھا۔ اب عقل (reason) کا موقف بھی عین وہی ہے جو اس سے پہلے عقیدہ (belief) کا موقف تھا۔

مذہب کا موقف قدیم ترین زمانہ سے یہ تھا کہ سچائی یا حقیقت اپنی نوعیت میں ایک غیبی چیز ہے، وہ نہ دکھائی دینے والی دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے لئے صرف یہ ممکن ہے کہ ہم ظاہری قرائن کی بنیاد پر یہ مستنبط کریں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے۔ اگرچہ وہ دکھائی نہیں دیتی۔ اب سائنس کا موقف بھی عین یہی ہو چکا ہے۔ جدید سائنس کا کہنا ہے کہ ہم چیزوں کی اصل کو نہیں دیکھ سکتے، ہم چیزوں کے صرف ظاہری اثر (effect) کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور ظاہری اثر سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ فلاں چیز یہاں موجود ہے، اگرچہ بظاہر وہ ہمارے مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے تمام لوگوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرینہ (probability) کی بنیاد پر مذہب کی واقعیت کو بھی اسی طرح مانیں جس طرح وہ سائنسی نظریات کی واقعیت کو مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ماننے کے بعد دوسرے کو نہ ماننے کی کوئی وجہ ان کے پاس موجود نہیں۔ ان حضرات کو جاننا چاہئے کہ اب ان کے لئے جن دو حالتوں کے درمیان انتخاب ہے وہ انکار مذہب اور اقرار مذہب نہیں ہے بلکہ وہ اقرار مذہب اور انکار خویش کے درمیان ہے۔ یہ حضرات اگر مذہب کے انکار پر مصر ہوں تو انہیں خود اپنا انکار بھی کرنا پڑے گا۔ چونکہ ان کے لئے اپنا انکار ممکن نہیں اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مذہب کا انکار کریں۔

دوسرا گروہ: آئنسٹائن

دوسرے گروہ کی ایک علامتی شخصیت آئنسٹائن ہے۔ آئنسٹین نے اپنی پوری زندگی سائنس کے مطالعہ میں گزاری۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے اندر روحانی جذبات بھی پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے مذہب کا بھی مطالعہ کیا۔ مذہب کے بارے میں بھی اس کا عقیدہ اتنا ہی گہرا تھا جتنا کہ سائنس کے بارے میں اس کا عقیدہ گہرا تھا۔ تاہم اس کے نظریہ کے مطابق دونوں دو بالکل الگ الگ موضوعات تھے۔ اس کے الفاظ میں، سائنس کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہے (what is) اس کے مقابلہ میں مذہب کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہونا چاہئے (what should be) گویا مذہب کا تعلق داخلی یقین سے ہے اور سائنس کا تعلق خارجی معلومات سے۔

تاہم یہ تقسیم کافی نہیں۔ اس تقسیم کے باوجود وہ اصل سوال بدستور باقی رہتا ہے جس کی بنا پر سائنس اور مذہب کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ خالص علمی اعتبار سے مذکورہ تقسیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ اصل سوال مذہب اور سائنس دونوں کو ملانے کا ہے۔ مذہب علم الٰہی کا نام ہے اور سائنس علم انسانی کا نام۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ایسا فارمولا دریافت کریں جو علم الٰہی اور علم انسانی دونوں کو ایک کر سکے۔ اس کے بغیر انسان کے اندر وہ مطلوب شخصیت پیدا نہیں ہو سکتی جس کو علم نفسیات میں متکامل شخصیت (integrated personality) کہا جاتا ہے۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے لوگوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے علم کی نوعیت کو نہیں سمجھا۔ اس لئے وہ صحیح رائے تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرح آئنسٹائن اور اس کے جیسے لوگوں کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے مذہب کی نوعیت کو نہیں سمجھا اور اپنی عدم واقفیت کی بنا پر مذہب کا ایک خود ساختہ تصور قائم کر لیا جو حقیقت سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ اس گروہ کے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ تمام مروجہ مذاہب کو مذہب کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب (major religions) ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں دوسرے مذاہب موجود ہیں۔ یہ لوگ ان سب کو ملا کر مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مذہب کی تعلیمات ایک دوسرے سے

مختلف ہیں۔ ان میں وہ یکسانیت نہیں پائی جاتی جو سائنس میں موجود ہے۔ اس لئے وہ یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ مذہب ایک شخصی معاملہ ہے۔ جو شخص جس مذہبی عقیدہ کو مانے وہی اس کا مذہب ہے، کسی دوسرے شخص کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

اس قسم کا مذہبی تصور خود مذہب کی نفی ہے۔ مذہب کیا ہے۔ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ایسی مکمل آئیڈیالوجی کا نام ہے جو انسان اور کائنات کی اطمینان بخش توجیہہ کر سکے۔ جس میں انسان اپنے تمام داخلی اور خارجی سوالات کا جواب پالے۔ مذہب آدمی کے لئے یقین کا سرچشمہ ہے۔ جو مذہب کلی صداقت نہ ہو وہ انسان کو یقین کا سرمایہ نہیں دے سکتا۔ اور جو مذہب انسان کو یقین نہ دے وہ مذہب بلاشبہہ مذہب بھی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جدید اہل علم مذہب کے مطالعہ میں چند غلطیاں کرتے ہیں۔ اس بنا پر وہ مذہب کو سمجھنے میں بھی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

ا۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر موجود مذہب کو مستند مذہب سمجھ لینا اور اس بنیاد پر مذہب کا مطالعہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے توہماتی عقائد جیوتش (Astrology) اور فلکیات (Astronomy) سب کو یکجا کر کے اور پھر ان کے مجموعی مطالعہ سے ایک علم الافلاک بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس معاملہ میں سائنٹفک مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ غیر ثابت شدہ خیالات اور اوہام کو الگ کر دیا جائے اور صرف ثابت شدہ معلومات کی بنیاد پر علم افلاک وضع کیا جائے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہمیں مذہب کے مطالعہ میں بھی اختیار کرنا چاہئے۔ بطور واقعہ یہ درست ہے کہ آج کی دنیا میں مذہب کے نام سے بہت سے اعتقادی نظام پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کا گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص علمی اعتبار سے تمام مذاہب کی حیثیت یکساں نہیں۔

ان میں ایسے مذاہب ہیں جن کی کوئی معلوم تاریخ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام مذاہب ابتدائی طور پر ہی رد ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ جن مذاہب کو تاریخی اعتباریت (historical credibility)

حاصل نہ ہو وہ سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ اسی طرح کتنے مذاہب ہیں جن کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ ان کا موجودہ متن (text) کسی تبدیلی کے بغیر آج موجود ہے، اور جس مذہب کا خود متن مشتبہ ہو اس کی صداقت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے مختلف علمی معیار (scientific criteria) ہیں جن کا استعمال مذاہب کے مطالعہ میں ضروری ہے۔ مگر جب ان معیاروں کو موجودہ مذاہب پر منطبق کیا جاتا ہے تو یہ مذاہب اس علمی جانچ پر پورے نہیں اترتے۔

مذاہب کے پورے مجموعے میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو استثنائی طور پر اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ ہر قسم کی علمی جانچ پر پورا اترتا ہے۔ ایسی حالت میں تمام موجود مذاہب کو یکساں درجہ دے کر ان کا خلاصہ نکالنا ایک غیر علمی فعل ہے۔ اس معاملہ میں واحد درست موقف یہ ہے کہ ضروری علمی جانچ پر پورا اترنے والے مذہب کو لے لیا جائے اور جو مذاہب اس قسم کی علمی جانچ پر پورے نہ اتریں انہیں تاریخ کے کتب خانہ میں محفوظ کر دیا جائے۔

۲۔ اسلام کو مذہب کا مستند ایڈیشن (authentic version) ماننے کے بعد وہ تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جاتی ہیں جو مختلف مذاہب کو یکساں درجہ دینے کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کائنات کے بارے میں توہماتی عقائد کو الگ کر کے خالص سائنسی حقیقتوں کی بنیاد پر کائنات کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ اسلام کو مذہب کا واحد نمائندہ ماننے کی صورت میں ہم کو ایک ایسا مستند ماخذ مل جاتا ہے جس کے ذریعہ مذہبی عقائد کا ایک غیر اختلافی نظام بنایا جا سکے۔ مثلاً مذاہب میں خدا کے بارے میں مختلف اور متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبری اور رسالت کے بارے میں سخت اختلافی نظریات موجود ہیں۔ موت کے بعد زندگی کی نوعیت کیا ہوگی، اس کے بارے میں بھی متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے تمام مذہبی عقائد وافکار کا ہے۔ مگر اسلام کو مذہب کے مستند ماخذ کی صورت میں لینے کے بعد ہمیں ایسے غیر اختلافی نظریات وعقائد

مل جاتے ہیں جن پر ہم یقین کر سکیں۔ یقین وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کے لئے انسان کو مذہب کی ضرورت ہے۔ اور تمام مذاہب کو یکساں ماننے کی صورت میں، اسی اصل مطلوب چیز سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔

۴۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ مذہب اور دنیوی معاملات کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہو۔ یہ ایک بے حد اہم سوال ہے جس کا جواب مختلف مذاہب میں مختلف انداز سے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں دنیوی معاملات کو مذہب کا لازمی جزء قرار دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ لوگوں کو ناقابل عمل نظر آنے لگا۔ یہاں تک کہ چرچ اور ریاست میں وہ جنگ شروع ہوئی جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ اس معاملہ میں اسلام نے نہایت اہم ہدایات دی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

الف۔ اسلام میں ایک اہم تعلیم وہ ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: انتم اعلم بامور دنیاکم (صحیح مسلم) یعنی تم لوگ اپنی دنیا کے معاملہ میں زیادہ جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالص دنیوی نوعیت کے معاملات، مثلاً زراعت، باغبانی، شہری منصوبہ بندی، اقتصادی تنظیم جیسی چیزوں کو علمی ریسرچ کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔ یعنی علمی ریسرچ میں جو چیز انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوگی وہی مذہب کے نزدیک بھی درست مانی جائے گی۔

ب۔ اسی طرح مذہب اور سیاسی حکمرانی کے معاملہ میں قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ سیاسی اقتدار اللہ کا ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے سیاسی اقتدار دیتا ہے (آل عمران ۲۶) مزید یہ کہ سیاسی اقتدار امتحان کا ایک پرچہ ہے جس طرح مال اور اولاد وغیرہ امتحان کے پرچے ہیں (یونس ۱۴)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی حکمرانی کے حصول کے لئے لڑائی کرنا اسلام کی تعلیم نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فطری تاریخی حالات جس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کریں، دوسرے لوگ اس کو قبول کر کے اس کو اپنے امتحان کا موقع دیں، نہ کہ لڑائی کر کے اس سے سیاسی امتحان کے خداداد پرچے کو چھیننے کی کوشش کریں۔

کیمسٹری کی سائنس اگر مفروضات پر بنے ہوئے قدیم فن کیمیا کو اپنے ساتھ شامل رکھتی تو کیمسٹری کی سائنس کبھی ترقی نہیں کرتی۔ اسی طرح ایسٹرانمی، اگر اوہام پر قائم قدیم علمی نجوم پر بھروسہ کرتی تو جدید ایسٹرانمی کا ارتقاء ممکن نہ ہوتا۔ یہی معاملہ تمام علوم کا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف علوم کی ترقی صرف اس وقت ممکن ہوئی ہے جبکہ ہر علم سے غیر سائنسی مفروضات کو الگ کردیا گیا۔ اور خالص سائنسی حقائق کی بنیاد پر تمام علوم کو مدون کیا گیا۔ یہی اصول ہمیں مذہب کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔

مذہب میں سائنسی مطالعہ کے ذریعہ ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ کون سا مذہب غیر متغیر حالت میں آج بھی موجود ہے۔ اور کون سے وہ مذاہب ہیں جو تغیرات کی بنا پر اپنا علمی استناد (authenticity) کھو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے جب خالص علمی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیثیت اب صرف اسلام کو حاصل ہے۔ اسلام کا متن، اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات حتیٰ کہ اس کے متن کی اصل زبان بھی آج تک پوری طرح اپنی ابتدائی حالت میں موجود ہے۔ اسلام ہمیں قابلِ یقین مذہبی نظام بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسری وہ تمام چیزیں بھی جن کی ہمیں اپنی مذہبی زندگی کی تشکیل کے لئے ضرورت ہے۔

اتحاد کا فارمولا

نومبر۔دسمبر ۱۹۹۹ میں امریکہ کے لئے میرا دوسوال سفر ہوا۔ موجودہ زمانہ میں امریکہ کو مادی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ اس کارازمیں نے یہ جانا کہ امریکہ کے لوگ کٹر ذہن کے نہیں ہیں۔ وہ تجربہ سامنے آنے کے بعد فوراً اس کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں یونی کلچرل ازم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی یہ کوشش کی گئی کہ امریکہ کے تمام لوگ ایک ہی کلچر کو اختیار کرلیں۔ اس تحریک کو امریکنائزیشن کا نام دیا گیا۔ مگر متنوع کلچر کے امریکی سماج میں اس نظریہ کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اب امریکیوں نے اس کے جبری نفاذ کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یونی کلچرل ازم کے نظریہ کو چھوڑ کر ملٹی کلچرل ازم کے نظریہ کو اختیار کرلیا۔

اب امریکہ میں ہر کلچرل گروپ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ انھیں باقاعدہ تعاون دیا جاتا ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے اپنے کلچرل روٹ پر قائم رہو۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسٹیبلائزڈ سوسائٹی (stabilized society) اسی طرح بن سکتی ہے۔ جس سماج کے افراد اپنی ثقافتی جڑوں سے اکھڑ جائیں، وہ اکھڑے ہوئے پیڑ کی مانند ہیں۔ ایسے لوگ نہ اپنے کام کے ہوں گے اور نہ دوسروں کے کام کے۔ کلچرل نیشنلزم یا یونی کلچرل ازم ایک قسم کا نظریاتی جنون ہے۔ ایسا نظریہ تخریب کاری میں تو مددگار ہو سکتا ہے مگر وہ کسی قوم کی تعمیر کاری نہیں کر سکتا۔

اس کے پیچھے زبردست حکمت ہے۔ کسی قوم کا کلچر ہمیشہ تاریخی عمل کے دوران تدریجی طور پر بنتا ہے۔ کلچر کوئی نافذ کرنے کی چیز نہیں۔ کسی خود ساختہ کلچر کو جبری طور پر نافذ کرنا سوسائٹی کو ڈی اسٹیبلائز کرنے کے ہم معنی ہے۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ سماجی انتشار ہوتا ہے۔

ہندستان میں کلچر کے معاملہ میں صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ "رام رحیم ایک ہے"۔ مگر یہ ایک خلاف واقعہ بات تھی اس لئے وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ خود مہاتما

گاندھی بھی اس کو اختیار نہ کر سکے۔ ۱۹۴۸ میں جب ان کو گولی لگی تو انھوں نے "ہے رام ہے رحیم" نہیں کہا بلکہ اس وقت ان کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ صرف یہ تھا: "ہے رام"۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ جو ہندستان میں ابھرا وہ ہندتو کا نظریہ تھا جس کو کلچرل نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ یعنی سب کو ایک مفروضہ بھارتی کلچر کا پابند بنانا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو رامائزیشن آف رحمان کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوسرا نظریہ نا قابل عمل ہونے کے ساتھ کٹرپن یا فناٹسزم کا عنصر بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ عقل اور فطرت دونوں کے خلاف تھا اس بنا پر وہ نہ چلا اور نہ کبھی چل سکتا۔ صحیح اور فطری بات یہ ہے کہ کلچرل اختلاف کے معاملہ میں لکم دینکم ولی دین کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی وہی طریقہ جس کو انگریزی میں کہا جاتا ہے: Let us agree to disagree.

کلچر اپنی فطرت ہی میں متنوع چیز ہے۔ کلچر کے معاملہ میں صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہر ایک کو آزادی دی جائے، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی آزادی کو جارحیت کی حد تک نہ لے جائے۔ گاندھی اور ان جیسے لوگوں کا نظریہ اس اصول پر مبنی ہے کہ تم مجھ کو سچا مانو میں تم کو سچا مانوں گا۔ اس کے مقابلہ میں ہندتو کا نظریہ گویا تنوع کو بلڈوز کر کے صرف ایک کو قائم کرنے کا نام ہے۔ مگر یہ دونوں ہی نا قابل عمل ہیں۔ اس معاملہ میں صحیح فارمولا یہ ہے کہ ہر ایک اپنی پسند کے طریقہ پر چلے، اور دوسرا طریقہ اپنانے والوں کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا جائے۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرق واختلاف انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوں۔ بالفرض اگر ہم مذہبی فرق کو ختم کر دیں تب بھی ہزاروں معاملات ایسے باقی رہیں گے جن میں لوگوں کے درمیان فرق واختلاف موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں اصل ضرورت یہ ہے کہ مجموعی انسانی زندگی کے لئے اتحاد کا فارمولا دریافت کیا جائے نہ کہ صرف مذہبی شعبہ کے لئے۔ اور یہ فارمولا صرف ایک ہے۔ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کرنا اور باہم مل جل کر رہنا۔

سوال

ہم لوگوں نے ہندو مسلم میل ملاپ کا ایک منچ بنایا ہے۔ اس کے بارے میں ہم کو مارگ درشن کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سب مذہب ایک ہیں۔ جیسے رام ویسے محمد۔ یہ بات دونوں مان لیں تو آپس میں اپنے آپ میل ملاپ ہو جائے گا۔ (بلراج ملک اور وجے آنند، پانی پت)

جواب

ہندو مسلم میل ملاپ کا مقصد بہت اچھا ہے۔ مگر "سب مذہب ایک ہیں" کے نظریہ سے یہ مقصد حاصل ہونے والا نہیں۔ اس لئے کہ یہ بات اصل واقعہ کے خلاف ہے۔ مثلاً ہندو عقیدہ کے مطابق۔ رام خدا کے اوتار تھے، یعنی ان کی صورت میں خود خدا مجسم ہو کر آیا۔ مسلمان اوتارواد کے اس عقیدہ کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک محمد ﷺ ایک انسان تھے جن پر خدا نے اپنی وحی بھیجی۔ ایسی حالت میں دونوں کو ایک کہنے سے جس چیز کو فروغ ہوگا وہ منافقت (hypocrisy) ہے نہ کہ فرقہ وارانہ میل ملاپ۔

ہندو مسلم میل ملاپ کا منچ بنانے کے لئے مفید طریقہ یہ ہے کہ اس کو سیکولر پیٹرن پر بنایا جائے نہ کہ کسی مذہبی پیٹرن پر۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کانگریس کے لوگ جو اسٹیج بناتے تھے اس پر ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی کافی تعداد میں آتے تھے۔ مگر آج ہندوتو کو ماننے والے جو اسٹیج بناتے ہیں اس پر زیادہ تر صرف ایک فرقہ کے لوگ آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہندوتو والا اسٹیج بناتے ہیں وہ وہاں سرسوتی دیوی کی وندنا کرتے ہیں اور کھڑے ہو کر بندے ماترم گاتے ہیں۔ مسلمان چونکہ ان چیزوں سے بھڑکتے ہیں اس لئے وہ ایسے اسٹیج پر اکٹھا نہیں ہوتے۔ جب کہ کانگریس کے اسٹیج پر اس قسم کی مذہبی رسمیں نہیں تھیں بلکہ وہ بالکل سیکولر انداز میں ہوتا تھا۔ اس لئے وہاں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی یکساں طور پر شریک ہوتے تھے۔

اگر آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک منچ بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ایسی چیزوں سے بچنا ہوگا جو دونوں کے لئے حساس اشو (sensitive issue) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ اپنے

منچ پر یہ کہیں کہ اجودھیا کے موجودہ عارضی مندر کو ڈھا کر وہاں دوبارہ بابری مسجد بنائی جائے تو ایسے منچ پر مسلمان تو آسکتا ہے مگر وہاں ہندو نہیں آئے گا۔ اسی طرح اگر آپ اپنے منچ پر یہ کہیں کہ جانوروں کا ذبیحہ بالکل ختم کر دیا جائے تو ایسے منچ پر ہندو آسکتے ہیں مگر وہاں مسلمان نہیں آئے گا۔ اس لئے آپ کو دونوں فرقوں کے میل ملاپ کا منچ بنانا ہے تو آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اس قسم کے حساس اشو کو نظر انداز کریں اور صرف ان باتوں کو لیں جو دونوں کے درمیان مشترک ہیں۔ مثلاً امن، باہمی محبت، سوشل جسٹس، تعلیم، ملک کی مادی تعمیر، سماج سدھار وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالت میں ہندستان کے لئے وہی نمونہ قابل عمل ہے جو یورپ اور امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس معاملہ کا ایک عملی فارمولا دریافت کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پرائیویٹ دائرہ میں ہر آدمی کے لئے مذہب کی مکمل آزادی اور اجتماعی دائرہ میں مشترک مفاد والی باتوں پر زور دینا۔ موجودہ حالات میں ہم کو بھی یہی کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک فرقہ وارانہ میل ملاپ یا مذہبی ہم آہنگی کا بہترین قابل عمل فارمولا یہ ہے کہ ایک پر عمل کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one, respect all

برصغیر ہند کے تقریباً ۱۵ ملین ہندو اور مسلمان امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہاں دونوں کے درمیان کوئی مذہبی جھگڑا نہیں۔ دونوں نے بڑی تعداد میں مسجد اور مندر بنائے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے انداز پر اپنے مذہبی فرائض کو ادا کرتا ہے۔ پھر اگر امریکہ میں ہندو اور مسلمان مذہبی یکسانیت کے فارمولا کے بغیر اتحاد کے ساتھ رہ سکتے ہیں تو یہی چیز ہندستان میں کیوں ممکن نہیں۔

سوال

سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (The Satanic Verses) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ اور اس کا مصنف ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہے جس کی سزا سخت ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ (نکہت کاظمی، نئی دہلی)

جواب

اسلام کی تعلیمات حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ اس طرح کے معاملات کو اسلام میں جذباتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ رزلٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم باطل معبودوں کو برا نہ کہو ورنہ لوگ جہالت کی بنا پر خدا کو برا کہنے لگیں گے (الانعام ۱۰۸) یہی وجہ ہے کہ قدیم مدینہ کے سب سے بڑے گستاخ عبد اللہ بن ابی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے طاقت کے باوجود قتل نہیں کرایا۔ اس کی وجہ آپ نے یہ بتائی کہ اگر میں ایسا کروں تو وہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہوگا۔ چنانچہ عبد اللہ بن ابی اپنی طبعی موت مرا اور اس کو قتل نہیں کیا گیا، حالانکہ اس وقت عبد اللہ بن ابی کو قتل کرنا بالکل آسان تھا۔

سلمان رشدی کے خلاف قتل کا فتویٰ ۱۷ فروری ۱۹۸۹ کو دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو اب تقریباً ۱۲ سال ہو رہے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس فتویٰ نے صرف الٹا نتیجہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی بدنامی ہوئی۔ اسلام کو نفرت اور تشدد کے مذہب کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اس کتاب کے خلاف فتویٰ اور شور و غل سے اس کے مصنف کو تو زبردست فائدہ حاصل ہوا، جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے حصہ میں صرف اس کا نقصان آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ میڈیا کا دور تھا۔ اور جدید میڈیا کے دور میں یقیناً وہی ہونے والا تھا جو عملاً پیش آیا۔

سلمان رشدی کی مذکورہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب تصنیفی اعتبار سے اس قدر لغو اور غیر دلچسپ ہے کہ شاید کوئی بھی شخص اس کو شروع کرکے ختم نہیں کر سکتا۔ عام حالت میں وہ ایک ایسی کتاب تھی جو اپنی لغویت کی بنا پر اپنے آپ مر جاتی۔ اس کو نہ کوئی خریدتا اور نہ اس کو کوئی پڑھتا۔ مگر مصنف کے قتل کے فتویٰ کے بعد جب میڈیا میں اس کا چرچا ہوا تو فطری طور پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس طرح ایک ناقابل مارکیٹ کتاب بھی قابل مارکیٹ (marketable) کتاب بن گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس فتنہ کا صحیح ترین حل یہ تھا کہ اس کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا

اوراس طرح یقینی طور پر وہ اپنے آپ مر جاتی۔ اس طرح کے مسئلہ کا صحیح ترین حل وہ ہے جو اسلام کے خلیفۂ ثانی عمر فاروق کے ایک قول میں ملتا ہے۔ انھوں نے کہا: امیتوا الباطل بالصمت عنہ. یعنی باطل کو ہلاک کرو اس پر چپ رہ کر:

Kill the falsehood by observing silence over it.

سوال

آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ سارے لوگ آپ کی بولی بول رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کا نام لئے بغیر آپ کی باتوں کو دہرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ میثاق (اپریل ۲۰۰۰) میں پاکستان کی تنظیم اسلامی کے امیر کا مفصل خطاب چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے صلح حدیبیہ کی پالیسی کی حمایت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ "بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ کے طرز کی مفاہمت" ہمارے مسئلہ کا حل ہے۔ حالانکہ یہ صاحب پہلے آپ کے مخالف تھے اور جوش و خروش کے ساتھ مسلح جدو جہد (armed struggle) کی بات کیا کرتے تھے۔ یہی بات دوسرے اکثر لکھنے اور بولنے والوں میں دیکھی جارہی ہے۔ اس طرح آپ کے اعتراف کے بغیر تقریباً تمام لوگوں نے آپ کے نقطۂ نظر کو مان لیا ہے۔ اس پر آپ کا تبصرہ کیا ہے (عبدالرحمٰن، نئی دہلی)

جواب

یہ بات عملی طور پر اطمینان بخش ہے کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اب عام طور پر حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ مگر میرے لئے اس میں بہت زیادہ خوشی کی بات نہیں۔ میں حدیبیہ کی وکالت بطور ایک اصول کرتا رہا ہوں۔ مگر یہ حضرات اس کو ایک مجبورانہ عمل کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔ مثلاً ماہنامہ میثاق کے مذکورہ خطاب میں حدیبیہ پالیسی کی وکالت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پاکستان کو بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ کی طرز کی مفاہمت کرنی چاہئے (۲۵) پاکستان جس مسئلہ سے دوچار ہے اس کا علاج صلح حدیبیہ ہے (۱۵) پاکستان کے لئے جنگ جیتنا ممکن نہیں کیوں کہ پاکستان سے کہیں زیادہ ایٹم بم بھارت کے پاس موجود ہیں (۲۲)۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جو کچھ کہتا ہوں، بطور اصول کہتا ہوں نہ کہ بطور مجبوری۔ صبر میرے نزدیک ایک اعلیٰ اصول ہے نہ کہ مجبورانہ روش۔ اسی طرح صلح حدیبیہ میرے نزدیک ایک اعلیٰ اسلامی اصول ہے، وہ کوئی مجبورانہ پالیسی نہیں۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ جب مجبوری کی فضا نہ ہو تو مسلح تصادم کی باتیں کی جائے، اور جب مجبوری کی حالت پیش آجائے تو صلح حدیبیہ کا وعظ شروع کر دیا جائے۔ صلح حدیبیہ میرے نزدیک دعوتی عمل کو موثر طور پر جاری رکھنے کی ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔ نہ کہ کسی قسم کی مجبورانہ روش۔

سوال

میں آپ کے الرسالہ کا خریدار ہوں۔ ایک حدیث کی وضاحت چاہتا ہوں۔ حدیث یہ ہے: اذان کے وقت کی دعا قبول ہوتی ہے۔ کیا مطلب ہے۔ کیا باقی اوقات میں اللہ تعالیٰ دعا قبول نہیں کرتا۔ یہ حدیث صحیح ہے یا غلط ہے یا مشکوک ہے۔ معلوم کریں۔ (محمد موسیٰ، مانوی، Pin-584123)

جواب

آپ نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: ان الدعاء لا یرد بین الاذان والاقامۃ فادعوا (مسند احمد، الترمذی، کتاب الصلاۃ) یعنی اذان اور اقامت کے درمیان کی دعا رد نہیں ہوتی، پس تم اس وقت اللہ سے دعا کرو۔ اس حدیث میں جو بات وقت کے حوالہ سے کہی گئی ہے وہ دراصل کیفیت کے حوالہ سے مقصود ہے۔ اذان کو سن کر مومن کے اندر یاد خدا کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس بنا پر اس وقت کی دعا میں وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو قبولیت کی علامت ہے۔

اس حدیث کا خطاب اس مومن سے ہے جس نے مسجد سے اذان کی آواز سنی اور پھر اس کے دل میں وہ ربانی جذبات پیدا ہونے لگے جن کا اعلان اس وقت موذن کر رہا تھا۔ وہ اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمت کے احساسات سے بھرا ہوا مسجد میں آیا۔ یہاں اس نے وضو کر کے اپنے کو پاک کیا، یہاں تک کہ اس کی زبان سے نکلا: رب اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطہرین۔

اس کے بعد وہ مسجد کے خدا پرستانہ ماحول میں داخل ہوا اور سنت کی رکعتیں ادا کر کے اللہ کی یاد کو اپنے دل میں تازہ کیا۔ اس طرح اذان اور اقامت کے درمیان وہ ایک ایسا انسان بن گیا جو ایمانی جذبات سے سرشار تھا اور نفسیاتی اعتبار سے اس قابل بن چکا تھا کہ اس کی زبان سے ایسے پاکیزہ کلمات نکلیں جو سیدھے اللہ تک پہنچ جائیں۔ یہی وہ انسان ہے نہ کہ وقت جس کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اے بندے خدا سے دعا کر، کیوں کہ اس وقت تو جس حال میں ہے اس حال میں کی ہوئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔

یہاں دعا کا مطلب دعا کے الفاظ منھ سے بول دینا نہیں ہے بلکہ دعا کا حقیقی عمل کرنا ہے۔ دعا کا عمل یہ ہے کہ آدمی جذبۂ احتیاج کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ ایک طرف اپنے عجز اور دوسری طرف خدا کی قدرت کو یاد کر کے وہ اس کو پکارے۔ جب ایک بندہ اس عملِ دعا کے لئے بیٹھے تو اذان اور اقامت کے درمیان کا وقت اس عمل کے لئے اسی طرح انتہائی معاون ثابت ہوگا جس طرح گرمی کا موسم لکڑی میں آگ لگانے کے لئے معاون ہوتا ہے۔ جس طرح گرمی کے ماحول میں جلانے کا عمل کیا جائے تو لکڑی فوراً آگ پکڑ لیتی ہے اسی طرح جب اذان اور اقامت کے درمیان پر اثر ماحول میں ایک شخص دعا کا عمل کرے تو اس کے اندر وہ کیفیات امنڈ پڑتی ہیں جو اس کی دعا کو حقیقی معنوں میں بندے کی پکار بنا دیں۔ جو اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو وہ ربانی الفاظ بنا دیں جس کے بعد دعا کی قبولیت کا معاملہ ٹھیک ویسا ہی بن جاتا ہے جیسے گرمی کے موسم میں لکڑی کو جلانا۔ سخت گرمی کے موسم میں دیا سلائی جلاتے ہی لکڑی آگ کو پکڑ لے گی اسی طرح اذان اور اقامت کی درمیان پر اثر فضا تیار ہو جاتی ہے جب کہ بندہ کی زبان سے حقیقی دعا نکلے اور اس کا رب اس کو فوراً قبول کر لے۔

سوال

آپ نے الرسالہ مئی ۲۰۰۰ میں لکھا ہے کہ الجزائر کے اسلام پسندوں کو بندوق اٹھانے کے بجائے اسلامی دعوت کا کام کرنا چاہئے۔ گویا کہ آپ اسلام کو سیاست سے دور رکھنے کا مشورہ

دے رہے ہیں۔ حالانکہ اسلامی شاعر کے بقول: جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔
(م۔ا۔ معراج، ناندیڑ)

جواب

مسئلہ دین کو سیاست سے جدا کرنے کا نہیں ہے بلکہ دین کو چنگیزی سے جدا کرنے کا ہے۔ دین کے نام پر سیاست چلانا بجائے خود چنگیزی کی بدترین قسم ہے۔ کیوں کہ اس قسم کی سیاست سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ دین نہیں ہے بلکہ سیاسی ہنگامہ آرائی، تشدد اور باہمی جنگ و جدال ہے۔ جس کا نمونہ آج ہر اس جگہ نظر آتا ہے جہاں نام نہاد اسلام پسند اسلام کے نام پر اپنی سیاست چلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دین جب جدا ہوتا ہے تو سیاست سے جدا نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان سے جدا ہوتا ہے۔ انسان کے دل سے جب اللہ کا خوف نکل جاتا ہے تو اس کی سیاست اور غیر سیاست سب چنگیزی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو انسان اللہ کی پکڑ کا اندیشہ رکھتا ہو اس کی سیاست بھی رحمت ہو گی اور اس کی غیر سیاست بھی رحمت۔

سوال

آپ کے خیال میں علم و فکر کی فوقیت عمل پر ہے جیسا کہ عام خیال ہے کہ عمل پہلے ہے اور فکر بعد میں۔ اسلام کی روشنی میں واضح فرمائیں۔ (طارق اشفاق، علیگڑھ)

جواب

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کامن سنس ہی اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ کوئی بھی آدمی جو کوئی بڑا عمل کرتا ہے، اس کے عمل کا آغاز فکر کی دنیا سے ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر فکر کی سطح پر ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ خارجی عمل کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہی معاملہ ایمان و عمل کا بھی ہے۔ اسلام میں بھی خارجی عمل کا اصل سرچشمہ داخلی ایمان ہے۔ کسی آدمی کے اندر جتنا گہرا ایمانی شعور پیدا ہوگا، خارجی دنیا میں اتنا ہی زیادہ اس سے عمل کا اظہار ہوگا۔

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۴۷

۱ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، سہارنپور کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے سہارنپور کا سفر کیا۔ وہاں انھوں نے ۱۰ اپریل ۲۰۰۰ کو ایک عمومی جلسہ میں خطاب کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفر نامہ کے تحت شائع کی جائے گی۔

۲ نئی دہلی کے ہندی اخبار ویر ارجن نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ویر ارجن کے شمارہ ۱۱ اپریل ۲۰۰۰ میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو میں تفصیل کے ساتھ ملکی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے: مولانا وحید الدین خاں کا کہنا ہے کہ دیش میں اشکشت لوگوں کی سنکھیا ادھک ہونے کے کارن ہم اس تیزی سے وکاس نہیں کر پا رہے ہیں جس تیزی سے ہمارے ساتھ آزاد ہونے والے دوسرے دیش کر رہے ہیں۔ مولانا کا کہنا ہے کہ میں مہاتما گاندھی کے اس وچار سے سہمت نہیں ہوں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میرے دیش کے لوگ اشکشت ضرور ہیں مگر وہ اگیانی نہیں۔ (صفحہ ۴)

۳ دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ نے ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر شیطانک ورسز اور اس کے مصنف سلمان رشدی سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ کتاب ہمارے نزدیک بھی اتنی ہی غلط ہے جتنا کہ دوسرے لوگ اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کا حل تشدد نہیں ہے بلکہ علمی تردید ہے۔ میڈیا کے زمانہ میں اس طرح کے معاملات میں تشدد کا نتیجہ ہمیشہ الٹا (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔ یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۰ اپریل ۲۰۰۰ میں اس کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔

۴ ایک مشترک سمیلن میں شرکت کے لئے صدر اسلامی مرکز نے پانی پت اور کرنال کا سفر کیا۔ یہ سفر ۷ مئی ۲۰۰۰ کو ہوا۔ اس سفر کے تجربات اور خطابات انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دئے جائیں گے۔

۵ بی بی سی لندن (ہندی سروس) نے ۸ مئی ۲۰۰۰ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر میڈیا کے بارے میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ میڈیا کا مزاج یہ ہے کہ وہ سلیکٹیو رپورٹنگ کرتا ہے۔ وہ ہاٹ نیوز کو لیتا ہے اور سافٹ نیوز کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس بنا پر جو لوگ میڈیا پر انحصار کرتے ہیں وہ دنیا کے بارے میں حقیقی تصویر نہیں بنا پاتے۔

۶ مطالعۂ قرآن، مطالعۂ حدیث، مطالعہ سیرت کے نام سے تین کتابوں کے سٹ جو منصوبہ ہے ان میں سے مطالعۂ قرآن اللہ کے فضل سے لکھی جا چکی ہے اور اب زیر طبع ہے۔ مطالعۂ حدیث اس وقت زیر ترتیب ہے۔ مطالعۂ سیرت تیار ہو کر چھپ چکی ہے۔

۷ جامعہ ماس کیمونی کیشن سنٹر (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ۱۶ مئی ۲۰۰۰ کو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع تھا: عورت اسلام میں۔ اس میں موضوع سے متعلق سوالات کے جواب دئے گئے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ عورتیں اگر مردوں کی طرح طلاق کا ذاتی حق حاصل کرنا چاہیں تو اس کا شرعی حل نکاح تفویض کی صورت میں موجود ہے۔ وہ نکاح تفویض کے ذریعہ یہ حق حاصل کر سکتی ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا گیا کہ تعدد ازواج کا حکم اس وقت کے لئے ہے جب کہ عورتیں مرد کے مقابلہ میں سرپلس ہو گئی ہوں۔ مثال کے طور پر دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی میں مردوں کی تعداد کم ہو گئی اور عورتیں بہت زیادہ ہو گئیں۔ چنانچہ عورتوں نے اپنے دروازہ پر یہ بورڈ لگا لیا کہ رات گزارنے کے لئے ایک مہمان چاہئے:

Wanted an evening guest

گویا ایسی صورت حال میں انتخاب مونوگیمی اور پولوگیمی کے درمیان نہیں ہے بلکہ مونوگیمی اور سیکشول انارکی کے درمیان ہے۔ ایسی صورت حال میں جدید تہذیب سیکشول انارکی کا چوائس لیتی ہے جبکہ اسلام نے پولوگیمی کا چوائس لیا ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ دونوں میں سے کون سا چوائس زیادہ بہتر ہے۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/20 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

الرسالہ، اگست ۲۰۰۰

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

فلسفۂ صحبت

"ایک بڑا سائنسداں جو چیز اپنے شاگرد کو دیتا ہے، وہ ایک ذہنی رجحان (attitude of mind) ہے۔" ایک مبصر نے یہ بات نوبل انعام پانے والوں کی ایک جماعت کا جائزہ لینے کے بعد لکھی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کسی سائنسداں کو نوبل انعام پانے کے قابل بنانے والی چیز یہ نہیں ہے کہ اس کو کہیں سے سائنسی معلومات کا بڑا ڈھیر حاصل ہو گیا تھا۔ وہ چیز جس نے اس کو اس عالمی اعزاز کا مستحق بنایا، وہ صرف اخذ و مطالعہ کا ایک ذہنی رجحان تھا جو کسی بڑے سائنسداں کی صحبت سے اسے ملا تھا۔ اسی چیز نے بالآخر اس کو ترقی کے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

صوفیاء کے یہاں جس چیز کو صحبت کہا جاتا ہے اس کی اصل بھی یہی ہے۔ یہ صحبت کوئی پر اسرار چیز نہیں۔ یہ ایک سادہ فطری حقیقت ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ مذہبی شخصیت کے یہاں بھی پائی جاتی ہے اور غیر مذہبی شخصیت کے یہاں بھی۔

ایک شخص جس نے لمبی جد و جہد کے بعد علم اور تجربہ میں اپنا حصہ پایا ہو اس کی ہر بات گہرے معانی لئے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو وہ علوم کے سرے کو بتاتا ہے۔ وہ جب تبصرہ کرتا ہے تو اس کا تبصرہ ایک بڑے ذخیرۂ کتب کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہ جب اپنے تجربات بیان کرتا ہے تو وہ برسوں کے درمیان پھیلے ہوئے سفر کو چند منٹوں میں سمیٹ رہا ہوتا ہے۔ وہ جب مشورہ دیتا ہے تو اس کے مشورہ کے پیچھے نشیب و فراز اور کامیابی و ناکامی کی طویل کہانی چھپی ہوئی ہوتی ہے جس سے وہ گزر چکا ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک کتاب ہوتا ہے، اس کی ہر تقریر ایک پورے کتب خانہ کا خلاصہ ہوتی ہے۔ اس کا بولنا پوری تاریخ کا بولنا ہوتا ہے اور اس کا سوچنا پورے عالم بشری کا سوچنا۔

یہی فلسفۂ صحبت کا خلاصہ ہے۔ زیر صحبت آدمی اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ صاحب صحبت نے جو چیز ایک عمر صرف کر کے حاصل کی ہے، اس کو وہ چند لمحات صرف کر کے حاصل کر لے۔

زیر صحبت آدمی صاحب صحبت سے صرف علم حاصل نہیں کرتا، اسی کے ساتھ، وہ ایک زاویۂ نظر بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ صرف معلومات نہیں لیتا بلکہ وہ اس سے تڑپ بھی پاتا ہے۔ اس کو صرف یہ فائدہ نہیں ہوتا کہ وہ کتابوں اور مصنفوں کے نام سن کر اپنی فہرست مکمل کرلے بلکہ اس کی صحبت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ علم کی ہواؤں میں سانس لے اور معرفت کے سمندروں میں نہائے۔ تاہم یہ فائدہ صرف حقیقی طالب کے لئے ہے نہ کہ محض ظاہری طور پر صحبت میں بیٹھنے والے کے لیے۔

قرآن میں اہل ایمان کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے "یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین (التوبہ ۱۱۹) یعنی اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔ یہ سچے لوگ یا صادقین کون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ (استوت ظواھرھم وبواطنھم) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی۔ ۲۸۹/۸

اس قسم کے صادقین کی صحبت میں بیٹھنا ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا ہر بیان مبنی بر حقیقت ہوتا ہے۔ وہ وہی کہتے ہیں جو انہیں کہنا چاہئے، وہ وہی بولتے ہیں جو انہیں بولنا چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کے اندر سچائی کا مزاج پرورش پاتا ہے۔ وہ بے بنیاد باتوں میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے والے بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر اعلیٰ انسانی اوصاف ابھرتے ہیں۔ ان کی نیتوں میں پاکی اور ان کے قول میں سنجیدگی آجاتی ہے۔

ایسے لوگ بے حد نادر الوجود ہیں جو صحبت سے یا اپنے ماحول سے اثر نہ لیں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہی ہے کہ وہ دوسروں سے اثر لیتے ہیں۔ وہ ویسے ہی بن جاتے ہیں جیسا کہ ان کے گرد و پیش کا ماحول ہو۔ اس لئے آدمی کو صحبت کے معاملہ میں بے حد محتاط رہنا چاہئے۔ قرآن کے مطابق قابل صحبت آدمی وہ ہے جس کے ظاہر اور باطن میں فرق نہ پایا جاتا ہو۔

شیر کا طریقہ

امریکہ کی ایک سائنٹفک سوسائٹی ہے جو ۱۸۸۸ میں قائم ہوئی اس کا نام نیشنل جغرافی سوسائٹی (National Geographic Society) ہے۔ اس ادارہ نے خصوصی اہتمام کے تحت شیروں کی زندگی پر ایک ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے۔ یہ فلم شیروں کی حقیقی زندگی پر مشتمل ہے جو افریقہ کے جنگلوں میں خصوصی اہتمام کے ساتھ تیار کی گئی ہے۔ میں نے اس کو وی۔ سی۔ آر پر دیکھا ہے۔ اس ڈاکومنٹری فلم میں شیر کی حقیقی زندگی کے بہت سے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اس میں ایک منظر یہ تھا کہ شیر ایک جانور کا شکار کرتا ہے۔ بکری کے قسم کے اس جانور کو وہ منہ میں دبا کر لاتا ہے اور اس کو پانی کے ایک تالاب کے کنارے رکھتا ہے۔ اس کے بعد شیر تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے ہٹ کر کہیں اور چلا گیا۔ وہ جب دوبارہ وہاں لوٹا تو وہاں یہ منظر تھا کہ تالاب کا ایک گھڑیال تیرتا ہوا کنارے کی طرف آیا۔ اس نے اپنا لمبا منہ نکال کر شکار کو اپنے منہ میں دبا لیا اور اس کے بعد وہ پیچھے کی طرف پانی میں جانے لگا۔ ابھی وہ جانور کو لے کر پوری طرح پانی میں داخل نہیں ہو پایا تھا کہ شیر وہاں آگیا۔

بظاہر یہ شیر کے لئے ایک سخت اشتعال انگیز لمحہ تھا۔ اس کے شکار کو ایک اور جانور اس کی آنکھوں کے سامنے لئے چلا جا رہا تھا۔ مگر شیر خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے شکار کو چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ شکار اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ شیر کا طریقہ ہے۔ شیر تمام جانوروں میں سب سے زیادہ طاقت ور جانور ہے، اس کے باوجود وہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ متحمل مزاج ہوتا ہے۔ وہ ٹکراؤ کے موقع پر آخری حد تک اعراض اور رواداری برتتا ہے۔ وہ طاقت کا استعمال صرف اس وقت کرتا ہے جب کہ اس کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔

ایک کتاب

روحانیت کے موضوع پر ایک کتاب ہے جو ۱۹۹۴ میں امریکہ سے چھپی ہے۔اس میں فطرت(Nature) کو روحانیت کے حصول کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ۲۸۲ صفحات کی اس کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

This Blue Planet: Finding God in the Wonders of Nature. –Janice Miller

اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا ہمارے لئے بطن مادر (womb) کی طرح گویا ایک اور بطن ہے (صفحہ ۲۷۹) اس دنیوی بطن میں ہم اس لئے رکھے گئے ہیں کہ یہاں کے واقعاتِ قدرت سے روحانی غذا لے کر اپنی شخصیت کی تعمیر کریں۔ یہاں اس نیلے کرۂ ارض پر ایک ابدی وجود کی حیثیت سے ہماری تشکیل کی جارہی ہے:

Here on this Blue Planet, we are being shaped into eternal beings. (p. 9)

اس طرح موجودہ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے ہمارے اندر وہ شخصیت تیار ہوتی ہے جو آخرت میں بسنے کے قابل ہو۔ وہ مزید لکھتی ہیں کہ جب ہمارا ارتقاء مکمل ہو جائے گا تو ایک معیاری روحانی وجود کی حیثیت سے ایک سچی، روحانی دنیا میں ہم دوبارہ جنم لیں گے، اگر ہم اس دنیا میں خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزاریں:

When we are fully developed, we will be "born" into the true world, the spiritual world, as the perfect spiritual beings we will become if we choose to serve Him (p. 9)

یہ بات اصولی طور پر درست ہے مگر یہاں دو باتوں کا اضافہ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ اس روحانی سفر کے لئے ایک گائڈ بک درکار ہے اور وہ گائڈ بک صرف قرآن ہے۔ قرآن اپنی اصل حالت میں محفوظ رہنے کی وجہ سے اس روحانی سفر کے لئے واحد اور مستند الہامی گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ موجودہ دنیا کے بعد دوسری جو معیاری دنیا بننے والی ہے اس میں صرف ان افراد کو جگہ ملے گی جو آج کی دنیا میں اپنی روحانی تطہیر کرلیں۔ جو لوگ آج کی غیر معیاری دنیا میں اپنی روحانی تطہیر کرنے میں ناکام رہیں وہ اگلی دنیا میں صرف وہاں کے کوڑے خانہ میں جگہ پائیں گے۔

عالم فطرت میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی صفاتِ کمال کا مظہر ہے۔ یہاں خالق اپنی تخلیقات میں نمایاں ہوا ہے۔ اس طرح فطرت کی دنیا ہمارے لئے خالق کی معرفت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہم خالق کو نہیں دیکھتے مگر ہم اس کی تخلیقات میں اس کے جلووں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس طرح فطرت ہمارے لئے خالق فطرت سے قربت کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ایک حقیقی انسان فطرت کے اندر خالق کے پڑوس کا تجربہ کرتا ہے، ہواؤں کے جھونکے اس کو لمس خداوندی کا تجربہ کراتے ہیں۔ روشن آفتاب کی صورت میں وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ خلاء کی وسعتیں اس کو خدا کی بے پناہ عظمت کا احساس دلاتی ہیں۔ دریاؤں کی روانی اس کو خدا کی رحمت سے آشنا کرتی ہے۔ فطرت کے بے پناہ حسن میں وہ خالق کے برتر حسن کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چڑیوں کے نغمے میں اس کو چڑیوں کے خالق کی حیات بخش آواز سنائی دیتی ہے۔ دنیا میں بکھرے ہوئے ہر قسم کے سامانِ حیات اس کو یقین دلاتے ہیں کہ اس کا خالق ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے بے خبر نہیں۔ اس طرح موجودہ دنیا میں زندگی کا ہر تجربہ اس کے لئے خالق کے تعارف کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

اس طرح کے لطیف تجربات کے درمیان آدمی کی روحانی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ وہ عام انسان سے ترقی کر کے ایک ربانی انسان بنتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے وجود کے اندر وہ کامل انسان بن کر تیار ہو جاتا ہے جو خدا کے پڑوس میں رہنے کے قابل ہو ـــــ اسی خدائی پڑوس کا دوسرا نام جنت ہے۔

کبر کی علامت

ایک شخص اگر کسی آدمی پر بے بنیاد الزام لگائے، اس کو غلط طور پر بدنام کرے۔ اس کو دگوں کے سامنے ذلیل کرے، تو یہ بلاشبہہ ایک بدترین گناہ ہے۔ اب ایک شخص وہ ہے جس کو غلطی کرنے کے بعد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہی نہ ہو۔ ایسا آدمی اللہ کی نظر میں مبغوض ترین انسان ہے۔ اس کو کبھی اللہ کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شخص وہ ہے جسے بعد کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے خواہ یہ احساس اپنے ضمیر کی بنیاد پر ہوا ہو یا فریق ثانی کی وضاحت اور دلائل کی بنیاد پر۔ اب یہ شخص اگر ایسا کرے کہ اپنے ظاہری رویہ کو بدل لے اور فریق ثانی سے دوبارہ اپنے تعلق کو بحال (patch up) کر لے تو اس کا ایسا کرنا صرف ایک سماجی فعل ہو گا۔ دینی معنوں میں وہ کوئی عبادتی فعل نہ ہو گا۔

جب کوئی شخص مذکورہ قسم کا مجرمانہ فعل کرتا ہے تو یہ دراصل کبر کی نفسیات کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ اظہارِ کبر کا ایک معاملہ ہوتا ہے نہ کہ سادہ طور پر محض سماجی آداب کی خلاف ورزی کا معاملہ۔ ایسی حالت میں اگر وہ شخص صرف یہ کرے کہ عملی طور پر فریق ثانی سے اپنے تعلق کو بحال کر لے تو اس کے ایسا کرنے سے برائی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اصل برائی جس کا اس نے ارتکاب کیا وہ تو تکبر تھا۔ پھر سماجی آداب کی سطح پر ازالہ کرنے سے اصل جرم کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے۔

جب ایک شخص مذکورہ قسم کا جرم کرنے کے بعد صرف یہ کرے کہ وہ ظاہری طور پر فریق ثانی سے تعلق کو بحال کر لے مگر اپنی زبان سے غلطی کا کھلا اعتراف نہ کرے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا اصل جرم (تکبر) بدستور اس کے سینہ کے اندر موجود ہے۔ کیوں کہ اگر اس کا دل تکبر سے خالی ہوتا تو اس کو اس وقت تک تسکین نہ ملتی جب تک وہ اپنی زبان سے اس کا اقرار نہ کر لیتا۔

قولی اعتراف آدمی کے متواضع ہونے کا ثبوت ہے اور قولی اعتراف نہ کر کے ظاہری تعلق کو بحال کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی متکبرانہ نفسیات میں جی رہا ہے۔ وہ اپنے کبر کے

بت کو توڑنے کے لئے تیار نہیں۔

اس معاملہ کی ایک مثال قرآن کی سورۃ نمبر ۱۲ میں ملتی ہے۔ امرأۃ عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام پر ایک بے بنیاد الزام لگایا۔ بعد کو حقیقت ظاہر ہوئی تو اس نے کھلے طور پر کہا کہ "اب حق واضح ہو گیا۔ اس معاملہ میں غلطی میری ہی تھی اور یوسف بلاشبہ سچے ہیں" (یوسف ۵۱)

حق کی وضاحت کے بعد اگر امرأۃ عزیز صرف یہ کرتی کہ ظاہری طور پر اپنی روش کو درست کر لیتی اور زبان سے اس کا اعلان نہ کرتی تو اس کا جرم کبھی ختم نہ ہوتا۔ مگر جب اس نے اپنی زبان سے کہا کہ ساری غلطی میری ہے اور یوسف بلاشبہ بری الذمہ ہیں تو اس کا جرم معاف ہو گیا اور اس کا درجہ بلند ہو گیا۔

اسلامی شریعت کے مطابق، کبر ایک ایسی روش ہے جو اللہ کے نزدیک نا قابلِ معافی جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر۔ (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۱۳) یعنی وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا جس کے دل کے اندر ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو۔ کبر کی پہچان کیا ہے۔ حدیث کے مطابق، کبر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی کے سامنے ایک حق بات پیش کی جائے مگر وہ اس کو صرف اس اندیشہ کی بنا پر نظر انداز کر دے کہ اس کو قبول کرنے کی صورت میں اس کی حیثیت عوام کی نظر میں گھٹ جائے گی۔ وہ کسی ایسے حق کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو جو بظاہر اس سے کمتر کسی آدمی کی طرف سے پیش کیا گیا ہو۔

اس دنیا میں ہر قسم کی بڑائی صرف ایک اللہ کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی کو کسی بھی قسم کی کوئی بڑائی حاصل نہیں۔ اگر بظاہر کوئی بڑا دکھائی دیتا ہے تو وہ صرف اس کے امتحان کا ایک پرچہ ہے نہ کہ اس کی واقعی حیثیت کا اظہار۔ ایسی حالت میں جو شخص بڑائی پا کر جھک جائے وہ امتحان میں پورا اترا۔ اور جو شخص بڑائی پا کر متکبر بن جائے وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اللہ کے یہاں اس کے لئے ذلت کی سزا کے سوا اور کچھ نہیں۔

دردناک انجام

دمشق کی تاریخ کے ساتھ جن لوگوں کے نام شامل ہیں ان میں سے ایک ٹی ای لارنس (T.E.Lawrence) ہے۔ یہ ایک انگریز تھا جو ۱۸۸۸ میں پیدا ہوا۔ اس نے عرب علاقہ کی تاریخ پڑھی اور عربی زبان سیکھی۔ اس کے بعد عربی لباس پہن کر عربوں کے درمیان داخل ہو گیا۔ ۱۸-۱۹۱۴ کے درمیان اس نے دمشق کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ اس وقت عرب ممالک بشمول شام پر ترکوں کی حکومت تھی۔ لارنس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ عربوں میں ترکوں کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ یہاں تک کہ عربوں کے اندر عرب قومیت کا جذبہ اتنی شدت سے ابھرا کہ انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ لارنس کی یہ کہانی حسب ذیل کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے:

Lawrence of Arabia, by Richard Aldington

کرنل لارنس بظاہر اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ مگر اس کا آخری انجام نہایت دردناک تھا۔ انگریزی حکومت نے اس کو اس کے حوصلہ کے بقدر "انعام" نہیں دیا۔ وہ مایوسی کے عالم میں ۲۶ فروری، ۱۹۳۵ کو رائل ائر فورس سے ریٹائر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے آخری ایام گزارنے کے لئے کلاوڈس ہل (Clouds Hill) چلا گیا۔ وہ ایک شکستہ دل انسان کی طرح یہاں اپنے صبح و شام گزار رہا تھا کہ ۱۳ مئی ۱۹۳۵ کو موٹر سائیکل کے حادثہ میں شدید زخمی ہو گیا۔ اور چھ دن تک بے ہوش رہ کر مر گیا۔

> A motorcycling accident on May 13, (1935) solved the problem of his future. He died six days later without regaining consciousness (10/727)

توہین کا مسئلہ

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ توہین اسلام کا مسئلہ جانتے ہیں، مگر وہ توہین مسلم کا مسئلہ نہیں جانتے۔ اگر کوئی غیر مسلم اسلام کی توہین کر دے تو تمام لوگ بھڑک اٹھیں گے اور اس کے خلاف پر جوش مہم شروع کر دیں گے۔ لیکن ایک مسلمان ہر روز دوسرے مسلمان کی توہین کرتا ہے اور اس پر کوئی نہیں بھڑکتا، اس کو اس طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ حالاں کہ شریعت کے مطابق، مومن کا اکرام فرض ہے اور مومن کی توہین حرام۔

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام کی توہین کرے تو ایسا واقعہ نہایت آسانی کے ساتھ مسلمانوں کے لئے قومی غیرت اور قومی فخر کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے فخر کو قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسلم کی توہین عملاً احتساب خویش کا مسئلہ ہے، اور احتساب خویش بلاشبہہ ان لوگوں کے اوپر بہت سخت ہے جو اپنے دل میں اللہ کا خوف نہیں رکھتے۔ اسلام اللہ کا آخری دین ہے۔ اللہ نے اس کے لئے ابدی عظمت کا فیصلہ کر دیا ہے۔ کسی شخص یا گروہ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اسلام کو زیر کر سکے۔ اسلام کا ابدی محافظ خود اللہ ہے، اور اللہ سے بڑا محافظ اور کون ہو سکتا ہے۔

مگر جہاں تک توہین مسلم کا معاملہ ہے اس کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے اوپر ہے۔ مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ کسی مسلمان کی توہین نہ کریں۔ اور جب کوئی شخص ایک مسلمان کی توہین کرے تو اس کو ایسا کرنے سے روک دیں۔ جو مسلم معاشرہ اس روح احتساب سے خالی ہو جائے وہ اللہ کی رحمتوں سے بھی دور ہو جائے گا۔

اغیار کی طرف سے قومی فخر پر زد پڑے تو اس پر بھڑک اٹھنا اور جب خود اپنی اصلاح یا احتساب کا مسئلہ ہو تو اس پر بے حس بنے رہنا ایمان کی موت کی علامت ہے نہ کہ ایمان کی زندگی کی علامت۔

اسلوب تنقید

مولانا انیس لقمان ندوی نے بتایا کہ ۲۲ جون، ۱۹۹۸ کو ابو ظبی میں ڈاکٹر عزالدین ابراهیم سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دوران ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ ابتداء ہی میں میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ مجھ سے صرف فصیح عربی میں بات کریں۔ کیوں کہ میں فصیح عربی کے معاملہ میں اس سے زیادہ غیور ہوں جتنا غیور کوئی مرد اپنی بیوی کے معاملہ میں ہوتا ہے اور یہ کہ اگر آپ مجھے فصحی میں گالی دیں تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ آپ عامی زبان میں میری تعریف کریں (كلّمني من فضلك بالعربية الفصحي، فاني والله أغار علي اللغة العربية الفصحي أكثر مما يغار الرجل علي زوجته. ولو شتمتني بالفصحي، فانه أحب إلي من أن تمدحني بالعامية) یہ سن کر وہ بہت محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ بات آپ نے اتنے خوب صورت پیرایہ میں کہی ہے کہ وہ اس قابل ہے کہ ضرب المثل بن جائے (إن كلامك هذا مصوغ صياغة رائعة لدرجة أنه ليكاد أن يكون مضرب المثل)

مولانا انیس لقمان ندوی نے مذکورہ عرب سے جو بات کہی وہ عربوں کے لیے ایک سخت تنقید کی حیثیت رکھتی تھی کیوں کہ عرب دنیا میں علماء تک کا یہ حال ہے کہ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو غیر فصیح زبان بولنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ مصر میں یہ حال ہے کہ فصیح زبان میں گفتگو کرنا ادبی اعتبار سے غیر معیاری ہے۔ ایسے آدمی کو دیہاتی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ غیر فصیح زبان بولنے کا رواج شہروں میں ہے نہ کہ دیہات میں۔

مگر اس کھلی تنقید کو انہوں نے برا نہیں مانا۔ اس کی وجہ تنقید نہیں ہے بلکہ تنقید کا اسلوب ہے۔ ناقد نے اگرچہ ایک تنقیدی بات کہی تھی لیکن اس کے لئے انہوں نے ایسا انداز اختیار کیا جو نہ صرف غیر جارحانہ تھا بلکہ اس میں عربی زبان کا ایک اعتراف بھی تھا۔ اس میں ایک عرب کے لئے اس کی پر فخر نفسیات کی تسکین موجود تھی۔

گناہ کیا ہے

گناہ (sin) کیا ہے۔ اس کے بارے میں لوگوں کے درمیان مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک نظریہ وہ ہے جو فطرت (nature) پر مبنی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان کی فطرت ہی میں گناہ کے اسباب موجود ہیں۔ اس لئے انسان مجبور ہے کہ وہ گناہ کرے، یہ رائے ان لوگوں کی ہے جن کو جبریہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جو تربیت (nurture) پر مبنی ہے۔ اس نظریہ کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ پیدائشی طور پر انسان سادہ ورق کی مانند ہوتا ہے۔ گردوپیش کی دنیا یا سماجی حالات مرد یا عورت کو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ گویا گناہ کے فعل کا ذمہ دار خارجی سماج ہے نہ کہ خود انسان۔

گناہ کا تیسرا تصور وہ ہے جو خصوصی طور پر مسیحی چرچ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے مطابق پہلے انسان آدم نے جنت میں ایک گناہ کیا جس کو مسیحیت میں معصیت اصلی (original sin) کہا جاتا ہے۔ انسانِ اول کے اس گناہ کے سبب ساری نسل انسانی گناہ گار ہو گئی۔ اب اس کے لئے پاک ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ مصلوب ہو کر لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔

گناہ کے بارے میں اسلام کا تصور ان سب سے مختلف ہے۔ اسلام کے مطابق انسان موجودہ دنیا میں امتحان (ٹسٹ) کے لئے پیدا کیا گیا ہے (الملک ۲) امتحان کی اسی مصلحت کی بنا پر انسان کو قول و عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ انسان کو پورا اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے اور جس طرح چاہے زندگی نہ گزارے۔ اس اختیار کو قرآن میں الامانۃ کہا گیا ہے (الاحزاب ۷۲)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کو آزادی دینے کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ فکر اور قول اور عمل کا کون سا طریقہ اس کے لئے درست ہے اور قول و عمل کا کون سا طریقہ اس کے لئے درست نہیں (الشمس ۸)

قرآن کے مطابق، انسان کو اس دنیا میں یہ اختیار تو حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادی کو جس طرح چاہے استعمال کرے مگر اس کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ آزادی کے استعمال کے نتائج کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دے۔ مثلاً انسان یہ اختیار رکھتا ہے کہ وہ آگ کے انگارہ کو اپنے ہاتھ میں لے یا نہ لے۔ لیکن آگ کے انگارے کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اس کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس فعل کے انجام سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تصور گناہ کیا ہے۔ اسلام کے نزدیک گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی آزادی کو غلط استعمال کرے۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ خدا کی ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہو جائے۔

گناہ کی پہچان کیا ہے۔ اس کی ایک خارجی پہچان ہے اور ایک داخلی پہچان۔ خارجی پہچان سے مراد خدا کی کتاب ہے۔ خدا کی کتاب (قرآن) میں واضح طور پر یہ بتادیا گیا ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو خدا کے نزدیک گناہ ہیں اور جن سے آدمی کو بچنا چاہئے۔ گناہ کی داخلی پہچان انسان کا ضمیر (conscience) ہے۔ قرآن کے مطابق، انسان کے اندر پیدائشی طور پر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ (الشّمس ۸) اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: **الاثم ما حاك في صدرك وكرهت أن يطلع عليه الناس** (صحیح مسلم، کتاب البر) یعنی گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم کو یہ ناگوار ہو کہ لوگ اس کو جان لیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان صحیح فطرت پر پیدا کیا گیا ہے (الروم ۳۰) یہی بات حدیث میں بھی بتائی گئی ہے (کل مولود یولد علی الفطرۃ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک گناہ کرنا انسان کا مقدر نہیں بلکہ وہ اس کے لئے choice کا ایک معاملہ ہے۔ انسان کو شیطانی طاقتیں بہکاتی ہیں۔ اسی طرح سماجی اسباب اس کو غلط راستہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اسباب سے متاثر ہو کر گناہ کرے تو وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اس سلسلہ میں اسلام کی دوسری تعلیم یہ ہے کہ گناہ کی تلافی ممکن ہے۔ اگر آدمی گناہ کے بعد توبہ کرے اور آئندہ وہ اس سے باز رہے تو وہ اللہ کے نزدیک قابل معافی ٹھہرے گا۔

مغربی یوپی کا سفر

اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن کی دعوت پر سہارنپور کا سفر ہوا۔ ۹ر اپریل، ۲۰۰۰ کی صبح کو دہلی سے روانگی ہوئی اور ۱۰ اپریل کی شام کو واپسی ہوئی۔ اس سفر میں سہارنپور اور مغربی یوپی کے دوسرے علاقوں کے حالات جاننے کا موقع ملا۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ جس تاریخ کو سہارنپور کا یہ پروگرام تھا ٹھیک اسی تاریخ کو بنگلور میں مختلف مذاہب کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں بودھ پیشوا دلائی لاما بھی آرہے تھے۔ انہوں نے ذاتی طور پر اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں اس میں ضرور شرکت کروں۔ ان لوگوں نے میرے مددگار سمیت سفر کے متعلق انتظامات بھی مکمل کر دیے تھے۔ مگر میں دونوں میں سے کسی ایک ہی پروگرام میں شریک ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بنگلور کو چھوڑ کر سہارنپور کا فیصلہ کیا۔ ۹ اپریل کی صبح کو دہلی سے شتابدی اکسپریس کے ذریعہ روانگی تھی۔ یہ ٹرین ہندستان کی ایک خصوصی ٹرین سمجھی جاتی ہے۔ مگر مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں وہ ہر اعتبار سے ایک معمولی ٹرین ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے برٹش حکومت کے زمانہ میں ہندستان کی ٹرینیں تقریباً اسی درجہ کی تھیں جیسا کہ یورپ کے ملکوں کی ٹرینیں۔ مگر آزادی کے بعد مغربی ملکوں کی ٹرینیں نمایاں طور پر بہتر ہو گئیں جب کہ ہندستان کی ٹرینیں ترقی کے اس انٹرنیشنل معیار تک نہ پہنچ سکیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستان میں ترقی کا جو عمل ۱۹۴۷ تک جاری تھا وہ ۱۹۴۷ کے بعد اسی رفتار سے جاری نہ رہ سکا۔ حالانکہ ۱۹۴۷ کے بعد سے لے کر اب تک ہمارے ملک میں بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں کی دھوم رہی ہے۔ دونوں زمانوں میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ ایک لفظ میں وہ کرپشن ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ایسا ہوتا تھا کہ حکومت جو بجٹ بناتی تھی وہ پوری طرح انہیں مدوں میں خرچ ہوتا تھا جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد برعکس طور پر یہ ہوا کہ

حکومت کا بجٹ تو بدستور مزید اضافہ کے ساتھ بنتا رہا مگر کرپشن کی بنا پر اس کی بیشتر رقم قومی ترقی کے کاموں میں خرچ نہ ہو کر افراد کے جیبوں میں جاتی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد ہمارے ملک میں جو نئے نئے مسائل پیدا ہوئے ان سب کا سبب، براہ راست یا بالواسطہ طور پر یہاں کا بڑھا ہوا کرپشن ہے۔

۹؍اپریل ۲۰۰۰ کو صبح سویرے میں نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ سورج نکلنے میں چند منٹ کی دیر تھی۔ اسٹیشن پر لوگ بڑی تعداد میں سرگرم دکھائی دئے۔ ہر آدمی تیزی سے اپنی منزل کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ کیا چیز ہے جو ان لوگوں کو اس طرح مسلسل سرگرم کئے ہوئے ہے۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ وہ صرف سیلف انٹریسٹ ہے۔ فطرت نے ہر آدمی کے اندر سب سے طاقتور جذبہ انٹریسٹ کا رکھا ہے۔ وہی ہر آدمی کو متحرک کئے ہوئے ہے۔ اگر انٹریسٹ نہ ہو تو پوری زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔ سوچتے ہوئے پھر میرا ذہن اس سوال پر گیا کہ کیا وجہ ہے کہ سوشلسٹ سسٹم دنیا میں ناکام ہو گیا۔ روس سے لے کر انڈیا تک ہر جگہ اس کی کہانی یہی ہے۔ اس کے برعکس بدنام سرمایہ داری سسٹم اتنا زیادہ کامیاب ہے کہ آج بڑے بڑے سوشلسٹ لیڈروں کے بیٹے اور پوتے بھاگ بھاگ کر امریکہ پہنچ رہے ہیں۔ اس کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ بدنام سرمایہ داری نظام فطرت کے اصول پر قائم ہے جو کہ سیلف انٹریسٹ پر مبنی ہے۔ اس کے برعکس نام نہاد سوشلسٹ نظام مصنوعی آئیڈیالوجی پر قائم کرنے کی ایک کوشش تھی جو کہ فیل ہو گئی۔

شتابدی اکسپریس اپنے ٹھیک وقت پر سات بجے دہلی سے روانہ ہوئی۔ میرے قریب والی سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ ان کا نام روہت درما ہے۔ ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ وہ احمد آباد میں اپنے والدین کے ساتھ رہتے ہیں۔ (Tel-423344) وہ دہرہ دون نیشنل ڈیفنس اکیڈمی میں ٹیسٹ دینے کے لئے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ مسلمانوں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اب تک ان کی

ملاقات نہ کسی مسلمان سے ہوئی، اور نہ اسلام یا مسلمانوں کے بارے میں انہوں نے کچھ پڑھا۔ میں ان کی زندگی میں پہلا مسلمان تھا جس کے ساتھ انہوں نے ۳ گھنٹہ سفر کیا اور بات چیت کی۔ انہوں نے بتایا کہ میرے اسکول میں نہ کوئی مسلمان اسٹوڈینٹ ہے اور نہ کوئی مسلمان ٹیچر۔ میں نے سوچا کہ دو فرقوں کے درمیان اس دوری کا سبب کیا ہے۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ان مسلم رہنماؤں پر ہے جنہوں نے ناقابلِ فہم طور پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا۔ موجودہ زمانہ میں اسکول اور کالج دونوں فرقوں کے لئے فطری میٹنگ گراونڈ بن رہے تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں کی غلط تعلیمی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوان اس میدان میں پہنچ ہی نہ سکے جہاں جدید تاریخ نے ان کے لئے ملاقات (انٹرایکشن) کا انتظام کیا تھا۔

ٹرین میں اخبارات پڑھنے کے لئے دئے گئے۔ سنڈے آبزرور (۹ اپریل) میں آندھرا پردیش کے چیف منسٹر چندرابابو نائڈو کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا ہوا تھا۔ وہ آج کل اس حیثیت سے مشہور ہو رہے ہیں کہ آندھرا پردیش کو انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں پہنچائیں۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ یہ جدید ٹکنیک سرخ فیتہ شاہی کو ختم کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگی جو انڈیا کی بیوروکریسی میں بہت زیادہ سرایت کر چکی ہے۔

It may prove to be a good tool to remove the red-tapism so inbuilt in Indian bureaucracy.

تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری ٹرین سہارنپور ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ یہاں کئی لوگ پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ ڈاکٹر جی۔بی لال (G.B. Lal)، جناب سبودھ کانت شرما، جناب محمد سلیم رومانی، ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر شبیر احمد بیگ، ذوالنور احمد، لئیق احمد، راجیو، منوج، دانش خان، حکیم نفیس الرحمٰن، وغیرہ۔

ٹرین میں میں نے مسٹر رودھت ورما سے کہا تھا کہ میرا ڈریم یہ ہے کہ اس ملک کے ہندو مسلمان ایک فیملی کی طرح مل جل کر رہنے لگیں۔ پلیٹ فارم پر جب میں نے دیکھا کہ ہندو مسلم دونوں میرے انتظار میں ہیں اور جیسے ہی میں اپنی کوچ سے نکل کر باہر آیا تو وہ پھولوں کے ہار کے

ساتھ میری طرف بڑھے تو میری آنکھوں میں شدت احساس سے آنسو آگئے۔ اس بات کے لئے نہیں کہ وہ میرا سواگت کر رہے تھے، بلکہ اس مشترک گروپ کی صورت میں مجھے مستقبل کا انڈیا دکھائی دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس ملک میں بہت جلد وہ دور آنے والا ہے جبکہ ہندو اور مسلمان سچ مچ ایک فیملی کی طرح مل جل کر رہنے لگیں گے اور دونوں مل کر اس عظیم ہندستان کی تعمیر کریں گے جس کا خواب ہمارے قومی معماروں نے دیکھا تھا۔

ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہو کر ہم لوگ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ یہاں سہارنپور کے تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مجلس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، میں نے اپنی عادت کے مطابق لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنے اپنے تجربات بتائیں۔ چنانچہ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے، ان سب کے خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ آج کی زندگی میں مذہب کا وہ رول ختم ہو گیا ہے جو پچھلے زمانوں میں تھا۔ پچھلے زمانہ میں ہر آدمی خدا سے ڈرتا تھا۔ خدا کا خوف اس کو غلط کاموں سے روک دیتا تھا۔ اب آزادی اور ڈیموکریسی کے دور نے ہر آدمی کا مزاج یہ بنادیا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ اس مزاج نے لوگوں کو بے خوف بنادیا ہے اور یہی بے خوفی تمام بدعنوانیوں کی جڑ ہے۔

ڈاکٹر شاہد صابری (امبہٹہ) نے بتایا کہ ۱۹۸۳ میں انہوں نے "ناخواندگی ہٹاؤ" کے مقصد کے تحت لوگوں کو ساتھ لے کر کام کرنا چاہا مگر تجربہ کے بعد محسوس ہوا کہ حقیقی معنوں میں ساتھ دینے والا کوئی نہیں، البتہ رکاوٹ کے لئے ہر آدمی تیار ہے۔ اسی کشمکش میں کئی سال بیت گئے۔ آخر کار آٹھ سالہ تجربہ کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی ساتھ دے یا نہ دے ان کو اب اکیلے ہی یہ کام کرنا ہے۔

انہوں نے کہا کہ "اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو اور اپنے وسائل کو بھرپور طور پر اس تعلیمی مشن میں لگادیا۔ ۱۹۸۳ میں میں نے پہلی کلاس کھول کر نامساعد حالات میں یہ کام شروع کیا تھا۔ اب ۲۰۰۰ میں خدا کے فضل سے ہمارا ادارہ انٹر میڈیٹ تک پہنچ چکا ہے۔ تقریباً پانچ سو طلبہ ہمارے یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔"

جناب سیودھ شرما ایڈوکیٹ نے ایک بنیادی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ آج جب میں ریلوے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا تو وہاں کا منظر دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہاں بظاہر بہت سے لوگ کھڑے ہوئے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک یہاں صرف اس انتظار میں ہے کہ کب اس کی ٹرین آئے اور وہ اس پر بیٹھ کر یہاں سے روانہ ہو جائے۔ ہماری زندگی بھی اسی قسم کا ایک سفر ہے۔

مسٹر راجیو کوشک (ایم۔بی۔اے) نے اپنے تجربات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارے بزرگوں نے جس طرح کے سماج میں زندگی بتائی، آج کا سماج اس سے بہت زیادہ الگ ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم اپنے پریوار میں ہوتے ہیں تو وہاں ہم پاتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے کا ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔ ہر ایک دوسرے کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کی ترقی پر خوش ہوتا ہے۔ پہلے ایسا تھا کہ جو ماحول آدمی کو اپنے پریوار میں ملتا تھا وہی ماحول اس کو باہر آکر سماج میں بھی ملتا تھا۔ مگر آج ایسا نہیں ہے۔ آج یہ حال ہے کہ ہم جب اپنے پریوار میں ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنوں کے بیچ میں ہیں مگر جب ہم پریوار سے نکل کر سماج میں آتے ہیں اور کچھ کام کرنا چاہتے ہیں تو اچانک یہاں دوسرا ماحول ملتا ہے۔ ہم پاتے ہیں کہ یہاں مدد کرنے کے بجائے رکاوٹ ڈالنے کا ماحول ہے۔ ترقی پر خوش ہونے کے بجائے اس پر جلن کا ماحول ہے۔ ہر ایک دوسرے کو غیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی آج کی سب سے بڑی سمسیا ہے۔ اس کو کیسے حل کیا جائے۔

بی۔پی دیش بھگت (۸۳ سال) ۱۹۷۱ سے پولیٹکس کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ پارٹی کا نام بھارتیہ سماج وادی مورچہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندستان میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ پولیٹکل کرپشن ہے۔ اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہماری پارٹی پاور میں آجائے گی تو ہم دیش کو بھرشٹاچار سے مکت کر دیں گے۔

میں نے کہا کہ بہت سی پارٹیاں بھرشٹاچار مٹاؤ کے اشو کو لے کر اٹھیں۔ مگر جب وہ الیکشن جیت کر پاور میں آگئیں تو انہوں نے خود بھی بھرشٹاچار کا وہی کام شروع کر دیا جو دوسرے لوگ کر

رہے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ دو باتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ایکسپلائٹیشن کے ذہن کے تحت کرپشن کو اپنا الیکشنی اشو بنائیں۔ ایسے لوگ وہی کریں گے جن کی آپ نے مثال دی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک ایمان دار سماج بنانا آپ کا اصل مقصد ہو اور اس مقصد کو لے کر آپ اپنی پوری تحریک چلائیں، صرف الیکشن کے وقت نہیں، بلکہ اپنی پوری زندگی کے لئے آپ کا یہی مشن ہو۔ اس دوسری قسم کے لوگ جب فطری عمل کے تحت پاور میں آتے ہیں تو وہ ان سے مختلف ہوتے ہیں جو الیکشنی پولیٹکس کے ذریعہ پاور میں آجائیں۔

۹؍اپریل کو مسلسل لوگ میری قیام گاہ پر آتے رہے اور ان سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان میں اتنا زیادہ تعصب ہے کہ مسلمانوں کو ہر شعبہ میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ مسلمانوں کی ترقی کا کیا نسخہ بتاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ مسلمان تو بروقت ہی ترقی کر رہے ہیں۔ ہمیں اس مقصد کے لئے کسی نئے نسخہ کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ اس دنیا کا نظام کسی کے تعصب یا سازش پر نہیں چل رہا ہے، بلکہ فطرت کے قانون پر چل رہا ہے اور فطرت کا قانون کسی تعصب کے بغیر ہر ایک کو ترقی کا موقع دے رہا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں یہ معاملہ اور بھی زیادہ ہماری موافقت میں ہو گیا ہے۔ آج ہم ایک نئے دور میں جی رہے ہیں۔ یہ دراصل اقتصادی انفجار کا دور ہے۔ اس زمانہ میں اقتصادی ترقی کے مواقع عمومی سیلاب کی طرح ہر انسان تک پہنچ رہے ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں ننگے جسم اور ننگے پاؤں والے لوگ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں گے۔ اس حدیث پر غور کیجئے۔ یہ حدیث دراصل جدید صنعتی دور کی پیشین گوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ دولت کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہوگا کہ وہ عام لوگوں تک پہنچ جائے گا۔ نوبت یہاں تک آئے گی کہ وہ لوگ جو غریب طبقہ سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی بڑی بڑی کمائی کریں گے، اور بڑے بڑے گھر بنائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ گھر

آدمی کی معاشی حالت کی پہچان ہوتا ہے۔ بڑے گھر کا مطلب ہے معاشی خوش حالی۔

میں نے کہا کہ اس حدیث میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ الا المسلمون، یعنی تمام لوگ دولت مند ہو جائیں گے سوائے مسلمانوں کے۔ پھر آپ لوگ اس قسم کی بات کیوں کرتے ہیں۔

۹؍اپریل کی شام کو سہارنپور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع دودھ کیندر (چندر نگر) میں تھا اس میں زیادہ تر ہندو صاحبان تھے۔ یہ زیادہ تر وکیل اور ڈاکٹر لوگ تھے۔ کچھ افراد ایسے بھی تھے جو ہندو قوم پرست تنظیموں کے لیڈر تھے۔

یہ اجتماع دو گھنٹے سے زیادہ دیر تک رہا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ زیادہ تر ہندو صاحبان اسلام کے بارے میں سوالات کرتے رہے، اور میں ان کا جواب دیتا رہا۔ اکثر سوالات اختلافی نوعیت کے تھے، مگر پوری گفتگو کے دوران کسی قسم کی کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔

میں نے تمام سوالات کا جواب قرآن اور حدیث کی روشنی میں دیا۔ لوگ اتنا متاثر ہوئے کہ لوگوں نے بتایا کہ کئی ہندوؤں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک صاحب جو ایک کٹر ہندو تنظیم کے سکریٹری ہیں انہوں نے آخر میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ مولانا صاحب جس طرح اسلام کو پیش کرتے ہیں اگر اسی طرح دوسرے لوگ بھی اسلام کو پیش کریں تو اسلام ساری دنیا کا مذہب بن جائے۔

ایک اور ہندو وکیل نے کہا کہ تقریر کے بارے میں لوگوں کا تاثر اتنا شدید تھا کہ لوگ اپنے احساس کا اظہار کرنے کے لئے الفاظ نہیں پارہے تھے۔ بس یہ کہتے تھے کہ ——— ونڈرفل، مارولس۔ بس اس طرح کے الفاظ بول رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر فطرت کی زبان میں کلام کیا جائے تو اسلام ہر ایک کو خود اپنی چیز نظر آئے گا۔ مگر جب ایسی زبان استعمال کی جائے جو سننے والے کو ایک فرقہ کی وکالت نظر آئے تو فوراً دوسرے فریق کے اندر ضد اور دفاع کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اسلام کو اپنی چیز کے بجائے "غیر" کی چیز سمجھ لیتے ہیں۔ اور پھر سنانے اور سننے والے کے درمیان وہ صحیح ربط ہی نہیں قائم ہوتا جو مثبت دعوتی عمل کے لئے ضروری ہے۔

۹ر اپریل کی شام کو ویودت کلا کیندر کے اجتماع میں ایک پولیس افسر بھی شریک تھے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں کئی سوالات کئے۔ڈاکٹر شاہد نے بتایا کہ انہوں نے اجتماع کے بعد اپنے تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

جب آدمی آنکھ سے دیکھتا ہے تو وہ کچھ دوری تک دیکھ لیتا ہے جب چشمہ لگا کر دیکھتا ہے تو کچھ زیادہ دوری تک دیکھ لیتا ہے۔ جب دوربین سے دیکھتا ہے تو کافی دوری تک دیکھ سکتا ہے۔ اور جب اوپر منزل پر کھڑے ہو کر دیکھتا ہے تو کافی کچھ دیکھتا ہے اور جب ہیلی کاپٹر سے دیکھتا ہے تو وہ پورے شہر کو دیکھ لیتا ہے۔ مولانا اتنی اونچائی پر پہنچ چکے ہیں جس سے وہ پورے مانو سماج کو اسی انداز میں دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی ہیلی کاپٹر سوار دیکھتا ہے۔ یہ الفاظ انہوں نے ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دئے۔

"آپ کا بھاشن ان لوگوں کے لئے بہت خطرناک ہے جو اپنی سوچ روپی کانچ کے مرتبان کی یتن پوروک رکچھا کرتے آرہے ہیں۔ آپ کے سہج شبد اس ادھوری وو کرت سوچ کو توڑ دیتے ہیں۔"

आपका भाषण उन लोगों के लिए बहुत खतरनाक है जो अपनी सोच रुपी काँच के मर्तबान की यत्न पूर्वक रक्षा. करते आ रहे हैं। आपके सहज शब्द उस अघूरी व विकृत सोच को तोड़ देते हैं।

–Subodh Sharma Advocate, Saharanpur
0132-644020,644752,(M)9837093422

ایک صاحب نے کہا کہ آپ مشرکوں اور کافروں کے جلسوں میں جاتے ہیں—یہ اسلام کے خلاف ہے۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے: اتقوا مواضع التهم (یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو) میں نے کہا کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں۔ اگر اس کا یہ مطلب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ عرب کے مشرکوں اور کافروں کے مقامات اجتماع میں نہ جاتے۔ جب کہ یہ ثابت ہے کہ آپ ایسے مواقع پر برابر جاتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ اس کا تعلق نیت سے ہے اگر آپ غیر مسلموں کے اجتماع میں دعوت دین کے مقصد سے جائیں تو یہ عین سنت نبوی کی پیروی ہوگی۔ البتہ اگر آپ ایسے مواقع پر کسی غلط

مقصد کے تحت جائیں تو یہ البتہ ممنوع اور قابل اعتراض ہے۔

ڈاکٹر محمد اسلم خان صاحب اپنی میڈیکل پریکٹس کے علاوہ اسلام پر بھی کافی مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ ایک ملاقات میں انہوں نے خود اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے:

موجودہ زمانہ میں علم کا ارتقاء P.H.D. لیول کو پہنچ گیا ہے۔ اب ہمیں اسی لیول پر اسلام کی نمائندگی کرنا ہے۔ آج کا انسان جس علمی سطح پر کسی چیز کو سمجھنا چاہتا ہے اسی علمی سطح پر اگر وہ اسلام کو پائے گا تو اسے قبول کرے گا، ورنہ وہ اسے رد کر دے گا۔

میں خوش قسمت ہوں کہ میں اس دور میں پیدا ہوا ہوں جس دور میں مولانا وحید الدین خاں کا فکر عالمی سطح پر پرواز کر رہا ہے۔ تمام دیگر مسلم اہل قلم اس صحیح فکر کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔

عصمت آرا (۴۰ سال) ڈاکٹر محمد اسلم صاحب کی اہلیہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ الرسالہ کی مسلسل تعلیم یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ ٹکراؤ سے درگزر کرتے ہوئے اپنے خاص مقصد یعنی دعوت کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔

مس ارم قدسیہ (۱۴ سال) ڈاکٹر محمد اسلم کی صاحبزادی ہیں۔ ان کو تعلیم کا بہت شوق ہے خاص طور پر انگریزی زبان سیکھنے سے بہت دلچسپی ہے۔ ان کا جذبہ یہ ہے کہ وہ انگریزی سیکھ کر دین کی خدمت کریں۔ انہوں نے اپنے تیار کیے ہوئے کئی چارٹ دکھائے۔ ان میں سے ایک چارٹ کا مضمون یہ تھا:

It is too dangerous to leave politics to politicians alone, similarly, too hazardous to leave theology to theologians alone.

—Mustafa, Chief Mufti of Bosnia

ایک صاحب نے موجودہ زمانہ کی بعض مسلم شخصیتوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کو امت میں زبردست کامیابی ملی۔ میں نے کہا کہ کامیابی نہ کہئے بلکہ ذاتی مقبولیت کہئے۔ مقصد میں کامیابی اور شخصی مقبولیت میں فرق ہے۔ غور کیجئے تو ان میں سے کوئی بھی اس معنی میں کامیاب نہیں ہوا کہ

اس کی کوششوں سے امت میں حقیقی زندگی پیدا ہو جائے۔ البتہ ان کے گرد لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو گئی۔

میں نے کہا کہ ان لوگوں کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ انہوں نے ایک زوال یافتہ قوم کو اس کی زوال کی سطح پر اس کی پسندیدہ خوراک فراہم کر دی۔ کسی نے لوگوں کی فخر پسندی کو غذا دی۔ کسی نے لوگوں کی جذباتیت کے مطابق انہیں خوراک مہیا کی۔ کسی نے ایسا نسخہ فراہم کیا کہ لوگوں کو بے عملی میں عمل والے فائدے ملتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کسی نے جنت کے سستے ٹکٹ تقسیم کرنے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ کسی نے ایسا نظریہ دیا جس میں سیاسی ہنگامہ آرائی اعلیٰ اسلامی عمل دکھائی دیتا تھا۔ کسی نے ایسے خوشنما تخیلات دئے جن میں لفظی بلند پروازی سے حقائق کی منزلیں طے ہو رہی تھیں۔ اس قسم کی باتوں کے ذریعہ مقبولیت حاصل کرنا ایسا ہی ہے جیسے خارش زدہ آدمی کو کھجلانے کا نسخہ بتا دیا جائے۔

ایک مجلس میں چھوٹے مکان اور بڑے مکان کا تذکرہ ہوا۔ میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ كل بناء وبال على صاحبه إلا ما لا، إلا مالا (ہر عمارت اس کے مالک کے لئے وبال ہے۔ سوا اس عمارت کے جو بالکل ضروری ہو۔)

میں نے کہا کہ بڑا مکان اگر ضرورت کے لئے ہو تو وہ یقیناً جائز ہے مگر عام طور پر ایسا ہے کہ لوگ بڑا مکان اس لئے بناتے ہیں کہ سماج میں اونچا درجہ حاصل کر سکیں۔ یہی وہ مکان ہے جس کے بارہ میں اس حدیث میں انتباہ دیا گیا ہے۔ اس قسم کا مکان لوگوں کے اندر احساس فخر پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر یہ نہایت پست چیز ہے۔ کسی انسان کا درجہ درودیوار سے متعین نہیں ہوتا، بلکہ اخلاقی صفات اور روحانی اقدار سے متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگوں کے لئے شاندار مکان صرف ان کے لئے اور ان کے بچوں کے لئے شاندار قبر بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے مکان میں صرف ایسے لوگ رہتے ہیں جو دینی اور اخلاقی اعتبار سے مر چکے ہوں۔ کچھ لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ عام طور پر لوگ غربت کو بدنصیبی اور

دولت مندی کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ مگر ایسا سمجھنا غلط ہے۔ قرآن کے مطابق، یہ دنیا امتحان کے لئے ہے۔ یہاں ہر چیز امتحان کے لئے ہے۔ غربت بھی امتحان کا ایک پرچہ ہے اور دولت مندی بھی امتحان کا ایک پرچہ۔ کسی کو خدا بے زور حالت میں آزماتا ہے اور کسی کو زور اور طاقت دے کر آزمارہا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ ان چیزوں کو وہ نہ یافت سمجھے اور نہ محرومی۔ وہ اپنی ہر حالت کو امتحان کی حالت سمجھے۔ اس کی ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ اس امتحان میں پورا اترے جس میں مبتلا کر کے اس کا خدا اسے آزمارہا ہے۔

سفروں میں آدمی کی جگہ بدلتی ہے۔ ملاقاتوں کا دائرہ بڑھتا ہے۔ نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اس طرح مختلف قسم کے لوگوں کے خیالات سامنے آتے ہیں۔ سفر اگر کھلی آنکھ اور کھلے ذہن کے ساتھ کیا جائے تو وہ مسافر کے لئے توسیع مطالعہ کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

موجودہ سفر میں کثیر تعداد میں لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی اور بہت سے سوالات سامنے آئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں آپ کی تحریریں برابر پڑھتا رہا ہوں اور ان کو پسند کرتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کے بعد کون۔ میں نے کہا کہ اکثر لوگ اس طرح کا سوال کرتے ہیں۔ مگر میں تو یہ سوچتا ہوں کہ میری موجودگی میں کون۔ میری دعوتی جدوجہد تقریباً پچاس سال کی مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس راہ میں میں نے اپنا خون خشک کر دیا۔ میری شخصیت ویران ہو گئی۔ میرے دن اور رات کا سکون چھن گیا۔ مگر اب بھی وہی حال ہے جس کی مشابہت انجیل میں ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ہم نے بانسری بجائی مگر تم نے رقص نہیں کیا۔ ہم نے نوحہ کیا مگر تم روئے نہیں۔ (انا زمرنا لکم فما رقصتم و ندبنا لکم فما بکیتم)

۱۹۹۱ میں رام نومی کے موقع پر سہارنپور میں فساد ہوا اس کی خبریں اخبار میں چھپیں۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے اس میں سے ایک واقعہ یہ ہوا کہ سہارنپور کی ایک خاتون تسنیم جو جدہ میں رہتی تھیں۔ انہوں نے سہارنپور میں فساد کی خبر سنتے ہی ٹیلی فون کیا کہ سہارنپور کے مسلمانوں کی حالت معلوم کریں۔ ان کا فون سبودھ شرما ایڈوکیٹ کے گھر پر

آیا (Ph-644752)۔ شرما صاحب کی بہن مس اپیتا چوں کہ تسنیم صاحبہ کی کلاس فیلو تھیں اس لئے انہوں نے یہ فون ان کے یہاں کیا۔ ۱۹ اپریل کی ملاقات میں مسٹر سیودھ شرما ایڈوکیٹ نے بتایا کہ جب ہمارے گھر میں فون کی گھنٹی بجی اور میری بہن اپیتا نے ریسیور اٹھایا اور فون پر کہا کہ ہلو تو اچانک فون کے دوسری طرف سے رونے کی آواز آنے لگی۔ مس اپیتا نے کہا کہ کیوں رو رہی ہو۔ جدہ سے بولنے والی خاتون نے کہا "ہمیں تو یہ پتہ چلا تھا کہ چوک فوارہ کا علاقہ فساد میں مکمل طور سے نذر آتش ہو چکا ہے اور کسی کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ وہ اپنی فرینڈ کو زندہ پا کر اور اس کی آواز فون پر سن کر اچنبھے میں تھیں اور دیر تک روتی اور سسکتی رہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی رہیں۔

۹/اپریل کی رات کا کھانا ڈاکٹر کوشل کے یہاں تھا۔ یہاں ڈاکٹر کوشل کے سوا مسٹر امین سیانی (آرٹسٹ) مسٹر دلیش بھگت (سیاسی لیڈر) وغیرہ موجود تھے۔ حسب رواج لوگ میری پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگے۔ میں نے ہر ایک کو منع کیا۔ ہر ایک سے کہا کہ آپ لوگ کھایئے، میں بعد کو لے لوں گا۔ یہاں تک کہ سب لوگ اپنی پلیٹ میں لے کر کھانا کھانے لگے۔ میں نے کچھ دیر کے بعد ایک سادہ روٹی اپنی پلیٹ میں رکھی اور بہت آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ میں چنے کے برابر روٹی کا ایک ٹکڑا توڑتا اور اس کو منھ میں ڈال کر چباتا رہتا۔ لوگ کھانا کھا چکے اور میری پلیٹ میں آدھی روٹی رہ گئی تھی۔ میں نے بچی ہوئی روٹی برادرم محمد اسلم کو اصرار کر کے دے دی۔ اس کے سوا میں نے دستر خوان پر کچھ بھی نہیں کھایا۔ وہاں سے لوٹ کر اسی طرح رات کو سو گیا۔ اگلے دن صبح کو کافی دیر کے بعد ڈاکٹر شاہد صابری (امبیہٹہ) کے یہاں ناشتہ کیا۔ دوبارہ یہ ہوا کہ میز پر پھیلے ہوئے بہت سے آئیٹم میں سے صرف ایک دو چیز کھائی۔ اور بقیہ کو چھوڑ دیا۔

دہلی واپسی کے بعد میں نے برادرم کوکب الباری سے ڈاکٹر کوشل کے یہاں پیش آنے والا روٹی کا قصہ بتایا۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جب میز یا دستر خوان پر طرح طرح کے پر تکلف کھانے ہوں تو ان کو دیکھ کر میرا

شہیہ (appetite) ختم ہو جاتا ہے۔ بھوک کی حالت میں بھی کھانے کی رغبت نہیں ہوتی۔ بس زبردستی کچھ کھالیتا ہوں۔ اس کے برعکس اگر سادہ کھانا ہو تو کھانے کا جی چاہتا ہے اور میں بھوک کے مطابق شوق سے کھانا کھاتا ہوں۔

میں نے کہا کہ ایک بار میں جموں و کشمیر کے علاقہ میں گیا۔ ایک صاحب کے یہاں شام کے کھانے کی دعوت تھی۔ جن کے متعلق بتایا گیا تھا کہ وہ میرے فین (Fan) ہیں۔ انہوں نے انتہائی لذیذ اور پر تکلف کھانے پکوائے۔ دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانوں کے ساتھ خالص شہد اور تازہ بادام ہرے چھلکوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے مسرت کے انداز میں کہا کہ کل جب آپ یہاں سے جائیں گے تو ہم آپ کو شہد اور بادام کا تحفہ دیں گے۔

مگر دستر خوان پر پر تکلف اور خوشبودار کھانوں کو دیکھ کر وہی ہوا کہ میری رغبت ختم ہو گئی۔ وہ مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ یہ لیجئے، وہ لیجئے۔ مگر میں کچھ کھا نہ سکا۔ میں نے صرف روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا اور کچھ شہد اور بادام۔ اس پر صاحب خانہ غصہ ہو گئے۔ شاید انہوں نے اس کو توہین سمجھا کہ ان کے تیار کئے ہوئے پر تکلف کھانے کو میں نے نہیں کھایا۔ ان کا غصہ اتنا بڑھا کہ اگلے دن جب میں ان کے یہاں سے واپس ہو کر دہلی کے لئے روانہ ہوا تو انہوں نے حسب وعدہ مجھ کو نہ شہد کا تحفہ دیا اور نہ تازہ بادام کا۔

جموں اور کشمیر کے اس سفر میں ایک اور بالکل برعکس واقعہ پیش آیا۔ ایک اسکول کے ماسٹر نے مجھے ناشتہ کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ میں صبح سویرے اسکول کے لئے بذریعہ بس روانہ ہو جاتا ہوں اس لئے آپ سویرے میرے گھر پر آجائیں تاکہ ہم آپ ایک ساتھ ناشتہ کر سکیں۔ میں نے کہا کہ میں صرف ایک شرط پر آؤں گا۔ وہ یہ کہ مجھے آپ وہی ناشتہ کرائیں جو آپ روزانہ کرتے ہیں۔ انہوں نے میری یہ شرط مان لی۔

صبح سویرے میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے دستر خوان بچھایا اور اس پر دو چیز رکھی ــــ سادہ روٹی اور اچار کا ایک ڈبہ۔ انہوں نے کہا کہ میں روزانہ یہی ناشتہ کرتا

ہوں۔ اچار سے روٹی کھاتا ہوں اور ایک پیالی چائے پی کر فوراً اسکول چلا جاتا ہوں۔ میں نے سادہ روٹی اور اچار کا یہ ناشتہ بہت شوق کے ساتھ کھایا۔ یہ سادہ کھانا کھا کر اس سے زیادہ خوشی ہوئی جو کھانے کے شوقین لوگوں کو پر تکلف دعوتوں میں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر کوشل کے یہاں کئی دوسرے لوگ بھی موجود تھے ان میں سے ایک صاحب وہ تھے جو آرٹ کے میدان میں آل انڈیا شہرت رکھتے ہیں۔ ایک اور صاحب تھے جو سینئر پالی ٹیشین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان لوگوں سے کافی گفتگو ہوئی۔

میں نے محسوس کیا کہ آرٹسٹ لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے صرف لائٹ سائڈ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو یہ خصوصی مہارت حاصل ہے کہ آپ سائنٹفک سوالات کا بھی پوئٹک جواب دے سکیں۔ یہی حال موجودہ زمانہ کے سیاست دانوں کا ہوتا ہے۔ وہ اس بات کی کافی مہارت رکھتے ہیں کہ وہ مثبت ایشوز کو بھی منفی رنگ میں بیان کر سکیں۔ ایسے لوگ ہر بات میں ایسا پہلو نکال لیتے ہیں جس کی زد حکمراں گروہ پر پڑتی ہو۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں ہر آدمی اپنے ماحول کے اعتبار سے کنڈیشنڈ ہو جاتا ہے اور کسی انسان کے لئے شاید سب سے زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ وہ کنڈیشننگ کے اس ذہنی کھر سے باہر آجائے۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا کم و بیش یہی کیس ہے۔ ہر آدمی اپنے ماحول کے اعتبار سے کنڈیشنڈ تھنکنگ کا شکار ہے۔ ایسی حالت میں دعوتی عمل کا آغاز براہ راست خطاب سے نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ اس سے پہلے وہ کام کیا جائے جس کو تقریب ذہن کہا جاتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے حکمت کے ساتھ ذہن بنانا اور اس کے بعد براہ راست دعوتی خطاب کرنا۔ اسی حکیمانہ عمل کا نام اسلامی شریعت میں تالیف قلب ہے۔

۱۰ اپریل کی صبح کو فجر کی نماز کے بعد ڈاکٹر اسلم صاحب کے مکان کی چھت پر ٹہل رہا تھا۔ اس دوران کچھ لاؤڈ اسپیکر کی آواز سنائی دی۔ میں نے دھیان دیا تو لاؤڈ اسپیکر پر بولنے والا کہہ رہا تھا کہ: سورج نکلنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔

میں نے سوچا کہ آج ہر آدمی کے پاس گھڑی ہے۔ ہر آدمی کو پتہ ہے کہ سورج نکلنے یا ڈوبنے میں کتنے منٹ باقی ہیں مگر ایک اور خبر ہے جس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ ہر آدمی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر کوئی یہ اعلان کرنے والا نہیں کہ تمہاری موت کے آنے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔

۱۰ اپریل کی صبح کو ڈاکٹر شاہد صابری صاحب کے ساتھ امبہٹہ کے لئے روانگی ہوئی جو کہ سہارنپور سے ۲۵ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے، امبہٹہ میں وہ پبلک اسکول دیکھا جس کو ڈاکٹر شاہد صابری نے لمبی کوشش کے بعد قائم کیا ہے۔

امبہٹہ میں ڈاکٹر شاہد صابری کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں وہاں کے تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس موقع پر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ مختلف متعلق پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی گئی۔ ایک صاحب کا خیال تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور زیادتی کا معاملہ کیا جاتا ہے ایسی حالت میں وہ یہاں کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ایک فرضی بات ہے۔ مسلمان بروقت ہی اس ملک میں زبردست ترقی کر رہے ہیں۔ اس ترقی کا نمونہ ہر بستی اور ہر شہر میں اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کی موجودہ حالت کا تقابل ان کی ۱۹۴۷ کی حالت سے کیا جائے۔ ملک کی جس مسلم فیملی کا اس روشنی میں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ہر مسلم فیملی ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی کر چکی ہے۔

یہ سلیکٹیو رپورٹنگ (selective reporting) کا پیدا کیا ہوا مسئلہ ہے۔ ہندستان میں ہر دن ہزاروں گاڑیاں دوڑتی ہیں۔ لیکن میڈیا میں کبھی ان کی خبر نہیں آتی۔ میڈیا کبھی یہ نہیں بتاتا کہ فلاں ٹرین فلاں اسٹیشن سے اپنے وقت پر روانہ ہوئی اور سیکڑوں میل کا سفر کر کے فلاں اسٹیشن پر خیریت کے ساتھ پہنچ گئی۔ اس قسم کے مثبت واقعات میڈیا میں کبھی رپورٹ نہیں ہوتے اس لئے لوگ غیر شعوری طور پر ان سے بے خبر رہتے ہیں۔ لوگ صرف ان بری خبروں کو جانتے ہیں جو میڈیا میں رپورٹ ہوتے ہیں اور تصویروں کے ذریعہ جن کو خوب نمایاں کیا جاتا ہے۔ یہی وہ

حادثاتی واقعات ہیں جو ریلوے کی دنیا میں کبھی کبھی اتفاقاً پیش آجاتے ہیں۔ ان استثنائی واقعات کو پڑھ کر وہ سمجھتے ہیں کہ ریلوں میں روزانہ حادثہ ہی ہوتا رہتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا نے یہ مسئلہ بہت بڑے پیمانہ پر پیدا کیا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ کے اکثر فکری اور عملی مسائل براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی میڈیا کی پیداوار ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ مسلمانوں کی جو تصویر عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ میڈیا پر مبنی ہے اور میڈیا گویا سلیکٹیو رپورٹنگ کی ایک انڈسٹری ہے جو اچھی خبروں کو نظر انداز کرتی ہے اور صرف بری خبروں کو پیش کرتی ہے۔ اس غلط تصویر کشی میں سب سے زیادہ دخل اردو اور ہندی اخباروں کا ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری بات میں نے یہ کہی کہ موجودہ زمانہ میں صنعتی انقلاب کے بعد ایک قسم کا اقتصادی انفجار (economic explosion) آیا ہے۔ اس لئے آج کسی کے لئے بھی عام حالات میں اقتصادی محرومی کا سوال نہیں۔

ڈاکٹر شاہد صابری نے ہاروت وماروت کے بارے میں سوال کیا۔ جن کا قصہ قرآن (البقرہ ۱۰۲) میں آیا ہے۔ میں نے کہا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے۔ بابل (عراق) کا مشرک بادشاہ فلسطین کے یہودیوں کو بڑی تعداد میں پکڑ کر بابل لے گیا اور وہاں وہ خدمت گار کے طور پر رہنے لگے۔ اس زمانہ میں بابل میں جادو اور عملیات کا بہت زور تھا بڑے بڑے ساحر وہاں موجود تھے۔ ان کے ساحرانہ کرشموں کو دیکھ کر یہودی بہت متاثر ہوتے تھے۔

جو لوگ سحر کے کرشمے دکھاتے ان کو وہ بزرگ اور صاحب کرامت سمجھ لیتے۔ اس وقت اللہ تعالی نے ہاروت وماروت کی صورت میں دو فرشتے بابل کی طرف بھیجے۔ وہ وہی ساحرانہ کرشمے زیادہ بڑے پیمانہ پر دکھا سکتے تھے جو بابل کے ماہر جادوگر دکھاتے تھے۔ اس کے ساتھ

اروت وماروت یہ بھی کہتے کہ یہ محض فتنہ ہے اس کا بزرگی اور خدارسیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔

ہاروت وماروت چونکہ خود بھی جادو جیسے بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتے تھے اس لئے ان کی زبان سے ان کرشموں کی نفی بیحد اہم تھی۔ عام آدمی اگر کہے کہ ساحرانہ شعبدے بے حقیقت ہیں تو لوگ اس کو وزن نہ دیں گے۔ مگر جو شخص خود بڑے بڑے ساحرانہ شعبدے دکھارہا ہو جب وہ یہ کہے کہ یہ کوئی بزرگی اور کرامت کی چیز نہیں تو اس کے بعد لوگوں کے لئے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ یہ سب چیزیں چمتکار ہیں نہ کہ بزرگی یا خدارسیدگی کی علامت۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے اس ملاقات کا ذکر کیا جو چند دن پہلے دہلی میں ہوئی تھی۔ یہ مسٹر مارک تلی (Mark Tully) کی ملاقات تھی۔ وہ ایک سینئر برٹش صحافی ہیں۔ وہ آج کل نئی دہلی میں رہتے ہیں۔ (Tel. 4629687)

مسٹر مارک تلی ہندستانی مسلمانوں پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مجھ سے ملے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمان آج پاکستان کے مسلمانوں سے بھی زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ اس پر انھیں تعجب ہوا۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جو میڈیا میں آتا ہے۔ اور میڈیا کا حال یہ ہے کہ وہ سلیکٹیو رپورٹنگ کی انڈسٹری ہے۔ یعنی بری خبروں کو چھاپنا اور اچھی خبروں کو چھوڑ دینا۔ میں نے بتایا کہ چند دن پہلے میں بی بی سی لندن کی نشریات کو سن رہا تھا۔ اناؤنسر نے ماریشس کے ایک ہندو کا خط پڑھ کر سنایا۔ اس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ آپ اپنے نیوز بلیٹین میں ماریشس کی خبریں نہیں دیتے۔ اناؤنسر نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ماریشس میں سب گڈ نیوز ہوتی ہیں۔ اور جدید میڈیا کے اصول کے مطابق good news is no news۔ آپ لوگ کچھ بیڈ نیوز (bad news) فراہم کریں تو ہم ضرور ان کو نشر کریں گے۔

امیٹھ سے واپس ہو کر سہارنپور پہنچا تو یہاں ڈاکٹر اسلم صاحب کے مکان پر بہت سے تعلیم یافتہ افراد منتظر تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان سے دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔

ایک مجلس میں آخرت اور جنت و دوزخ کا ذکر ہوا۔ ایک صاحب نے کہا کہ جنت ہمارے عمل سے تو ملے گی نہیں۔ وہ تو اللہ جس کو چاہے گا دے گا۔ اس رائے کی تائید میں انہوں نے بعض آیتیں اور حدیثیں پیش کیں۔

میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھی میرا عمل جنت میں نہیں پہنچائے گا۔ الا یہ کہ خدا اپنی رحمت اور اپنے فضل سے مجھے ڈھانک لے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کا عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جنت کی معیاری دنیا اتنی زیادہ قیمتی ہے کہ عمل کی کوئی بھی مقدار اس کی قیمت نہیں بن سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت کسی عمل کی قدر دانی کی بنا پر ملے گی نہ کہ اس عمل کی قیمت کے طور پر۔ قیامت میں خدا ہر ایک کے عمل کو جانچے گا۔ پھر جس آدمی کے عمل کو خالص اور قابل قدر پائے گا اس کی عزت افزائی اس طرح کرے گا کہ اس کے لئے جنت کا فیصلہ فرمادے گا۔

ایک مجلس میں تصوف پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ حقیقی تصوف وہ ہے جس کو قرآن میں ربانیت کہا گیا ہے۔ اس تصوف کا مطلب ہے، خارج سے بلند ہو کر داخل کا تجربہ کرنا۔ الفاظ سے گزر کر معانی تک پہنچ جانا۔ میں نے کہا کہ ایک صوفی کا قول ہے: العلم مع اورادکم ونحن مع وارداتنا۔ اس طرح کے اقوال کو کچھ ناقدین تصوف نے مطلق معنوں میں لے کر یہ سمجھ لیا کہ تصوف ظاہری عمل کی نفی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اس طرح کے اقوال صرف ایک کے مقابلہ میں دوسرے پر زور دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ مذکورہ قول کا مطلب یہ ہے کہ عام لوگ اوراد یا ظاہری عمل ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ آدمی کا ظاہری عمل اس کے اندر واردات یا اعلیٰ کیفیات پیدا کرنے کا ذریعہ بن رہا ہو۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ جبری مادیت (compulsive materialism) کا زمانہ ہے۔ ہر آدمی مال کمانے کی طرف دوڑ رہا ہے تاکہ وہ سماج میں اعلیٰ اسٹیٹس کو حاصل کر سکے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ مال اور سامان کا ڈھیر لگانے کے بعد آخرکار آدمی محسوس کرتا

ہے کہ وہ ایک ناکام انسان ہے۔ کیوں کہ مال کا مقصد خوشی اور سکون تھا، اور وہ مال کے باوجود اس کو نہ مل سکا۔

اس تضاد پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اصل چیز مال نہیں ہے بلکہ اصل چیز مال سے انتفاع یا انجوائے کرنے کی استعداد ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو جو وجود ملا ہے وہ مختلف قسم کی محدودیتوں (limitations) کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ یہی محدودیتیں اس میں رکاوٹ ہیں کہ آدمی یہاں چیزوں سے انجوائے کرے۔ آخرت میں یہ محدودیتیں ختم کردی جائیں گی۔ اس وقت آدمی اس قابل ہو جائے گا کہ وہ اپنی بھرپور استعداد (full capacity) کے ساتھ جی سکے۔ اور اسی قسم کی زندگی کا دوسرا نام خوشی اور سکون ہے۔

سہارنپور کے علاقہ میں بہت سے دینی مدرسے ہیں۔ ان میں سے دو زیادہ بڑے ہیں ــــــ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور۔ ان مدرسوں کے ذریعہ دینی تعلیم کی اشاعت کا کام بہت بڑے پیمانہ پر انجام پایا ہے۔

سہارنپور سے ایک اردو ماہنامہ آئینۂ مظاہر العلوم کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کا شمارہ مارچ تا مئی ۲۰۰۰ نظر سے گذرا۔ اس میں "دینی مدارس کی اصلی غرض" کے عنوان سے مولانا اشرف علی تھانوی کی ایک تحریر شائع ہوئی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مدارس کے علمی معیار کو بڑھانے کی صورت یہ ہے کہ مدارس میں زیادہ اعلیٰ قابلیت کے افراد رکھے جائیں۔ اس تحریر کا ایک اقتباس یہ ہے:

"کوئی مدرسہ کھولنا ہو تو آج کل عادت یہ ہو گئی ہے کہ جو مدرسہ کی اصلی غرض ہے اس کی طرف تو لوگ نظر کرتے نہیں زوائد کو شروع کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے عمارت بنتی ہے اور وہ بھی ایسی ہوتی ہے کہ لوگ تماشہ کے لئے آیا کریں۔ روپیہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تو اس میں خرچ ہو جاتا ہے اور جو اصل غرض تھی اس میں تخفیف کی جاتی ہے۔ اصل غرض تعلیم ہے۔ اس میں تخفیف یوں کی جاتی ہے کہ مدرسین بہت کم تنخواہ کے

ڈھونڈے جاتے ہیں۔ مدرس جتنا کم تنخواہ پر مل جائے اسی کو مہتمم اپنی کارگزاری سمجھتے ہیں۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ مدرسین کی تعداد بڑھالیں چاہے وہ فارغ التحصیل بھی نہ ہوں۔ بس تماشائیوں کو دکھلادیا کریں کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے مدرسین ہیں۔ صاحبو!! اہل کمال تو کسی فن کے بھی سستے نہیں آتے۔ اچھا کاریگر، معمار مزدور کی اجرت پر نہیں آسکتا، اچھا دھوبی معمولی دھوبیوں سے دام زیادہ ہی لیتا ہے۔ پھر مدرس وہ کیسے اچھا ہوگا جو کم تنخواہ پر آجاوے۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز میں تو آج کل ترقی ہے اور دین میں پست ہمتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز میں تو وہی چیز پسند کی جاتی ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور دین میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کو بھی کافی سمجھ لیتے ہیں، افسوس آج کل حقیقت شناسی سے کس قدر بعد ہوگیا ہے۔"(صفحہ ۱۶)

ایک مجلس میں ایک صاحب نے آرٹ کے بارے میں سوال کیا۔ کیا اسلام میں آرٹ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً رقص، موسیقی، پینٹنگ، گانا وغیرہ۔ میں نے کہا کہ یہ چیزیں اسلام میں صراحۃً حرام نہیں کی گئی ہیں۔ مگر اسلام اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آرٹ خواہ حرام نہ ہو مگر اس کا ایک اور شدید نقصان ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ اس قسم کی چیزوں میں مشغول ہوتے ہیں وہ زندگی کے صرف لائٹ (light) سائڈ میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ زندگی کے زیادہ سنجیدہ (serious) سائڈ میں ان کی دلچسپی کم یا ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہ بلاشبہہ کسی انسان کی حقیقی ترقی کے لئے بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

۱۰ اپریل کو دو بجے ہوٹل پنجاب کے وسیع ہال میں عام جلسہ ہوا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ جگہ نہ پانے کی بنا پر کھڑے ہوئے نظر آئے۔ اس جلسہ میں جناب جسٹس شمیم صاحب اور مسٹر امین سیانی اور بعض دوسرے افراد کی تقریریں ہوئیں۔ مسٹر امین سیانی ریڈیو کے ذریعہ کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں میل ملاپ کا پیغام دیا۔ جناب جسٹس شمیم صاحب مائنارٹی کمیشن کے چیرمین ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ

موجودہ حالت میں ہماری سب سے بڑی ضرورت نیشنل انٹگریشن ہے۔ جب تک نیشنل انٹگریشن نہ ہو کوئی بڑی ترقی ممکن نہ ہو گی۔

اس جلسہ میں مجھ کو تقریر کا جو عنوان دیا گیا تھا وہ اسلام اور سائنس تھا۔ میں نے اپنی مفصل تقریر میں بتایا کہ سائنس اسلامی انقلاب ہی کی ایک پیداوار ہے۔ سائنس کیا ہے۔ سائنس حقائق فطرت کی دریافت پر مبنی ہے۔ فطرت (نیچر) اسلام سے پہلے پرستش کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ اسلام سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا، اور شرک فطرت کی پرستش (نیچر ورشپ) کا دوسرا نام ہے۔ فطرت کی چیزوں کو قابل پرستش معبود سمجھ لینے کی وجہ سے فطرت کی تحقیق رکی ہوئی تھی۔ اسلام نے جب فطرت کو پرستش کے بجائے تسخیر کا موضوع بنایا تو اس کے بعد علوم فطرت ظہور میں آنا شروع ہوئے۔ اس طرح تاریخ میں سائنس کے دور کا آغاز ہوا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب اسلام دور جدید کا خالق)

ایک مجلس میں مسٹر امین سیانی (بمبئی) نے یہ سوال کیا کہ **حب الوطنی من الایمان** قرآن میں ہے یا حدیث میں۔ میں نے کہا کہ وہ نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ یہ دراصل ایک عربی مقولہ ہے۔ پھر میں نے کہا کہ یہ عربی مقولہ فطرت پر مبنی ہے۔ وہ انسانی فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ حب الوطنی من الایمان تو قرآن و حدیث میں نہیں۔ مگر معمولی فرق کے ساتھ وہ ہر آدمی کے سینہ کے اندر لکھا ہوا ہے اور وہ یہ ہے: **حب الوطنی من الفطرۃ۔**

میں نے کہا کہ قرآن میں کہیں یہ لکھا ہوا نہیں کہ اے ماؤ تم اپنے بیٹوں سے محبت کرو۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماؤں کو اپنے بیٹوں سے محبت نہیں کرنا چاہئے۔ بیٹے کے لئے ماں کے دل میں محبت ہونا خود انسانی فطرت میں لکھا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو قرآن میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے اس کو قرآن میں درج نہیں کیا گیا۔ بلکہ فطرت انسانی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو چھوڑ دیا گیا۔

یہاں ایک صاحب تھے جن کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن اور وید ایک ہی ہیں۔ انہوں نے اپنے

اس نظریہ کے حق میں قرآن کی ایک آیت پیش کی: وانه لفی زبر الاولین (الشعراء ۱۹۶) انہوں نے کہا کہ زبر الاولین آدی گرنتھوں کا لفظی ترجمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو جس کو آدی گرنتھ کہتے ہیں اس کی باتیں قرآن میں بھی آئی ہیں۔

یہ دلیل نہیں بلکہ لفظی تک بندی ہے۔ لفظی مشابہت سے کوئی بھی چیز ثابت نہیں ہوتی۔ اگر یہ کوئی دلیل ہو تو ایک شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں بھارت کے آدی باسیوں کا تذکرہ موجود ہے کیوں کہ قرآن میں آیا ہے کہ ـــــ فی شیع الاولین (الحجر ۱۰) اور شیع الاولین آدی باسی کا لفظی ترجمہ ہے۔

لفظی مشابہت سے استدلال کا دائرہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ اس کے ذریعہ کچھ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کہا کہ انگریزی زبان کے تمام الفاظ اردو زبان سے لئے گئے ہیں۔ سننے والے نے کہا کہ وہ کیسے۔ کہنے والے نے کہا کہ آپ کوئی لفظ بتائیے اور میں ابھی اس کو ثابت کردوں گا۔ سننے والے نے کہا کہ ڈیکوریشن (decoration) کس اردو لفظ سے لیا گیا ہے۔ کہنے والے نے فوراً کہا: دیکھو رے شان سے۔ اسی طرح کہنے والے نے کہا کہ انگریزی شاعری سب کی سب ہندستان سے امپورٹ کی گئی ہے۔ اس کے ثبوت میں اس نے کہا کہ شیکسپئر اصل میں ایک ہندستانی شاعر شیخ پیرو تھا جس کو انگریزوں نے انگریزی میں ڈھال کر شیکسپئر بنا دیا۔

ایک مجلس میں اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہندستان میں دو قسم کے مذہبی رجحان نہایت غلط ہیں۔ اور ان سے کسی کو کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔ ان میں سے ایک رجحان یہ ہے کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے جس کا علمی مطالعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً خدا کا تصور ہندوازم میں مانزم (monism) پر مبنی ہے اور اسلام میں مانوتھی ازم (monotheism) پر۔ ہندوازم میں خدائی اوتار کا تصور ہے اور اسلام میں پیغمبر کا تصور۔ ہندوازم میں پنر جنم کا عقیدہ ہے اور اسلام میں موت کے بعد ہی جزاء و سزا کا تصور، وغیرہ۔

اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان فرق

(difference) کا انکار کرنے کے بجائے علمی ڈائیلاگ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مذاہب کا احترام کرتے ہوئے لوگ آپس میں اسی طرح مذہبی موضوعات پر کلام کریں جس طرح سیکولر لوگوں کے درمیان سائنسی موضوعات پر کھلی بحث کی جاتی ہے۔ اور کوئی اس کو برا نہیں مانتا۔

اس سلسلہ میں دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ سماجی ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تمام مذاہب کی تعلیمات ایک ہیں۔ مگر بطور واقعہ یہ دعویٰ درست نہیں۔ مثال کے طور پر ہندو مذہب میں یہ عقیدہ ہے کہ آدمی موجودہ زندگی میں جو کرم کرتا ہے اس کو وہ دوبارہ اسی دنیا میں واپس آکر بھوگتا ہے اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ جبکہ اسلام میں یہ عقیدہ ہے کہ موجودہ زندگی میں آدمی جو عمل کرتا ہے اس کا انجام موت کے بعد ہی اس کے سامنے آجاتا ہے اور جنت یا جہنم کی صورت میں وہ اس کو پالیتا ہے، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ سماجی ہم آہنگی کا کوئی تعلق مذہبی یکسانیت سے نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک ہی مذہب کے ماننے والے آپس میں نہ لڑتے جب کہ باہم لڑائی کی مثالیں ہر مذہب کے ماننے والوں میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ سماجی ہم آہنگی کے لئے زیادہ صحیح فارمولا یہ ہے کہ لوگ اپنے عقیدہ کے مطابق، ایک مذہب پر عمل کریں اور دوسرے مذہب کے پیروؤں کا احترام کریں:

Follow one, respect all

کئی اخباروں نے تفصیلی انٹرویو لینا چاہا مگر وقت کی کمی کی بنا پر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ ایک ہندی اخبار راشٹر یہ سوروپ کے دو نمائندے مسٹر ٹی ایم گاندھی اور مسٹر ونود پیشگی اپائنٹمنٹ کے بغیر میری قیام گاہ پر آگئے۔ انھوں نے مختلف ملکی اور ملی مسائل پر سوالات کئے جن کا میں نے جواب دیا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ملک کا اصل مسئلہ تعلیم ہے۔ جب تک تعلیم میں قوم آگے نہیں بڑھے گی کوئی بھی ترقی نہیں ہو سکتی۔

۱۰ اپریل ۲۰۰۰ کی شام کو سہارنپور سے دہلی کے لئے واپسی ہوئی۔ یہ سفر دوبارہ شتابدی

اکسپریس کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ ٹرین جاتے ہوئے بھی ٹھیک ٹائم پر تھی اور واپسی میں بھی وہ اپنے ٹھیک ٹائم پر ۱۱ بجے رات کو دہلی پہنچ گئی۔

بہت دنوں سے ٹرین میں میرا کوئی سفر نہیں ہوا تھا اس لئے جب سہارنپور کا یہ سفر پیش آیا تو ذہن میں ایک موہوم سی تشویش پیدا ہو گئی۔ اس مدت میں مجھے ٹرینوں کا ذاتی تجربہ تو نہیں تھا لیکن میڈیا میں میں اس کی خبریں سنتا اور پڑھتا رہا۔ فلاں جگہ ٹرین پٹری سے اتر گئی، فلاں جگہ دو گاڑیاں آمنے سامنے سے ٹکرا گئیں، فلاں جگہ ریلوے کراسنگ پر ٹرین اور بس کی ٹکر ہو گئی۔ فلاں جگہ ٹرین میں آگ لگ گئی۔ اس قسم کی خبروں کی بنا پر ذہن میں ٹرین کی جو تصویر بنی تھی وہ بظاہر یہ تھی کہ ٹرین ایک ایسی سواری ہے جو اکثر حادثات کا شکار ہوتی رہتی ہے لیکن جب میں نے ٹرین کے ذریعہ سفر کیا تو میں خیریت کے ساتھ دہلی سے سہارنپور گیا اور سہارنپور سے دہلی واپس آ گیا۔

سوال

کیا مادیت اپنے زوال کے بعد از سر نو عروج کو پہنچے گی؟ کیا جدید مادیت کا زوال ہو رہا ہے؟ اگر زوال ہو رہا ہے تو اس کی علامتیں کیا ہیں اور اگر اس کا زوال نہیں ہو رہا ہے تو آئندہ کب اس کا زوال ہو گا۔ کیوں کہ فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ: ہر کمالے را زوال (طارق اشفاق، علیگڈھ)

جواب

مٹیر یلزم کے دو مطلب ہیں۔ فلسفیانہ معنوں میں مٹیر یلزم خدائی مذہب کے بالمقابل ایک اور مذہب کی حیثیت رکھتا ہے جو صرف مادہ کو واحد حقیقت مانتا ہے۔

In phliosophy, the doctrine that matter is the only reality and that everything in the world, including thought, will, and feeling, can be explained only in the terms of matter. (Webster's, p.1110)

مٹیریلزم اس مفہوم میں عملاً اب ختم ہو چکا ہے۔ جدید سائنس نے میٹر کے اس تصور کو مکمل طور پر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے جس کے اوپر مادی فلسفہ کا نظریہ قائم تھا۔ مٹیر یلزم کے لئے اب کوئی نظریاتی بنیاد نہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب، "مذہب اور سائنس"۔

مٹیر یلزم کا دوسرا مفہوم وہ ہے جو عملی طور پر لوگوں کے اندر قائم ہے یعنی مادی خوشی یا مادی فائدے کو سب کچھ سمجھنا۔ مادی ترقی کو زندگی کا مقصد قرار دینا۔ اس دوسرے مفہوم میں مٹیر یلزم ہر دور میں تھی اور آج بھی وہ پوری طرح زندہ ہے۔ بیشتر لوگ اس کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اس دوسرے مفہوم میں مٹیر یلزم کبھی مرنے والا نہیں۔ وقتی لذت یا وقتی خوشی کا فریب اتنا زیادہ پرکشش ہے کہ آدمی کبھی اس کے سحر سے نجات نہیں پائے گا۔ اس لئے وہ کبھی اس مفہوم میں مٹیر یلزم کو نہیں چھوڑے گا۔

جہاں تک مادی تہذیب کا تعلق ہے، وہ میرے نزدیک مستقل بالذات کوئی چیز نہیں۔ انسانوں کی مادیت پسندی اجتماعی صورت اختیار کر کے تہذیب بن جاتی ہے۔ میرے نزدیک تاریخ کی ہر تہذیب بنیادی طور پر مادی تہذیب ہی تھی اس لئے اگر ایک مادی تہذیب مٹے تو عملاً

صرف یہ ہوگا کہ اس کی جگہ دوسری مادی تہذیب غالب آجائے گی۔ اس دنیا میں فرد کی حیثیت سے غیر مادی انسان کا وجود تو ممکن ہے مگر اجتماعی معنوں میں کسی ایسی انسانی تہذیب کا قائم ہونا شاید ممکن نہیں جو مجموعی معنوں میں غیر مادی اصولوں پر قائم ہو۔

سوال

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارے میں سنجیدہ لوگ عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی سوچ کے اعتبار سے جذباتی ہو گئے ہیں۔ ان کے اندر حقیقت پسندانہ مزاج موجود نہیں۔ جب کہ کسی بھی ترقی کے لئے غیر جذباتی سوچ اور حقیقت پسندانہ مزاج لازمی طور پر ضروری ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا یہ مزاج کیسے بنا اور اس کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔
(ڈاکٹر کے۔ عبد الستار، مدراس)

جواب

میرے نزدیک اس غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا آغاز زیادہ نمایاں طور پر انیسویں صدی میں ہوا۔ اس زمانہ میں مغربی قومیں مسلم علاقوں میں داخل ہو گئیں، انھوں نے تقریباً ہر جگہ براہ راست یا بالواسطہ انداز میں سیاسی اور تہذیبی طور پر غلبہ حاصل کر لیا۔

یہ وقت معاملہ کی تشخیص کا تھا۔ بدقسمتی سے اس وقت کے مسلم رہنماؤں نے معاملہ کی غلط تشخیص کر کے مسلمانوں کی سوچ کو غلط رخ پر ڈال دیا۔ ان حضرات نے مسلمانوں کو بتایا کہ اس واقعہ کے پیچھے تمام تر مغربی قوموں کی سازش اور ان کی دشمنی ہے۔ جب کہ صحیح بات یہ تھی کہ مسلمان اب اپنے دور زوال میں پہنچ چکے تھے اور دوسری طرف مغربی قومیں تازہ دم قوتوں سے مسلح ہو کر آرہی تھیں۔ اس کے بعد جو کچھ قانون فطرت کے تحت ہوا وہ عین وہی تھا جو مقابلہ کی اس دنیا میں ہمیشہ پیش آتا ہے۔

اس وقت مسلم رہنماؤں کو چاہئے تھا کہ وہ مسلمانوں سے یہ کہیں کہ جو کچھ ہوا ہے وہ قانون فطرت کے تحت ہوا ہے اور وہ خود تمہاری اپنی کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ ایسا کہتے تو مسلمانوں

میں تعمیر خویش کا جذبہ جاگ اٹھتا مگر جب انہوں نے اس معاملہ کو اغیار کی سازش اور دشمنی کا نتیجہ قرار دیا تو مسلمانوں میں غیر قوم کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پورا مسلم معاشرہ منفی سوچ کا شکار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو آپ نے جذباتی سوچ کا نام دیا ہے۔

اس طرح تقریباً دو سو سال پہلے مسلمانوں کے اندر جذباتی طرز فکر شروع ہوا۔ وہ بڑھتے بڑھتے پوری مسلم ملت پر چھا گیا۔ اب ضرورت ہے کہ اس جذباتی طرز فکر کو توڑا جائے اور لوگوں میں حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کیا جائے۔ مگر یہ کام ایک بھاری قربانی چاہتا ہے۔ اور وہ قربانی شخصی مقبولیت کی قربانی ہے۔ جو آدمی اس مزاج کو ختم کرنے کے لئے اٹھے گا یقینی طور پر وہ مسلمانوں میں غیر مقبول ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کے فہیم حضرات مصلحت کا انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے مزاج کو توڑنے کی بجائے اس کو وہ غذا دے رہے ہیں جو اس کو پسند ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر غیر مقبول ہونے سے بچائیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کو ایک ڈیگال کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ شخص جو اپنی مقبولیت کی موت کے اوپر مسلمانوں کی زندگی کی بنیاد رکھ سکے۔ جو مسلمانوں کی جذباتیت کو ختم کر کے ان کو حقیقت پسند بنائے، جو آدمی جذباتی تسلسل کو توڑنے کی کوشش کرے گا، ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کی پہلی نسل میں غیر مقبول ہو جائے مگر یہی وہ حوصلہ مند شخص ہے جو اپنی ذاتی قربانی کی بنیاد پر ملت کے مستقبل کی تعمیر کرے گا۔ تاریخ کو ایسے ہی ایک بہادر انسان کا انتظار ہے۔

سوال

الرسالہ جنوری ۲۰۰۰ میں ایک مضمون "مستقبل کی قیادت" کے عنوان سے ہے۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ: "ملک کے upper cast (ہندو) کے پاس جو آئیڈیالوجی ہے اس میں اونچی ذات والوں کے لئے تو باعزت جگہ ہے، مگر نیچی ذات اور غریب عوام کے لئے اس میں کوئی باعزت جگہ نہیں۔" مگر مسلمانوں میں بھی اسی طرح کی تفریق و کمزوری ہے، وہ کس آئیڈیالوجی یا سسٹم کے تحت ہے اس گمبھیر معاملہ کی وضاحت فرمائیں۔ (انوار الحق، شیخ پورہ)

جواب

برادران وطن کے اندر راونچی ذات اور نیچی ذات کی جو تقسیم ہے وہ ان کے مذہبی عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہے، اس کو ورن آشرم کہا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف خود ہندوؤں کے بڑے بڑے اہل علم نے کیا ہے، مثال کے طور پر داداصاحب کالیلکر۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں آج جو تفریق نظر آتی ہے وہ ایک عملی تفریق ہے۔ وہ مسلمانوں کے اپنے قومی تنزل کے سبب سے وجود میں آئی ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے نہ کہ اسلام پر۔ مسلمانوں کی موجودہ تفریق کو مسلمانوں کی اصلاح کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے مگر برادران وطن کے درمیان جو تفریق ہے وہ اس وقت ختم ہو گی جب کہ خود ان کے مذہب میں ریفارم لایا جائے۔

سوال

میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر میرے اندر یہ جذبہ پیدا ہوا ہے کہ میں دعوت کا کام کروں۔ میری آرزو ہے کہ اپنی ڈگری لینے کے بعد میں کسی ایسے جامعہ میں داخل ہو جاؤں جو اس دور کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو۔ اور لوگوں کو تذکیر و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے کے قابل بناتا ہو۔ (محمد سعید۔ پاکستان)

جواب

دعوت کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے کا جذبہ بے حد قیمتی ہے۔ مگر پاکستان یا کسی بھی دوسرے ملک میں تعلیم و تربیت کا کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جو ایک آدمی کو داعی کامل بنائے۔ داعی خود اپنی کوششوں سے بنتا ہے نہ کہ کسی ادارہ کی تعلیم و تربیت سے۔

پاکستان میں دعوتی کام کے عظیم مواقع موجود تھے مگر وہاں کے اسلام پسند رہنماؤں کی ایک غلط فکر نے سارے امکان کو تباہ کر دیا۔ وہ فکر یہ کہ اسلامی دعوت کا کام اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ اس غلط سوچ نے پاکستان کی اسلامی تحریک کو عملاً سیاسی تخریب کے راستہ پر ڈال دیا۔ بہترین مواقع کے ہوتے ہوئے وہ کوئی مثبت دعوتی کام نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام اسلامائزیشن آف مین تھا مگر ان لوگوں نے اسلامائزیشن آف اسٹیٹ کو اپنا نشانہ بنایا۔ یہ نہ صرف ایک غیر اسلامی نشانہ تھا بلکہ وہ اللہ کی ناقدری بھی تھی۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور میڈیا اور کمیونی کیشن اور انٹرنٹ نے دعوت کے مواقع کو ہزاروں گنا زیادہ وسیع پیمانہ پر ہمارے لئے کھول دیا ہے۔ ایسے دور میں اسلام کے نام پر تخریبی سیاست چلانا صرف ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں یہ کہوں گا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کی ناقدری ہے۔ اللہ نے کمیونی کیشن کے عالمی ذرائع کھول کر ہم کو یہ موقع دیا ہے کہ ہم نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اسلام کے پیغام کو ساری دنیا تک پہنچا سکیں۔ پیغام رسانی کے اس کام میں آج کسی بھی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ ایسی حالت میں اسلام کے نام پر تخریبی سیاست چلانا گویا اسلام کو ذبح کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی سیاست ایک ایسا جرم ہے جو اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی نہیں کیا گیا۔ یہ مواقع کو تباہ کرنا اور تخریبی نشانوں پر قوم کو دوڑانا ہے جس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہو سکتا۔

آپ جیسے نوجوانوں کو میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنے حالات کے اعتبار سے دعوت کا کام شروع کر دیں۔ آپ کا دعوتی کام ہی آپ کے لئے وہ تربیت گاہ بن جائے گا جہاں آپ کو فطری عمل کے دوران دعوتی تربیت ملتی رہے۔ دعوت ہمیشہ حقیقی تجربہ کے دوران سیکھی جاتی ہے نہ کہ کسی رسمی کورس کے ذریعہ۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا اللہ و یعلمکم اللہ (البقرہ ۲۸۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کا اصل سرچشمہ تقویٰ ہے۔ آدمی کا اخلاص اور اس کا خوف خدا، دیانتداری اور شفقت علی الخلق اور مسئولیت کا احساس، یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی آدمی کے لئے علم و آگہی کی سب سے بڑی ضمانت ہیں۔

تقویٰ کا تعلق علم سے یہ ہے کہ تقویٰ آدمی کے ذہن کو بیدار کرتا ہے۔ وہ انسان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ انسان کو زیادہ گہرے غور و فکر کے قابل بنا دیتا ہے۔

۱ مدرسہ صدیقیہ (ضلع چمپارن) کی دعوت پر بہار کا سفر ہوا۔ یہ سفر ۲۵ مئی سے ۲۷ مئی ۲۰۰۰ تک جاری رہا۔ اس دوران بہار کے مختلف مقامات پر دعوتی پروگرام ہوئے۔ اس سفر کی روداد سفرنامہ کے تحت انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔ اس سفر کا ایک تجربہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں اب ہر جگہ ایک نئی اور تعمیری سوچ ابھر رہی ہے۔ یہ تعمیری سوچ زیادہ تر الرسالہ مشن کا نتیجہ ہے۔ الرسالہ کی براہ راست کوشش کے علاوہ جن لوگوں نے الرسالہ کی مخالفت کی ان کا بھی اس میں بالواسطہ انداز میں حصہ ہے۔ انھوں نے مخالفت کر کے لوگوں کو بتایا کہ حالات سے مقابلہ کرنے کا ایک اور طریقہ ہے جس کو الرسالہ پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ جب پچھلے طریقے فیل ہو گئے تو اب لوگ الرسالہ کے طریقہ کو استعمال کر رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں۔

۲ آواز جرس (آکولہ) کے نمائندہ جناب سید اسحاق راہی نے ۲۹ مئی ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دینی تعلیم کے ساتھ سیکولر ایجوکیشن بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر ملت کی مجموعی ترقی نہیں ہو سکتی۔ دینی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو صحیح شعور اور صحیح نظریۂ حیات دیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں سیکولر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے زمانہ سے واقف ہو۔ وہ اس قابل ہو سکے کہ عصری تقاضوں کے مطابق زندگی کی تعمیر کر سکے۔ اسی کے ساتھ خود اسلام کی خدمت اور اشاعت کے لئے عصری علوم سے واقفیت ضروری ہے۔

۳ ایس آئی او کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ان کے ایک آل انڈیا پروگرام (نئی دہلی) میں ۶ جون ۲۰۰۰ کو شرکت کی۔ اور وہاں طلبہ کے اجتماع میں مفصل خطاب کیا، خطاب کا عنوان تھا: ہندستان میں مسلمانوں کی حکمت عملی کیا ہو۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ قرآن کے مطابق اس

دنیامیں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر موجود رہتا ہے۔ یعنی پرابلم کے ساتھ سلوشن۔ اگر کبھی مسئلہ حل نہ ہو رہا ہو تو سمجھنا چاہئے کہ ہم جو فارمولا استعمال کر رہے ہیں وہ صورت حال کے مطابق نہیں۔ ایسی حالت میں نئے فارمولے کا استعمال کرنا چاہئے۔ یہی سنت رسول ہے۔ جہاں جنگ کا فارمولا کارآمد نہ ہو رہا ہو وہاں امن کا فارمولا استعمال کرنا چاہئے۔ جہاں براہ راست مقابلہ موثر نہ ہو رہا ہو وہاں بالواسطہ مقابلہ کرنا چاہئے، وغیرہ۔

۴ اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات خدا کے فضل سے ساری دنیا میں پہنچ رہی ہیں۔ اب یہ مطبوعات براہ راست مارکیٹ میں آگئی ہیں۔ آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک اکثر ملکوں کے بک سیلر انگریزی مطبوعات منگوا رہے ہیں اور اپنے نظام کے تحت ان کو پھیلا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ویب سائٹ اور انٹرنٹ کی ذریعہ مستقل طور پر اسلامی مرکز کا دعوتی پیغام عالمی سطح پر پہنچ رہا ہے۔ فالحمد لله علی ذالك۔ اطلاعات کے مطابق، لوگ ان کتابوں اور مضامین کو وقت کے اعلیٰ معیار کے مطابق پارہے ہیں اور بڑی تعداد میں اس سے فائدہ اٹھارہے ہیں۔

۵ انٹرنٹ کے ذریعہ مسلسل طور پر دنیا بھر میں لوگوں سے دعوتی روابط جاری ہیں۔ لوگ اپنے سوالات اور تاثرات بھیجتے ہیں جن کا جواب دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انٹرنٹ کے ذریعہ ملے ہوئے ایک خط کا کچھ حصہ یہ ہے:

Salaam.

I have recieved an article from your organization and I thought it was most informative...it was sent by a friend.... please can you forward me more...

jazakallah

Faheema Khan, South Africa.

۶ ایک نئی انگریزی کتاب *Islam Re-discovered* کے نام سے تیار ہو چکی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع کی جائے گی۔ یہ کتاب فی الحال انگریزی زبان میں ہے۔ اس میں اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات کو عصری اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

۷   روزنامہ قومی آواز (نئی دہلی) کے شمارہ ۱۴ جون ۲۰۰۰ میں اس کے "مراسلات" کے کالم میں ایک مراسلہ چھپا ہے جس کا عنوان ہے "تاریخ ساز ہستی"۔ یہ مراسلہ قومی آواز کے کالم سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت ان کے علمی و دینی کاموں کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ آج کے اس پر فتن دور میں جب کہ قبروں کی تجارت سے لے کر مساجد و مدارس کی تجارت اور نوع بنوع تنظیموں کی بھر مار بامِ عروج پر ہے جس سے مسلمانوں پر ایسے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ وہ قوتِ فکر سے عاری اور حق و باطل کی تمیز سے کوسوں دور ہیں۔ اخلاقیات کا جنازہ نکل چکا ہے۔ اسلام کی آفاقیت رہبانیت کی شکل اختیار کر گئی ہے اور بد قسمتی سے ایک محدود ذہنیت کے لوگ اسلام کی تصویر مسخ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایسے میں مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت نے مسلمانوں کو نئی زندگی اور صحیح انداز فکر کی دعوت دی ہے۔ وہ ایسے واحد مسلم مفکر ہیں جو بے لوث و بے غرض اور منفعت خوری سے ہٹ کر مسلمانوں کے تئیں مخلصانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں مسلمانوں کو بے جا جذباتیت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں کیوں کہ بے جا جذباتیت سے ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ ان کے گرانقدر مشوروں اور نصیحتوں کو سمجھتا ہے اور انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ بھی ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان کی پوری زندگی قرآنی علوم و احادیث نبویہ و تواریخ قدیم و جدید کے گہرے مطالعہ سے وابستہ ہے۔ اس لئے ان کا ایک ایک لفظ جادو سے زیادہ موثر اور سونے سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ ماہنامہ "الرسالہ" ایک زندہ و تابندہ شہادت ہے۔ یوں تو ہر دور میں منافقت و تشدد کا دور دورہ رہا ہے لیکن عصر حاضر میں یہ وبا کچھ اور عام سی ہو گئی ہے۔ وقت کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ جب جب لوگوں نے اپنے اپنے دور میں صدائے حق اور علم اور عرفان بلند کی ہے۔ ایک علم و آگہی سے کورا اور غبی طبقہ ان کا مخالف ہو گیا ہے کیوں کہ یہ طبقہ ان بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے جنہیں قدرت نے اشرف المخلوقات

جیسی عقل و خرد سے ہمکنار نہیں کیا۔

تاریخ کے صفحات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی مذہب میں چاہے وہ عیسائی دھرم ہو یا اسلام جیسا صاف ستھرا آفاقی مذہب ہو جب بھی اس کی صفوں میں جوگیوں راہبوں کی کثرت ہونے لگی ہے، قدرت نے ان کے اندر ایک مصلح بھیجا ہے جس نے انشراح صدر کے ساتھ تمام مظالم کا سامنا کیا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آیا ہے کہ اس کی بے پناہ زمینی حقیقت کے سامنے بڑے بڑے پادریوں جوگیوں اور رہبانیت کی تعلیم دینے والے اماموں کی ہوا اکھڑ گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سب کچھ ایک طویل مدت میں سرانجام پاتا ہے اگر ایک طرف اسلام کا آغاز قرآنی آیات کی قرأت ہے تو دوسری طرف کفار اور حاسدین کی پوری کوشش ہے کہ قرآن کی آواز کسی دوسرے کان تک نہ پہنچ سکے اور یہی واقعہ عصر اسلام سے عصر جدید تک دہرایا جارہا ہے۔

مولانا کا "علم جدید کا چیلنج" ان کے معترضین کے لئے ایک بڑا چیلنج ہے جس نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ مولانا کے مداحوں اور ان کے موقف کی تائید کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے وہیں ان کی معترضین بغلیں جھانک رہے ہیں کیوں کہ انہیں تعلیم یافتہ طبقہ کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہ سب ایک مخصوص گراؤنڈ کے لوگ ہیں جنہیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ مسلمانوں کی کیا حالت ہے اور ان کے بنیادی مسائل کیا ہیں؟ موجودہ مشکلات کے اسباب کیا ہیں اور ان سے کیوں کر نمٹا جا سکتا ہے۔ ہم جے این یو (J.N.U.) کے طلباء مولانا کا بہت احترام کرتے ہیں کیوں کہ ان کی ہستی پوری امت اسلامیہ کے لیے مایۂ افتخار ہے"۔ (عمیر احمد ندوی، ایم اے عربک، جواہر لال نہرو یونیورسٹی)

۸ انگریزی میں ایک کتاب اسلام ری ڈسکورڈ (Islam Rediscovered) کے نام سے تیار ہوئی ہے اور اس وقت زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ اسلام کے مختلف فکری اور عملی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ پوری کتاب جدید سائنسی اسلوب میں ہے۔

دینی مدارس

اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب

از : مولانا وحید الدین خاں

دینی مدارس کے عنوان پر ایک مفصل مقالہ تیار ہوا ہے جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ انشاء اللہ الرسالہ ماہ ستمبر ۲۰۰۰ میں اس کے خصوصی شمارہ کے طور پر شائع ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ مقالہ دینی مدارس کے نام سے علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع ہو رہا ہے جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۲۵ روپیہ ہے۔ زیادہ تعداد میں خریدنے کی صورت میں خصوصی رعایت دی جائے گی۔

اس کتاب میں تاریخی حقائق کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ علم کی اہمیت کیا ہے۔ اسلام میں علم کو کتنا بڑا مقام دیا گیا ہے۔ "مدرسہ" کی تحریک نے کس طرح عظیم کارنامے انجام دئے ہیں۔ دینی مدرسے اس ملک کے لئے خطرہ نہیں۔ وہ ملک کے لئے ایک اثاثہ اور نعمت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مدرسے نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے ایک نعمت ہیں۔

تفصیلات کے لئے دفتر سے خط و کتابت کریں۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خصوصی شمارہ: دینی مدارس

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان
زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

Composed by Imran Ahmad (Islahi)

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

الرسالہ، ستمبر ۲۰۰۰

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

آغاز کلام

پہلی بار جب میں ایک بڑے مدرسہ میں گیا تو اس کو دیکھ کر اچانک میری زبان سے نکلا — مدینۃ العلم (علم کا شہر)۔ ہر مدرسہ گویا علم کا ایک شہر ہے، اس واحد فرق کے ساتھ کہ ان میں سے کوئی بڑا شہر ہے اور کوئی چھوٹا شہر۔

دور اول میں جب مسلمان مختلف ملکوں میں پھیلے تو ہر جگہ انہوں نے اس قسم کے علمی شہر قائم کیے۔ یہ تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ تھا۔ قدیم زمانہ میں عمارت کے نام سے یا تو بڑے بڑے بت کدے (Temples) بنائے جاتے تھے یا محل اور قلعے اور مقبرے۔ جدید معنوں میں تعلیم گاہیں بنانے کا کوئی رواج ہی قدیم زمانہ میں نہ تھا۔ ایک مغربی محقق نے بجا طور پر لکھا ہے کہ صد فی صد تعلیم (hundred percent literacy) کا تصور پہلی بار مسلمانوں نے تاریخ میں پیدا کیا۔

مسلمانوں کے اندر یہ علمی مزاج کہاں سے آیا۔ یہ براہ راست قرآن کا نتیجہ تھا۔ قرآن کو کھلے ذہن کے ساتھ پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں سب سے زیادہ زور علم اور تعلیم و تعلم پر دیا گیا ہے۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے علم کو محدود دائرہ سے نکالا اور تاریخ انسانی کو عمومی تعلیم (mass education) کے تصور سے آشنا کیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ پر پہلی وحی ۶۱۰ء میں اتری جب کہ آپ غار حرا میں تھے۔ وحی کا پہلا لفظ یہ تھا: اقرأ (پڑھ)۔ روایات میں آتا ہے کہ خدا کے فرشتہ جبریل نے آپ کے پاس آکر کہا کہ اقرأ (پڑھ) آپ نے فرمایا کہ: ما انا بقارئ (صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی) یعنی مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ جبریل نے دوبارہ کہا کہ اقرأ۔ آپ نے فرمایا کہ ما انا بقارئ۔ جبریل نے تیسری بار کہا کہ اقرأ۔ اس کے بعد آپ نے سورۃ العلق کے وہ کلمات اپنی زبان سے دہرائے جو جبریل پہلی وحی کے طور پر آپ کے پاس لائے تھے۔

ابتدائی وحی کے اس واقعہ پر غور کیجئے۔ پیغمبر اسلام ثابت شدہ طور پر ایک امی تھے۔ اس کے باوجود کیوں خدا کا فرشتہ بار بار کہہ رہا ہے کہ اقرأ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پڑھنا نہیں آتا تب بھی پڑھو۔

ں جانتے تب بھی لکھو۔ اس اعتبار سے اسلامی کلچر گویا اقرأ کلچر کا دوسرا نام ہے۔

یہ ایک انتہائی انقلابی تعلیم تھی جو پیغمبر اسلام ﷺ کو اور بالواسطہ طور پر آپ کے پیروؤں کو آغاز ، میں اللہ کی طرف سے ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم آپ کے پیروؤں کی سرگرمی کا ایک مستقل حصہ . پڑھنے اور لکھنے کا رواج اتنا بڑھا کہ وہ وقت آیا جب کہ مسلمان تمام قوموں کے معلم بن گئے۔ اہل ب عرب سے نکلے اور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے تو ہر جگہ انہوں نے پڑھنے اور پڑھانے کو ہی مشن بنالیا۔ یہ لہر مکہ سے اٹھی۔ پھر وہ مدینہ پہنچی۔ اس کے بعد وہ دمشق پہنچی۔ اس کے بعد ر قاہرہ اس کا مرکز بنا۔ اس کے بعد وہ قرطبہ اور غرناطہ میں داخل ہو۔ وہاں سے مزید پھیل کر وہ عالم میں پہنچ گئی۔ اس زمانہ میں مسلم دنیا کے تمام شہر تعلیم و تعلم کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

اہل اسلام کے اسی مزاج کا نتیجہ تھا کہ جب ان کے قافلے برصغیر ہند میں داخل ہوئے تو یہاں ں نے کثرت سے شخصی اور اجتماعی طور پر مدرسے اور تعلیم گاہیں قائم کیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ برصغیر لم کی عمومی اشاعت بھی پہلی بار مسلمانوں کے ذریعہ ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اعتراف کیا ب مسلمان انڈیا میں ایک شاندار کلچر (brilliant culture) لے کر آئے۔ (ڈسکوری آف انڈیا)

انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں جب برصغیر ہند میں انگریزوں کا غلبہ بڑھا تو اس کے سلم تعلیم گاہوں کا زوال شروع ہوگیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف ابتدائی سیاسی ، زیادہ تر علماء اسلام کی قیادت میں ہوئی تھی۔ اس سے انگریزوں نے یہ تصور قائم کیا کہ اسلامی ، انگریز مخالف تحریک کے فکری مرکز ہیں۔ چنانچہ وہ مدارس کے دشمن ہوگئے۔ انہوں نے رح سے مدارس پر روک لگانے کی کوشش کی۔ مثلاً انہوں نے مدارس کی جاگیریں اور اوقاف کے ان کے ذرائع کو مسدود کردیا۔ بہت سے علماء کو گرفتار کرلیا، وغیرہ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ، اد میں اس ملک کے مدارس بند ہوگئے۔

ہندستان میں انگریزوں کے سیاسی قبضہ کے بعد ایک عرصہ تک مسلم رہنما یہ سوچتے رہے کہ پہلے ں کو ملک سے نکالو۔ اس کے بعد ہی اس ملک میں دوبارہ کسی دینی کام کے مواقع نکلیں گے۔ ا مسلح اقدام اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا جو اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اس تجربہ کے بعد علماء نے محسوس

کیا کہ انگریزوں سے مسلح ٹکراؤ عملی طور پر غیر مفید ہے۔اب واحد قابل عمل صورت یہ ہے کہ جنگ اور ٹکراؤ کو چھوڑ کر پر امن عمل کے میدان میں کوئی تعمیری کام شروع کیا جائے۔اسلام کی روشنی میں انھیں نظر آیا کہ یہ کام صرف علم اور تعلیم کا کام ہے۔چنانچہ علماء نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزوں سے ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر وہ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے میں اپنی ساری طاقت صرف کریں۔

اس نئے ذہن کے تحت انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پورے بر صغیر ہند میں مدارس کی تحریک پھیل گئی۔داخلی اور خارجی حالات اس کے موافق ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ تحریک مدارس بڑھتے بڑھتے اب تحریک انقلاب کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

میں اپنی ابتدائی عمر ہی سے علماء اور تحریک مدارس سے بہت قریب رہا ہوں۔میرے والد کا انتقال ۱۹۲۹ میں بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔اس لئے میرے عم زاد بھائی مولانا اقبال احمد خاں سہیل ایڈوکیٹ،ایم،اے،ایل ایل بی ہی گویا میرے خاندانی سر پرست تھے۔وہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔وہ علماء کے بہت عقیدت مند تھے۔انھوں نے مشہور عالم اور بزرگ مولانا حسین احمد مدنی کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

وارث انبیاء حسین احمد   کہ بدیں مستقار موتمن است

تقسیم ہند سے پہلے کے دور میں دو قومی نظریہ کا ہنگامہ اٹھا۔مولانا حسین احمد مدنی نے اس کا جواب دیتے ہوئے ۱۹۳۷ میں کہا کہ "فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔اس کے رد میں علامہ اقبال نے اپنا مشہور فارسی قطعہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ تھا:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ   ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

اس وقت اقبال احمد سہیل ایڈوکیٹ نے فارسی نظم کی صورت میں اس کا مدلل جواب دیا جس کے دو شعر یہ ہیں:

بہ دیو بند گرا، گر نجات می طلبی   کہ دیو نفس سلح شور و دانش تو صبی است

بگیر راہ حسین احمد ار خدا خواہی   کہ وارث است نبی را و ہم ز آل نبی است

برادر بزرگ مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم سے مجھے زندگی کی پہلی سوچ ملی۔چنانچہ نوجوانی کی عمر ہی میں علماء اور تحریک مدارس سے میرا رشتہ جڑ چکا تھا جو پھر کبھی ختم نہ ہوا۔

مدرسہ کی دنیا سے مسلسل میرا ربط رہا ہے۔ میری تعلیم مدرسہ ہی میں ہوئی۔ مدارس سے وابستہ افراد سے مسلسل میری ملاقاتیں رہی ہیں۔ میں بار بار مدارس کے اجتماعات اور پروگراموں میں شریک ہوتا رہا ہوں وغیرہ۔ مگر باضابطہ طور پر میں نے ابھی تک مدارس کے بارہ میں نہیں لکھا تھا۔ اس موضوع پر میری متفرق تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں مگر ابھی تک اس موضوع پر میں نے مستقل کتاب تیار نہیں کی تھی۔

مختلف مدارس سے تعلق رکھنے والے علماء اکثر مجھ سے یہ کہتے تھے کہ آپ مدارس کے بارے میں ایک کتاب یا مفصل مقالہ لکھیں۔ مگر اب تک میں یہ کام نہیں کر سکا تھا۔ آخر کار مئی ۲۰۰۰ میں ایسے اسباب پیدا ہوئے جس کے نتیجہ میں وہ کتاب تیار ہوئی جو اس وقت ناظرین کے سامنے ہے۔

تنظیم ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مجھے ایک دعوت نامہ مؤرخہ ۹ مئی ۲۰۰۰ موصول ہوا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ نئی دہلی میں ۲۰۔۲۲ مئی ۲۰۰۰ کو "الامام محمد قاسم النانوتوی سیمنار" کے عنوان پر ایک بین اقوامی اجتماع ہو رہا ہے۔ تنظیم کے ذمہ داروں کی طرف سے مجھے یہ دعوت دی گئی تھی کہ میں اس کے افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کروں اور ہندستان میں مدارس دینیہ کی تحریک کے موضوع پر وہاں خطاب کروں۔ اس کے بعد دہلی کے کئی فضلاء مدارس مجھ سے ملے۔ مثلاً مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا محمد مزمل الحق الحسینی، مولانا بدر الزماں قاسمی، مولانا وارث مظہری قاسمی، وغیرہ۔ ان صاحبان نے اس کام کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ ان کی تحریک پر میں نے آخری فیصلہ کر لیا اور اس موضوع پر مطالعہ و تحریر کا کام شروع کر دیا۔

مذکورہ سیمنار میں پیش کرنے کے لئے جو تقریر میں نے تیار کی تھی وہ ابتداءً صرف ۱۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد موضوع کی مزید تحقیق کے دوران اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۸۰ صفحات کی یہ کتاب تیار ہو گئی۔ یہ کتاب ابتداءً اردو میں شائع کی جا رہی ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ دوسری زبانوں میں بھی اس کی اشاعت کی جائے گی، وباللہ التوفیق۔

وحید الدین

نئی دہلی، ۱۹ جولائی ۲۰۰۰

تاریخِ تعلیم

موجودہ زمانہ میں تعلیم (education) کی تاریخ پر کافی تحقیق کی گئی ہے اور اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی تاریخ میں اسلام کا ایک بہت بڑا حصہ (contribution) ہے۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار علم اور تعلیم کو محدود دائرہ سے نکال کر وسیع دائرہ تک پہنچایا۔ ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اسلام کا ظہور ہوا۔ اسلام سے پہلے علم صرف خواص کے دائرہ کی چیز بنا ہوا تھا۔ اسلام کے تحت آنے والے انقلاب کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ علم کو خواص کے دائرہ سے نکال کر عوام کے دائرہ میں لایا گیا۔ توسیع تعلیم کی یہی انقلابی تحریک ہے جس کو تعلیم کی تاریخ میں "مدرسہ" کہا جاتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں تاریخ تعلیم (History of Education) پر ۹۲ صفحہ کا ایک مفصل مقالہ شامل ہے۔ اس کو متعدد ماہرین تعلیم نے تیار کیا ہے۔ اس مقالہ میں تعلیم کی تاریخ کو چند ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، پہلا دور وہ ہے جس کو ابتدائی کلچر (primitive culture) کہا گیا ہے۔ اس ابتدائی دور میں تعلیم کا مقصد بنیادی طور پر یہ تھا کہ قبائلی روایات اور قبائلی اخلاقیات سے نئی نسل کو باخبر کیا جائے اور اس کے لئے اس کو تیار کیا جائے۔ اس زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج بے حد کم تھا۔ چنانچہ یہ قبائلی تعلیم بھی زیادہ تر زبانی طور پر دی جاتی تھی اور ان کو محفوظ رکھنے کے لئے نوجوانوں کو یاد کرلیا جاتا تھا۔

مزید یہ کہ اس تعلیم کا تعلق پورے قبیلہ سے نہ تھا بلکہ صرف اعلیٰ طبقہ سے تھا۔ اس اعلیٰ طبقہ میں بنیادی طور پر صرف دو قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ ایک، قبیلہ کے سردار اور امراء اور اعلیٰ طبقہ (upper class) کے نوجوان اور دوسرے، مذہبی پیشواؤں کا طبقہ (priestly class) جو لوگوں کو مذہبی رسوم و آداب کی ادائیگی میں مدد دیتا تھا۔ عام افراد اس تعلیمی نظام سے خارج سمجھے جاتے تھے۔(EB 6/317-18)

اس کے مطابق، دوسرا دور وہ ہے جس کو کلاسیکل کلچر کا نام دیا گیا ہے، یعنی قدیم چرچی دور۔ اس

زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج کافی بڑھ چکا تھا۔ مگر جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اب بھی تعلیم کا انداز (pattern) بنیادی طور پر وہی باقی رہا جو ابتدائی دور میں تھا۔ اب غیر رسمی تعلیم کے علاوہ رسمی تعلیم کا رواج بھی شروع ہو گیا۔ مگر یہ تعلیم بنیادی طور پر اعلیٰ طبقہ اور اونچی ذات (higher castes) تک محدود رہی۔ اونچی ذات یا اونچے طبقہ میں دو قسم کے لوگ شریک سمجھے جاتے تھے۔ ایک، سردار اور امراء جو قبیلوں یا قوموں کے سیاسی لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے، جو انتظام سلطنت کے ذمہ دار تھے۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو مذہبی مراسم کی ادائیگی میں پیشوا (priests) کا کام کرتا تھا۔ وہ عبادت گاہوں کا نظام چلاتا تھا اور دوسرے خاندانی یا سماجی رسوم مثلاً نکاح یا دوسری تقریبات کو مذہبی اصولوں کے مطابق ادا کرتا تھا۔ ان اعلیٰ مذہبی اور سیاسی طبقوں کے علاوہ قوم یا قبیلہ کے دوسرے افراد کے لئے تعلیم کو ضروری نہ سمجھا جاتا تھا۔

بعض قوموں میں عام لوگوں کی تعلیم کا رواج بھی ملتا ہے مگر یہ تعلیم حقیقۃً حصول علم کے معنی میں نہ تھی۔ وہ زیادہ تر سماج کی عملی ضرورت کے معنی میں تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ سماج کی روایات کو جانیں تاکہ وہ قائم شدہ سماج کے وفادار بن سکیں اور سماج انتشار سے بچا رہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام یہ جانیں کہ اعلیٰ طبقہ کی ماتحتی میں انھیں کس طرح زندگی گزارنا چاہئے۔ (6/319-320)

اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس کو حقیقی معنوں میں تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور کا آغاز بنیادی طور پر اسلامی انقلاب کے بعد ظہور میں آیا۔ اس نئے دور کے آغاز کے لئے جو لازمی صورت حال درکار تھی وہ یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان تفریق کا خاتمہ ہو۔ اور اس تفریق کا خاتمہ صرف اسلام کے بعد ممکن ہوا۔ اسلام سے پہلے کا جو زمانہ ہے، اس وقت یہ حال تھا کہ انسانیت دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی ــــ اعلیٰ طبقہ (upper class) اور نچلا طبقہ (lower class) یا برتر نسل (superior race) اور کمتر نسل (inferior race)۔ مثال کے طور پر چین میں بادشاہ کو آسمانی اولاد (Son of Heaven) کہا جاتا تھا۔ ہندستان میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ کچھ لوگ اعلیٰ ذات (upper class) کی حیثیت رکھتے ہیں جو برہما کے سر سے پیدا ہوئے اور بقیہ لوگ درجہ بدرجہ اس کے نچلے دھڑ سے۔ تقریباً یہی حال دوسری قوموں اور ملکوں کا تھا۔ انسانیت کے درمیان اس تفریق و تقسیم کو پہلی بار اسلام نے ختم کیا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو عام طور پر مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ اسلام

ؐ نے جب انسانیت کے درمیان تفریق و تقسیم کو توڑا، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ تعلیم خواص کے دائرہ سے نکل کر عوام کے دائرہ تک پہنچ جائے۔ وہ تمام انسانوں کے لئے قابل حصول چیز بن جائے۔

اس عمل کا آغاز عبادتی فعل سے ہوا۔ اسلام سے پہلے عبادت کی صورت یہ تھی کہ وہ ایک ایسا عمل سمجھا جاتا تھا جو براہ راست خدا اور بندے کے درمیان پیش نہیں آتا تھا بلکہ وہ ایک درمیانی واسطہ (mediator) کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ اس تقسیم کی بنا پر مذہبی علم صرف اسی مذہبی پیشوا (priest) کے لئے ضروری تھا جو درمیانی کردار ادا کرکے عبادت کے مراسم کی تکمیل کرے۔ یہی تقسیم تھی جس کی بنا پر پڑھنا لکھنا مذہبی پیشواؤں تک محدود رہا اور عوام اس سے بے تعلق بنے رہے۔

اسلام نے پہلی بار عبادت کو انسان اور خدا کے درمیان ہونے والا براہ راست عمل قرار دیا اس طرح لکھنا پڑھنا ہر انسان کی ذاتی ضرورت بن گیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر آدمی قرآن کو پڑھنے اور اس کو یاد کرنے لگا تاکہ وہ روزانہ اپنی عبادتوں میں قرآن کو پڑھے۔ دعا اور اذکار کے دوسرے کلمات کو بھی یاد رکھنے کے لئے لکھنے اور پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی طرح اسلام نے زندگی کے دوسرے معاملات میں ایسی اصلاحات کیں جن کے بعد خود بخود انسانوں کے درمیان خواص و عوام کی تقسیم ختم ہو گئی۔

انسانوں کے درمیان بظاہر فرق دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً رنگوں کا فرق، صلاحیت کا فرق، درجہ کا فرق۔ ان فرقوں کی بنا پر تاریخ کے قدیم زمانوں میں یہ سمجھا جاتا رہا کہ کچھ لوگ اونچے ہیں اور کچھ لوگ نیچے۔ اسلام نے امتیاز پر مبنی اس تصور کا خاتمہ کیا اور کھلے طور پر یہ اعلان کیا کہ: اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے (الحجرات ۱۳)

یہی بات حدیث میں مختلف انداز میں آئی ہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام نے فرمایا: ان العباد کلھم اخوۃ (سنن ابی داؤد) یعنی بلا شبہہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: والناس بنو آدم و خلق اللہ آدم من تراب (الترمذی، کتاب التفسیر) یعنی تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: الا لا فضل لعربی علی اعجمی

ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر إلا بالتقویٰ (مسند احمد ۵؍۴۱۱) یعنی سنو، کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔

انسانی برابری کا یہ اعلان صرف اعلان نہ تھا بلکہ وہ ایک حقیقی عملی انقلاب کا مینی فیسٹو تھا۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کو اللہ کی خصوصی مدد سے یہ موقع ملا کہ وہ انسانی مساوات اور اخوت کا نہ صرف اصولی اعلان کریں بلکہ زمین کے وسیع رقبہ میں انقلاب برپا کر کے اس کو عملاً قائم کردیں۔ محققین نے عام طور پر تسلیم کیا ہے کہ انسانی مساوات کا عملی نظام تاریخ میں پہلی بار اسلام کے ذریعہ قائم ہوا۔

قدیم زمانہ میں علم اور تعلیم کا خواص کے دائرے میں محدود رہنا زیادہ تر انسانی عدم مساوات کی بنا پر تھا۔ جب نابرابری کا خاتمہ ہوا اور انسانی برابری کا دور آیا تو فطری طور پر وہ حالات پیدا ہوگئے جب کہ علم اور تعلیم کا دائرہ کسی مخصوص انسانی گروہ تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ انسان کے تمام طبقوں تک پھیل جائے۔ اور اسلامی انقلاب کے بعد عملاً یہی پیش آیا۔ اسلام سے پہلے قدیم دور میں ہر جگہ بادشاہت (Kingship) کا نظام قائم تھا۔ کچھ لوگوں کو مطلق حکمراں کا درجہ حاصل ہوتا تھا، اور بقیہ لوگوں کے لئے صرف یہ تھا کہ وہ ماتحت رعایا بن کر زندگی گزاریں۔ امتیاز پر مبنی اس سیاسی نظام نے علم اور تعلیم کو امراء اور حکام کے دائرے کی چیز بنا دیا تھا۔ عوام کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔

اسلام نے اس آمرانہ نظام کے برعکس جمہوری شورائیت (الشوریٰ ۳۸) کا تصور پیش کیا۔ اور اس کو عملاً قائم کیا۔ مؤرخین نے تسلیم کیا ہے کہ قدیم بادشاہت کے نظام کا خاتمہ اسلامی انقلاب کے ذریعہ ممکن ہوا۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مؤرخ ہنری پرین (Henri Pirenne) نے لکھا ہے کہ اسلام نے اگر بازنطینی ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کو توڑا نہ ہوتا تو دنیا سے شاید کبھی بھی سیاسی آمریت کا دور ختم نہ ہوتا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم بادشاہی نظام کا ٹوٹنا اور اس کی جگہ پر جمہوری یا عوامی دور کا دنیا میں آنا صرف اسلامی انقلاب کے بعد ممکن ہوا۔ اس انقلاب کے مختلف سماجی نتائج تاریخ میں ظاہر ہوئے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ انسانی سماج میں خواص و عوام یا برتر طبقہ اور کمتر طبقہ کی تقسیم ختم ہوگئی۔ اس کے بعد عین اس کے فطری نتیجہ کے طور پر پڑھنے لکھنے کا رواج سارے انسانوں میں پھیل گیا، جو اس

سے پہلے خواص کے دائرہ کی چیز بنا ہوا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانکا (۱۹۸۴) میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد مدرسوں یا درسگاہوں کا پھیلاؤ (expansion) بڑے پیمانہ پر ہوا۔ ابتداء میں تعلیم کے حلقے قائم ہوئے پھر ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب اس کے لازمی جزء کے طور پر بننے لگا۔ پھر مزید اضافہ ہوا اور مسجدوں میں قائم ہونے والے مکتب ناکافی نظر آئے تو کثرت سے مستقل مدرسے قائم ہونے لگے۔ عباسی دور تک پہنچ کر یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا۔ اب بہت بڑے بڑے جامعات (universities) قائم ہونے لگیں۔ مثال کے طور پر نظامیہ اور مستنصریہ وغیرہ۔ (6/332-33)

خلاصہ یہ کہ اسلام سے پہلے مختلف توہمات (superstitions) نے انسانی سماج کو اونچے اور نیچے طبقوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم صرف اونچے طبقہ کے لئے مخصوص ہو گیا اور نچلے طبقہ کے لوگ ہزاروں سال تک جہالت میں پڑے رہے۔ ساتویں صدی میں ظاہر ہونے والے اسلامی انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار ان توہمات کا خاتمہ کیا۔ اس نے انسانی زندگی کا نظام توہمات کے بجائے حقائق فطرت کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس انقلاب کے جو مثبت نتائج ظاہر ہوئے انہیں میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ علم خواص کے طبقہ سے نکل کر سارے انسانی گروہوں میں پھیل گیا۔

مدرسہ کا لفظ تعلیم کی تاریخ کا اسی طرح ایک مسلمہ حصہ بن چکا ہے جس طرح ایجوکیشن (education) کا لفظ انگلش ڈکشنری کا ایک مسلمہ حصہ ہے۔ انٹرنٹ کو آج عالمی معلومات کا خزانہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ اس سے جڑے ہوئے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر مدرسہ (madrasah) کا لفظ ٹائپ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی اسکرین پر اچانک مدرسہ کے بارے میں معلومات کا ایک دفتر سامنے آگیا ہے۔

دینی مدارس

انیسویں صدی کے وسط سے لے کر اب تک بر صغیر ہند میں جو دینی یا اسلامی سرگرمیاں جاری ہوئیں ان میں غالباً سب سے اہم سرگرمی وہ تھی جس کو دینی مدارس کی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے قائد زیادہ تر علماء تھے۔ ان کی مسلسل کوشش سے اس پورے خطۂ ارض میں مدارس کا جال (network) قائم ہو گیا۔ چھوٹے بڑے مدارس اتنی کثرت سے وجود میں آئے کہ شاید کوئی بھی علاقہ اس سے خالی نہیں رہا۔

علماء اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ ادارہ کی صورت میں با قاعدہ مدرسے قائم کیے، اسی کے ساتھ ان کی ذات بھی مسلسل طور پر لوگوں کے لئے علم اور تعلیم کا مرجع بنی رہی۔ حتیٰ کہ یہ گویا علماء کی روایت بن گئی کہ ان کا گھر لوگوں کے لئے تعلیم گاہ کا کام کرنے لگا۔ میں خود بھی مدرسہ کی با قاعدہ تعلیم کے علاوہ اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں مسلسل طور پر علماء اسلام سے وابستہ رہا ہوں۔ اور ان سے برابر علمی اور دینی استفادہ کرتا رہا ہوں۔

علم کی اہمیت

اسلام میں علم کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اللہ کی شریعت پیغمبروں کے اوپر کتاب کی صورت میں اتاری گئی اور قلم کے ذریعہ اس کو لکھا گیا (العلق ۴۔۵)۔ یہ قلم اور کتاب دونوں علم ہی کی علامت ہیں۔ وحی کو قلم اور کتاب سے وابستہ کرنا بذاتِ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ دین خداوندی کی بنیاد علم پر قائم کی گئی ہے۔

قرآن میں علم کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں۔ یہ دو قسمیں اس آیت سے معلوم ہوتی ہیں: إيتوني بكتاب من قبل هذا أو اثارة من علم إن كنتم صدقين (الاحقاف ۴) یعنی میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، علم کا پہلا ماخذ آسمانی کتاب ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں الہامی علم (revealed knowledge) کہا جا سکتا ہے۔ یہاں الہامی علم سے مراد وہ الہامی علم ہے جو تاریخی طور پر ثابت شدہ ہو۔ محض دعویٰ کی بنیاد پر کوئی علم الہامی علم نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے آج

قرآن ہی الہامی علم کے حقیقی نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری مقدس کتابیں، تاریخی طور پر ثابت شدہ نہ ہونے کی بنا پر الہامی علم کے لئے معتبر ماخذ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔

دوسرا علم وہ ہے جس کے لئے قرآن میں اثارۃ من علم کا لفظ آیا ہے۔ اَثر کے معنی ہیں نقل کرنا۔ "اثارۃ" کی تشریح "المفردات فی غریب القرآن، الامام راغب" میں ان الفاظ میں کی گئی ہے: وھو ما یروی او یکتب فیبقی له اثر (صفحہ ۹) یعنی اس سے مراد وہ علم ہے جس کی روایت کی جائے یا جس کو لکھا جائے پھر اس کا اثر باقی رہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد غالباً وہ مبنی بر فطرت علم ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مصدقہ علم (verified knowledge) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ علم جو مسلسل تحقیق اور مشاہدہ اور تجربہ سے درست ثابت ہو یہاں تک کہ اہل علم کے درمیان اس کو عمومی قبولیت (general acceptance) حاصل ہو جائے۔ ان دونوں قسم کے علوم کو دوسرے لفظوں میں الہامی علم اور سائنسی علم کہا جا سکتا ہے۔

قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ہی علم انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ (البقرہ ۲۸۲) یعنی اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو سکھائے گا۔ قرآن کی اس آیت میں علم کا تعلق تقویٰ سے بتایا گیا ہے۔ یعنی جو آدمی اپنے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کرے گا وہ علم سے بہرہ ور ہوگا۔ تقویٰ آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ اور کامیاب علمی سفر میں سنجیدگی لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: و من الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها وغرابیب سود، ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانه کذالك، انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر ۲۷-۲۸) یعنی اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

اس آیت میں پہاڑ اور جانور (دوسرے لفظوں میں جمادات اور حیوانات) فطرت کے مظاہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فطرت کے مظاہر کا مطالعہ بھی اسی طرح خشیت اور تقویٰ کا

سرچشمہ ہے جس طرح الہامی کتاب کا مطالعہ۔

علم کی دو قسموں کی اس اہمیت کا تقاضا تھا کہ مدارس کے نصاب میں دو قسم کی کتابیں رکھی جائیں۔ چنانچہ علماء نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے ایک کو منقولات کہا اور دوسری کو معقولات۔ یہ تقسیم شرعی اور عقلی دونوں اعتبار سے بالکل درست ہے۔

مدرسہ یا تعلیم گاہ کے بارے میں قرآن کا تصور کیا ہے، اس کا جواب ہم کو قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: **وما كان المؤمنون لينفروا كافة فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون** (التوبہ ۱۲۲) یعنی اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔

قرآن کی اس آیت میں تفقہ فی الدین کا لفظ تقریباً اسی معنی میں آیا ہے جس معنی میں علم دین کے حصول کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس آیت کے مطابق، علم دین کے حصول کے مقاصد بنیادی طور پر دو ہیں۔ ایک یہ کہ طالب علم خود بخوبی طور پر اسلام کی تعلیمات سے واقف ہو۔ اس کی رسائی ان معارف و حقائق تک ہو جائے جو قرآن و سنت میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا دوسرا مقصد وہ ہے جس کو انذار قوم کہا گیا ہے یعنی پر امن طور پر تمام انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچانا۔ ہر پیدا ہونے والے انسان کو اس ہدایت سے باخبر کرنا جو خالق کائنات نے اسلام کی صورت میں نازل فرمائی ہے۔

انھی دو طرفہ تقاضوں کا یہ نتیجہ ہے کہ مدارس دینیہ میں ابتدا ہی سے یہ تصور رہا ہے کہ ان مدارس کے فارغین بیک وقت دو صفات کے حامل ہوں۔ وہ عالم بھی ہوں اور اسی کے ساتھ داعی بھی۔ ایک طرف وہ علم دین میں قابل اعتماد دستگاہ حاصل کریں اور دوسری طرف وہ اپنی پڑوسی قوموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔

تحریکِ مدارس کا آغاز

۱۹ویں صدی عیسوی میں بر صغیر ہند کے مسلمان بیک وقت کئی سنگین مسائل سے دوچار ہوئے۔ ایک طرف لمبی مدت سے قائم شدہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا۔ دوسری طرف برٹش حکومت نے ملک پر مکمل قبضہ کر لیا، وغیرہ۔ ان حالات میں مسلمان سخت ذہنی انتشار کا شکار تھے۔ ان کے سامنے کوئی واضح راہ عمل (line of action) موجود نہ تھی۔ ایسے نازک وقت میں علماء اسلام نے اللہ کی توفیق سے بر صغیر ہند کے مسلمانوں کو سمت کا شعور (sense of direction) دیا۔

مسلم اقتدار کے خاتمہ کے بعد یہ علماء نئے دور میں مسلمانوں کی نشاۃ جدیدہ کے معمار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے مقدر کر دیا تھا کہ وہ انیسویں صدی میں پیش آنے والے مسلم زوال کے نتائج کا براہ راست مشاہدہ کریں تاکہ وہ نئے دور میں مسلمانوں کی حیات نو کی مبنی بر حقیقت منصوبہ بندی کر سکیں۔

علماء ہند نے مدارس کے قیام کے سلسلہ میں جو کوششیں کیں وہ انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس مدت میں جو مدرسے قائم کئے گئے، ان میں سے صرف چند ابتدائی مدارس کا ذکر یہاں بطور مثال کیا جاتا ہے۔

۱۔ دارالعلوم	دیوبند	۱۸۶۶
۲۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء	لکھنؤ	۱۸۹۴
۳۔ مدرسۃ الاصلاح	سرائے میر، اعظم گڈھ	۱۹۰۹
۴۔ مدرسہ باقیات الصالحات	ویلور، تامل ناڈو	۱۸۸۳
۵۔ دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ	ٹونک	۱۸۹۹
۶۔ مدرسہ امینیہ	دہلی	۱۸۹۷
۷۔ مظاہر العلوم	سہارنپور	۱۸۶۶
۸۔ جامعہ دارالسلام	عمر آباد	۱۹۲۴
۹۔ جامعہ مظہر العلوم	بنارس	۱۸۹۳
۱۰۔ جامعہ عربیہ حیات العلوم	مبارک پور	۱۸۹۹

یہ مدارس سادہ طور پر صرف مدارس نہ تھے بلکہ وہ ملت مسلمہ کو ایک مثبت میدان کار کی طرف رہنمائی دینے والے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور کے علماء کا گروہ بر صغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے رائد (trend setter) کے مقام پر کھڑا ہوا نظر آئے گا۔

اس ابتدائی دور کے علماء نے مدارس کی صورت میں جو تعلیمی ادارے قائم کئے وہ پورے ملک میں ایک قسم کی تعلیمی بیداری کا ذریعہ بن گئے۔ اس کے بعد بر صغیر ہند میں جو دینی مدارس قائم ہوئے وہ تقریباً سب کے سب براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی ابتدائی تحریکِ مدارس کے اثرات کا نتیجہ تھے۔

علم بلاشبہ کسی انسان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ علم معمولی انسان کو غیر معمولی انسان بناتا ہے۔ علم ہر قسم کی انسانی ترقی کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔ مسند احمد (۳/ ۴۱۲) اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ایک روایت آئی ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ما نحل والد ولده افضل من أدب حسن**۔ (الترمذی، کتاب البر) یعنی کسی والد نے اپنی اولاد کو اچھی تعلیم وتربیت سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں دی۔

اس حدیث میں والد اور اولاد کے لفظ کو اگر توسیعی معنی میں لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اولاد سے مراد افراد ملت ہیں اور والد سے مراد ملت کے رہنما۔ یعنی کوئی ملی رہنما اگر اپنی ملت کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام کرے تو وسیع تر انطباق کے اعتبار سے وہ بھی اس حدیث رسول کا مصداق قرار پائے گا۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس دور کے علماء نے ملت مسلمہ کو یہی سب سے زیادہ قیمتی تحفہ دیا ہے۔ اللہ کی توفیق سے انھیں یہ موقع ملا کہ وہ علم دین کا ایسا سلسلہ جاری کریں جو نسل در نسل مسلمانوں میں چلتا رہے۔ جو غیر منقطع طور پر مسلم نسلوں کو فائدہ پہنچاتا رہے۔

چیلنج کا مثبت جواب

پچھلے ڈیڑھ سو سال کے اندر بر صغیر ہند میں، اسلام اور ملت اسلام کے حوالہ سے جو تحریکیں اٹھیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ دوررس اور نتیجہ خیز تحریک یہی زیر بحث تحریک تھی۔ اس تحریک کو مدارس دینیہ کی تحریک یا تحریک مدارس کہا جاتا ہے۔

مدارس دینیہ کی تحریک کا فکری آغاز متعین کرنا ہو تو غالباً وہ ۱۸۳۴ ہوگا، جیسا کہ معلوم ہے، اس

سال برطانیہ کا مشہور مدبر لارڈ میکالے(Thomas Babington Macaulay) لندن سے ہندستان آیا۔اس وقت یہاں برٹش اقتدار قائم ہو چکا تھا۔لارڈ میکالے نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک تعلیمی اسکیم بنائی۔ اسی اسکیم کی بنیاد پر اس کے بعد ہندستان میں وہ نظام تعلیم جاری ہوا جس کو انگریزی نظام تعلیم کہا جاتا ہے۔اس تعلیمی نظام کو جس مقصد کے تحت بنایا گیا تھا وہ خود میکالے کے الفاظ میں یہ تھا—تاکہ یہاں ایک ایسی نسل اٹھے جو کہ پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور فکر کے اعتبار سے انگریز ہو:

So that a generation may arise, which is
Indian in birth and English in thought.

یہ بلاشبہہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔مدارس دینیہ کی تحریک اصلاً اسی چیلنج کے جواب کے طور پر ظہور میں آئی۔ علماء کی اس تعلیمی اسکیم کا نشانہ لارڈ میکالے کے مذکورہ بیان کی روشنی میں بتایا جائے تو وہ غالباً یہ ہوگا—تاکہ یہاں ایک ایسی نسل اٹھے جو پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی اور اپنے فکر و خیال کے اعتبار سے مسلمان ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ لارڈ میکالے کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوا اور علماء ہند کا منصوبہ اللہ کی توفیق سے کامیاب رہا۔اسی کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر ہند میں مسلمان اپنی دینی شناخت کے ساتھ پوری طرح موجود ہیں۔ مغربی تہذیب کا طوفان مسلمانوں کی ملی شناخت کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا،اور یہ زیادہ تر انھیں مدارس کا کارنامہ ہے جن کو علماء نے اپنی قربانیوں سے قائم کیا تھا۔

ہندستان دار التعلیم ہے

سب سے زیادہ مشکل کام فیصلہ کو بدلنا ہے۔ صحابیٔ رسول خالد بن الولید نے غزوۂ موتہ (۸ھ) کے موقع پر یہی جرأت مندانہ فیصلہ کیا تھا۔ہندستانی علماء نے انیسویں صدی کے وسط میں اسی عظیم سنت کو دہرالیا۔ جیسا کہ معلوم ہے شاہ عبد العزیز دہلوی نے ۱۸۲۳ میں یہ فتویٰ دیا کہ ہندستان دار الحرب ہو چکا ہے۔اس کی تعمیل میں علماء ہند کی ایک جماعت نے دشمن طاقتوں کے خلاف مسلح جہاد کا آغاز کر دیا۔ مگر تقریباً ۴۰ سال کے تجربہ نے اس کو غیر مفید ثابت کیا۔اب علماء نے اس معاملہ پر نظر ثانی کی اور ایک اور بلا اعلان "فتویٰ" دیا۔ اپنے معنی کے اعتبار سے یہ دوسرا فتویٰ یہ تھا کہ—ہندستان دار التعلیم ہو چکا ہے۔اب تمام مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں سرگرم ہو جانا چاہئے۔ یہ نیا فیصلہ اتنا اہم

تھا کہ اس نے متنوع قسم کے مثبت نتائج پیدا کیے۔

اہل مدارس کی قربانیاں

ہندستان کو "دار التعلیم" قرار دینے کے بعد، پچھلے ڈیڑھ سو سال کے اندر ملک میں مدارس دینیہ کا جو پھیلاؤ ہوا ہے وہ اپنے آپ نہیں ہو گیا بلکہ وہ ہزاروں علماء کی خاموش قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے کوئی عالم صرف یہ کر سکتا تھا کہ وہ ایک تعلیمی منصوبہ پیش کرے یا ایک ابتدائی مدرسہ کا قیام عمل میں لائے۔ مگر کوئی بھی ایک عالم اپنی محدود عمر میں یہ نہیں کر سکتا کہ وہ ایک پورے خطۂ ارض میں مدارس کا جال بچھادے اور نسل در نسل ایک پوری امت کو تعلیم یافتہ بناتا رہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ مسلسل ایسے معاون علماء اٹھیں جو اس منصوبہ کو آگے بڑھائیں۔ جو اس کو عملی صورت دینے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرتے رہیں۔

پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے اندر ملک کے ہزاروں علماء نے ایثار و قربانی کا یہی عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو آج ہم جانتے ہیں اور بہت سے لوگ وہ ہیں جو وفات پا کر اپنے رب کے پاس چلے گئے اور اب انھیں کوئی نہیں جانتا۔ مگر ان میں سے ہر ایک کی قربانیاں یکساں طور پر عظیم ہیں۔ ان میں سے کسی کا مشہور ہونا اور کسی کا مشہور نہ ہونا صرف ایک اضافی چیز ہے نہ کہ کوئی حقیقی چیز۔

ان علماء کے لئے تعلیم کے اس منصوبہ میں شرکت کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ گویا ملت کو زندہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مٹادینا تھا۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جس میں سادہ زندگی گزار کر مر جانا تھا۔ کم آمدنی پر اپنے آپ کو ساری عمر کے لئے راضی کر لینا تھا۔ حتی کہ بعض اوقات کسی مشاہرہ یا معاوضہ کے بغیر ساری عمر ایک ادارہ کی خدمت انجام دینا تھا۔ یہ ایک ایسے کام میں ساری زندگی گزار دینا تھا جس کی بابت پیشگی طور پر معلوم تھا کہ اس میں کوئی دنیوی عزت ملنے والی نہیں۔ مزید یہ کہ یہ ایک ایسا پر خطر کام تھا جس میں اپنے اہل و عیال کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر کے قوم کے مستقبل کی تعمیر کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا تھا۔

ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اس تعلیمی منصوبہ کو عوامی چندہ کے ذریعہ چلانا تھا۔ اور چندہ کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر (وفات ۱۹۳۱) نے درست طور پر کہا تھا کہ چندہ مانگنا اپنے آپ کو دوسروں کی نظر میں بندہ بنانا ہے۔ مدرسہ کو چلانے کے لئے یہ سب سے بڑی قربانی تھی جو علماء کو دینی

پڑی۔ مگر انھوں نے اللہ کی خاطر ان تمام چیزوں کو برداشت کیا اور اس مشکل ترین تعلیمی مہم کو جاری رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہزاروں علماء اگر ایک کے بعد ایک اس تعلیمی مہم کے لئے کھڑے نہ ہوتے اور ہر قسم کی قربانی کے باوجود اس کو مسلسل جاری نہ رکھتے تو یہ منصوبہ صرف ایک نظری منصوبہ بن کر رہ جاتا وہ کبھی تکمیل کے مرحلہ تک نہ پہنچتا۔

یہ علماء قناعت کی بوریوں پر بیٹھ کر ملت کے بچوں کو دین کی تعلیم دیتے تھے، اور معاشرہ کا حال یہ تھا کہ وہ عزت دینے کے بجائے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا اندازہ ایک مشہور مسلم شاعر کے ان دو شعروں سے ہوتا ہے:

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں تمام خواہد شد

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اسلام کو کن دل خراش حالات میں اپنا یہ تعلیمی کام انجام دینا پڑا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بر صغیر ہند میں تعلیمی منصوبہ کو مختلف مصلحتوں کی بنا پر فری ایجوکیشن (مفت تعلیم) کے اصول پر چلایا گیا تھا۔ اس اصول نے اہل مدرسہ کے کام کو مزید مشکل بنا دیا۔

مدارس کے ملک گیر اور انتہائی وسیع نظام کو فری ایجوکیشن کے اصول پر چلانا ایک بے حد مشکل منصوبہ تھا۔ جب کہ علماء کا یہ فیصلہ بھی تھا کہ اس کو حکومت کے تعاون کے بغیر آزادانہ طور پر چلانا ہے۔ اس انتہائی مشکل منصوبہ کو علماء اسلام نے اس طرح ممکن بنایا کہ اس کا سارا بوجھ خود اپنے اوپر لے لیا۔ علماء نے توکل اور قناعت اور کفایت شعاری کو اختیار کر کے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ اللہ کے یہ بندے دنیا کے نفع اور نقصان سے بے نیاز ہو کر تعلیم و تدریس کے اس خشک کام میں مصروف رہے! حقیقت یہ ہے کہ دور جدید میں فری ایجوکیشن کے اس وسیع منصوبہ کو کامیابی کے ساتھ چلانے کا یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اتنے بڑے پیمانہ پر شاید کسی اور انسانی معاشرہ میں نہیں ملے گی۔

اب اہل مدرسہ کے حالات کافی بدل چکے ہیں۔ ماضی کی قربانیوں کا صلہ اب علماء کے موجودہ گروہ کو یہ مل رہا ہے کہ آج ان کی خدمات کا عام طور پر اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ اسی کے ساتھ جدید سہولتوں نے قدیم مشکلات کی جگہ لے لی ہے۔ تاہم اس تبدیلی کے لئے تاریخ کو ڈیڑھ سو سال کا انتظار کرنا پڑا۔

شریعت کی رہنمائی

اسلامی شریعت کی رہنمائی کا تعلق کچھ محدود مسائل سے نہیں ہے بلکہ اس سے زندگی کے ہر معاملہ میں رہنمائی ملتی ہے۔ مدارس کی تحریک کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کو اس معاملہ میں شریعت کے رہنما اصولوں کی روشنی میں چلایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس کی تحریک کو وہ کامیابی ملی جو موجودہ زمانہ میں کسی دوسری تحریک کو نہیں ملی۔ یہاں اس سلسلہ میں اس کے چند پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حدیث رفق

یہ دنیا فطرت کے مقرر قوانین پر چل رہی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس دنیا میں طاقت کا زیادہ بڑا حصہ عدمِ تشدد (non-violence) میں ہے۔ اس کے مقابلہ میں تشدد (violence) اکثر تخریب کاری پر منتج ہوتا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں طاقت کا زیادہ بڑا سرچشمہ امن ہے نہ کہ جنگ۔ اس حقیقت کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: إن الله يعطي على الرفق مالا يعطي على العنف (صحیح مسلم، کتاب البر)۔ یعنی اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جس کو وہ سختی پر نہیں دیتا۔

اس حدیث کا تعلق صرف اخلاقی سلوک سے نہیں بلکہ اس کا تعلق ہر قسم کے عمل سے ہے، حتی کہ اجتماعی زندگی کی بڑی بڑی سرگرمیوں سے بھی۔ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی نتیجہ خیز عمل گہری منصوبہ بندی چاہتا ہے۔ اس دنیا میں ہر عمل کے راستہ میں بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ قدم قدم پر دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ کا امکان پیش آتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

اگر آپ یہ چاہیں کہ پہلے تمام رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹا دیا جائے تاکہ آپ کا سفر بلا روک ٹوک تیزی کے ساتھ جاری ہو سکے، تو ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ آپ کا سفر ہی کبھی شروع نہ ہو سکے گا۔ اس قسم کا ذہن کبھی نہ ختم ہونے والا تشدد شروع کر دے گا۔ ایک کے بعد ایک آپ مختلف رکاوٹوں سے لڑتے رہیں گے۔ آپ کی یہ متشددانہ جدوجہد کبھی ختم نہ ہو گی۔ کیوں کہ اللہ نے اس دنیا میں انسان کو مختلف قسم کی رکاوٹوں اور مشکلات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (البلد ۴) اللہ کی مشیت یہی ہے کہ یہ دنیا کبھی ان رکاوٹوں سے خالی نہ ہو۔ ایسی حالت میں اس دنیا میں ٹکراؤ کا

طریقہ صرف ایک بے نتیجہ عمل کا نام ہے، وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا نام نہیں۔

پھر اس دنیا میں عمل کا طریقہ کیا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ رکاوٹوں کو نظر انداز کیا جائے اور پر امن عمل کے ذریعہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔ قرآن کی شہادت کے مطابق، اس دنیا میں عسر کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہمیشہ یسر موجود رہتا ہے۔ (الانشراح ۵)

قرآن کی اس آیت میں عسر سے مراد مسائل (problems) ہیں، اور یسر سے مراد مواقع (opportunities) ہیں۔ قانون فطرت کے مطابق، یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے (مع العسر ہو جد الیسر، ابن کثیر)۔ ایسی حالت میں عمل کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ مسائل و مشکلات کو نظر انداز کیا جائے اور جو مواقع موجود ہیں ان کو غیر نزاعی انداز میں استعمال کیا جائے۔

مدارس دینیہ کی تحریک اسی حکیمانہ اصول کی ایک عملی مثال ہے۔ انیسویں صدی میں جو علماء اس تحریک کو لے کر اٹھے ان کی ایک سوچ یہ ہو سکتی تھی کہ پہلے موجودہ عسر کو ختم کرو۔ یعنی برطانی حکمرانوں کو ہلاک کرو۔ انگریزی نظام تعلیم کے ڈھانچہ کو تباہ کرو، وغیرہ۔ اس کے بعد ہی ہمارے لئے وہ وقت آسکتا ہے جب کہ ہم اپنی پسند کا تعلیمی نظام اس ملک میں قائم کریں۔

اگر ہمارے علماء کی یہ سوچ ہوتی تو ان کی یہ تحریک شروع ہو کر چند سال کے بعد ہی ختم ہو جاتی۔ اس کا کوئی مثبت نتیجہ ملت مسلمہ کو نہ ملتا، جیسا کہ اس قسم کی بہت سی متشددانہ تحریکوں کا کوئی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ مگر علماء کو اللہ تعالیٰ نے یہ بصیرت (vision) دی کہ وہ دونوں طریقوں کے فرق کو سمجھیں۔ چنانچہ انھوں نے تخریب غیر کے بے فائدہ کام کو چھوڑ کر تعمیر خویش کے مفید میدان میں اپنی ساری طاقت لگادی۔ اس کا نتیجہ اتنا کامیاب نکلا کہ یہ تحریک مذکورہ حدیث کی ایک عملی مثال بن گئی۔

حدیث مداومت

- عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیشہ رہنے والا عمل، اگرچہ وہ کم ہو۔ اور آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے آپ کو ایسے عمل کا پابند بناؤ جس کی تم طاقت رکھتے ہو:

عن عائشة رضي الله عنها أنها قالت: سئل النبي صلى الله عليه وسلم: أي

الاعمال احب الیٰ الله؟ قال : أدومها وإن قل. وقال: اکلفوا من الاعمال ما تطیقون. (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد و المداومة علی العمل)

اس حدیث کا انطباق عام طور پر اذکار اور عبادات جیسے اعمال پر کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں ایک عام اصولِ حیات بتایا ہے۔ اس کا ایک جزء بلاشبہہ ذکر وعبادت ہے، مگر زندگی کے بقیہ شعبوں سے بھی اس کا تعلق اتنا ہی ہے جتنا کہ ذکر وعبادات سے۔

ایسا عمل جو قابل مداومت ہو، وہ اللہ کو زیادہ پسند ہے، یہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کسی بھی عمل کا کوئی بڑا اور گہرا نتیجہ صرف اس وقت نکلتا ہے جب کہ اس کو لمبی مدت تک جاری رکھا جائے۔ نتیجہ اور لمبا عمل دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ اللہ کے نزدیک قدر افزائی کے قابل کام صرف وہی ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ وقتی قسم کی بے نتیجہ ہنگامہ آرائی اللہ کو پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی عمل قابل قدر ہے جس میں مداومت کی صفت پائی جائے۔ علماء کی تحریکِ تعلیم ایک مثبت اور غیر متشددانہ تحریک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں مداومت کی صفت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی اس صفت کی بنا پر اللہ کی پسندیدہ تحریک قرار پائی۔ اور نتیجۃً بہت سے فوائد کا سبب بنی۔

علماء نے تحریکِ مدارس کی صورت میں جو کام کیا اس کی خاص صفت یہ تھی کہ یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا کام تھا جو شروع ہونے کے بعد مسلسل جاری رہ سکے۔ چنانچہ وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برصغیر ہند میں جاری ہے اور دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اس مدت میں یہ کام نہ صرف برصغیر ہند میں پھیلا ہے بلکہ اس نظام کے تربیت پائے ہوئے افراد باہر کے ملکوں میں بھی جا کر کثیر تعداد میں چھوٹے اور بڑے مدارس قائم کر چکے ہیں۔ ان کی نہ صرف تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے بلکہ نوعیت کے اعتبار سے بھی ان میں مختلف قسم کی ترقیاں وقوع میں آئی ہیں۔ مثلاً لڑکوں کے مدرسہ کے علاوہ لڑکیوں کے بڑے بڑے مدرسہ کا قائم ہونا، مدرسوں کا ماڈرنائز کیا جانا، مدرسوں میں کمپیوٹر اور دوسری نئی چیزوں کا اضافہ۔ مدرسوں میں مختلف علمی شعبوں کا اضافہ، مثلاً دارالافتاء، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ اور صحافت، وغیرہ۔

ان علماء کے کام کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک ایسی صحت مند روایت (healthy tradition) کو

قائم کرنے کا سبب بنے جو ان کے بعد مسلسل جاری رہی اور بے شمار لوگ اس روایت کو لے کر آگے بڑھتے رہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ ان علماء کی جاری کردہ تحریک مدارس اس ارشاد رسول کی مصداق ہے: لا یسن عبد سنة صالحة یعمل بها بعده الا کتب له مثل اجر من عمل بها ولا ینقص من اجورهم شيء (صحیح مسلم، کتاب العلم، صفحہ ۲۲۶)۔ یعنی جب بھی کوئی بندہ ایک صالح سنت کو جاری کرتا ہے جس پر اس کے بعد عمل کیا جائے تو اس کے لئے بھی اتنا ہی ثواب لکھ دیا جاتا ہے جتنا اس کے بعد عمل کرنے والوں کے لئے، اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ اس حدیث میں صالح سنت سے مراد صحت مند روایت (healthy tradition) ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان علماء کی جاری کردہ تحریک مدارس اسی قسم کی ایک صالح سنت تھی۔ اس لئے جن لوگوں نے اب تک اس روایت پر عمل کیا یا آئندہ جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان سب کے اجر وثواب کے بقدر اجر وثواب اس کے ابتدائی معماروں کو بھی ملتا رہے گا، بغیر اس کے کہ بعد کو عمل کرنے والوں کے اجر وثواب میں کوئی کمی کی گئی ہو۔

پر امن میدان عمل

انیسویں صدی عیسوی میں جب مغربی استعمار کا مسئلہ نمایاں طور پر سامنے آیا تو اس کے خلاف مسلم رہنماؤں کا پہلا ردعمل متشددانہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد (۱۸۵۷) کیا۔ مگر یہ جہاد اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس تجربہ کے بعد انھوں نے اپنے طریقہ کار کو بدل دیا۔ یہ مسلح جہاد حکماً اگرچہ ایک اسلامی فعل تھا، مگر اجتماعی معاملات میں کسی اقدام کے بارے میں صرف یہ دیکھنا کافی نہیں کہ حکماً وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ دیکھنا بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ عملی طور پر نتیجہ خیز ہے یا نہیں۔ ایک طریق کار، تجربہ کے بعد نتیجہ خیز ثابت نہ ہو تو عقل وشریعت کا تقاضا ہے کہ طریق کار کو بدل دیا جائے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے سرداران قریش سے بدر (۲ھ) کے مقام پر مسلح مقابلہ کیا۔ مگر اس کے بعد انہی سرداران قریش سے حدیبیہ (۶ھ) کے مقام پر آپ نے صلح کرلی۔ اسی طرح غزوۂ احد (۳ھ) کے موقع پر آپ نے مدینہ سے تین میل باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کیا، مگر

اس کے بعد انہیں حملہ آوروں سے غزوۂ احزاب (۵ھ) کے موقع پر مدینہ کے اندر رہتے ہوئے دفاع کا انداز اختیار کیا، وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح صالح مقصد کے لئے اقدام کرنا ایک پیغمبرانہ سنت ہے اسی طرح دفاعی تدبیر کو بدلنا بھی ایک پیغمبرانہ سنت ہے۔ دونوں کام یکساں طور پر اسلامی ہیں اور سنت رسول بھی۔ ہندستان کے علماء نے اسی معلوم سنت پر عمل کیا چنانچہ انھوں نے مسلح جہاد کو غیر موثر دیکھ کر اپنے میدان کار کو بدل دیا۔ اور تعلیم کو اپنا میدان عمل بنالیا۔ گویا کہ مدرسہ ملی جدوجہد کو تشدد کے میدان سے نکال کر امن کے میدان میں لانے کا عنوان ہے۔

اس اعتبار سے یہ گویا پر تشدد عمل کے مقابلہ میں پر امن عمل کا انتخاب (choice) لینا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان مسلم رہنماؤں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تشدد کے میدان میں اپنی کوششیں صرف کرنے کے بجائے امن کے میدان میں وہ زیادہ مفید طور پر اپنی کوششوں کا استعمال کریں۔

عجیب بات ہے کہ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر میں تقریباً ایک ساتھ دو مختلف تعلیمی تحریکیں اٹھیں۔ ایک طرف سر سید احمد خاں کی تحریک تھی جو عام طور پر علیگڈھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے ایک رکن مولانا الطاف حسین حالی (وفات ۱۹۱۴) نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

دوسری طرف مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے ہم عصر علماء تھے۔ مولانا نانوتوی سر سید احمد خاں کے ہم سبق تھے، دونوں دلی کالج میں ایک ساتھ مولانا مملوک علی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ دونوں کا نشانہ بیک وقت تعلیم تھا۔ فرق یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے انگریزی زبان اور سیکولر علوم کو اپنی تعلیمی تحریک کا مرکز بنایا۔ اس کے مقابلہ میں مولانا نانوتوی اور ان کے ہم عصر علماء کا نشانہ یہ تھا کہ ملت مسلمہ کے درمیان عربی زبان اور دینی علوم کی اشاعت کی جائے۔

سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک گویا وقت کا تقاضا تھی اور علماء کی تحریک گویا دین کا تقاضا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر اٹھنے والی تحریکوں میں یہی دونوں تحریکیں ہیں جو مثبت معنوں میں نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ اس کا سبب بلاشبہ یہی تھا کہ ان دونوں تحریکوں کو پر امن

جدوجہد کے اصول پر چلایا گیا۔ علماء اسلام کی طرف سے شروع کی جانے والی مدارس دینیہ کی تحریک وقت کی ایک ضرورت تھی۔ وہ اپنے اندر بھرپور امکانات رکھتی تھی۔ چنانچہ وہ شروع ہونے کے بعد پھیلتی رہی، یہاں تک، کہ اب وہ اس توسیعی مرحلہ تک پہنچ چکی ہے کہ ہر جگہ اس کے مظاہر دیکھے جاسکتے ہیں۔

علماء کا قائدانہ کردار

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے مخاطب اول ہمیشہ ملاء قوم (الاعراف ۸۸) ہوتے تھے۔ یعنی وقت کے سردار۔ وقت کے سرداروں کو اپنا مخاطب بنانے کے لئے پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ داعی اور مدعو کی زبان ایک ہو۔ اگر داعی اور مدعو کے درمیان لسانی بعد (language gap) ہو تو ایسے تخاطب کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھیجے سب لسان قوم (ابراہیم ۴) میں بھیجے، یعنی پیغمبروں کی زبان بھی وہی تھی جو قوم کے اعلیٰ افراد کی زبان تھی۔

علماء پیغمبروں کے وارث ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کے ظہور کے بعد علماء تقریباً ایک ہزار سال تک یہ کام بخوبی طور پر انجام دیتے رہے۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ پچھلے زمانوں میں علماء کی زبان بھی وہی ہوتی تھی جو وقت کے سربرآوردہ طبقہ کی ہوتی تھی۔ دمشق اور بغداد اور قاہرہ اور قرطبہ وغیرہ میں جو نظام اقتدار قائم ہوا ان میں ہمیشہ علماء اپنا قائدانہ رول ادا کرتے رہے۔ اس کا بنیادی سبب بلاشبہ یہی تھا کہ اس زمانہ میں سربرآوردہ طبقہ کی زبان عربی تھی اور علماء اسلام کی زبان بھی عربی تھی۔ اس طرح دونوں طبقوں کے درمیان کوئی لسانی بعد نہیں پایا جاتا تھا۔

برطانوی اقتدار سے پہلے کے ہندستان میں بھی یہ صورت حال باقی رہی۔ اس زمانہ کے مسلم ارباب اقتدار عام طور پر فارسی زبان بولتے یا سمجھتے تھے، اور علماء اسلام کی زبان بھی اس زمانہ میں فارسی تھی۔ اس بنا پر علماء کے لئے ممکن ہو گیا کہ وہ وقت کے سربرآوردہ طبقہ کو براہ راست مخاطب کرسکیں اور اپنے قائدانہ رول کو کامیابی کے ساتھ ادا کرتے رہیں۔ مثال کے طور پر شیخ احمد سرہندی نے اپنے وقت کے امراء حکومت کو مخاطب کرنا چاہا تو انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ دونوں کی زبان یکساں طور پر فارسی تھی۔

مگر ہندستان میں برطانوی اقتدار قائم ہونے کے بعد صورت حال بدل گئی۔ اب یہاں کے حاکموں اور لیڈروں اور تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان انگریزی بن گئی۔ اب نہ صرف حکام سے ربط کے لئے بلکہ عوامی سطح پر کوئی بڑی تحریک چلانے کے لئے بھی انگریزی زبان لازمی طور پر ضروری ہو گئی۔ اس لسانی تبدیلی کے بعد ملکی تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ علماء اسلام جو تقریباً ہزار سال سے ملی اور سیاسی معاملات میں قائدانہ رول ادا کرتے چلے آرہے تھے، انہوں نے اچانک اپنے آپ کو اس میدان میں حاشیہ پر پایا۔

مثال کے طور پر بیسویں صدی کے نصف اول میں برصغیر ہند میں دو بڑی تحریکیں اٹھیں ــــــ آزادیٔ ہند کی تحریک اور تقسیم ہند کی تحریک۔ علماء نے ان دونوں تحریکوں میں حصہ لیا۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ دونوں تحریکوں میں ان کا رول زیادہ تر ثانوی رہا۔ دونوں ہی میں قائدانہ رول وہ غیر علماء ادا کرتے رہے جو انگریزی زبان میں لکھنے اور بولنے کی قدرت رکھتے تھے۔

تقسیم کے بعد بھی کم و بیش یہی صورت حال باقی رہی۔ مثال کے طور پر تقسیم کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے درمیان اٹھنے والی سب سے بڑی تحریک وہ تھی جو آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک میں علماء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ مگر دھیرے دھیرے دوبارہ یہی ہوا کہ علماء اس کے نظام میں غیر مؤثر ہو گئے اور غیر علماء، مثلاً ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور ڈاکٹر سید محمود وغیرہ عملاً اس کے اوپر چھا گئے۔ اس کا نتیجہ علماء اور غیر علماء کے درمیان کشاکش کی صورت میں نکلا۔ جس کا آخری انجام یہ ہوا کہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اپنا نشانہ پورا کرنے سے پہلے ہی اختلاف و انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندستانی علماء بالقوہ طور پر اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتے ہیں جو آج کے حالات میں قیادتی کردار ادا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ مگر صرف ایک کمی نے ان کو قیادت کے میدان سے باہر کر دیا ہے، اور وہ ہے انگریزی زبان یا بالفاظ دیگر عصری زبان میں لکھنے اور بولنے پر قادر نہ ہونا۔ اب آخری طور پر علماء کے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ انگریزی زبان کو خصوصی اہتمام کے ساتھ سیکھیں۔ بصورت دیگر، انھیں آج کی دنیا میں تقدس کا درجہ تو مل سکتا ہے مگر انھیں قیادت کا درجہ

ملنا ممکن نہیں۔اور یہ خود فطرت کے قانون کی بنا پر ہوگا نہ کہ کسی کی سازش کی بنا پر۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مدارس کے نصاب میں انگریزی زبان لازمی مضمون کے طور پر داخل نصاب ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہر بڑے مدرسہ میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو اختیاری مضمون(optional subject) کی حیثیت سے شامل کیا جائے۔اور طلبہ کے لئے یہ موقع ہو کہ ان میں سے جو شخص چاہے وہ اس سے استفادہ کر سکے۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم مدارس کو یا علماء کو دوبارہ اس قابل بنا سکتے ہیں کہ آج کے حالات میں وہ اپنا قائدانہ رول ادا کر سکیں۔

بین اقوامی کانفرنسوں میں شرکت کے دوران مجھے بار بار یہ تجربہ ہوا ہے کہ دوسرے مذاہب میں ایسے افراد کثرت سے موجود ہیں جو عالمی اسٹیج پر اپنے مذہب کی نمائندگی انگریزی زبان اور عصری اسلوب میں کر سکیں۔ مگر اسلام کی صفوں میں ایسے علماء مشکل سے ملیں گے جو حقیقی طور پر اس کام کے اہل ہوں اور ان مواقع کو استعمال کرتے ہوئے وقت کے معیار پر اسلام کی نمائندگی کر سکیں۔ دینی مدارس کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نقصان کی تلافی کے لئے ضروری تدابیر اختیار کریں۔

اس سلسلہ کی چند مزید صورتیں یہ ہو سکتی ہیں۔ جدید متعلق موضوعات پر توسیعی لکچر (Extention Lecture) کا انتظام کرنا۔ مقرر نصاب کے ساتھ مزید کتابیں تجویز(recommend) کرنا۔ طلبہ کو بین مذاہب اجتماعات میں شرکت کے مواقع دینا۔ تعطیلات میں طلبہ کے تربیتی کیمپ قائم کرنا۔ طلبہ کی انجمن کے تحت جدید موضوعات پر تقریر و مذاکرہ کا پروگرام رکھنا، وغیرہ۔

مدارس کا دعوتی پہلو

اسلامی درس گاہ کا تصور جو قرآن میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ایسے لوگ تیار ہوں جو درس گاہ سے فارغ ہو کر اقوام عالم میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام (التوبہ ۱۲۲) انجام دیں۔ اسلام کے ظہور کے بعد مسلسل یہ کام جاری رہا۔ ہر دور میں جو دینی مدارس قائم کئے گئے ان کا خاص مقصد یہی تھا کہ ان کے نظام کے تحت ایسے علماء تیار ہوں جو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے ساتھ اسلام کی عمومی اشاعت کا فریضہ بھی انجام دے سکیں۔ مدارس کا یہ نظام کم و بیش آج بھی جاری ہے۔ مگر بعد کے اسباب کے تحت مدارس کا یہ شعبہ دعوتی اسلوب کے بجائے مناظرہ کے اسلوب پر قائم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مدارس حقیقی اسلامی تبلیغ کے میدان میں عملاً غیر موثر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے مدارس سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں علماء تیار ہو کر نکل رہے ہیں مگر وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اسلام کی دعوتی ضرورت کو پورا کر سکیں۔

اس کا سبب زمانی حالات کا فرق ہے۔ ہمارے مدارس میں بظاہر آج بھی طلبہ کو نصابی یا غیر نصابی ذرائع سے دعوت و تبلیغ کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ مگر یہ تیاری تمام تر مناظرہ کے اصول پر ہوتی ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں دعوت کے اصول پر۔ مدارس کے طلبہ علم مناظرہ تو پڑھتے ہیں مگر وہ علم دعوت سے آشنا نہیں ہوتے۔ وہ اچھے مناظر تو ہوتے ہیں مگر وہ اچھے داعی نہیں ہوتے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہمارے مدارس کے فارغین کو عملاً دعوت و تبلیغ کے لئے غیر موزوں بنادیا ہے۔

قدیم زمانہ مناظرہ (debate) کا زمانہ تھا۔ مناظرہ کا یہ طریقہ قدیم "دور شمشیر" کے زیر اثر پیدا ہوا۔ شمشیر کا عمل ہار جیت کے اصول پر قائم تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں جو شخص جیتے وہ کامیاب، اور جو شخص ہارے وہ ناکام۔ اسی مخصوص فضا کے تحت مناظرہ کا فن پیدا ہوا جو خود بھی جیت اور ہار کے اصول پر مبنی تھا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ میدان جنگ میں تلوار جیت اور ہار کا فیصلہ کرتی تھی اور میدان مناظرہ میں الفاظ سے جیت اور ہار کا یہ کام لیا جاتا تھا۔

اس قسم کا مناظرہ قدیم دور کے حالات میں بہت مقبول ہوا۔ ہر طرف اس کی دھوم ہونے لگی، مگر موجودہ زمانہ میں یہ رجحان مکمل طور پر بدل چکا ہے۔ موجودہ زمانہ سائنسی تجزیہ کا زمانہ ہے نہ کہ لفظی جدال کا زمانہ۔ چنانچہ پہلے جہاں مناظرہ کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اب وہاں سنجیدہ ڈائیلاگ (serious dialogue) کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں۔

یہ زمانی تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ مدارس کے نظامِ تعلیم کو اس سے ہم آہنگ کیا جائے۔ طلبہ کو مناظرہ اور مجادلہ کے بجائے علمی ڈسکشن (scientific discussion) کے لئے تیار کیا جائے۔

مناظرہ اور ڈائیلاگ میں کیا فرق ہے، وہ فرق بنیادی طور پر یہ ہے کہ مناظر پیشگی طور پر فریق ثانی کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ مناظر کے دل میں فریق ثانی کے لئے خیر خواہی کا جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ فریق ثانی کی اصلاح سے زیادہ اس کی شکست سے دلچسپی رکھتا ہے۔ مناظر کے اس ذہن کی بنا پر مناظرہ کا

پورا عمل ایک قسم کی لفظی کشتی بن جاتا ہے۔ مناظر کی زبان آرا کی طرح تیز ہو جاتی ہے نہ کہ پھول کی طرح نرم۔ یہاں تک کہ یہ نوبت آجاتی ہے کہ مناظر کو اس سے دلچسپی نہیں رہتی کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ اس کی ساری دلچسپی اس سے ہوتی ہے کہ ایک ماہر وکیل کی مانند کسی نہ کسی طرح وہ فریق ثانی کو میدان مقابلہ میں ہرا دے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہونے والے مناظروں کی رودادیں پڑھ کر اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مناظرہ اور دعوت کے فرق کو قرآن کی زبان میں بیان کرنا ہو تو وہ ایک لفظ میں یہ ہوگا کہ دعوت کا نشانہ آدمی کا قلب ہوتا ہے۔ داعی ایسی بات کہنے کی کوشش کرتا ہے جو فریق ثانی کے دل میں اتر جانے والی ہو (النساء ۶۳)۔ اس کے برعکس مناظر کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح فریق ثانی کو مقابلہ کے میدان میں پچھاڑ دے۔ مگر مناظرہ کا یہ طریقہ پیغمبروں کی سنت کے مطابق نہیں۔

یہ ایک لازمی ضرورت ہے کہ اس معاملہ میں مدارس کے نظام کو بدلا جائے۔ اس کو مناظرہ کے بجائے دعوت کے قرآنی اصول پر قائم کیا جائے۔

علم کا چشمۂ رواں

اسلام کے آغاز ہی سے تعلیم یا پڑھنا اور پڑھانا مسلم معاشرہ کا ایک لازمی حصہ بن گیا اور پھر وہ کبھی اس سے جدا نہ ہوا۔ علم کے اس چشمۂ رواں کے دو بڑے دھارے تھے۔ ایک اجتماعی ادارہ (institution) اور دوسرے انفرادی تلمذ (discipleship)۔ علم کے یہ دونوں دھارے اس کے دور اول سے ہی اسلام کی تاریخ کا مستقل حصہ بن گئے۔ دور اول میں قائم ہونے والا پہلا تعلیمی ادارہ وہ تھا جو صفہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مدرسۂ صفہ کے معلم اول خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور اس کے جو طلبہ تھے ان کو اصحاب صفہ کہا جاتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ اسی مدرسۂ صفہ کے ایک طالب علم تھے جو احادیث رسول کا سب سے بڑا ماخذ ہیں۔ مدرسۂ صفہ گویا ایک تعلیمی بیج تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے آخر کار ایک تناور درخت بن گیا۔ اس کی شاخیں اور پتیاں تقریباً تمام آباد دنیا میں پھیل گئیں۔

اس تعلیمی چشمہ کا دوسرا زیادہ بڑا دھارا وہ ہے جو انفرادی تلمذ (discipleship) کی صورت میں جاری ہوا۔ ہر صاحب علم اس عظیم تعلیمی قافلہ کا ایک ممبر تھا۔ اس سلسلہ کی پہلی مثال اصحاب رسول کے یہاں ملتی ہے۔ تقریباً تمام اکابر صحابہ کا حال یہ تھا کہ وہ روزانہ لوگوں کے لئے حصول علم کا مرکز بنے رہتے تھے۔ یہ تعلیم انفرادی تلمذ کے اصول پر جاری تھی۔

اس کے بعد انفرادی معلمی کا یہ سلسلہ نسل در نسل جاری ہو گیا۔ صحابہ کے ذریعہ تابعین نے کسب فیض کیا۔ تابعین اس کے بعد تبع تابعین کے معلم بنے رہے۔ یہی تمام علمی گروہوں کا حال ہوا۔ محدثین اور فقہاء، مفسرین اور شارحین، متکلمین اور مورخین اسلام، ائمہ اور علماء اسلام، صلحاء اور صوفیہ کی بیشتر تعداد اسی طرح انفرادی تلمذ اور شخصی کسب فیض کے ذریعہ علم دین حاصل کرتی رہی۔ تاریخ اسلام کے اکثر بڑے بڑے علماء انہی انفرادی درس گاہوں میں تعلیم پا کر تیار ہوئے۔ حتی کہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی جیسے علماء متاخرین بھی اسی انفرادی تعلیمی نظام میں بن کر تیار ہوئے۔

مغربی کلچر دراصل مرچنٹ کلچر تھا جس نے ہر چیز بشمول تعلیم کو کمرشلائز کر دیا۔ اس کے نتیجہ

ں ساری اہمیت ملازمت رخی تعلیم (job oriented education) کی ہو گئی۔ تعلیم کو ملازمت (job) سے مربوط کر دیا گیا۔ اب سرٹیفکٹ دینے والے اسکول اور کالج کا رواج بڑھنے لگا یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ سیکولر تعلیم کے دائرہ میں انفرادی تلمذ کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ مطلوب ڈگری منظور شدہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ملتی ہے نہ کہ انفرادی علمی صحبتوں کے ذریعہ۔ اس تبدیلی کا فطری اثر قت کے دینی نظام تعلیم پر بھی پڑا۔

یہ تعلیمی سلسلہ جس کو میں نے علم کے چشمۂ رواں کے دو دھارے قرار دیا ہے وہ میرے لئے رف ایک تاریخی خبر کی چیز نہیں بلکہ وہ میرا ذاتی تجربہ بھی ہے۔ اللہ کے فضل سے مجھے یہ موقع ملا کہ ں علم کے ان دونوں دھاروں سے کسب فیض کروں اور بھرپور طور پر ان سے سیراب ہوں۔

یہاں میں اس سلسلہ میں اپنے ان بعض تجربات کا ذکر کروں گا جن میں عمومی سبق موجود ہے۔

ں غالباً ۱۹۳۰ میں اپنے گاؤں کے مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ یہاں میں نے الف ب سے اپنی تعلیم شروع ی۔ گاؤں کے اس مدرسہ میں میرے استاد مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی مرحوم تھے جو مدرسۃ الاصلاح کے انی مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم کے فرزند تھے۔ مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی جو ایک ذی استعداد عالم تھے، وہ نہ صرف میرے مدرسی استاد تھے بلکہ وہ میرے خصوصی معلم بھی تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ گاؤں کے اس مدرسہ میں شاید میں پہلا طالب علم تھا جس نے وہاں ابتدائی فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ جب کہ دوسرے طلباء زیادہ تر اردو اور ناظرہ قرآن تک پڑھائی پر اکتفا کرتے تھے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اپنے زمانۂ تشکیل (formative period) میں مولانا فیض الرحمٰن اصلاحی جیسا مخلص عالم ملا جس نے ابتدائی عمر ہی میں میرے اندر تحصیل علم کا شوق پیدا کر دیا جو پھر کبھی ختم نہ ہو سکا۔

مدرسہ کی رسمی تعلیم کے علاوہ میرا گھر بھی میرے لئے مستقل طور پر ایک غیر رسمی درس گاہ بنا رہا۔ میرے والد فرید الدین خاں مرحوم کے انتقال (۱۹۲۹) کے بعد میرے عم زاد برادر بزرگ مولانا اقبال احمد خاں سہیل ایڈوکیٹ، ایم اے، ایل ایل بی گویا میرے سرپرست تھے۔ وہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ وہ گہری علمی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے وقت کے اساتذہ سے فارسی اور عربی کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھی تھیں، مثلاً مولانا محمد شفیع صاحب (بانی مدرسۃ الاصلاح)، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ۔

بعد کو انہوں نے علی گڑھ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ اور اعظم گڈھ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے بعد وہ 'مسٹر' ہو گئے اور 'صاحب' کہے جانے لگے۔ تاہم جہاں تک ان کے ساتھ میرے علمی استفادہ کا تعلق ہے وہ آخر عمر تک جاری رہا۔ مولانا اقبال احمد سہیل مرحوم کے ساتھ میرا یہ تعلیمی استفادہ اس قدیم دور کی یاد دلاتا ہے جب کہ ہر صاحب علم اپنی ذات میں ایک درس گاہ ہوتا تھا۔ زمانۂ قدیم کے اکثر علماء اسی قسم کی انفرادی درس گاہوں میں تعلیم پاکر علم کے بڑے مرتبہ تک پہنچے۔

میرے بزرگ چچا صوفی عبد المجید خاں صاحب کو یہ شوق تھا کہ خاندان میں ایک ایسا شخص ہو جو مدرسہ کی تعلیم و تربیت حاصل کرے اور وہ باقاعدہ عالم ہو۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۸ میں اپنے صَرف پر ایک مستطیع طالب علم کی حیثیت سے میرا داخلہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڈھ) میں کرلیا اور اپنی ذاتی نگرانی میں میری تعلیم کی تکمیل کرائی۔ مدرسی انداز پر میری رسمی تعلیم اسی ادارہ میں ہوئی۔ مدرسۃ الاصلاح کی باقاعدہ تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے مجھے علمی استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے کچھ کا ذکر اس کتاب کے دوسرے صفحات میں موجود ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میرے اوپر ایک لمبا دور ایسا گزرا ہے جب کہ میں کتب خانوں میں گم رہا۔ مثلاً دار المصنفین اعظم گڈھ کا کتب خانہ اور اسی طرح دوسرے بہت سے کتب خانے اور لائبریریاں۔ اس دوران میں نے قرآن و حدیث اور سیرت اور دوسرے اسلامی علوم کو ازسر نو زیادہ تفصیل کے ساتھ پڑھا۔ اعظم گڈھ کے زمانۂ قیام میں اسی کے ساتھ مختلف علماء سے انفرادی کسب فیض کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ مثلاً شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا اقبال احمد سہیل وغیرہ (ملاحظہ ہو "مولانا سہیل" مطبوعہ مضامین رشید، از پروفیسر رشید احمد صدیقی)

میں ۱۹۵۶ میں جماعت اسلامی ہند کے مرکزی شعبۂ تصنیف سے وابستہ ہوا۔ اس وقت جماعت اسلامی ہند کا مرکزی دفتر اور اس کا شعبۂ تصنیف و تالیف دونوں رام پور (یوپی) میں تھے۔ یہاں کے زمانہ قیام میں مولانا جلیل احسن ندوی (وفات ۱۹۸۱) میرے عربی کے استاد بنے رہے۔ مولانا مرحوم کو ادب عربی پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ان سے میرا تعلیمی استفادہ مسلسل جاری رہا۔ اس زمانہ میں رام پور میں ایک جید عالم مولانا عبد الوہاب صاحب رہتے تھے۔ ان سے بھی مجھے بار بار علمی استفادہ کا موقع ملا۔

رامپور کے زمانہ قیام میں مولانا صدرالدین اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) سے بھی مجھے مسلسل علمی استفادہ کا موقع ملا۔

۱۹۶۳ میں میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (لکھنؤ) سے وابستہ ہوا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اقامت اختیار کی۔ اس سلسلہ میں کئی سال تک میرا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کیمپس میں رہا۔ اس قیام کے زمانہ میں مسلسل میں وہاں کے سینئر اساتذہ سے استفادہ کرتا رہا۔ مثلاً مولانا محمد اسحاق سندیلوی، مولانا محمد اویس نگرامی، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مولانا محمد تقی امینی وغیرہ۔ اس فہرست میں بلاشبہہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں مجھے مسلسل طور پر مولانا عبدالباری ندوی وفات (۱۹۷۶) سے علمی استفادہ کا موقع ملتا رہا جو ندوہ سے قریب ہی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ میں نے ۱۹۶۶ کے آخر میں ان سے بیعت بھی کرلی۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفۂ مُجاز تھے۔

میں دہلی ۱۹۶۷ میں آیا۔ اس کے بعد پھر دہلی ہی میں مستقل طور پر مقیم ہوگیا۔ یہاں بھی میرا تعلق مسلسل طور پر دہلی کے مدارس اور دہلی کے علماء سے جاری رہا۔ مثلاً مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد میاں سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا قاضی سجاد حسین، صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا عبدالخالق نقوی، وغیرہ۔

دہلی میں اپنی آمد ۱۹۶۷ کے بعد کثرت سے میں علی گڈھ کا سفر کرتا رہا۔ وہاں مولانا محمد تقی امینی (ناظم دینیات، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی) اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہ سے علمی استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس درمیان ایک بار کئی مہینہ تک مستقل طور پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی جامع مسجد میں قیام کیا۔

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں وہ براہ راست طور پر تحریک مدارس کے ثمرات کا نتیجہ تھیں۔ یہ دراصل تحریک مدارس ہی کا کارنامہ ہے کہ ہر بستی اور ہر شہر میں ایسے تعلیمی ادارے قائم ہوگئے جہاں میں اور میرے جیسے دوسرے بہت سے لوگ داخلہ لے کر باقاعدہ طور پر دینی تعلیم حاصل کرسکیں۔ اسی طرح تقریباً ہر جگہ ایسے علماء وجود میں آگئے جو علمی تشنگی رکھنے والے کسی شخص کے لئے حصول فیض کا ذریعہ بن سکیں۔ اپنے آبائی گاؤں سے لے کر دہلی کے زمانۂ قیام تک میرے تقریباً ۸۰ سالہ سفر حیات میں ہر جگہ مجھ کو ایسے تعلیمی ادارے ملے اور ہر جگہ ایسی علمی شخصیتیں موجود تھیں جن سے میں استفادہ کرکے اپنے دینی علم کو ترقی دیتا رہا۔ اور یہ سب کچھ بلاشبہہ تحریک مدارس کی وجہ سے ممکن ہوا۔

فوائد و برکات

دینی مدارس کے فائدے اور برکتیں بہت زیادہ ہیں اور ان کا تعلق زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہے۔ جس طرح علم کے فائدے کی کوئی حد نہیں، اسی طرح مدرسہ یا تعلیم گاہ کے فوائد کی بھی کوئی حد نہیں۔ یہاں صرف علامتی طور پر اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

علم دین کا تسلسل

مدارس دینیہ کے ذریعہ مسلمانوں کو مختلف قسم کے فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک فائدہ وہ ہے جس کو علم دین کا تسلسل یا استمرار کہا جا سکتا ہے۔ یہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر مدارس دینیہ کا ہی کارنامہ ہے کہ علم دین کا سلسلہ نسل در نسل برصغیر ہند میں جاری رہا۔ جو کسی قوم کو مسلسل زندہ رکھنے کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے میں ایک واقعاتی مثال دوں گا۔

۱۹۹۴ میں، میں نے اسپین (اندلس) کا سفر کیا۔ اسپین کے بارے میں یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ جب وہاں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اسی کے ساتھ وہاں کے مسلمانوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان یا تو مار ڈالے گئے یا وہاں سے بھاگ کر وہ باہر چلے گئے۔ مگر اسپین کے سفر کے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کے خاتمہ (۱۴۹۲ء) کے بعد بھی اسپین میں مسلمان ہزاروں کی تعداد میں باقی رہے۔ جو حادثہ پیش آیا وہ یہ نہیں تھا کہ اسپین سے مسلمانوں کا وجود مٹ گیا ہو، جو بات ہوئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی بعد کی نسلوں میں تعلیم دین کا تسلسل (استمرار) ٹوٹ گیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، مسلم اسپین میں علم کو بہت زیادہ فروغ ہوا مگر یہ سارا کام وہاں حکومت کی سرپرستی میں ہو رہا تھا۔ تعلیم و تدریس اور اشاعت دین کا سارا کام حکومت کر رہی تھی۔ یہ کام اتنا زیادہ بڑھا کہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں اسپین کے مسلمان تقریباً صد فی صد تعلیم یافتہ ہو گئے تھے۔ حکومت کے خاتمہ کے بعد جب اس کی تعلیمی سرپرستی ختم ہوئی تو اسی کے ساتھ تعلیم کا سارا نظام بھی ختم ہو گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد کی مسلم نسلوں میں علم دین کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ نسل در نسل یہ انقطاع

حالت قائم رہی یہاں تک کہ لوگ اپنی دینی شناخت کھو بیٹھے۔ اسپین کے مقامی معاشرہ میں وہ اس طرح ضم ہو گئے کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ان کے آباواجداد پہلے کبھی مسلمان تھے۔

انیسویں صدی میں جب ہندستان میں مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا تو یہاں کی مسلم نسلوں کے لئے بھی اسی قسم کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہاں بھی تعلیم و تدریس کا پورا کام حکومت کی سرپرستی میں انجام پاتا تھا۔ حکومت کے خاتمہ کے جو حالات پیدا ہوئے اس کے نتیجہ میں خارجی سرپرستی تقریباً ختم ہو گئی، مگر اس نازک موقع پر اللہ تعالی نے علماء اسلام کو کھڑا کیا۔ انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ حکومت کے تعاون کے بغیر عام مسلمانوں کی مدد سے تعلیم دین کا نظام چلایا جائے۔ اللہ کی خصوصی توفیق سے یہ منصوبہ کامیاب رہا اور بڑھتے بڑھتے یہ حال ہوا کہ سارے ملک میں چھوٹے بڑے بے شمار مدارس کا جال بچھ گیا۔

اسی تعلیمی منصوبہ کا نتیجہ تھا کہ ہندستان اسپین جیسے حالات سے مکمل طور پر بچ گیا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملک کے مسلمان آج پوری دینی شناخت کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں۔ ان کی دینی زندگی یہاں اتنی مستحکم ہو چکی ہے کہ بار بار یہاں مختلف قسم کے طوفان آتے ہیں مگر وہ مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے کوئی خطرہ نہیں بنتے۔ ایک انگریزی مثل کے مطابق، اس ملک کے مسلمان ہر موقع پر طوفان کی بڑی چڑیا (big bird of the storm) ثابت ہوئے ہیں۔ اور یہ سارا کریڈٹ بڑی حد تک علماء کے قائم کردہ اس تعلیمی نظام کو جاتا ہے جس کو مدارس دینیہ کا نظام کہتے ہیں، جو نسل در نسل مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا کام انجام دے رہا ہے۔

کتابوں تک رسائی

حدیث میں آیا ہے کہ: قیدوا العلم بالکتاب (الدارمی، مقدمۃ) یعنی علم کو لکھ کر محفوظ کرو۔ اس کے مطابق، ایک علم وہ ہے جو بشکل تحریر محفوظ ہو اور دوسرا علم وہ ہے جس کو تحریری طور پر محفوظ نہ کیا گیا ہو۔ عالم اور جاہل میں یہ فرق ہے کہ جاہل کی رسائی صرف غیر محفوظ علم تک ہوتی ہے اور عالم کی رسائی محفوظ علم تک بھی اور غیر محفوظ علم تک بھی۔

ایک شخص جو پڑھنا نہ جانتا ہو وہ صرف انھی باتوں کو جان سکتا ہے جن کو وہ سن سکتا ہو۔ وہ علوم جو اس کی سماعت سے باہر کتابوں اور تحریروں کی صورت میں محفوظ کیے گئے ہیں، ان علوم تک ایک جاہل کی

رسائی ممکن نہیں، جب کہ علم کا ۹۹ فی صد سے زیادہ حصہ وہی ہے جس کو تحریر کی صورت میں محفوظ کیا گیا ہے۔ تعلیم گاہیں اس محفوظ علم تک انسانوں کو پہنچنے کے قابل بناتی ہیں۔

میرا ذاتی معاملہ یہ ہے کہ میں فطری طور پر ایک تنہائی پسند آدمی ہوں۔ ایک بار ایک عرب شیخ نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ انا رجل یحب العزلة (میں ایک تنہائی پسند آدمی ہوں) مدرسہ کی تعلیم نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں اپنی تنہائی کو بھی مکمل طور پر حصول علم کے لئے استعمال کر سکوں۔ اگر میں مطالعہ کتب کی صلاحیت سے محروم رہتا تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا میں صرف انہی چند باتوں کو جانتا جن کو میں نے اپنے آس پاس کے لوگوں سے اتفاقاً سن لیا ہو۔ مگر پڑھنے کے قابل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنے تمام وقت کو علم و واقفیت کے اضافہ کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ پڑھنے کی صلاحیت کا یہ عظیم فائدہ ہے کہ آدمی اس حیثیت میں ہو جاتا ہے کہ وہ ساری دنیا کے اہل دماغ، حتی کہ وفات یافتہ انسانوں کی علم و تحقیق سے بھی واقفیت حاصل کر سکے۔

کسی کا قول ہے کہ جس کے پاس کتاب ہے وہ اکیلا نہیں ہے۔ یہ بات لفظ بلفظ درست ہے۔ ایک تعلیم یافتہ آدمی کتابوں کے ذریعہ اپنے دن اور رات کو عالی دماغ انسانوں کی صحبت میں گزارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی کوئی اور خوش قسمتی نہیں ہو سکتی۔

دینی مدارس نے بے شمار لوگوں کو یہی تحفہ دیا ہے۔ ان مدارس نے لوگوں کو اس قابل بنایا کہ جو کچھ وہ سن نہیں سکتے اس کو پڑھ کر جان لیں۔ جن اعلیٰ انسانوں کو انہیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا وہ ان کی کتابوں کے ذریعہ ان کے ہم نشین بن جائیں۔

ابتدائی عمر سے میرا یہ مزاج ہے کہ میں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کرتا ہوں جس کو عام طور پر لوگ قابل غور نہیں سمجھتے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر مجھ کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑے بڑے سبق ملتے ہیں۔ یہی وہ مخصوص صفت ہے جس کو قرآن میں "توسم" (الحجر ۷۵) کہا گیا ہے۔

مثال کے طور پر مدرسہ کی زندگی میں میں نے وہاں کے استاد مولانا سعید احمد عمروی سے کچھ کتابیں پڑھیں جن میں حدیث کی کتاب بھی شامل تھی۔ حدیث کو پڑھتے ہوئے میرے اندر ایک عجیب احساس پیدا ہوا۔ میں نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو باتیں ۱۴۰۰ سال پہلے کہی تھیں اور جن کو سننے

کے لئے میں وہاں موجود نہ تھا ان کو میں آج کتاب میں پڑھ رہا ہوں۔ اسی طرح میں نے مولانا ابو اکبر اصلاحی سے کئی کتابیں پڑھیں۔ دروس التاریخ الاسلامی پڑھتے وقت خاص طور پر مجھے یہ احساس ہوا کہ جن واقعات میں میں شخصی طور پر شریک نہ تھا ان کو میں آج کتاب کے ذریعہ جان رہا ہوں۔

مدرسہ میں میں نے عربی کی جو کتابیں پڑھیں ان میں سے ایک المفصل فی النحو تھی۔ یہ کتاب ہم لوگوں کو مولانا اختر احسن اصلاحی نے پڑھائی تھی۔ اس کتاب کے مصنف جار اللہ الزمخشری (۵۳۸ھ) ایک معتزلی عالم تھے۔ وہ اپنے اعتزال کو چھپاتے نہ تھے۔ حتی کہ وہ غیر معتزلی علماء پر سخت تنقید کرتے تھے۔ اس زمانہ کے معتزلی علماء کی تمام کتابیں تباہ کردی گئیں مگر الزمخشری کی کتاب المفصل فی النحو اور الکشاف عن حقائق التنزیل استثنائی طور پر باقی رکھی گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نحو اور تفسیر میں ان کتابوں کا کوئی بدل موجود نہ تھا۔ اس واقعہ کے ذریعہ تعلیم ہی کے دوران میں نے زندگی کی اس عظیم حقیقت کو جان لیا کہ آدمی اگر علم وہنر میں ممتاز درجہ حاصل کرلے تو اس کو نظر انداز کرنا اس کے شدید مخالفین کے لئے بھی ممکن نہیں۔

تعلیمی اداروں کے نصاب میں عام طور پر کلاسیکل کتابیں مقرر کی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ مدارس کا بھی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے مدرسہ میں مقرر نصاب کے تحت جو کتابیں پڑھیں وہ زیادہ تر کلاسیکل کتابیں تھیں، یعنی قدماء کی لکھی ہوئی کتابیں۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ احساس میرے دل میں آتا تھا کہ تحریر کیسی عجیب نعمت ہے کہ انسان ہر زمانہ کے اہل علم کی تصنیفات کو پڑھ سکتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ اس زمانہ میں موجود رہا ہو۔

مدرسہ کی تعلیم آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ کتابوں تک رسائی حاصل کرسکے۔ اور جب ایک آدمی کتابوں سے اخذ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو عین اسی وقت وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دنیا بھر کے اہل دماغ اور اہل فکر کے نتائج تحقیق سے استفادہ کرسکے۔ قوت مطالعہ نہ ہو تو آدمی کی شخصیت ایک محدود شخصیت ہوتی ہے۔ قوت مطالعہ حاصل ہوتے ہی اس کی شخصیت ایک آفاقی شخصیت بن جاتی ہے۔ پوری دنیا کا کتابی ذخیرہ اس کے لئے ایک وسیع علمی دستر خوان کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں میں نے اپنی مدرسی زندگی کے کچھ واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ایسا میں نے

اس لئے کیا ہے تا کہ مدرسہ کے تحت جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ پڑھنے والوں کو زیادہ حقیقی اور واقعی (factual) نظر آئے۔ یہ دراصل شخصی تجربہ کے حوالہ سے ایک عمومی حقیقت کا اظہار ہے۔ ان انفرادی واقعات کی تعمیم (generalisation) کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مدارس کے ماحول میں لوگوں کو کس قسم کی روحانی اور انسانی تربیت دی جاتی ہے۔

سپلائی ہاؤس

دینی مدارس کا ایک اور عظیم فائدہ وہ ہے جس کو ایک لفظ میں سپلائی ہاؤس کہا جاسکتا ہے۔ سپلائی ہاؤس سے کیا مراد ہے اس کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندستان میں بہت بڑے پیمانہ پر اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کی صورت میں ایک عظیم تعلیمی ڈھانچہ قائم ہے۔ اس تعلیمی نظام کو ہمارے ملک کی حکومت بہت بڑی مالی مدد دے کر چلا رہی ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سیکولر تعلیمی ادارے ملک کے لئے ایک عظیم سپلائی ہاؤس کا کام کر رہے ہیں۔ ملک کو مسلسل ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اس کی اقتصادی اور قومی مشین کو چلا سکیں۔ یہ ادارے یہی کام انجام دے رہے ہیں۔ ملک کو اپنے مختلف شعبوں کے لئے مسلسل قابل اعتماد کارکن درکار ہیں ـــــ ٹیچر، کلرک، افسر، مینیجر، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، سپروائزر، ایڈیٹر، پائلٹ، سکریٹری، ایڈمنسٹریٹر، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے افراد انہی سیکولر تعلیمی اداروں سے پیدا ہو رہے ہیں جن کو اسکول، کالج اور یونیورسٹی کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ وسیع مسلم ملت کا بھی ہے۔ اس ملک میں بسنے والی تقریباً بیس کرور مسلم ملت کو مسلسل ایسے افراد درکار ہیں جو اس کی مختلف دینی و ملی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ان سارے افراد کی فراہمی کے لئے مدارس دینیہ گویا ایک مستقل "سپلائی ہاؤس" کا کام کر رہے ہیں۔

ہندستان میں اس وقت تقریباً پانچ لاکھ مسجدیں ہیں ان مسجدوں کو امام انہی دینی مدارس سے ملتے ہیں۔ بیشتر تعلیمی اداروں کو یہیں سے مدرسین سپلائی ہو رہے ہیں۔ اسی طرح ملی اداروں کے لئے ناظم، تصنیف و تالیف کے شعبوں کے لئے مصنف، ملی صحافت کے لئے ایڈیٹر، انہی مدارس سے سپلائی ہوتے ہیں۔ اس وقت مسلمانوں میں بہت سی جماعتیں قائم ہیں۔ ان تمام جماعتوں کو بھی اکثر افراد اسی سپلائی ہاؤس سے فراہم ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر تبلیغی جماعت براہ راست طور پر مدارس کی پیداوار ہے۔

یہ مدارس میں تیار ہونے والے علماء ہی تھے جنہوں نے اس جماعت کو شروع کیا اور پھر اس کو موجودہ عالمی وسعت تک پہنچایا۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم سبق آموز بات یہ ہے کہ منفی اقدام ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ جب کہ مثبت اقدام نہ صرف اپنے اصل نشانہ کو پورا کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ بہت سے مزید فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں جس کا اس کے ابتدائی رہنماؤں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانہ میں ایک نئی چیز وجود میں آئی جس کو کمپیوٹر کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہر جگہ اردو آپریٹر اور عربی آپریٹر کی ضرورت تھی۔

کمپیوٹر کے اس نئے کام کے لئے بھی افراد کار زیادہ تر مدارس دینیہ کے سپلائی ہاؤس ہی سے فراہم ہوئے۔ موجودہ زمانہ کی سیکولر یونی ورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز اور مسلم تاریخ کے مطالعہ کے نام پر ایسے شعبے کھلے جن میں داخل ہو کر مسلمان یونی ورسٹی کی سطح پر اسلام کی علمی نمائندگی کر سکیں۔ ان شعبوں کے لئے افراد بھی انہی مدارس دینیہ سے حاصل ہوئے۔

اسی طرح سفارت خانوں اور ریڈیو اور امور خارجہ سے تعلق رکھنے والے مختلف شعبوں نیز ثقافتی اداروں اور برآمدی تجارت وغیرہ کے لئے اردو داں اور عربی داں افراد کی ضرورت پیش آئی۔ یہ ضرورت بھی زیادہ تر مدارس دینیہ کے سپلائی ہاؤس سے پوری ہوئی، وغیرہ۔

موجودہ زمانہ میں صنعتی انفجار (industrial explosion) کے بعد لوگوں کے لئے عام مواقع کھلے کہ وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بڑی تعداد میں جا سکیں۔ ان جانے والوں میں ایک قابل لحاظ تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو مدارس دینیہ میں تعلیم پائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا بیرونی ملکوں میں جا کر قیام کرنا ایک مزید فائدے کا سبب بنا۔ ان لوگوں کے بیرونی ملکوں میں آباد ہونے ہی کا یہ فائدہ تھا کہ بعد کو جب اردو داں علماء نے اپنے دینی اسفار کے تحت ان ملکوں کا دورہ کیا تو یہ لوگ پیشگی طور پر ان علماء کے لئے وہاں مددگار اور رابطہ کار کی حیثیت سے موجود تھے۔

اس طرح مدارس دینیہ کی صورت میں جو سپلائی ہاؤس قائم ہوا، اس کا دائرہ کسی مخصوص حد تک محدود نہ رہا۔ اس سپلائی ہاؤس سے ملک کے اندر کی دینی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور ملک کے باہر کی

دینی ضرورتیں بھی۔ ان لوگوں نے ہندستان میں بھی دینی مدارس قائم کئے اور یورپ و امریکہ اور افریقہ میں بھی۔ ان کے ذریعہ ہر علمی شعبہ کو قابل کار افراد ملے اور مل رہے ہیں۔

اس دنیا میں ہر چیز میں مسلسل ترقی کی گنجائش رہتی ہے۔ مذکورہ سپلائی ہاؤس کو مفید تر بنانے کے لئے بھی بلاشبہہ بہت سے امکانات موجود ہیں۔ مشترک غور و فکر کے ذریعہ ان امکانات کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے اور تعلیم و تربیت کے اس نظام کو اور زیادہ مفید بنایا جاسکتا ہے۔

ذہنی بُعد کا خاتمہ

مدارس دینیہ کے ذریعہ ایک اور فائدہ یہ حاصل ہوا کہ اس کی وجہ سے ملت کے خواص اور ملت کے عوام کے درمیان وہ نقص پیدا نہ ہو سکا جس کو ذہنی بُعد (intellectual gap) کہا جاتا ہے۔

قرآن میں یہود کے تذکرہ کے تحت بتایا گیا ہے کہ ان میں ایک فریق وہ ہے جو علم و عقل رکھتا ہے (البقرہ ۷۵) یہاں "فریق" سے مراد یہود کے علماء ہیں جن کو احبار کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ یہود میں دوسرا طبقہ ان کے عوام کا ہے۔ ان کی بابت قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ومنهم اميون لايعلمون الكتاب الا اماني وان هم الا يظنون (البقرہ ۷۸) یعنی اور ان میں اَن پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو مگر آرزوئیں۔ ان کے پاس گمان کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن کی اس آیت میں امیون کا لفظ آیا ہے۔ امیون جمع کا لفظ ہے۔ اس کا واحد امی ہے۔ امی عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو نہ لکھنا جانتا ہو اور نہ پڑھنا جانتا ہو (من لايكتب و لا يقرأ)۔ الجامع لاحكام القرآن للقرطبي، الجزء الثاني، صفحہ ۵۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے اندر عمومی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ کچھ مخصوص خاندان محدود طور پر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہی لوگ تھے جو اپنی مذہبی کتابیں پڑھتے تھے۔ ان کے علاوہ یہود کی بہت بڑی اکثریت جاہل رہتی تھی۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں عام طور پر خاندانی تعلیم کا رواج تھا نہ کہ عمومی تعلیم کا۔ عوام کی تعلیم و تدریس کے لئے ان کے یہاں مدرسے نہ ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کے درمیان بڑے پیمانہ پر خواص اور عوام کی تقسیم قائم ہو گئی۔ کچھ افراد یا کچھ خاندان کو علماء کا درجہ حاصل ہوتا تھا۔ اور بقیہ لوگ طبقۂ عوام میں شمار ہوتے تھے جو نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ ان

کی براہ راست رسائی مذہبی کتابوں تک ہو سکتی تھی۔

اس کے نتیجہ میں یہود کے علماء اور عوام کے درمیان ایک ذہنی بُعد (intellectual gap) قائم ہو گیا۔ ان کے عوام نہ خود اپنی مذہبی کتابوں کو پڑھ سکتے تھے اور نہ ان کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنے علماء کی علمی باتوں کو سمجھ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام دھیرے دھیرے علماء سے دور ہوتے چلے گئے۔ مذہب کے نام سے ان کے پاس توہمات (superstitions) اور آرزوؤں (wishful thinking) کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ خواص اور عوام کے درمیان اس ذہنی بُعد کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی اصلاح ناممکن ہو گئی کیوں کہ گہری اصلاح کی بات آسمانی کتابوں کے حوالہ سے کرنی پڑتی ہے، اور ان کے عوام اپنی جہالت کی بنا پر اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ کتابی زبان اور علمی اسلوب کو سمجھ سکیں۔

یہی حال قدیم زمانہ میں تمام قوموں کا تھا۔ اس کی ایک مثال ہندستان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہندستان میں ہزاروں سال سے خواص و عوام کی یہی تقسیم بہت بڑے پیانہ پر قائم تھی۔ علم یا پڑھنا لکھنا صرف برہمن خاندانوں کے درمیان محدود تھا۔ ایسے تعلیمی ادارے موجود نہ تھے جہاں عوام لکھنا پڑھنا سیکھیں۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم زیادہ تر کچھ برہمن خاندانوں میں منحصر ہو کر رہ گیا اور ملک کے ۹۵ فیصد عوام اپنی جہالت کی بنا پر توہمات کو مذہب سمجھ کر اس میں مبتلا رہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم کو خواص کے دائرہ سے نکال کر عوام کے دائرہ تک پہنچانے کا کام تاریخ میں پہلی بار اسلام نے کیا۔ مسلم علماء نے علم کی توسیع کا یہ کام دنیا کے ہر ملک میں انجام دیا جن میں سے ایک ملک بلاشبہہ ہندستان بھی تھا۔

علماء اسلام نے تعلیم و تدریس کا جو کام شروع کیا اس کا فائدہ فطری طور پر یہاں کی غیر مسلم آبادی کو بھی پہنچا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہندستان میں مسلم دور کے آغاز سے پہلے ہندوؤں میں صرف برہمن اور اعلیٰ حیثیت کے کچھ لوگ تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ہندو عوام زیادہ تر اس سے محروم تھے۔ مسلم عہد میں جب ملک میں عمومی تعلیمی ادارے کھولے گئے تو مسلم طلبہ کے ساتھ ہندو طلبہ بھی اس میں داخلہ لے کر تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس کے بعد جب ۱۹ویں صدی میں مسلم علماء نے زیادہ بڑے پیانہ پر مدارس کھولنا شروع کیا تو ان مدارس کے ذریعہ مسلمانوں کے ساتھ غیر

مسلموں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

مدارس کی خاص صفت یہ تھی کہ وہ گاؤں گاؤں میں کھولے جارہے تھے۔ اس طرح ہر خاندان کے لئے ممکن ہوگیا کہ وہ اپنے بچوں کو مدرسہ میں بھیج کر تعلیم دلائے۔ فطری طور پر والدین اپنے چھوٹے بچوں کو دور کسی شہر میں بھیجنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے لیکن جب ان کی اپنی بستی میں مدرسہ کھل گیا تو ان کے لئے ممکن ہوگیا کہ وہ اپنے بچہ کو مدرسہ کی تعلیم میں شامل کر دیں۔ مدارس کے اس عمومی پھیلاؤ سے بڑی تعداد میں غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچا۔ مثال کے طور پر آزاد ہندستان کے پہلے پریذیڈنٹ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے اپنے بچپن میں ابتدائی تعلیم بہار کے ایک مسلم مدرسہ میں حاصل کی تھی۔

اس طرح اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جس نے عوام اور خواص کے درمیان ذہنی بُعد (intellectual gap) کے تباہ کن نقصانات کو سمجھا اور اس کو دور کرنے کی موثر کوشش کی۔

اسلام کی اس روایت کو ہندستان کے علماء نے اس ملک میں بھی پوری طرح باقی رکھا۔ برصغیر ہند میں علماء نے مدارس کا جو سلسلہ شروع کیا اس کا ایک اہم فائدہ یہ تھا کہ خواص اور عوام یا علماء اور عوام کے درمیان ذہنی بعد (intellectual gap) کا مسئلہ پیدا نہ ہو سکا۔ بستی بستی اور شہر شہر مدارس کی کثرت نے کروروں لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ اس طرح تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر اسلامی کتابیں عوام کی دسترس میں آگئیں۔ لوگ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو گئے کہ وہ علماء کی باتوں کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنے شعور کی تعمیر کر سکیں۔ اگر مدارس کے ذریعہ اس ذہنی بُعد کو توڑا نہ جاتا تو خدانخواستہ مسلمانوں مین بھی وہی تباہ کن تقسیم قائم ہو جاتی جو یہود کی تاریخ میں احبار اور امیون کی صورت میں اور ہندوؤں میں برہمن اور غیر برہمن کی صورت مین قائم ہوئی۔

علماء ہند کا مزید کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دینی تعلیم کو فری ایجوکیشن (مفت تعلیم) کی حیثیت دے دی۔ عوام بیشتر حالات میں معاشی تنگی کا شکار رہتے ہیں۔ اس بنا پر وہ اپنے ذاتی خرچ پر تعلیم حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اگر مدارس کا نظام فیس کی بنیاد پر قائم کیا جاتا تو بیشتر مسلمانوں کا حال یہ ہوتا کہ مدارس کے باوجود وہ علم حاصل کرنے سے محروم رہتے۔ علماء ہند کا یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے بھروسہ پر دینی تعلیم کے نظام کو فری ایجوکیشن (مفت تعلیم) کے اصول پر رائج کیا

اور ہر قسم کی مشکلوں کے باوجود اس کو قائم رکھا۔

انگریزی حکومت نے جو اسکول اور کالج کھولے وہ زیادہ تر شہروں میں واقع تھے۔ اس طرح وہ بڑی حد تک گاؤں کی دسترس سے باہر تھے جہاں ملک کی تقریباً ۷۵ فیصد آبادی رہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں علماء نے یہ کیا کہ انھوں نے گاؤں گاؤں میں مکتب اور مدرسہ کھول دیا۔ اس طرح انھوں نے دینی تعلیم کو عملاً ہر خاندان کے دروازہ (doorstep) تک پہنچادیا۔

مثال کے طور پر میں یوپی کے ایک دور دراز گاؤں میں پیدا ہوا، مگر یہاں بھی یہ حال تھا کہ گاؤں کی مسجد میں ایک مدرسہ موجود تھا۔ یہ مدرسہ ڈاکٹر عبدالعلی خاں صاحب کے خاندان نے اپنی ذاتی ذمہ داری پر قائم کیا تھا۔ اب جناب یمین الاسلام خاں (انجینئر) وغیرہ کے تعاون سے اس کو بہت زیادہ ترقی دی جارہی ہے۔ عام قاعدہ کے مطابق اس مدرسہ میں کوئی تعلیمی فیس نہ تھی۔ ابتدائی عمر ہی میں مجھے اس مدرسہ میں داخل کردیا گیا۔ اگر گاؤں کے اندر یہ مدرسہ نہ ہوتا تو میرے سرپرست کبھی بھی مجھ کو کم عمری میں کسی دور دراز مقام پر بھیجنے کی ہمت نہ کرپاتے۔ گاؤں کے اس مدرسہ میں میں نے اردو اور فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد میں مزید تعلیم کے لئے دوسرے مقام پر گیا اور وہاں ایک بڑے مدرسہ میں داخلہ لے کر عربی زبان اور دینی علوم کی تکمیل کی۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں برصغیر ہند میں اسلام اور ملت اسلام کے نام پر بہت سی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ان کے گرد اکٹھا ہوگئی۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تحریکیں کتنی نتیجہ خیز تھیں، ان تحریکوں کی مقبولیت اسی لئے ممکن ہوئی کہ مدارس دینیہ کے عمومی پھیلاؤ نے خواص اور عوام کے درمیان ذہنی بُعد کو ختم کردیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں جو بھی تحریک اٹھی اس نے قوم کے اندر اپنے لئے تیار ذہن (prepared mind) پایا۔ یہ تمام تر انھیں مدارس کی تعلیمی مہم کا نتیجہ تھا۔

اگر تعلیم کی عمومی اشاعت کے ذریعہ خواص اور عوام کے درمیان ذہنی دوری کا خاتمہ نہ ہو گیا ہوتا تو ان تحریکوں کو کبھی یہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی۔ ایسی حالت میں تحریکوں کے علم بردار اخبار اور رسالے جاری کرتے مگر یہاں ان کا کوئی پڑھنے والا نہ ہوتا۔ وہ جلسے کرتے مگر ان جلسوں میں ایسے لوگ

شریک ہوتے جو سننے کے باوجود کچھ نہ سمجھتے۔ ہمارے خواص ایسے الفاظ لکھتے اور بولتے جن کا مفہوم وہ خود تو جانتے مگر وہی عوام ان سے بے خبر رہتے جن کو باخبر کرنے کے لئے یہ الفاظ لکھے اور بولے جارہے تھے۔ ایسی حالت میں ان تحریکوں کا جو انجام ہو تا وہ پیشگی طور پر معلوم ہے۔

دینی وملی انفراسٹرکچر

دینی مدارس کے ذریعہ ملت کو جو فائدے حاصل ہوئے ان میں سے ایک فائدہ وہ ہے جس کو دینی انفراسٹرکچر کہا جاسکتا ہے۔ کسی بھی کام کو مؤثر انداز میں چلانے کے لئے ہمیشہ اس کے موافق ایک عملی ڈھانچہ یا انفراسٹرکچر (infrastructure) درکار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تجارتی کاروبار کسی ملک میں اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ تجارتی سازوسامان کی منتقلی کے لئے پورے ملک میں اچھی سڑک کی سہولت موجود ہو۔ ہر مقام پر ٹیلی فون کا عمدہ انتظام ہو تاکہ ملک کے مختلف حصوں میں باآسانی پیغامات کو بھیجنا ممکن ہو سکے، وغیرہ، وغیرہ۔

یہی معاملہ دینی اور ملی کام کا ہے۔ دینی وملی کاموں کے لئے بھی اس کے موافق ایک وسیع انفراسٹرکچر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح مادی انفراسٹرکچر کے بغیر مادی کاروبار ترقی نہیں کرتا، اسی طرح دینی انفراسٹرکچر کے بغیر دینی کام بھی زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

دینی مدارس کا جو کام برصغیر ہند میں شروع کیا گیا وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ایسا کام تھا جو مسلسل توسیع پذیر تھا۔ مدرسہ کے کام کی نوعیت یہ تھی کہ مدرسہ میں پڑھ کر تیار ہونے والا ہر نوجوان اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتا تھا کہ وہ اپنی مادر علمی کی طرح خود بھی نئے مدارس قائم کرسکے۔ چنانچہ دینی مدارس کی تحریک کا آغاز ہوتے ہی یہ کام خود اپنے فطری مزاج کے زور پر آگے بڑھنے لگا۔ مدرسہ کے فارغین مدرسہ سے نکلنے کے بعد نئے مدارس قائم کرنے لگے۔

مدارس کے کام کی یہ توسیع حسابی تناسب (arithmetical proportion) سے آگے نہیں بڑھی، یعنی اس کے بڑھنے کی رفتار ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، نہ تھی بلکہ وہ جیومیٹریکل تناسب (geometrical proportion) سے بڑھنا شروع ہوئی۔ یعنی اس کے بڑھنے کی رفتار یہ تھی۔۔۔۔ ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲، ۶۴۔ مزید یہ کہ یہ تحریک خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے قائل بقا (sustainable)

تحریک تھی۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس دینیہ کی تحریک نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ وہ خود اپنی داخلی طاقت سے روز افزوں تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی یہاں تک کہ وہ بڑھتے بڑھتے پورے بر صغیر ہند میں پھیل گئی۔ مسجد گویا پیشگی طور پر مدرسہ کے لئے بنی بنائی بنیاد (base) تھی۔ چنانچہ تقریباً ہر مسجد میں چھوٹا یا بڑا مدرسہ قائم ہو گیا۔ جہاں مسجد ناکافی معلوم ہوئی وہاں مسجد کے باہر مستقل عمارت کی صورت میں مدارس قائم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ پورے بر صغیر ہند میں مدارس کا جال بچھ گیا۔ جن کی تعداد بلا مبالغہ لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

یہ مدارس اصلاً دینی تعلیم کے لئے قائم کئے گئے تھے مگر قانون فطرت کے تحت وہ ایک ایسے انفراسٹرکچر کی صورت اختیار کر گئے جو اس ملک میں ہر دینی اور ملی مہم کے لئے بنیاد کا کام دے سکیں۔ چنانچہ بیسویں صدی میں جتنی بھی دینی یا ملی تحریکیں اس خطۂ ارض میں اٹھائی گئیں، ان سب کے لئے بنیادی زمین یہی ادارے بنے جن کو مدارس دینیہ کہا جاتا ہے۔

اس مدت میں جب بھی کوئی دینی اور ملی تحریک اٹھائی گئی تو انہی مدارس سے اس کو تیار ذہن (prepared mind) اور معاون ملے۔ انہی مدارس نے ہر تحریک کے رہنماؤں کا استقبال کیا۔ انہی مدارس نے پورے ملک میں اس تحریک کے حق میں موافق فضا تیار کی۔ ملی تحریکوں کے رہنما جب ملک کا دورہ کرتے ہیں تو یہی مدارس ان کے لئے مقامی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے ہر جگہ، ان کے لئے قیام گاہ سے لے کر جلسہ گاہ تک ہر ضرورت کی فراہمی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اگر مدارس دینیہ کا یہ جال نہ ہوتا تو موجودہ زمانہ میں اٹھنے والی کسی ملی تحریک کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ وہ اس پھیلاؤ اور وسعت کو حاصل کرے جو کہ عملاً اس نے حاصل کیا۔ کسی تحریک کی صحت کو جانچنے کا ایک معیار یہ ہے کہ جب وہ شروع ہو تو نہ صرف اپنا براہ راست نشانہ پورا کرے بلکہ اسی کے ساتھ وہ دوسرے بہت سے مثبت اور مفید نتائج پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔

باغبان جب ایک درخت لگائے تو اس کا براہ راست نشانہ اس سے پھل لینا ہوتا ہے مگر جب درخت بڑھ کر تیار ہوتا ہے تو پھل کے علاوہ لوگوں کو اس سے دوسرے بہت سے فائدے بھی ملنے لگتے ہیں —— مثلاً سایہ، ہریالی، لکڑی، پھول، وغیرہ۔ اسی طرح جب انسانی معاشرہ میں کوئی صالح تحریک

چلائی جائے تو اس سے بہت سے ضمنی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ مدارس دینیہ کا ہے۔ یہ مدارس اصلاً علم دین کو فروغ دینے کے لئے قائم کئے گئے تھے مگر جب وہ قائم ہو گئے تو وہ بہت سے دوسرے فوائد کا ذریعہ بھی بن گئے۔ انہی میں سے ایک خاص فائدہ یہ تھا کہ سارے ملک میں پھیلے ہوئے یہ مدرسے ملی تحریکوں کے لئے انفراسٹرکچر کا کام دینے لگے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے کہ تعرف الاشیاء باضدادھا (چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اس اصول کے مطابق، تھوڑی دیر کے لئے ملک سے مدارس دینیہ کے وجود کو حذف کر دیجئے۔ اس کے بعد یہ سوچئے کہ ملک میں اگر کوئی ملی تحریک چلائی جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ انجام یہ ہوگا کہ شروع ہوتے ہی یہ تحریک محسوس کرے گی کہ ملک میں قدم رکھنے کے لئے اس کے پاس کوئی زمین یا معاون ڈھانچہ موجود نہیں۔

کسی صحت مند تحریک کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ جب شروع ہو تو وہ لوگوں کو ایک ہی فائدہ نہ دے بلکہ لوگوں کو اس سے متنوع قسم کے فائدے حاصل ہوں۔ وہ نہ صرف یہ کہ کوئی نیا مسئلہ پیدا نہ کرے بلکہ وہ ہر متوقع اور غیر متوقع پہلو سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتی رہے۔

یہی معاملہ مدارس دینیہ کی تحریک کا تھا۔ وہ پورے معنوں میں ایک صحت مند تحریک تھی۔ اس لئے وہ ہر اعتبار سے مفید بنتی رہی۔ اس کی افادیت کی لمبی فہرست میں ایک چیز وہ بھی ہے جس کو انفراسٹرکچر کہا جاتا ہے۔

مدارس دینیہ کی تحریک کے درست ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس سے ملت کے اندر صحیح مزاج پیدا ہوا۔ وہ صحیح زاویۂ نظر پیدا ہوا جس سے لوگ چیزوں کو درست طور پر دیکھ سکیں۔ ملت منفی نقطۂ نظر سے بچ کر مثبت نقطۂ نظر کی حامل بن گئی۔ ملت کے افراد موانع سے ٹکرانے کے بجائے مواقع کو استعمال کرنے لگے، وغیرہ۔

اچھے شہری

مدارس دینیہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ذریعہ ملک کو اچھے شہری فراہم ہو رہے ہیں۔ اچھے شہری، یعنی ایسے لوگ جو اخلاقی اصولوں اور انسانی قدروں کے مطابق جینے والے ہوں۔ ایسے افراد کی ضرورت ہر سماج کو ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھے شہری کے بغیر کوئی سماج اچھا سماج نہیں بن سکتا۔

مگر آج کے ہندستان میں ایسے ادارے موجود نہیں جو اچھے شہری بنانے کا کام کر رہے ہوں۔ ملک میں اسکول اور کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر جو تعلیمی نظام قائم ہے وہ سیکولرزم پر مبنی تعلیمی نظام ہے۔ چنانچہ ایسے افراد کی تیاری اس کے مقاصد میں شامل ہی نہیں۔ اس تعلیمی نظام کا واحد نشانہ لوگوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی معاشی اور مادی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔

ایسی حالت میں مدارس دینیہ کا نظام ہی ملک میں وہ واحد بڑا نظام ہے جو اس اخلاقی مقصد کی تکمیل کر رہا ہے یا کر سکتا ہے۔ ان مدارس کا مقصد لوگوں کو اسلام کی تعلیم دینا ہے۔ کتب کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر دار العلوم تک ہر مرحلہ میں یہی مقصد اس کے سامنے رہتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اسلام کیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعثت لاتمم حسن الاخلاق (موطا امام مالک) یعنی میں دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ میں حسن اخلاق کی تکمیل کروں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: اکمل المومنین ایمانا أحسنهم خلقا (مسند احمد) یعنی سب سے زیادہ کامل ایمان اس کا ہے جو اخلاق میں سب سے زیادہ اچھا ہو۔

مدارس دینیہ میں جو نوجوان تعلیم و تربیت پاتے ہیں وہ اپنی پوری تدریسی مدت میں اسی قسم کی باتیں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ مدارس کا پورا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ وہاں آدمی کو صبح و شام اخلاق و انسانیت کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہاں رسول اور اصحاب رسول کو زندگی کے لئے رول ماڈل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مدارس عملاً ملک کے لئے اچھے شہری اور بہتر انسان فراہم کرنے کے ادارے بن گئے ہیں۔

یہاں میں اس کی وضاحت کے لئے چند مثالیں دوں گا۔ ایک بار میں ہماچل پردیش کے ایک مدرسہ میں گیا۔ اس مدرسہ کو دیوبند کے ایک عالم نے قائم کیا ہے۔ اس مدرسہ کے آس پاس زیادہ تر ہندوؤں کی آبادیاں ہیں، یہ مدرسہ جب قائم ہوا تو ان پڑوسی ہندوؤں کو تشویش ہوئی۔ وہ سوچنے لگے کہ مدرسہ کے لوگ پتہ نہیں کس قسم کی مصیبت ہمارے لئے کھڑی کریں گے۔ مگر ان کا یہ خوف بے بنیاد تھا۔ چنانچہ تجربات کے بعد دھیرے دھیرے وہ ختم ہوتا چلا گیا۔

مثال کے طور پر مدرسہ کے قریب ہندوؤں کے ایک گاؤں میں آگ لگ گئی۔ یہ رات کا وقت تھا۔ جب آگ کے شعلے بلند ہوئے تو مدرسے والوں کو اس کی خبر ہوگئی۔ وہ کسی طلب کے بغیر دوڑ کر اس گاؤں

میں پہنچے اور آگ بجھانے میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اللہ کی مدد ہوئی اور فوراً آگ بجھ گئی۔

اس طرح کے واقعات و تجربات کے بعد ہندو لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ وہ مدرسہ کو اپنے حق میں ایک نعمت سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ اب یہ حال ہے کہ یہ ہندو اپنے ذاتی نزاعات کو حل کرنے کے لئے مدرسہ والوں کے پاس آتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو مدرسہ والوں پر پورا بھروسہ ہے۔

اسی طرح ایک بار میں ایک اور مدرسہ میں گیا۔ وہاں مدرسہ سے ملا ہوا ایک باغ تھا۔ اس زمانہ میں باغ کو ایک ہندو ٹھیکہ دار نے لیا تھا۔ اس ہندو باغبان سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ جب میں یہاں آیا تو میں ڈرتا تھا کہ مدرسہ کے لڑکے ہمارے باغ کا نقصان کریں گے۔ مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ مدرسہ والوں کا حال یہ ہے کہ پیڑ کا پھل توڑنا تو درکنار زمین پر گرے ہوئے پھل کو بھی وہ نہیں اٹھاتے۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے دینی مدارس اسی طرح اچھے شہری تیار کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ اس کی مثالیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔

دینی مدارس کا امتیاز

دینی مدارس کی اہم ترین امتیازی صفت یہ ہے کہ ان کی بنیاد علم حقیقی پر قائم ہے، یعنی دین اسلام پر جو کہ مذہب کا واحد محفوظ ایڈیشن ہے۔ یہ ایک بے حد اہم بات ہے کیوں کہ دوسرے جتنے بھی تعلیمی نظام ہیں، ان سب کی بنیاد علم ظنی پر قائم ہے نہ کہ علم حقیقی پر۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں جو لوگ تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں وہ اس حیثیت میں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدہ و عمل کو اعتماد کی بنیاد پر قائم کر سکیں، وہ اس یقین کے ساتھ جئیں کہ انہوں نے جو کچھ پایا ہے وہ عین سچائی ہے، اس میں جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں۔

اکثر دینی مدارس میں قرآن کو تقریباً مکمل طور پر بطور نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مدارس میں قرآن کو سب سے زیادہ بلند مقام حاصل رہتا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں روزانہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ گفتگو اور تقریروں میں بار بار قرآنی آیتوں کے حوالے دئے جاتے ہیں۔ طلبہ نصاب سے باہر جو کتابیں اور جرائد پڑھتے ہیں ان میں عام طور پر بحث کا مرکزی نکتہ قرآن ہی ہوتا ہے۔ اس طرح عملی طور پر تمام طلبہ ہر روز براہ راست یا بالواسطہ انداز میں قرآن کا درس لیتے رہتے ہیں۔

یہی معاملہ حدیث کا ہے۔ وہ مدارس کے نصاب میں لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل رہتی ہے۔ اکثر بڑے مدارس میں صحاح ستہ مکمل یا منتخب انداز میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ کے ماحول میں طالب علم ہر روز حدیث کے حوالے یا اس کے تذکرے سنتا ہے۔ اس طرح عملی طور پر ہر طالب علم کو مدرسہ کی پوری زندگی میں مسلسل طور پر حدیث رسول کی فکری خوراک ملتی رہتی ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدارس اپنے طلبہ کو ذہنی اور روحانی حیثیت سے ایک ایسی تربیت دیتے ہیں جو کسی اور نظام تعلیم میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ دوسرے اداروں میں اگر تعلیم کی بنیاد انسانی علم پر ہے تو دینی اداروں میں تعلیم کی بنیاد خدائی علم پر۔

یہاں میں چند تقابلی مثالیں دوں گا جن سے اندازہ ہوگا کہ دینی مدرسہ اور غیر دینی مدرسہ میں کیا فرق ہے۔ وہ کون سے امتیازی اوصاف ہیں جو غیر دینی تعلیم گاہوں کے مقابلہ میں دینی تعلیم گاہوں کو حاصل ہیں۔

۱۔ غیر دینی درس گاہیں خواہ وہ ملک کے اندر ہوں یا ملک کے باہر، سب کی سب عملاً ایک ہی مقصد کے تحت قائم ہیں، اور وہ یہ ہے کہ طالب علم کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ دنیا میں اچھا جاب حاصل کر سکے۔ ہر جگہ جاب رخی تعلیم (Job-oriented education) کا رواج ہے۔ گویا کہ یہ تعلیم گاہیں انسان کو حیوانِ کاسب (earning animal) بنانے کے کارخانے ہیں۔

دینی مدارس کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک لفظ میں کہا جا سکتا ہے کہ دینی مدارس خدا رخی تعلیم (God-oriented education) کے ادارے ہیں۔ وہ انسان کے اندر اعلیٰ مقصدیت کا شعور جگاتے ہیں۔ وہ انسان کو مادی سطح سے اٹھا کر روحانی یا ربانی سطح پر جینا سکھاتے ہیں۔

۲۔ غیر دینی مدارس عملی طور پر یہ سبق دیتے ہیں کہ دنیا کی مادی چیزوں کا حصول ہی ہماری زندگی کی آخری منزل ہے۔ جب کہ دینی مدارس ہر طالب علم کے اندر یہ ذہن بناتے ہیں کہ دنیا کی مادی چیزیں تمہاری ضرورت ہیں نہ کہ تمہارا مقصد۔ غیر دینی مدارس کا جو فلسفہ ہے اس میں انسان کے لئے آزادی کا پیغام تو موجود ہے مگر آزادی کی حدود (limitations) کا کوئی تعین نہیں۔ اس کا ایک نتیجہ وہ ہے جو جدید ترقی یافتہ ملکوں میں بے قید جنسی تعلقات اور بے قید لذت پسندی کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ غیر دینی درسگاہوں میں اس بے قیدی پر روک لگانے کا کوئی قانون نظری طور پر موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سماجوں میں ظاہری ترقیوں کے باوجود حقیقی انسانیت کا ارتقاء ممکن نہ ہو سکا۔

اس کے برعکس دینی درسگاہوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد خدائی شریعت کے اصول پر قائم ہے۔ چنانچہ دینی درسگاہوں کے فلسفۂ تعلیم میں انسان کے لئے جس طرح آزادی ایک معلوم اصول کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح یہاں یہ بھی پوری طرح معلوم ہے کہ آزادی کے حدود کیا ہیں۔ کب تک آزادی ایک رحمت ہے اور وہ کون سی حد ہے جس سے تجاوز کرنے کے بعد آزادی اس کے لئے برعکس طور پر عذاب بن جائے گی۔

۳۔ غیر دینی تعلیم گاہوں میں عام طور پر جو اصول حیات پایا جاتا ہے وہ اضافیت (relativity) کا اصول ہے۔ یعنی اس دنیا میں ہمارا علم اور ہمارا ہر نظریہ اضافی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ حقیقی۔ اس فلسفہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم گاہوں میں اخلاق بھی ایک اضافی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ یہاں ہر اصول صرف

ضافی قدر رکھتا ہے۔ یہ نظریہ اپنی آخری حد پر پہنچ کر اس فلسفہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس کو افادیت (utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق صرف وہی چیز قابل قدر ہے جو اپنے اندر معلوم مادی افادیت رکھتی ہو، جو چیز اس صفت سے خالی ہو وہ قابل لحاظ ہی نہیں۔ اس نظریہ کے تحت تعلیم پائے ہوئے لوگ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ وہ انسانی سماج کو ایک قسم کا حیوانی جنگل بنادیں۔ اور اس تعلیمی نظام نے عملاً یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔

دینی مدارس کا فلسفہ اس کے برعکس ابدی حقیقت کے اصول پر قائم ہے۔ دینی مدارس کے پاس ہر معاملہ میں اللہ کا ایک معلوم حکم موجود ہوتا ہے۔ انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ حکم سراسر برحق ہے اور اس بنا پر وہ ناقابل تغیر ہے۔ وہ ابدی طور پر قابل اتباع ہے۔ یہ فلسفہ فطری طور پر ابدی اخلاقیات (eternal ethics) کا تصور پیدا کرتا ہے۔ اس کے تحت وہ مستحکم اخلاقی نظام بنتا ہے جس میں کسی بھی حال میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

۴۔ غیر دینی تعلیمی نظام میں ایک بڑا خلا یہ ہے کہ اس کو کسی بھی معاملہ میں نقطۂ آغاز (starting point) کا علم نہیں۔ اس کا سارا انحصار ذاتی تجربات اور مشاہدات پر ہوتا ہے۔ انسان اپنی لازمی محدودیت (limitation) کی بنا پر کبھی یہ جان نہیں پاتا کہ کسی معاملہ کا حقیقی نقطۂ آغاز کیا ہے۔ اس لئے ایسی درسگاہوں میں تربیت پائے ہوئے ذہن ابدی طور پر فکری ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں، وہ کبھی علم حقیقی کے درجہ تک نہیں پہنچتے۔ اس کے برعکس دینی درسگاہ اپنے الٰہی علم (divine knowledge) کی بنا پر اس حیثیت میں ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں پہلے ہی قدم پر صحیح نقطۂ آغاز کو پالے اور نتیجۃً فکری ٹھوکر کھانے سے بچ جائے۔

اس کی ایک مثال ارتقاء حیات کا فلسفہ ہے۔ اس معاملہ میں غیر دینی درسگاہوں میں تعلیم پائے ہوئے افراد کے پاس نقطۂ آغاز کے لئے کوئی معلوم اصول موجود نہ تھا، انھوں نے اٹکل سے حیاتیاتی ارتقاء کا مفروضہ (hypothesis) قائم کیا۔ سو سال سے بھی زیادہ مدت تک اس مفروضہ کو واقعہ ثابت کرنے کے لئے بے شمار اعلیٰ دماغوں نے اس پر اپنی عمریں صرف کردیں۔ اس پر ہزاروں بلین ڈالر خرچ کئے گئے۔ مگر ان کا مفروضہ آج بھی صرف مفروضہ ہے، بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی بھی درجہ میں

واس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ چنانچہ نظریہ ارتقاء کے محقق علماء خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظریہ اب بھی صرف ایک کام چلاؤ نظریہ (workable theory) ہے نہ کہ کوئی ثابت شدہ علمی حقیقت۔

اس کے برعکس دینی درس گاہ میں تربیت پائے ہوئے انسان کا ذہن اول دن سے بالکل صاف ہوتا ہے۔ قرآن کی بنیاد پر، وہ اول دن سے اس یقین کا حامل ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز خدائی تخلیق کے ذریعہ ہوا نہ کہ محض بے شعور مادی عوامل کے ارتقاء سے۔ اس طرح دینی درسگاہ کا ایک انسان نیاتیات کے معاملہ میں اس نقطۂ آغاز کو پہلے ہی دن پالیتا ہے جس کو غیر دینی درس گاہ میں تربیت پائے ہوئے لوگ سو سال سے زیادہ مدت تک مہنگی قسم کی علمی سرگرمیوں کے باوجود پانے میں ناکام رہے۔

۵۔ غیر دینی درس گاہ میں تعلیم پایا ہوا انسان جس فلسفۂ حیات کو لے کر وہاں سے نکلتا ہے اس کے عین فطری نتیجہ کے مطابق اس کا تصور حیات بالکل ادھورا ہوتا ہے۔ وہ آغاز حیات کو جانتا ہے مگر وہ انجام حیات کو نہیں جانتا۔ اس کو یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی زندگی کی سرگرمیوں کو کہاں سے شروع کرے مگر اس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ اس کی آخری منزل کیا ہے اور زندگی کے انجام کے اعتبار سے اس کو کس قسم کی تیاری کرنا چاہئے۔ وہ بظاہر اپنی زندگی کا آغاز اجالے میں کرتا ہے، صرف اس لئے کہ آخری عمر کو پہنچ کر اس کی زندگی نامعلوم اندھیروں میں بھٹک کر رہ جائے۔

دینی مدرسہ میں تعلیم و تربیت پائے ہوئے انسان کا معاملہ اس سے مکمل طور پر مختلف ہوتا ہے۔ یہاں کا تعلیم یافتہ انسان اپنے قرآنی پس منظر کی بنیاد پر پورے شعور کے ساتھ یہ جانتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی کا سفر کہاں سے شروع کرنا ہے اور اس کی آخری منزل کیا ہے۔ ایسا انسان اس واضح یقین پر کھڑا ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کی حیثیت راستہ کی ہے، اور اس کے بعد آنے والی آخرت کی دنیا کی حیثیت منزل کی۔

۶۔ غیر دینی درسگاہوں میں جو فلسفۂ حیات رائج ہے، اس کے مطابق انسان ایک متلاشیٔ مسرت حیوان (pleasure-seeking animal) ہے۔ اس فلسفہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان لذت ور مسرت کے حصول کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لے۔ چنانچہ آج غیر دینی درسگاہوں کے تعلیم پائے ہوئے تمام لوگ اسی واحد مقصد کے تحت زندگی گزار رہے ہیں۔ غیر دینی درسگاہوں میں تربیت پائے ہوئے لوگوں کا حال ہر جگہ یہی ہے، خواہ وہ ہندستان کے لوگ ہوں یا بیرون ہندستان کے لوگ۔

اس نظریہ کا عملی تجربہ بتاتا ہے کہ وہ ہلاکت خیز حد تک غلط ہے۔ اس ذہن کے لوگ اپنی ساری عمر ان چیزوں کے حصول میں لگا دیتے ہیں جن کو وہ بظاہر خوشی و لذت کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر جب ہزار کوشش کے بعد وہ ان مطلوب چیزوں کا ڈھیر اکٹھا کر لیتے ہیں تو اچانک ان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں خواہ کتنی ہی زیادہ ہوں، وہ انھیں لذت و مسرت دینے والی نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطری صلاحیت کے اعتبار سے لامحدود استعداد (unlimited capacity) کا مالک ہے۔ جب کہ دنیا کی ہر چیز صرف محدود خوشی اور محدود لذت ہی دے سکتی ہے۔ گویا انسان اپنی طلب کے اعتبار سے کامل تسکین چاہتا ہے جب کہ مادی چیزیں اپنی محدودیت کی بنا پر اس کو جزئی تسکین ہی دے سکتی ہیں۔ اسی فرق کا نتیجہ وہ چیز ہے جس کو اکتاہٹ (boredom) کہا جاتا ہے۔ طالب اور مطلوب کے درمیان یہ فرق اتنا زیادہ حتمی ہے کہ کسی بادشاہ کے لئے بھی اس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مادی ساز و سامان کی بے پناہ کثرت ہے مگر ان سامانوں نے انسان کو جو چیز دی ہے وہ صرف مایوسی (frustration) ہے نہ کہ تسکین، جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ مادی ساز و سامان فراہم کیا گیا تھا۔

دینی مدرسہ میں تعلیم و تربیت پائے ہوئے انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایسے لوگ جس فلسفۂ حیات کا سبق لے کر اپنی مادر علمی سے نکلتے ہیں وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کے لئے ہے نہ کہ حصول مسرت کے لئے۔ یہ نقطۂ نظر ان کے رویہ کو یکسر بدل دیتا ہے۔ وہ دنیا کی کامیابی کے بجائے آخرت کی کامیابی کو اپنی منزل بناتے ہیں۔ دنیا میں عیش ڈھونڈنے کے بجائے آخرت میں جنت کا حصول ان کا نشانہ بن جاتا ہے۔

سوچ کے اس فرق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دینی مدارس میں تعلیم پائے ہوئے لوگ تعیش (luxury) کے بجائے ضرورت کو اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ وہ فراوانی (abundance) کے بجائے قناعت کے اصول پر راضی رہتے ہیں۔ کل کی خوشی کا احساس ان کے لئے آج کے غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ وہ کبھی مایوسی سے دوچار نہیں ہوتے، کیوں کہ جو کچھ انھیں موجودہ دنیا میں ملتا ہے اسی کو وہ اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا سینہ حرص اور حسد جیسے منفی احساسات سے پاک ہوتا ہے۔ کیوں کہ حرص اور حسد جیسے احساسات مادی کمی کی زمین پر ابھرتے ہیں، اور دینی تعلیم کے تربیت یافتہ لوگ اپنے غیر مادی ذہن

کی بنا پر اس کمزوری سے پیشگی طور پر محفوظ ہوتے ہیں۔

یہ چند مثالیں بتاتی ہیں کہ دینی مدارس اور غیر دینی مدارس میں کتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ دینی مدارس حقیقی علم پر قائم ہیں، اس کے مقابلہ میں سیکولر مدارس غیر حقیقی علم پر۔ یہ فرق بے حد بنیادی ہے۔ اس فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ جس پہلو سے بھی دونوں کے درمیان تقابل کیا جائے دینی مدارس ہر اعتبار سے سیکولر مدارس پر فائق نظر آئیں گے۔

دینی مدارس اور غیر دینی مدارس کے فرق کے بارے میں یہاں جو کچھ لکھا گیا، وہ اصولی اعتبار سے لکھا گیا ہے۔ جہاں تک عملی حیثیت کا تعلق ہے، دینی مدارس میں بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ مگر بنیادی بات یہ ہے کہ غیر دینی تعلیم گاہوں میں جو کمیاں ہیں وہ عین ان کے اصول اور فلسفہ کی بنا پر ہیں۔ اور اس اعتبار سے وہ ان کے نظام کا لازمی حصہ ہیں۔ جب کہ دینی تعلیم گاہوں میں جو کمیاں پائی جاتی ہیں وہ ان کی عملی کوتاہی کا نتیجہ ہیں نہ کہ نظریۂ تعلیم میں نقص کا نتیجہ۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ عملی کوتاہی کو اصلاحی کوشش سے دور کیا جا سکتا ہے، جب کہ نظریاتی نقص کو اس وقت تک دور نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ خود نظریہ ہی کو غلط قرار دے کر اس کو رد نہ کر دیا جائے۔

مدرسہ کلچر

ہندستان میں یا دوسرے ملکوں میں جو سیکولر تعلیمی ادارے قائم ہیں، ان کی بنیاد مادی فلسفہ پر ہے۔ یعنی جو کچھ ہے یہی دکھائی دینے والی دنیا ہے۔ اس دنیا کے سوا کسی اور حقیقی چیز کا وجود نہیں۔ اس فلسفہ کی بنا پر سیکولر نظام تعلیم اپنے طلبہ کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ اپنی ساری طاقت مادی ترقی میں لگاؤ۔ دنیا کی خوشی (pleasure) جتنی زیادہ ممکن ہو حاصل کرو۔ تمہارے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز مادی مفاد (material interest) ہے نہ کہ غیر مادی اقدار، وغیرہ۔

اس سیکولر نظام تعلیم اور سیکولر تہذیب نے ساری دنیا کو مادہ پرست بنادیا ہے۔ مادی فکر، مادی اخلاق اور مادی سرگرمیاں لوگوں کے اوپر اتنا زیادہ چھا گئی ہیں کہ اب یہاں مادیات کا جنگل بنتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس وسیع صحرا میں دینی مدارس کی حیثیت گویا نخلستان کی ہے۔ دینی مدارس کی بنیاد، برعکس طور پر، غیر مادی تہذیب یا روحانی فلسفہ پر رکھی گئی ہے۔ مدارس کا پورا نصاب اور اس کا پورا نظام اس ڈھنگ پر بنا ہے کہ وہ لوگوں کو مادی سطح سے اوپر اٹھائے۔ وہ مادی کلچر کے مقابلہ میں روحانی کلچر کا متبادل (alternative) پیش کرے۔ مدارس کے نظام میں یہ مقصد کس طرح جاری و ساری ہے، اس کو میں اپنی مدرسی زندگی کے کچھ ذاتی تجربات کی روشنی میں بتانے کی کوشش کروں گا۔

ا۔ "مدرسہ کلچر" کا پہلا تجربہ مجھ کو اپنے گاؤں کے مدرسہ میں ہوا جہاں میں نے اردو اور فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ یہاں اس زمانہ میں مولانا اسماعیل میرٹھی (وفات ۱۹۱۷) کی اردو ریڈریں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان ریڈروں میں بہت سلیقہ کے ساتھ اخلاقی اور روحانی تعلیمات سمودی گئی تھیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر، انہیں اپنے ذہن کا جزء بناتا رہا۔ جن کا اثر آج تک میں اپنی زندگی میں پاتا ہوں۔

ایک اردو ریڈر میں مصنف نے ایک کہانی بیان کی ہے کہ ایک اونٹ بھٹک کر جنگل میں پہنچ گیا۔ اس کی نکیل کی رسی زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ ایک چوہے نے دیکھا تو اس کو شوق ہوا کہ میں اس اونٹ کو اپنے ہاں لے جاؤں اور اس کو اپنا مہمان بناؤں۔ اس نے اونٹ کی رسی اپنے منہ میں پکڑلی اور اپنی بل کی

طرف چلنے لگا۔اونٹ بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔یہاں تک کہ دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں چوہے کی بل تھی۔اب چوہا بہت پشیمان ہوا کیوں کہ اس نے تقابل کر کے دیکھا تو اس کو معلوم ہوا کہ اس کی بل بہت چھوٹی ہے اور اس کے مقابلہ میں اونٹ بہت زیادہ بڑا ہے۔اس کے بعد مصنف نے لکھا تھا:

کیا کیا خیال باندھے ناداں نے اپنے دل میں پر اونٹ کی سمائی کب ہو چوہے کے بل میں

یہ حقیقت پسندی کا پہلا سبق تھا جو مجھے اپنی زندگی میں ملا۔اور بلاشبہ اس دنیا میں حقیقت پسندی کے بغیر کوئی بھی کام نہیں کیا جاسکتا۔خواہ اس کا تعلق انفرادی معاملہ سے ہو یا اجتماعی معاملہ سے۔

۲۔ مدرسۃ الاصلاح کی تعلیم کے زمانہ میں میرے ایک استاد مولانا نجم الدین اصلاحی (وفات ۱۹۹۵) مرتب مکتوبات شیخ الاسلام تھے۔ان سے میں نے فارسی کی کئی کتابیں، مثلاً گلستاں اور بوستاں وغیرہ پڑھیں۔فارسی زبان کی ایک امتیازی صفت یہ ہے کہ اس میں بڑے پیمانہ پر اخلاقی ادب تیار ہوا۔اخلاقیات پر جتنی اچھی کتابیں فارسی زبان میں ہیں شاید کسی اور زبان میں نہیں۔چنانچہ فارسی کتابوں سے مجھے حکمت اور اخلاق کی بہت سی اعلیٰ باتیں ملیں۔استاد مرحوم نے ایک بار فارسی کا ایک شعر سنایا جو عظیم حکمت پر مشتمل ہے۔شاعر کہتا ہے کہ — میرے اور تمہارے درمیان صرف سننے کا فرق ہے۔جس آواز کو تم دروازہ بند ہونے کی آواز سمجھ رہے ہو، اس کو میں دروازہ کھلنے کی آواز کے طور پر سن رہا ہوں:

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو تو غلقِ باب و منم فتحِ باب می شنوم

استاد مرحوم نے اس شعر کی جو تشریح کی تھی وہ طالب علمی کے زمانہ میں زیادہ گہرائی کے ساتھ مجھ پر واضح نہیں ہوئی تھی۔مگر یہ فارسی شعر میرے حافظہ کا جزء بن گیا۔بعد کے مطالعہ اور تجربہ کے درمیان اس کی اہمیت اور معنویت واضح ہوتی چلی گئی۔یہاں تک کہ میری سمجھ میں آیا کہ جو بات اس شعر میں کہی گئی ہے وہ موجودہ ناموافق دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔اس دنیا میں وہی شخص بڑی ترقی حاصل کر سکتا ہے جس کا شعور اتنا زیادہ بیدار ہو کہ وہ منفی واقعات میں مثبت پہلو تلاش کر سکے۔وہ دروازہ بند ہونے کی آواز میں دروازہ کھلنے کی آواز سن لے۔

۳۔ جس مدرسہ میں میری تعلیم ہوئی وہاں عربوں کے کلام جاہلیت کا بہت تذکرہ تھا۔کیوں کہ وہ لوگ قرآن فہمی کے لئے اس کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔مجھے زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ

اس جاہلی کلام میں حکمت کی باتیں کثرت سے موجود ہیں۔ بعد کے مطالعہ سے میں نے یہ جانا کہ اس کا سبب یہ تھا کہ جاہلی دور کے عربوں میں انسانی صفات (human qualities) نہایت اعلیٰ درجہ میں موجود تھیں۔ وہ نہایت زندہ لوگ تھے۔ اس کا اظہار ان کے کلام میں ہوتا تھا۔ مدرسہ کی زندگی میں عرب جاہلیت کے جو اشعار میں نے پڑھے اور سنے ان میں سے ایک یہ تھا: جب آدمی کی آبرو قابل ملامت کردار سے گندی نہ ہوئی ہو تو وہ جو چادر بھی اوڑھے وہ اس کے لئے خوبصورت ہوگی:

اذاالمرء لم یدنس من اللؤم عرضہ فکل رداء یرتدیہ جمیل

میرا مزاج بچپن سے یہ تھا کہ میں تکلفات کے مقابلہ میں سادگی اور ظاہر داری کے مقابلہ میں حقیقت بینی کو پسند کرتا تھا۔ اس شعر نے غالباً پہلی بار میرے غیر شعوری مزاج کو شعور کا درجہ دیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ایسا ہوا کہ ظواہر کی اہمیت میرے ذہن سے نکل گئی۔ میں ہمیشہ یہ دیکھنے لگا کہ کوئی چیز اصل حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے۔ ظاہر دارانہ انداز مجھے یکسر بے معنی نظر آنے لگا۔

۴۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں مدرسۃ الاصلاح کے ایک استاد مولانا محمد احمد لہراوی تھے۔ انہوں نے مجھ کو جو کتابیں پڑھائیں ان میں سے ایک موطا امام مالک تھی۔ حدیث کی اس کتاب کو پڑھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث اس طرح میرے ذہن کا جزء بن گئی کہ وہ پھر کبھی مجھ سے جدا نہ ہوئی۔ وہ یہ ہے: عن حمید بن عبد الرحمن بن عوف، ان رجلاً اتی الی رسول اللہ ﷺ فقال: یا رسول اللہ علّمنی کلمات أعیش بھن ولا تکثر علیّ فانسی، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "لاتغضب" (کتاب الجامع، باب ماجاء فی الغضب) ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، مجھ کو ایسے کلمات بتایئے جن کے ساتھ میں جیوں۔ اور وہ کلمات زیادہ نہ ہوں کہ میں بھول جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم غصہ نہ کرو۔

استاد محترم کے اندر اگرچہ کسی قدر غضب کا مزاج تھا تاہم انہوں نے اس حدیث کی جو تشریح کی وہ میرے حافظہ میں نقش ہوگئی۔ اس سے مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں زندگی کا یہ بنیادی اصول مل گیا کہ آدمی کو غصہ کے حالات میں بھی غصہ کے بغیر جینا ہے۔ مزید مطالعہ کے بعد میری سمجھ میں آیا

کہ اس حدیث میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی کو اشتعال انگیز حالات میں بھی معتدل جواب دینا چاہئے۔ آدمی کو منفی ردعمل کی نفسیات سے مکمل طور پر پاک ہونا چاہئے، حتی کہ اشتعال انگیز حالات میں بھی۔

۵۔ مدرسہ میں درسیات کے تحت جو کتابیں میں نے پڑھیں ان میں سے ایک نہج البلاغہ تھی جو خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کے کلام پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مولانا اختر احسن اصلاحی نے پڑھائی تھی۔ وہ مولانا حمید الدین فراہی کے براہ راست شاگرد تھے۔ اس کتاب میں حکمت کی بڑی عجیب عجیب باتیں ہیں۔ گویا کہ یہ کتاب ایک کتاب حکمت (Book of wisdom) ہے۔ اس سے مجھے ابتدائی دور حیات میں تعلیم کے دوران ہی ایسی حکیمانہ باتیں معلوم ہوگئیں جو میرے لئے بعد کی زندگی میں بہت کار آمد ثابت ہوئیں۔ ان میں سے ایک، حضرت علی کا یہ قول ہے: العاقل ھو الذی یضع الشیٔ مواضعہ (عقل مند وہ ہے جو چیزوں کو ان کے مقام پر رکھے)۔

یہ ایک بے حد حکیمانہ کلام ہے۔ زندگی کے معاملات ہمیشہ بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بیشتر حالات میں انسان کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ افکار کے جنگل میں صحیح فکر کے سرے کو دریافت کرے۔ وہ متنوع انتخاب (options) میں صحیح انتخاب کو معلوم کرسکے۔ وہ دو مشابہ چیزوں کے درمیان فرق کو جانے تاکہ وہ غلط انطباق کی نادانی نہ کرے۔ ایسی حالت میں وہی شخص صاحب عقل کہے جانے کے قابل ہے جو، حضرت علی کے الفاظ میں، چیزوں کو ان کے اصل مقام پر رکھ سکے۔ یہی آدمی غلط استدلال سے بچے گا۔ وہ اس سے محفوظ رہے گا کہ غلط رائے اور غلط منصوبہ بندی میں مبتلا ہو جائے اور پھر خود بھی تباہ ہو اور دوسروں کی تباہی کا سبب بنے۔ اس حکیمانہ قول نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔ اس نے ابتداء ہی سے مجھے یہ ذہن دیا کہ میں صحیح تجزیہ کرنے کی کوشش کروں تاکہ صحیح رائے پر پہنچ سکوں۔

۶۔ مدرسۃ الاصلاح کے ایک ممتاز استاد مولانا محمد شبلی ندوی تھے۔ ان سے ہم نے فقہ اور کلام کی کتابیں پڑھیں۔ ان میں سے ایک ابن رشد کی کتاب بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد تھی۔ درس کے دوران اس کی یہ عبارت سامنے آئی: فأما شرط الحرب فھو بلوغ الدعوۃ باتفاق. أعنی أنہ لا یجوز حرابتھم حتی یکونوا قد بلغتھم الدعوۃ، وذلک شئ مجتمع علیہ من المسلمین لقولہ تعالیٰ: وما کنا معذبین حتی نبعث رسولاً (کتاب الجہاد، الفصل الرابع فی شرط الحرب) یعنی جہاں

تک جنگ کی شرط کا تعلق ہے تو وہ دعوت کا پہنچنا ہے۔ اور اس پر اتفاق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے جنگ کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ ان پر دعوت پہنچ گئی ہو۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس پر مسلمان متفق الرائے ہیں۔ اس کی بنیاد قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ ہم کسی کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ ہم اس کے پاس رسول نہ بھیج دیں۔

استاد مرحوم نے اس عبارت کی جو تشریح کی اس سے مجھے ایک اہم دینی نکتہ ملا۔ ابتدائی دور میں وہ کسی قدر مبہم صورت میں تھا بعد کے مطالعہ سے وہ زیادہ واضح ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میری سمجھ میں آیا کہ دین اسلام میں جنگ یا ٹکراؤ صرف ثانوی انتخاب (secondary option) ہے، وہ پہلا انتخاب (first option) نہیں۔ کسی فرد یا قوم سے نزاع کی صورت پیش آئے تو پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ پر امن بات چیت کے انداز میں مسئلہ کو حل کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہر ممکن ذریعہ اختیار کیا جائے۔ پر امن کوشش جب اتمام حجت کے درجہ کو پہنچ جائے اور اس کے باوجود فریق ثانی ٹکراؤ پر قائم رہے تو اس کے بعد ثانوی انتخاب کے طور پر جنگ قابل غور ہوگی۔

تجربات کی روشنی میں

دینی مدرسہ میں تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی باتوں سے بے خبر رہ جائے۔ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی باقاعدہ طور پر صرف دینی درس گاہ میں تعلیم پائے، اس کے باوجود وہ ان علوم و معارف سے باخبر ہو جن کو دنیا کے علوم و معارف کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال میں خود ہوں۔ میری باقاعدہ تعلیم دینی مدرسہ یا علماء کی صحبتوں میں ہوئی۔ مگر اس کے بعد میں نے اللہ کے فضل سے بیشتر سیکولر علوم کا مطالعہ کیا۔ پامسٹری سے لے کر اسٹرانومی تک شاید ہی کوئی علم ہو جس کو میں نے نہ پڑھا ہو۔

اس کا راز یہ تھا کہ میں نے مدرسہ سے فراغت کے بعد ذاتی محنت سے انگریزی زبان اچھی طرح سیکھ لی۔ انگریزی سیکھتے ہی میری دسترس تمام علوم تک ہو گئی۔ دوسری طرف میں اپنے دعوتی مزاج کی بنا پر ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت زیادہ اسفار کرنے لگا۔ اس طرح انگریزی زبان اور عمومی اختلاط (interaction) میرے لئے تمام علوم سے واقفیت کے لئے کافی ہو گیا۔ مدارس کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانہ میں کثیر تعداد میں ایسے لوگ رہے ہیں جن کی تعلیم اصلاً مدرسہ میں ہوئی لیکن اس کے بعد انھوں نے دنیوی علوم میں بھی مہارت حاصل کر لی اور یہ سب ان کی ذاتی محنت سے ممکن ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف علوم کو حاصل کرنے کے سلسلہ میں اصل اہمیت کھلے ذہن (open mind) کی ہے۔ اگر آدمی جمود ذہنی میں مبتلا نہ ہو، اگر وہ کھلے دل و دماغ کے ساتھ ہر چیز کو دیکھے اور ہر چیز کو پڑھے تو پوری دنیا اس کے لئے ایک عظیم درسگاہ بن جائے گی۔ وہ ہر لمحہ نئی نئی باتیں سیکھے گا۔ ہر روز وہ نئے علم سے واقفیت حاصل کرے گا۔ ڈگری کی حیثیت صرف پہچان کی ہے، جہاں تک علم کا تعلق ہے، اس کو آدمی ذاتی محنت سے حاصل کرتا ہے۔ اور ذاتی محنت کا دروازہ کبھی کسی کے لئے بند نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وسعت علم کے لئے اصل اہمیت اس مزاج کی ہے جو حضرت عمر فاروق کے اندر پایا جاتا تھا، جیسا کہ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: کان یتعلم من کل احد۔ یہ بات مدرسہ کے مقاصد میں شامل ہے کہ رسمی تعلیم کے علاوہ وہ طالب علم کے اندر اس قسم کا متعلمانہ ذوق پیدا کرے۔

تعلیم (education) کیا ہے۔ فنی بحثوں سے قطع نظر تعلیم کا مقصد بنیادی طور پر ایک ہے، اور

وہ انسانی شخصیت کا ارتقاء (personality development) ہے۔ تعلیم کے ذریعہ پیشہ ورانہ یا پروفیشنل ڈگری حاصل کرنا ایک اضافی چیز ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد شعور انسانی کو بیدار کرنا ہے۔ اور اس کو ان حقیقتوں سے باخبر کرنا ہے جو وسیع تر زندگی میں کام آنے والی ہوں۔

میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مدارس دینیہ، دوسری تعلیم گاہوں کی طرح اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ میں مکمل طور پر مدرسہ کی پیداوار (product) ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھ کو ایک کامیاب انسان سمجھتا ہو تو میں کہوں گا کہ میری یہ کامیابی تمام تر مدرسہ کی دین ہے۔ مدرسہ سے مجھے وہ شعور ملا اور وہ اقدار (values) حاصل ہوئیں جو میرے لئے جدوجہد حیات میں ہر قدم پر رہنما بن گئیں۔

مدرسہ ہو یا کالج اور یونیورسٹی، کوئی بھی ادارہ کسی انسان کو مکمل علم نہیں دیتا اور نہ دے سکتا۔ انسان اپنی پختگی کی عمر کو ۳۵ سال کے بعد پہنچتا ہے جب کہ مدرسہ یا یونیورسٹی کی تعلیم اس عمر سے پہلے ہی مکمل ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی تعلیمی ادارہ کسی انسان کو کامل علم دے سکے جس طرح ایک کیلو کے برتن میں دس کیلو دودھ رکھنا ممکن نہیں اسی طرح طالب علمی کی عمر میں کسی کو کامل علم بھی نہیں دیا جا سکتا۔

یہاں میں کیمسٹری کے ایک نوبل انعام یافتہ ایچ اے۔ کربز (H. A. Krebs) کی بات نقل کروں گا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ نوبل انعام حاصل کرنے کے لئے اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ دوران تعلیم آدمی کو معلومات کا انبار مل جائے۔ بلکہ ساری اہمیت اس بات کی ہے کہ آدمی کو کوئی ایسا ادارہ یا ایسا استاد مل جائے جو اس کے اندر صحیح زاویۂ نظر (attitude of mind) پیدا کر دے۔ اسی ابتدائی زاویۂ نظر کی رہنمائی میں آدمی آگے بڑھتا ہے اور ذاتی محنت سے ترقی کرتے کرتے وہ نوبل انعام تک پہنچ جاتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ مدرسہ کی تعلیم کا ہے۔ کوئی مدرسہ بذات خود کسی کو بڑا عالم نہیں بناتا۔ مدرسہ کا کام یہ ہے کہ وہ آدمی کو صحیح طرز فکر دے، جس کی روشنی میں وہ آئندہ اپنا علمی سفر مفید سمت میں جاری رکھ سکے۔ یہاں تک کہ وہ علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ جائے۔

انسان کی استعداد ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔ چنانچہ حصول علم کے لئے اس کا سفر بھی ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ایسی حالت میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ابتدائی عمر یا بالفاظ دیگر دور تیاری

(formative period) ہی میں اس کو مطالعہ اور استنباط کا صحیح رخ مل جائے۔ یہ رخ استاد اور ادارہ دونوں سے ملتا ہے۔ ایک لائق استاد گویا ایک زندہ لائبریری ہوتا ہے جو طالب علم کو بہترین رہنمائی دیتا رہتا ہے۔ اسی طرح ادارہ کا ماحول اگر تعمیری اور صحت مند ہو تو وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر طالب علم کی علمی شخصیت کی تشکیل میں موثر مددگار ثابت ہوتا ہے۔

یہاں میں علامتی طور پر ان میں سے صرف چند ذاتی تجربات کا ذکر کروں گا۔ تاہم یہ کسی ایک فرد کی کہانی نہیں ہے بلکہ وہ میرے جیسے ان لاکھوں لوگوں کی کہانی ہے جن کو مدارس سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ اور پھر انھوں نے دنیا میں ایک کامیاب زندگی گزاری۔

ا۔ مدرسۃ الاصلاح میں قرآن خصوصی طور پر داخل نصاب تھا۔ یہاں مجھے یہ موقع ملا کہ میں مشہور اور ممتاز عالم مولانا امین احسن اصلاحی (صاحب تدبر القرآن) سے براہ راست قرآن کی تعلیم حاصل کروں۔ مولانا محترم اس وقت مدرسہ میں استاد تفسیر بھی تھے اور صدر مدرس بھی۔ ایک روز درس قرآن کے دوران قرآن کے تیسویں پارہ کی یہ آیت سامنے آئی: افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۔ (الغاشیہ ۱۷) استاد محترم مولانا امین احسن اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) نے اس موقع پر طلبہ سے سوال کیا کہ اونٹ کے سُم پھٹے ہوتے ہیں یا جڑے ہوتے ہیں۔ یعنی بیل کی مانند ہوتے ہیں یا گھوڑے کی مانند۔ اس وقت ہماری جماعت میں تقریباً ۲۰ طالب علم تھے۔ مگر کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ اس کا جواب نہ دے سکا۔ ہر ایک اٹکل سے کبھی ایک جواب دیتا اور کبھی دوسرا جواب۔

اس کے بعد استاد محترم نے ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے جوابات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم لوگ اونٹ کے سُم کی نوعیت کے بارے میں نہیں جانتے۔ پھر انھوں نے عربی زبان کا یہ مقولہ سنایا "لا ادری" نصف العلم (میں نہیں جانتا، آدھا علم ہے) اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر تم لوگ یہ جانتے کہ تم اونٹ کے سم کے بارے میں بے خبر ہو تو گویا کہ اس معاملہ میں تمہارے پاس آدھا علم موجود ہوتا۔ کیوں کہ اپنی لاعلمی کو جاننے کے بعد تمہارے اندر یہ شوق پیدا ہوتا کہ تم اپنے علم کو مکمل کرنے کے لئے یہ معلوم کرو کہ اونٹ کے سُم کیسے ہوتے ہیں۔ اگر لاادری کا شعور تمہارے اندر بیدار ہوتا تو اونٹ پر نظر پڑتے ہی تم اس کے سُم کو غور سے دیکھتے اور پھر تم اپنے نہ جاننے کو جاننا بنا لیتے۔

مدرسہ کا یہ واقعہ میرے لئے اتنا موثر ثابت ہوا کہ یہ میرا عمومی مزاج بن گیا کہ میں ہر معاملہ میں اپنی ناواقفیت کو جانوں، تا کہ میں اس کو واقفیت بنا سکوں۔ علمی تلاش کا یہ جذبہ مجھے ابتداءً مدرسہ سے ملا تھا۔ بعد کو میں نے اس موضوع پر مغربی مصنفین کی کچھ کتابیں پڑھیں، مثلاً اسپرٹ آف انکوائری (spirit of inquiry)۔ ان سے معلوم ہوا کہ تجسس کا یہی جذبہ تمام علمی ترقیوں کی اصل بنیاد ہے۔ اس کی ایک مشہور مثال یہ ہے کہ ہزاروں لوگوں نے سیب کو درخت سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اس معاملہ میں وہ اپنے "لاادری" کو نہیں جانتے تھے، اس لئے وہ اس کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ نیوٹن پہلا شخص ہے جس نے اس معاملہ میں اپنے لاادری کو جانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس معاملہ میں "ادری" کے درجہ تک پہنچ گیا۔

۲۔ مدرسہ کے نصاب کے تحت میں نے شعر وادب پر جو کتابیں پڑھیں ان میں سے ایک دیوان الحماسہ ہے۔ یہ کتاب میں نے مولانا اختر احسن اصلاحی (وفات ۱۹۸۵) سے پڑھی۔ مولانا مرحوم کو کلامِ جاہلیت پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ دیوان الحماسہ عرب جاہلیت کے شعراء کے کلام کا انتخاب ہے جس کو ابو تمام (وفات ۸۴۵ء) نے تیار کیا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں مجھے اس دیوان کے بہت سے اشعار یاد ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض اشعار ایسے ہیں جن کا میری زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

اذا المرء اعیته المروٴة ناشئاً فمطلبها کهلاً علیه شدید

جب آدمی جوانی کی عمر میں مردانگی کی صفات حاصل کرنے میں عاجز رہ جائے تو ادھیڑ عمر میں اس کو پانا اس کے لئے بہت مشکل ہے۔

اس عربی شعر کی جو تشریح استاد محترم نے کی اس سے میں نے زندگی کی اس حقیقت کو سمجھا کہ کام کرنے کی بہترین عمر جوانی کی عمر ہوتی ہے۔ جو آدمی جوانی کی عمر کو استعمال نہ کر سکے وہ زیادہ عمر کو پہنچنے کے بعد کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے میرا یہ مزاج بن گیا کہ میں اپنے وقت کا کوئی حصہ ضائع نہیں کرتا تھا۔ رات دن کے ہر لمحہ کو میں مفید طور پر استعمال کرنے لگا۔ ابتدائی عمر سے عمل کا یہ مزاج بن جانا میرے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوا۔ اگر میں جوانی کی عمر کو غیر ضروری چیزوں میں کھو دیتا تو بعد کو میرے ساتھ وہی الیہ پیش آتا جس کو مسٹر رشید کوثر فاروقی ایم اے

نے اپنے ایک شعر میں اس طرح نظم کیا ہے:

زیست کا راز کھلا گردش ایام کے بعد اس کہانی کا تو آغاز تھا انجام کے بعد

۳۔ مدرسہ کے ماحول میں عملی اعتبار سے جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ رات اور دن کے درمیان پانچ وقت کی نمازیں ہیں۔ باجماعت نماز کا نظام مدرسہ کی زندگی میں مرکزی حیثیت (central position) رکھتا ہے۔ نماز اگرچہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی قربت تلاش کرنے کا نام ہے لیکن اس کا عملی اور ظاہری ڈھانچہ اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مزید اس چیز کی مکمل تربیت بن جاتی ہے جس کو ڈسپلن کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہر مدرسہ عملی طور پر نظم اور ڈسپلن کا ایک تربیتی سنٹر ہوتا ہے۔ مدرسہ کے نظام کے ساتھ ڈسپلن کا اضافہ اس کی اہمیت کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

پنج وقتہ نماز میں ڈسپلن کا یہ پہلو فرد کی روزانہ زندگی کو منظم کرتا ہے۔ اس کے رات دن کے اوقات گھڑی کی سوئی کی طرح نظم وضبط کے ساتھ گزرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کے منظم افراد سے جو مجموعی سماج بنتا ہے وہ اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ کوئی بھی طوفان اس کو ہلا نہ سکے۔

الفضل ما شهدت به الاعداء کے اصول پر یہاں قدیم ایران کے مجوسی سپہ سالار رستم کا ریمارک قابل ذکر ہے جو اس نے نماز کے اجتماعی پہلو پر کیا تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں جب مسلم فوجیں ایران میں داخل ہوئیں تو اس وقت وہاں مسقف مسجدیں نہ تھیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں کھلے میدان میں باجماعت نماز ادا کرنے لگے۔ رستم نے باجماعت نماز کے منظر کو دیکھا تو اس نے چیخ کر کہا: اكلَ عمرُ كبدى، يعلّم الكلابَ الآدابَ (مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۱۵۲)

میں جس زمانہ میں مدرسہ میں پڑھتا تھا وہاں باجماعت نماز کی نگرانی مدرسہ کے ایک سینئر استاد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کرتے تھے۔ وہ صبح کو فجر کی اذان کے فوراً بعد ہاسٹل میں آکر طلبہ کو جگایا کرتے تھے۔ اس وقت میں نوجوانی کی عمر میں تھا۔ میری نیند مشکل سے کھلتی تھی۔ چنانچہ مولانا مرحوم میرے بارے میں کہتے: "یہ بہت سخت سوتا ہے"۔

مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ مسجد کے وسیع اور کھلے صحن میں نماز کی صفیں کھڑی ہوئی تھیں۔ غالباً عشاء کی نماز ہو رہی تھی۔ اچانک ایک سانپ مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ صفوں سے گزرتا ہوا پیچھے کی

طرف جارہا تھا جہاں جوتے اتارے جاتے تھے۔ سانپ اگرچہ زیادہ بڑا نہ تھا تاہم سانپ تو سانپ ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ پوری جماعت میں کوئی بھگدڑ نہیں ہوئی۔ لوگ بدستور اپنی جگہ کھڑے رہے۔ اور سانپ لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس واقعہ کی صورت میں میں نے گویا مشاہداتی تجربہ کیا کہ نماز آدمی کے اندر کس قدر نظم و ضبط پیدا کرتی ہے۔

ایک مرتبہ مدرسہ کے صدر مدرس مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نماز کے بعد مسجد میں تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ نماز میں آپ کو مل کر عمل کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کا تعلق صرف مسجد تک نہیں ہے، مسجد سے باہر کی زندگی بھی آپ کو اسی طرح نظم واتحاد کے ساتھ گزارنی ہے۔ وہ زبردست مقرر تھے۔ تقریر کرتے ہوئے انھوں نے باب تفاعل کے چند الفاظ استعمال کئے جو عربی میں مشارکت کا مفہوم رکھتا ہے۔ مثلاً توافق، تشارك، تعامل، وغیرہ۔ اس کے بعد انھوں نے خطیبانہ انداز میں کہا: "باب تفاعل کے سارے صیغے گردان ڈالو۔" اس طرح ہر مدرسہ میں پنج وقتہ نماز با جماعت کی صورت میں اتحاد اور ڈسپلن کی تعلیم دی جاتی ہے۔ گویا ہر مدرسہ عملاً نظم اور ڈسپلن کا تربیتی سنٹر بنا رہتا ہے۔

دینی مدارس کے اس پہلو کی مزید اہمیت یہ ہے کہ مدرسہ کے نظام میں نظم اور ڈسپلن صرف ایک انسانی سلوک یا سماجی کلچر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ نماز سے وابستہ ہونے کی بنا پر اس کو مقدس فریضہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، ڈسپلن کو نماز کے ساتھ جوڑ کر اس کو ایک مقدس انسانی فریضہ بنادیا گیا ہے۔

جو لوگ مجھ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ میرے مزاج میں حد درجہ نظم اور ڈسپلن ہے۔ ڈسپلن میری طبیعت ثانیہ (second nature) بن گئی ہے۔ میرا یہ مزاج غالباً اس مسلسل تربیت کا نتیجہ ہے جو مدرسہ کے دور حیات میں مجھے حاصل ہوئی۔ مدرسہ کا عادتی ڈسپلن میرے مزاج میں اس طرح داخل ہوا کہ وہ پھر کبھی مجھ سے جدا نہ ہوا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر مدرسہ گویا نظم و ڈسپلن کا ایک ٹریننگ سنٹر ہے، وہ زندگی کو منظم انداز (disciplined way) میں گزارنے کی ایک مستقل تربیت گاہ ہے۔

۴۔ مدرسہ کے زمانۂ قیام کا ایک واقعہ بے حد سبق آموز ہے۔ یہ واقعہ میں نے اپنے ایک مضمون (حالات بدل سکتے ہیں) میں لکھا تھا جو ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) کے شمارہ ذیقعدہ۔ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ میں چھپ چکا ہے۔ یہ واقعہ الفرقان کے صفحات سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

غالباً ۱۹۴۰ کی بات ہے۔ ہمارے علاقہ میں سخت خشک سالی ہوئی۔ برسات کا موسم گزرتا جارہا تھا۔ مگر بارش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کسان روز آنہ صبح اٹھتے ہی آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر بادل کا ایک ٹکڑا بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ بالآخر جب مایوسی حد کو پہنچ گئی تو یہ تحریک ہوئی کہ استسقاء کی نماز پڑھی جائے۔ مدرستہ الاصلاح سے تقریباً دو کیلو میٹر دور ایک میدان میں مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ اور اطراف کی بستیوں کے مسلمان جمع ہوئے۔ مرحوم مولانا محمد سعید صاحب جو اس وقت مدرستہ الاصلاح میں استاد تھے اور جن سے میں نے حدیث پڑھی تھی، انھوں نے استسقاء کی نماز پڑھائی اور آخر میں بارش کے لئے دعا کی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہم لوگ سخت چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سفر کر کے وہاں پہنچے تھے اور اس حال میں نماز ادا کی تھی کہ جسم پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ مگر نماز سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ واپس ہوئے تو راستہ ہی میں بارش شروع ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے درختوں کے نیچے پناہ لی اور کچھ بھیگتے ہوئے اپنے گھروں کو بھاگے۔ (صفحہ ۴۴)

اس تجربہ میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں خدا کی مدد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ واقعہ میرے لئے اس عقیدہ کا ایک حسّی مظاہرہ بن گیا کہ "مانگو تو پاؤ گے، دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا"۔ اس وقت میری عمر ۲۰ سال کے قریب تھی جب کہ انسان چیزوں کو نہایت شدت کے ساتھ اخذ کرتا ہے۔ چنانچہ یہ تجربہ میرے شعور کا مستقل جزء بن گیا۔ وہ میری پوری شخصیت میں اس طرح شامل ہو گیا کہ پھر وہ کبھی مجھ سے جدا نہ ہو سکا۔

اس طرح کے تجربات صرف دینی مدرسہ کے ماحول میں پیش آتے ہیں۔ اس طرح مدرسہ علم کے حصول کے ساتھ روحانی تربیت کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ مدرسہ کے ماحول میں آدمی کو بار بار اعتماد علی اللہ اور معرفتِ آخرت کی خوراک ملتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسہ کے ماحول میں تیار ہونے والا انسان علم اور روحانیت دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے، نہ کہ یک طرفہ قسم کا انسان، جیسا کہ عام طور

پر سیکولر تعلیم گاہوں میں پایا جاتا ہے۔

مدرسہ کی یہ تربیت میرے لئے زندگی کے بعد کے دور میں میرا سب سے بڑا سرمایہ بنی رہی۔ کسی بڑے کام کا حوصلہ اللہ پر اعتماد کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہی سرمایہ مدرسہ سے مجھ کو حاصل ہوا۔ مجھے اپنے مقصد حیات کے اعتبار سے مادی ذرائع سے زیادہ اللہ پر بھروسہ کرنا تھا۔ اس قسم کے مشکل فیصلہ پر قائم رہنا میرے لئے زیادہ تر اسی مدرسی تربیت کی بنا پر ممکن ہو سکا۔ احیاء دعوت کا مشن جو میں نے اپنی زندگی میں اختیار کیا وہ حدیث کی زبان میں معروف دین کے مقابلہ میں اجنبی دین کے لئے کھڑا ہونا تھا۔ یہ بلاشبہ اس آسمان کے نیچے سب سے زیادہ مشکل مشن ہے۔ اس میں آدمی کو اکیلا ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں اور سمندروں کو عبور کرنا آسان ہے مگر اجنبی دین کو لے کر چلنا آسان نہیں۔ اللہ کے فضل سے میں اس دشوار ترین منصوبہ پر ہر قسم کی رکاوٹوں اور ناموافق حالات کے باوجود قائم رہا۔ یہاں تک کہ فضا تبدیل ہو گئی۔ اس انجام کو دیکھنے کے لئے مجھے ۴۰ سال کا صبر آزما انتظار کرنا پڑا۔ اور اس قسم کا انتظار اعتماد علی اللہ کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

غیر سیاسی ایمپائر

لارڈ میکالے کی مذکورہ تعلیمی اسکیم کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کو انگلش کلچر کے رنگ میں رنگ دیا جائے۔ اس وقت ہندستان کے علماء اگر یہ کرتے کہ لارڈ میکالے کے خلاف احتجاج کا طوفان برپا کرتے، انگریز وائسرائے پر بم مارتے، یا انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں آگ لگاتے تو اس کا کچھ بھی نتیجہ حاصل نہ ہوتا بلکہ اس قسم کی منفی سرگرمیاں مسلمانوں کی تباہی میں شاید کچھ اور اضافہ کر دیتیں۔ جیسا کہ ۱۸۵۷ کے متشددانہ تجربہ کے بعد پیش آیا۔

اس کے بجائے علماء اسلام نے یہ کیا کہ لارڈ میکالے کے تعلیمی منصوبہ کے مقابلہ میں ایک جوابی تعلیمی منصوبہ بنایا۔ انہوں نے خاموشی کے ساتھ پورے ملک میں مدارس قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

زندگی میں جب بھی آپ کوئی منصوبہ لے کر اٹھیں تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کا منصوبہ حقیقی حالات کے لحاظ سے قابل بقا (sustainable) ہے یا نہیں۔ اس دنیا میں کوئی بھی منصوبہ ہمیشہ بہت دیر میں اپنا نتیجہ دکھاتا ہے۔ شاہ بلوط (oak) کے درخت کو مکمل درخت بننے کے لئے ایک سو سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اسی طرح قومی منصوبے بھی لمبی مدت کے بعد تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی ایسا منصوبہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا جو تھوڑے دن کی دھوم کے بعد اچانک ختم ہو جائے۔ اس دنیا میں وہی منصوبہ حقیقی معنوں میں منصوبہ ہے جس کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ تاریخ میں مسلسل جاری رہ سکے۔

مدارس دینیہ کی تحریک اسی قسم کی ایک قابل بقا تحریک تھی۔ چنانچہ وہ آغاز کے بعد مسلسل جاری رہی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ بلا رکاوٹ چلتی رہی پھر بیسویں صدی میں وہ مسلسل جاری رہی اور اب اس نے کامیابی کے ساتھ اکیسویں صدی میں قدم رکھ دیا ہے۔

اس مدت میں ہندستان میں لاکھوں کی تعداد میں مکتب اور مدرسہ اور دار العلوم (جامعہ) قائم ہوئے۔ حتی کہ سارے ملک میں دینی اداروں اور تعلیم گاہوں کا ایک جال (network) وجود میں آگیا جو نسل در نسل لوگوں کو تعلیم یافتہ بناتا رہا۔

جیسا کہ معلوم ہے، علم زندگی کا کوئی ایک شعبہ نہیں۔ براہ راست یا بالواسطہ طور پر علم کا تعلق زندگی

کے تمام شعبوں سے جڑا ہوا ہے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ سو سال کی بلا انقطاع تعلیمی جدوجہد اس نوبت کو پہنچی ہے کہ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندستان میں اب مسلمانوں کا غیر سیاسی سطح پر ایک دینی و ملی ایمپائر قائم ہو چکا ہے جو اپنی مختلف خصوصیات کی بنیاد پر قدیم پولیٹیکل ایمپائر سے کہیں زیادہ اہم اور دوررس ہے۔

اس غیر سیاسی ایمپائر کے نمونے آج ہر جگہ اور ہر روز دیکھے جاسکتے ہیں ـــــــ ملک کے مختلف حصوں میں کھڑی ہوئی بلند مسجدیں، مدرسوں کی عالی شان عمارتیں، جدید وسائل سے لیس بڑے بڑے دینی اور ملی ادارے، تقریباً ہر روز ہونے والے عظیم جلسے اور کانفرنسیں، مسلم رہنماؤں کے پر شوکت دورے اور اسفار، مسلم اداروں میں بڑی مقدار میں کار اور ٹیلیفون اور فیکس اور کمپیوٹر جیسی جدید سہولیات، وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے بہت سے مظاہر آج کثرت سے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جو مذکورہ قسم کے غیر سیاسی ایمپائر کا تعارف کراتے ہیں۔ وہ خاموش زبان میں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ آج اس خطۂ ارض میں مسلم ملت کو ایسے عظیم مواقع حاصل ہیں جو سیاسی اقتدار کے زمانہ میں بھی اس کو حاصل نہ تھے۔ سیاسی اقتدار کے زمانہ میں جو کچھ صرف ایک شاہی خاندان کو حاصل ہو سکتا تھا، وہ آج پوری مسلم ملت کو حاصل ہو گیا ہے۔

علماء کی تعلیم دین کی تحریک کی یہ صفت کہ وہ قابل بقا (sustainable) تھی، بے حد اہم ہے۔ اس کے قابل بقا ہونے ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ وہ مستقبل میں ظاہر ہونے والے امکانات کو پا سکے۔ چنانچہ یہ تحریک مسلسل چلتی رہی، یہاں تک کہ وہ جدید صنعتی دور میں پہنچ گئی۔ اور اس طرح وہ اس قابل ہو گئی کہ بعد کے دور میں ظاہر ہونے والے امکانات کو اپنے حق میں استعمال کر سکے۔ اگر یہ تحریک قابل بقا نہ ہوتی تو دوسری بہت سی وقتی سرگرمیوں کی طرح، جدید امکانات کے ظہور سے پہلے ہی وہ ختم ہو جاتی۔ اس طرح اس کے لئے یہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ وہ بعد کو ظاہر ہونے والے امکانات کو اپنی ترقی کا جزء بنا سکے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ سابق پولیٹکل ایمپائر کے کھونے پر مسلمان لمبی مدت تک مرثیہ خوانی کرتے رہے، مگر اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ دنیا میں اس سے کہیں زیادہ بڑے دروازے ان کے لئے کھل گئے۔ اب یہ ممکن ہو گیا کہ یہاں ہم ایک ایسا غیر سیاسی ایمپائر کھڑا کر سکیں جو

اپنے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے سیاسی ایمپائر سے بہت زیادہ بامعنی اور مفید ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سالہ عمل کے نتیجہ میں اس خطۂ ارض میں مسلمانوں کا ایک پرامن غیر سیاسی ایمپائر قائم ہو چکا ہے۔ ہر مسجد و مدرسہ اور ہر مسلم ادارہ اس ایمپائر کا ایک غیر متزلزل ستون ہے۔ آج مسلم قوم کو اس ملک میں جو بقا و استحکام حاصل ہے وہ انہیں لاکھوں اداروں (institutions) کی بدولت ہے۔ اگر یہ ادارے نہ ہوں تو کوئی شہنشاہ بھی ان کو یہ استحکام نہیں دے سکتا۔

یہ واقعہ دور جدید کی بنا پر ممکن ہوا۔ جدید تبدیلیوں نے سیاسی اقتدار کو ثانوی اہمیت کی چیز بنا دیا ہے اب طاقت کا حقیقی سرچشمہ ادارے (institutions) ہیں۔ اداروں کی سطح پر آج وہ سب کچھ مزید اضافے کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی امید پہلے محدود طور پر صرف سیاسی اقتدار سے کی جاتی تھی۔

سیاسی ایمپائر فوج کی طاقت کے زور پر بنتا ہے، اور غیر سیاسی ایمپائر اداروں (Institutions) اور تنظیمات (Organizations) کی طاقت سے قائم ہوتا ہے۔ سیاسی ایمپائر ایک شخص یا گروہ کی عظمت کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ اور غیر سیاسی ایمپائر پوری ملت یا پوری قوم کا محل تعمیر کرتا ہے۔ سیاسی ایمپائر ایک کے اوپر دوسرے کی حکمرانی کی علامت ہوتا ہے، جب کہ غیر سیاسی ایمپائر مجموعی طور پر پوری انسانیت کی فلاح کا ضامن ہے۔ اللہ کی توفیق سے آج یہ غیر سیاسی ایمپائر اس خطۂ ارض کے مسلمانوں کے لئے پورے معنوں میں قائم ہو چکا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

دور کی تبدیلی

حدیث میں آیا ہے کہ: کانت بنوا اسرائیل تسوسھم الانبیاء (فتح الباری بشرح صحیح البخاری،۶؍۵۷۳)یعنی بنی اسرائیل کے (دینی امور) کی نگہبانی ان کے انبیاء کرتے تھے۔

یہ صرف بنی اسرائیل کی بات نہیں، قدیم زمانہ میں یہی تمام امتوں کا معاملہ تھا۔ ہر امت کی نگرانی و نگہداشت کی ذمہ داری اس کے پیغمبر کے اوپر ہوتی تھی۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں مسلسل پیغمبر آتے رہے۔ (المومنون ۴۴) یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ جن کے بعد نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی جو امت بڑی تعداد میں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے، اس کی نگرانی اور نگہداشت کی ذمہ داری کس کے اوپر ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کسی سیاسی حاکم پر نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری امت کے علماء پر ہے۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ: إن العلماء ورثة الانبیاء (صحیح البخاری، کتاب العلم) یعنی علماء نبیوں کے وارث ہیں۔ اس حقیقت کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: علماء امتی کأنبیاء بنی اسرائیل (یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں)۔ یہ آخری حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہونے کے باوجود معنی کے اعتبار سے قوی ہے کیوں کہ دوسری روایتیں اس کے مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔

امت محمدی کے علماء، ختم نبوت کے بعد، مقام نبوت پر ہیں۔ اب امت کے علماء کو وہی کام انجام دینا ہے جس کے لئے پہلے پیغمبر آتے تھے۔ یہ کام بنیادی طور پر دو ہیں —— امت کے امور و مسائل کی تدبیر قرآن و سنت کی رہنمائی میں کرنا، اور اسلام کے ابدی پیغام کو تمام قوموں تک پہنچانا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام تو بہت بڑا کام ہے۔ پیغمبر جب اس کام کو انجام دیتے تھے تو ان کے ساتھ اللہ کے فرشتوں کی غیبی مدد شامل رہتی تھی۔ جو پیغمبروں کے لئے ہر کامیابی کی یقینی ضمانت تھی۔ اب جب کہ اس قسم کی غیبی مدد آنے والی نہیں ہے تو علماء اس بھاری ذمہ داری کو کیوں کر انجام دیں گے۔

اس کا جواب پیشگی طور پر قرآن میں دے دیا گیا ہے۔ قرآن میں دین کی تکمیل و استحکام کا اعلان

کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: فلا تخشوھم واخشون (المائدہ ۳) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ دنیا میں جو انقلاب آیا، اس کے بعد دنیا کی تاریخ میں ایک نیا دور برپا ہو چکا ہے۔ آیت کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ اب خشیت انسانی کا دور ختم ہو گیا، اور انسانی تاریخ تمدنی اعتبار سے خشیت خداوندی کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اب ایک ایسا دور انسانی تاریخ میں آچکا ہے جب کہ کسی کے لئے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ وہ خدا کے دین کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ اب سارے مواقع پورے طور پر اور عمومی طور پر کھول دئے گئے ہیں، اب اگر کوئی رکاوٹ آئے گی تو وہ خود مسلمانوں کی داخلی کوتاہی کی بنا پر ہو گی نہ کہ خارجی زیادتیوں کی بنا پر۔

قدیم بادشاہی نظام کے دور میں توحید کا اعلان کرنے پر آدمی کے اوپر آرا چلا دیا جاتا تھا (صحیح البخاری، کتاب المناقب) اب اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ قدیم آمرانہ سیاست کو ختم کر کے جمہوری سیاست کا دور دنیا میں رائج کر دیا۔ اس کے تحت ہر انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے کہ وہ جس نظریہ کو چاہے اختیار کرے اور جس نظریہ کی چاہے تبلیغ کرے۔

قدیم زمانہ میں کوئی بڑا کام کرنے کے لئے عام لوگوں کے پاس وسائل نہیں ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں اقتصادیات کا تمام تر انحصار زراعت پر تھا۔ اور زرعی زمینوں کا تنہا مالک صرف بادشاہ ہوتا تھا۔ اس لئے دینی کام کرنے کے لئے عام لوگوں کے پاس وسائل نہ ہوتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے صنعتی انفجار (industrial explosion) کی صورت میں معاشی وسائل کا سیلاب بہا دیا۔ آج حکومت کے تعاون کے بغیر ہر آدمی بڑے سے بڑا سرمایہ حاصل کر سکتا ہے اور انتہائی بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج ہندستان میں یونیورسٹیوں کی مانند بہت سی بڑی بڑی دینی درس گاہیں قائم ہیں جو تمام تر غیر سرکاری تعاون کی بنیاد پر چل رہی ہیں، جب کہ قدیم دور میں اس نوعیت کے غیر سرکاری اداروں کی مثال پانا سخت مشکل ہے۔

قدیم زمانہ میں دعوتی کام بہت محدود پیمانہ پر ہو سکتا تھا کیوں کہ اس زمانہ میں سفر کے لئے صرف حیوانات ہوتے تھے جو صرف قریب کی منزل تک انسان کو لے جا سکتے تھے۔ اس زمانہ میں پیغام رسانی کا کوئی بڑا وسیلہ نہ تھا۔ آج کمیونی کیشن کے انقلاب نے ساری صورت حال بدل دی ہے۔ آج آپ چند

منٹوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ سکتے ہیں۔ منٹوں کے وقفے میں اپنا پیغام دنیا کے کسی بھی حصہ میں پہنچا سکتے ہیں۔ پرنٹنگ پریس کے ذریعہ ایک کتاب کو کروروں کی تعداد میں چھاپ کر ہر گھر میں داخل کر سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ جدید امکانات بھی آج بڑے پیانہ پر دین کی اشاعت کے لئے استعمال کئے جارہے ہیں۔ اس مہم میں زیادہ تر مدارس دینیہ کے لوگ ہی براہ راست یا بالواسطہ طور پر شریک ہیں۔ میں خود اپنے آپ کو بھی اسی قافلۂ مدارس کا ایک فرد سمجھتا ہوں۔

مذکورہ قسم کی بے شمار تبدیلیاں جو دنیا میں آئی ہیں وہ زیادہ تر غیر مسلم قوموں کے ذریعہ آئی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان قوموں سے اللہ تعالٰی نے بالواسطہ انداز میں اپنے دین کی خدمت کا کام لیا ہے۔ غالباً یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر اس حدیث میں کیا تھا: ان اللہ یؤید الدین بالرجل الفاجر (البخاری کتاب الجہاد، کتاب المغازی، باب غزوۃ خیبر) یعنی اللہ دین اسلام کی مدد فاجر شخص کے ذریعہ بھی کرے گا۔

امکانات و مواقع کا یہ سیلاب بلاشبہ علماء اسلام کے لئے ایک عظیم نعمت ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ علماء کے گروہ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کی توفیق سے اس منصوبۂ الٰہی کو سمجھا۔ اور جدید مواقع کو استعمال کرتے ہوئے بقدر امکان تجدید دین اور احیاء اسلام کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کی۔

میں اپنے آپ کو بھی انہی خادمان دین میں شمار کرتا ہوں۔ اللہ کی توفیق سے میں نے دور جدید کے تمام ذرائع کو دین کی اشاعت کے لئے استعمال کیا ہے ـــــ پریس، کانفرنس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، وغیرہ۔ میں مکمل طور پر دینی مدرسہ کی پیداوار ہوں، اس اعتبار سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرا یہ پورا دعوتی کام دینی مدارس کے تحت ظہور میں آنے والا کام قرار پاتا ہے۔ اس کا کریڈٹ سب سے پہلے مدارس دینیہ کو جاتا ہے اور اس کے بعد مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو۔

مدارس سنٹر

ضرورت ہے کہ مدارس سنٹر کے نام سے ایک مرکزی ادارہ قائم کیا جائے۔ یہ سنٹر اس مقصد کو اجتماعی طور پر حاصل کرنے کی ایک کوشش ہوگی جس کو مختلف مدرسے انفرادی طور پر حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

۱ مدارس سنٹر کا پہلا مقصد مدارس کے درمیان اتحاد کی فضا پیدا کرنا ہے۔ یہ سنٹر مختلف مدارس کے درمیان شیرازہ کا کام کرے گا۔ اللہ کے فضل سے مدارس کے درمیان ایک قسم کے خاموش اتحاد کا ماحول آج بھی قائم ہے۔ مدارس سنٹر کا کام یہ ہوگا کہ وہ اس اتحاد کو مزید موثر اور بامعنی بنائے۔ وہ مدارس کی اجتماعی آواز کے طور پر کام کرے۔

۲ موجودہ زمانہ معلوماتی انفجار (information explosion) کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑے ادارے میں ایسے شعبے ہوتے ہیں جو ادارے کو عصری معلومات سے مربوط رکھیں۔ مدارس سنٹر کا ایک کام یہ ہوگا کہ وہ مدارس سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق رکھنے والی عالمی معلومات کو جمع کرے اور مدارس کو ان سے باخبر کرتا رہے۔

حدیث میں مومن کی جو صفات بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: ان یکون بصیراً بزمانہ (وہ اپنے زمانہ سے آگہی رکھنے والا ہو) مدارس سنٹر کا معلوماتی شعبہ اہل مدارس کے لئے اسی ضرورت کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگا، وہ ان کو عصری واقفیت سے مسلح کرے گا۔

۳ جیسا کہ معلوم ہے، مدارس کا موجودہ نصاب دو قسم کے علوم پر مشتمل ہے — علوم عالیہ، اور علوم آلیہ۔ جہاں تک علوم عالیہ کا تعلق ہے، وہ بلا شبہہ مقدس علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم یہ تقدس ان کے متن (text) کے لئے ہے نہ کہ ان کی تشریح و تفسیر کے لئے۔ اس لئے علوم عالیہ میں متن کو علیٰ حالہ باقی رکھتے ہوئے ان کی تشریحی اور تفسیری کتابوں میں وقت کے تقاضے کے مطابق تبدیلی ہوتی رہے گی۔

علوم آلیہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ علوم آلیہ کبھی مقدس نہیں ہوتے۔ وہ مکمل طور پر زمانی حالات اور عصری افکار کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ علوم آلیہ پر مسلسل نظر

ثانی کی جاتی رہے۔ جیسا کہ سیکولر نظام تعلیم میں عام طور پر کیا جاتا ہے۔

۴ مدارس سنٹر کا ایک کام یہ ہوگا کہ وہ مدارس کے تعاون سے ایسی فضا پیدا کریں جس میں موجودہ نصاب پر نظر ثانی کے مسئلہ کو ممکن بنایا جاسکے۔ مدارس کے حلقہ میں لمبے عرصہ سے یہ بحث جاری ہے کہ مدارس کے مروجہ نصاب پر نظر ثانی کر کے اس کو مطابق حال بنایا جائے۔ مگر عملاً اس کی طرف بہت کم پیش قدمی ہو سکی ہے۔

مدارس کے موجودہ نصاب میں قرآن اور سیرت اور تاریخ اسلام کا حصہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ نصاب کی اس کمی کو پورا کیا جائے۔ اسی طرح حدیث کو اصلاً حدیث کے طور پر نہیں پڑھایا جاتا بلکہ اس کو فقہ کے ذیل میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس پہلو پر بھی دوبارہ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح موجودہ نصاب میں "فرق ضالۃ" کے نام پر بہت سی چیزیں داخل نصاب ہیں۔ حالاں کہ یہ فرقے قدیم فرقے ہیں جو اب عملاً معدوم ہو چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ طلبہ کو اس کے بجائے آج کے گمراہ فرقوں کے بارے میں معلومات دی جائیں، نہ کہ گذرے ہوئے فرقوں کے بارے میں۔ اسی طرح معقولات کے نام پر جو کتابیں مدارس کے موجودہ نصاب کا جزء ہیں وہ اب عملاً غیر مفید ہو چکی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کے بجائے طلبہ کو جدید معقولات سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ آج کے ذہن کے سامنے اسلام کی مدلل نمائندگی کر سکیں۔

اس قسم کی متعدد چیزیں ہیں جو موجودہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہ نظر ثانی مدارس کے تعاون ہی کے ذریعہ انجام دی جاسکتی ہے۔ مدارس سنٹر کا ایک اہم کام یہ ہوگا کہ وہ اس نظر ثانی کے لئے حالات فراہم کرے۔

۵ مدارس کے موجودہ نصاب کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ بڑی حد تک دعوت رخی (dawah-oriented) نصاب ہے۔ اس نصاب کو بنانے والوں کے ذہن میں غالباً یہ مقصد تھا کہ طلبہ کو اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ مدارس سے فارغ ہو کر دعوت وتبلیغ کے کام کو موثر طور پر انجام دے سکیں۔

یہ بجائے خود ایک صحیح نہج تھا۔ مگر اب زمانہ اتنا بدل چکا ہے کہ عملی طور پر دیکھا جائے تو ہمارے مدارس ایسے مخاطبین کے لئے دعاۃ تیار کر رہے ہیں جن کا اب کہیں وجود نہیں۔ مثلاً یہ نصاب طلبہ کو

دیم "معقولہ" کے خلاف ذہنی طور پر مسلح کرتا ہے۔ مگر آج کے جو زندہ معقولہ ہیں ان کے خلاف یہ
للبہ اپنے آپ کو تیار نہیں پاتے۔ اسی طرح قدیم ذوق کے مطابق طلبہ کو مناظرہ کے آداب پڑھائے
جاتے ہیں حالانکہ آج مناظرہ کا طریقہ متروک ہو چکا ہے اور اس کی جگہ سنجیدہ ڈائیلاگ کا طریقہ دنیا میں
رائج ہو گیا ہے، مگر ہمارے فارغین مدرسہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ وہ جدید طرز کے سنجیدہ
ڈائیلاگ میں حصہ لے سکیں۔ اسی طرح یہ فارغین مدرسہ قدیم طرز کی قیاسی منطق پر تیار ہوتے ہیں
جب کہ آج دنیا میں سائنٹفک منطق کا دور آ چکا ہے جس سے وہ آشنا نہیں ہوتے وغیرہ وغیرہ۔

٦ نصاب کی تبدیلی کے ذیل میں ایک سوال یہ ہے کہ اس کے لئے مدرسین کہاں سے آئیں
گے۔ مگر یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس معاملہ میں ہمیں موجودہ مدرسین ہی کو تیار کر کے استعمال کرنا ہے نہ کہ
نئے مدرسین کو درآمد کرنا۔ یہ عین وہی طریقہ ہے جو یونیورسٹیوں میں عام طور پر رائج ہے۔ وہ یہ کہ
جب بھی یونیورسٹی کے نصاب میں کوئی تبدیلی کی جاتی ہے یا کوئی نیا تقاضا سامنے آتا ہے تو اس کے لئے وہ
نئے استاد لانے کے بجائے اساتذہ کی موجودہ ٹیم ہی کو مختلف طریقہ سے تیار کرتے ہیں۔ مثلاً ریفریشر
کورس (refresher course) یا کریش کورس (crash course) چلانا۔ ان کو باہر کی یونیورسٹیوں میں
ٹریننگ کے لئے بھیجنا۔ اس مقصد کے لئے انھیں تدریسی کام سے باقاعدہ فراغت دی جاتی ہے تاکہ وہ
یکجمعی کے ساتھ اپنے کو نئے تقاضوں کے مطابق تیار کر سکیں۔

سیکولر تعلیمی اداروں میں مسلسل یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اساتذہ کے تدریسی معیار کو بڑھایا
جائے۔ اس مقصد کے لئے انھیں مختلف قسم کے مواقع دئے جاتے ہیں۔ مثلاً ریسرچ کے لئے بامشاہرہ
چھٹی دینا۔ بیرونی سفروں کا انتظام کرنا۔ پروموشن وغیرہ کے ذریعہ ایسے محرک (incentive) فراہم
کرنا جو ان کے لئے اپنے آپ کو مسلسل تیار کرنے میں مددگار ثابت ہوں وغیرہ۔

٧ اس سلسلہ میں ایک کام یہ ہے کہ معہد العلماء یا اور کسی نام سے ایک شعبہ قائم کیا جائے
اس کا مقصد عصری تقاضوں کے مطابق علماء کی تیاری ہو۔ منتخب نوجوان علماء متعین مدت کے لئے یہاں
لائے جائیں اور ان کو انگریزی زبان اور عصری معلومات سے بقدر ضرورت مسلح کیا جائے تاکہ وہ دور
جدید میں اسلام کی موثر نمائندگی کر سکیں اور جدید اسلوب میں اسلام کا پیغام آج کے انسان تک پہنچا سکیں۔

اس سلسلہ میں یہاں میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کروں گا۔ میرے اس تجربہ میں دوسرے لوگ بھی ایک عملی سبق پا سکتے ہیں۔

میں نے مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ ہی میں ابتدائی انگریزی سیکھ لی تھی۔ لیکن انگریزی زبان میں اپنی استعداد کو بڑھانے اور اس کے ذریعہ جدید طبقہ تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا جذبہ میری زندگی میں بعد کو شامل ہوا۔ اور آخر کار یہی میری زندگی کا اصل مشن بن گیا۔

انگریزی کو دعوت کا ذریعہ بنانے کا جذبہ میرے اندر کیسے پیدا ہوا، اس کے مختلف اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک بلاشبہ وہ ہے جو علماء اسلام سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے علماء کو یہ احساس ہوا کہ عصری تقاضوں کے مطابق اسلام کی خدمت کرنے کے لئے انھیں مغربی زبان بھی سیکھنا چاہئے۔ مثال کے طور پر مولانا شبلی نعمانی نے علی گڈھ میں پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھنے کی کوشش کی اگرچہ وہ اس کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ میں مدرسۃ الاصلاح میں اپنی تعلیم کے زمانہ میں دیکھتا تھا کہ میرے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی ڈکشنری کی مدد سے انگریزی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگرچہ مجھے نہیں معلوم کہ ان کی یہ کوشش کہاں تک پہنچی۔ اس سلسلہ کا ایک سبق آموز واقعہ وہ ہے جو مولانا محمد قاسم نانوتوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کو مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب سے لے کر ملخصا یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"حج کے سفر (۱۸۷۸ء) میں مولانا نانوتوی سے جہاز کے یورپین کپتان نے مذہبی سوالات کئے جن کا جواب "ترجمان" کے ذریعہ دیا گیا۔ کپتان آپ کے جوابوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔ مولانا نانوتوی نے اس کے بعد عزم کر لیا تھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد ہندستان پہنچ کر وہ خود انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ مولانا نانوتوی کا احساس تھا کہ ترجمان کے بغیر براہ راست تقریر سے کپتان زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔ مطلب جس کا یہی ہو سکتا ہے کہ دوسروں تک دین کی دعوت پہنچانے کے لئے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی حضرت والا نے اپنے "دینی مجاہدات" کی فہرست میں شامل کر لیا تھا" (سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی مطبوعہ دار العلوم دیوبند، صفحہ ۲۹۹۔ ۳۰۰، جلد دوم)

اس قسم کے مختلف واقعات ہیں جن کے ذریعہ میرے اندر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں مدرسہ کی تعلیم کے بعد انگریزی زبان کو سیکھوں اور جدید علوم کا مطالعہ کروں۔ تاکہ میں اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو زیادہ موثر طور پر ادا کر سکوں۔

میں کبھی کسی انگریزی اسکول میں داخل نہیں ہوا مگر مدرسہ کی تعلیم کے بعد لمبی مدت تک ذاتی محنت کے ذریعہ میں نے انگریزی زبان سیکھی۔ میں اس قابل ہو گیا کہ براہ راست ہر قسم کی انگریزی کتاب کا مطالعہ کروں اور ان سے ضروری مواد حاصل کر سکوں۔ میں تقریباً چالیس سال سے ہندستان کے اندر اور ہندستان کے باہر انگریزی داں حلقوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کی مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔

عربی اور انگریزی دونوں زبان سے واقفیت حاصل کرنے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ میں ایک بین اقوامی دعوتی مشن جاری کر سکا۔ اس دعوتی مشن کا آغاز تو بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن انگریزی زبان کے اعتبار سے اس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۴ میں ہوا جب کہ میں نے انگریزی ماہنامہ "الرسالہ" کا اجراء نئی دہلی سے کیا جو الحمد للہ اب تک جاری ہے اور ملک کے اندر اور ملک کے باہر انگریزی داں حلقوں میں دین کی اشاعت کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ درجنوں کی تعداد میں انگریزی کتابیں چھپ کر عالمی سطح پر پھیل رہی ہیں حتی کہ اب یہ دعوتی مشن انٹرنیٹ تک پہنچ چکا ہے۔ اور اس کا اپنا ویب سائٹ بھی کھولا جا چکا ہے۔

اللہ کا یہ خصوصی فضل ہے کہ اس پر امن دعوتی مشن کے ذریعہ اسلام کی اشاعت کا کام بین اقوامی سطح پر انجام پا رہا ہے۔ اس دعوتی مشن میں میرے ساتھ بہت سے اللہ کے بندے لگے ہوئے ہیں۔ ہماری اب تک کی کوششوں سے مختلف ملکوں میں ہزاروں لوگ اسلام کے سایۂ رحمت میں داخل ہو چکے ہیں۔

عربی زبان اور دینی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی زبان کا حصول میرے لئے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اسی دو طرفہ علم کا یہ نتیجہ ہے کہ میرے لئے یہ ممکن ہوا کہ میں بین اقوامی کانفرنسوں میں اسلام کی نمائندگی کر سکوں۔ ملک کے اندر اور ملک کے باہر مجھے بار بار اس قسم کے مواقع ملے۔ اگر میں انگریزی زبان سے بے خبر ہوتا تو میرے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ میں دور جدید کے دعوتی مواقع کو اس طرح استعمال کر سکوں۔

۸ مدارس سنٹر کا ایک کام یہ بھی ہو گا کہ وہ مدارس کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنے کا منظم اہتمام کرے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ غلط فہمیاں بے بنیاد ہیں لیکن وہ اتنی زیادہ پھیلی ہوئی ہیں کہ

اس سے صرف نظر کرنا کسی بھی طرح درست نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک سبق آموز واقعہ یہاں قابل ذکر ہے۔ کچھ عرصہ پہلے حکومت ہند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار ٹیلی فون کرکے میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک خاص مسئلہ میں آپ سے مشورہ کرنے کے لئے آیا ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ نومبر ۱۹۹۹ میں انڈین ائر لائنز کا ایک جہاز جب ہائی جیک کرکے نیپال سے قندھار لے جایا گیا تو اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے میں قندھار گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات کچھ افغانی نوجوانوں سے ہوئی۔ ان سے ہم نے پوچھا کہ کیا آپ لوگ سیاحت کے لئے انڈیا آنا پسند کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں، جب ہم نے پوچھا کہ آپ انڈیا کے کن مقامات کو دیکھنا چاہیں گے تو انہوں نے سب سے پہلے دیوبند کا نام لیا۔ مزید سوال پر انہوں نے بتایا کہ ہم کو وہاں جانے سے دلچسپی اس لئے ہے کہ ہم بھی دیوبندی ہیں۔

حکومت کے مذکورہ ذمہ دار کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دیوبند شاید جنگجوئی کی تربیت کا سینٹر ہے۔ افغانستان میں نیز ہندستان کی سرحد پر جو تشدد عرصہ سے جاری ہے اس کی فکری تربیت کا مرکز شاید دیوبند ہے۔

ان کی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا کہ دیوبندی تو میں بھی ہوں۔ میری تعلیم مدرستہ الاصلاح میں ہوئی۔ اس مدرسہ کا سنگ بنیاد دیوبند کے مولانا اصغر حسین نے رکھا تھا جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے شاگرد تھے۔ پھر میں نے ان کو بتایا کہ دیوبندی یا دیوبندیت سے مراد وہ مسلک ہے جس میں اتباع سنت پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے اِن افغانی نوجوانوں نے اپنے کو دیوبندی بتایا۔ کیوں کہ افغانستان کے لوگ عرصہ دراز سے دینی تعلیم کے لئے دیوبند آتے رہے ہیں۔ اور وہ اپنے شرعی مسلک کے اعتبار سے دیوبند کے علماء پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس معاملہ کا سیاسی تشدد یا جنگ جوئی سے کوئی تعلق نہیں۔ میری اس وضاحت کے بعد وہ پوری طرح مطمئن ہوگئے۔

مدارس دینیہ کے خلاف اس قسم کی غلط فہمیاں بڑی تعداد میں ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ دراصل یہی غلط فہمیاں ہیں جن کی بنا پر مدارس کے خلاف طرح طرح کی باتیں کہی جاتی ہیں، مثلاً مدارس پر کنٹرول کرنے کے لئے قانون بنانا یا کچھ لوگوں کی طرف سے بھارتیہ کرن کا نعرہ لگایا جانا۔ یا کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ

مدارس قومی یکجہتی یا نیشنل فکر پیدا کرنے میں رکاوٹ ہیں۔اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ مدرسے جب تک قائم ہیں اس وقت تک ملک میں مجموعی ترقی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ وہ مسلمانوں کو ملک کی مین اسٹریم میں داخل ہونے میں روک بنے ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ الزامات بلاشبہ بے اصل اور بے بنیاد ہیں اور اگر سنجیدہ انداز میں کوشش کی جائے تو یقینی طور پر ان کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ مجوزہ مدارس سنٹر کا ایک ضمنی یا جزئی کام یہ بھی ہوگا کہ وہ مناسب انداز میں ان غلط فہمیوں کی تردید کرے۔ وہ بروقت ان کی حقیقت سے لوگوں کو واقف کرائے۔ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ایک اسلامی کام ہے جس کو قرآن میں تبیین کہا گیا ہے۔

مدارس سنٹر کا اصل ایجابی کام یہ ہوگا کہ وہ مدارس اور اس کے نظام سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ باخبر کرائے۔ وہ لوگوں کے سامنے مدارس کی صحیح تصویر پیش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ مدارس کا صحیح تعارف ہی مدارس کے خلاف غلط فہمیوں کی کافی اور یقینی تردید ہے۔

مدارس سنٹر کا ایک کام یہ ہوگا کہ وہ ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کے بارے میں معلومات جمع کرے۔ وہ ان کے درمیان اتحاد کی فضا قائم کرے۔ وہ مدارس کے مشترک مقاصد کے حصول کے لئے عمل کرے۔ وہ مدارس کے جال کو انفرادی دائرہ سے نکال کر ایک وسیع مشترک مجموعہ بنادے۔

خلاصہ یہ کہ مدارس سنٹر داخلی اعتبار سے مدارس کے لئے شیرازۂ اتحاد ہوگا اور خارجی اعتبار سے مدارس کا اجتماعی نمائندہ۔ ایک اعتبار سے وہ مدارس کے استحکام کی علامت ہوگا اور دوسرے اعتبار سے مدارس کی آفاقیت کا محافظ۔ مدارس سنٹر کے قیام کی صورت میں مدارس کی افادیت اور مدارس کی طاقت دونوں میں نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔ مدارس سنٹر گویا ایک غیر سیاسی ایمپائر کی غیر سیاسی راجدھانی ہوگا۔ وہ بیک وقت مرکز ملت بھی ہوگا اور اسی کے ساتھ مرکز مدارس بھی۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala

1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£5 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

الرسالہ، اکتوبر ۲۰۰۰

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

دعوتی ذمہ داری

پیغمبر اسلام ﷺ کی حیثیت داعی کی تھی، آپ کی تبعیت میں آپ کی امت کی حیثیت بھی داعی کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے رسول، کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، سمجھ بوجھ کر، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے

(قل هذه سبيلي ادعوا الى الله على بصيرة انا و من اتبعني) یوسف ۱۰۸

رسول اللہ ﷺ پیغمبر ہونے کے ساتھ پیغمبر آخر الزماں بھی تھے۔ آپ آخری پیغمبر تھے۔ اس اعتبار سے آپ کی دعوتی ذمہ داری قیامت تک وسیع تھی۔ آپ کو قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو توحید کی حقیقت سے باخبر کرنا تھا۔ مگر ایک عمر کو پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی۔ اس لئے سوال ہے کہ اب یہ ذمہ داری کس کے اوپر ہے۔ اب یہ ذمہ داری امت محمدی پر ہے۔ امت محمدی کو آپ کی نیابت میں قیامت تک یہ فریضہ ادا کرنا ہے۔ حدیث میں ہے: مالي أمسِكُ بِحُجَزِكم عن النار، الا وَإِنَّ ربِّي داعيَّ وانه سائلي هل بلغت عبادي. فاقول رب قد بلغت. الا فليبلغ شاهدكم غائبكم (حياة الصحابه ۱/۷۷)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تم لوگوں کی کمر پکڑ کر تم کو آگ سے بچاؤں۔ سن لو کہ میرا رب مجھے بلائے گا اور بے شک وہ مجھ سے سوال کرے گا۔ کیا تم نے میرے بندوں تک میرا پیغام پہنچادیا۔ میں کہوں گا کہ ہاں میرے رب، میں نے پہنچادیا۔ سن لو، تمہارا حاضر تمہارے غائب تک پہنچادے۔

اس حدیث کے مطابق، رسول اللہ ﷺ گویا اپنی امت کے ایک ایک فرد کو ہدایت دے رہے ہیں کہ میرے بعد تم قیامت تک میرے دعوتی مشن کو جاری رکھو، دوسرے لفظوں میں یہ کہ مجھے یہ موقع دو کہ میں اللہ تعالٰی کے یہاں یہ کہہ سکوں کہ میں نے قیامت تک کے تمام لوگوں پر اپنی دعوتی ذمہ داری پوری کردی، اپنی حیات میں براہ راست طور پر، اور اپنی حیات کے بعد بالواسطہ طور پر۔

تنقید کا مسئلہ

ایک صاحب نے کہا کہ میں ماہنامہ الرسالہ پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے آپ کی تنقید پسند نہیں۔ آپ اکثر ہمارے اکابر پر تنقید کرتے ہیں۔اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ آپ کا یہ تنقیدی طریقہ مجھے صحیح نظر نہیں آتا۔

میں نے کہا کہ کوئی مثال دیجئے۔ انہوں نے الرسالہ کے ایک شمارہ کا ایک مضمون بطور مثال بتایا۔اس میں ایک بزرگ کے ایمان واخلاص کا اعتراف کرتے ہوئے یہ تنقید کی گئی تھی کہ انہوں نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو جو عملی رہنمائی دی اس میں جدید حالات کی رعایت شامل نہ تھی۔

میں نے کہا کہ یہ تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ آپ کو الرسالہ کی تنقید پر اعتراض کرنے کے بجائے خود اپنے طریق فکر پر نظر ثانی کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اس قسم کی تنقیدیں تو عین شریعت کے مطابق ہیں۔ ساری اسلامی تاریخ میں کبھی بھی اس قسم کی تنقید کو برا نہیں سمجھا گیا۔

الرسالہ میں کبھی کسی شخصیت کے ایمان واخلاص کو زیر بحث نہیں لایا جاتا۔اس میں ہمیشہ زمانہ کی نسبت سے فکری نہج یا عملی تدبیر پر نقد کیا جاتا ہے۔اور اس قسم کی تنقید کو کبھی امت میں نادرست نہیں کہا گیا۔ علماء اسلام کے یہاں یہ ایک معروف اور مسلم بات ہے کہ جب ایمان و اخلاص کو زیر بحث لائے بغیر صرف فکری نہج اور عملی تدبیر پر نقد کیا جائے تو اس کا مطلب صرف زیر تنقید شخص کی اجتہادی خطا کی نشان دہی ہوتا ہے۔اور اجتہادی خطا ایسی چیز ہے جو ہر شخص سے ہو سکتی ہے، حتی کہ اصحاب رسول سے بھی، جیسا کہ تاریخ کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ پھر ایسی تنقید پر برہم ہونے کی کیا ضرورت۔

تنقید کی اصل اختلاف رائے ہے، اور اختلاف رائے ایک عظیم رحمت ہے۔ جس قوم میں اختلاف رائے کا ماحول نہ ہو، اس کے درمیان فکری ارتقاء کا عمل رک جائے گا۔

واحد انقلاب

انقلاب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو (coup) اور دوسرے رویولوشن(revolution)۔ انسانیت کی معلوم تاریخ میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں وہ سب کے سب کو کے ہم معنی تھے۔ ایک کو چھوڑ کر کوئی بھی حقیقی معنوں میں رویولوشن نہ تھا۔ انقلابات کی تاریخ میں یہ واحد استثناء پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے انقلاب کا ہے جو خدا کی خاص مدد کے تحت ساتویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔

کو وہ سیاسی تبدیلی ہے جو ایک حکومتی ڈھانچہ کو توڑ کر اس کی جگہ دوسرا حکومتی ڈھانچہ قائم کرے۔ اس کے برعکس رویولوشن اس انقلاب کا نام ہے جو افراد کو نیا تعمیری شعور دے۔ جو خود ویلو سسٹم (نظام اقدار) کو بدل دے۔ جو انسان اور انسانی سماج کی نئی تشکیل کرے۔ اس قسم کے ہمہ گیر انقلاب کی مثال پیغمبر اسلام کے لائے ہوئے انقلاب کے سوا کوئی اور انسانی تاریخ میں موجود نہیں۔

پیغمبر اسلام کا لایا ہوا انقلاب واحد انقلاب تھا جس نے انسان کی سوچ کو اور اس کے معیار کو بدل دیا۔ اب یہ ہوا کہ ظواہر کے پرستار حقیقت کے پرستار بن گئے۔ ذاتی انٹرسٹ کے بجائے انسانیت کا انٹرسٹ دیکھا جانے لگا۔ اخلاقی بے قیدی کی جگہ اخلاقی پابندی لوگوں کا شیوہ بن گیا۔ اپنے حقوق پر نظر رکھنے والے اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھنے والے بن گئے۔ انا کی پرستش کرنے والوں نے اپنی انا کو خود ہی کچل دیا۔ اقتدار کے لئے کشمکش کرنے والے اقتدار سے بے رغبت ہو گئے۔ لوگوں نے تکلفات کو چھوڑ کر سادگی کو اپنا طریقہ بنا لیا۔ جو لوگ دنیا کو اپنا مقصد زندگی بنائے ہوئے تھے ان کی نظر میں دنیا زندگی کی صرف ایک ضرورت بن گئی۔ جو لوگ پہلے سرکشی میں لذت پا رہے تھے اب وہ تواضع میں لذت محسوس کرنے لگے۔ انتقام لینے والوں نے عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کر لیا۔

دنیا اور آخرت

بیج ڈالنے کے دن جو کسان فصل کاٹنا چاہے، وہ بیج کو بھی کھوئے گا اور فصل سے بھی محروم رہے گا۔ یہی معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت اس کا انعام پانے کی جگہ۔ جو شخص دنیا ہی میں "انعام" حاصل کرنا چاہے تو وہ اس قیمت پر ہو گا کہ وہ مطلوب عمل انجام نہ دے سکے گا۔ وہ آخرت کی تعمیر کے واحد موقع کو کھو دے گا۔

جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو آدمی موجودہ دنیا میں پانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دونوں ہی کو کھو دیتا ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو دنیا کے ذریعہ آخرت کو خریدے، نہ کہ دنیا میں پھنس کر اپنے آپ کو آخرت سے محروم کر لے۔

آپ سفر کے دوران وہ سکون حاصل کرنا چاہیں جو صرف گھر پر کسی آدمی کو ملتا ہے تو آپ کبھی اپنی اس طلب میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی مثال سے دنیا اور آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ دنیا کو خدا نے عمل کرنے کی جگہ بنایا ہے اور آخرت کو عمل کا انجام پانے کی جگہ۔ یا دنیا سفر کا راستہ ہے اور آخرت اس کی منزل۔

اب اگر آپ چاہیں کہ دنیا ہی میں اپنا انجام پالیں تو آپ کے عمل کی منصوبہ بندی بالکل غلط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر آپ راستہ میں منزل والا سکون حاصل کرنا چاہیں تو آپ اپنے راستہ کو کھوٹا کر لیں گے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے اس فرق کو سمجھے۔ وہ موت سے پہلے اس چیز کی خواہش نہ کرے جو صرف موت کے بعد والی زندگی میں کسی کو مل سکتی ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ حقیقت پسند بنے۔ وہ خواہشوں کے پیچھے نہ دوڑے۔ کیوں کہ خواہشیں آدمی کو گڑھے کے سوا کسی اور منزل پر پہنچانے والی نہیں۔

ہر آدمی اپنے سینہ میں خواہشات کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے۔ یہ خواہشات بجائے خود غلط نہیں۔ مگر ان خواہشات کی تکمیل کا مقام آخرت ہے نہ کہ موجودہ دنیا۔

فرقوں میں بٹ جانا

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور باہم اختلاف کیا جب کہ ان کے پاس واضح دلائل آ چکے تھے۔ اور ان کے لئے بڑی سزا ہے۔ (آل عمران ۱۰۵)

جب کسی قوم کی توجہ خدا کی طرف سے ہٹتی ہے تو اس کی توجہ اپنے آپ کی طرف لگ جاتی ہے۔ اب اس کے افراد کے اندر خود پسندی اور مفاد پرستی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ افتراق اور اختلاف ہے۔ جب لوگوں کی توجہ خدا کی طرف لگی ہوئی ہو تو آپس کا اختلاف قدرتی طور پر دب جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ باہمی اتحاد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب لوگوں کی توجہ اپنی ذات کی طرف لگ جائے تو ہر ایک کی رائے اور ہر ایک کا مفاد الگ الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر باہمی اختلاف اور آپس کا ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

اتحاد خدا سے خوف کا لازمی نتیجہ ہے، اور اختلاف خدا سے بے خوفی کا لازمی نتیجہ۔ کسی مذہبی گروہ میں اختلاف اس بات کی علامت ہے کہ اس کی زندگی تقویٰ کی پٹری سے اتر کر کسی اور پٹری پر چلنے لگی ہے۔ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا۔ مختلف اسباب سے ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان طرح طرح کے اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ اختلافات ناگزیر ہیں۔ کسی بھی تدبیر سے اختلافات کے وجود کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں اصل چیز یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے درمیان سرے سے اختلاف موجود نہ ہو۔ اصل چیز یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج پایا جائے کہ وہ اختلاف کے باوجود باہم مل کر کام کر سکیں۔

یہ مزاج لوگوں کے اندر کسی برتر مشن کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا سچا عقیدہ لوگوں کے اندر یہی مزاج پیدا کرتا ہے۔ خدا کی عظمت کا تصور لوگوں کی نظر میں بقیہ تمام چیزوں کی اہمیت کو گھٹا دیتا ہے۔ مزاج کی یہ تبدیلی لوگوں کے اندر یہ حوصلہ پیدا کرتی ہے کہ وہ اختلاف کو نظر انداز کر کے باہم متحد ہو جائیں۔

اشاعت اسلام کالج

علامہ اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸) نے اپنی عمر کے آخری زمانہ میں لاہور میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا جس کا نام تھا اشاعت اسلام کالج۔ اس کا مقصد غیر مسلموں میں کام کرنے کے لئے اسلام کے مبلغ تیار کرنا تھا۔ اس کالج کے پرنسپل یوسف سلیم چشتی (۱۸۹۶۔۱۹۸۴) تھے جن سے میری ملاقات ۱۹۷۱ میں لاہور میں ہوئی۔

اشاعت اسلام کالج چودہ سال تک بے کسی کی حالت میں چل کر آخرکار ختم ہو گیا۔ پروفیسر چشتی نے بتایا کہ اس کے ختم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کو مسلمانوں کا تعاون نہیں ملا۔ اقبال اپنی ساری مقبولیت کے باوجود اپنے تبلیغی ادارہ کے لئے مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ پانی سے محروم درخت کی طرح وہ سوکھتا رہا، یہاں تک کہ بالآخر وہ اپنی موت مر گیا۔

یوسف سلیم چشتی مرحوم نے بتایا کہ اقبال کا اندازہ یہ تھا کہ اشاعت اسلام کالج کے فارغ شدہ افراد کو مسلم مدرسے اور مسلم ادارے اپنے یہاں رکھ لیں گے۔ اور اس طرح انھیں موقع ملے گا کہ وہ گھوم گھوم کر غیر مسلموں میں تبلیغ کر سکیں۔ مگر مسلم اداروں نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اس کے نتیجہ میں اشاعت اسلام کالج کے فارغ شدہ طلبہ میں مایوسی پیدا ہو گئی اور مزید داخلہ نہ ملنے کی بنا پر کالج اپنے آپ ختم ہو گیا۔

میرے نزدیک اشاعت اسلام کالج اس لئے ناکام ہو گیا کہ وہ ایک غیر منظور شدہ ادارہ تھا۔ جاب مارکیٹ میں اس کی ڈگری کی کوئی قیمت نہ تھی، اس لئے زیادہ قابل عمل بات یہ ہے کہ سند یافتہ اور ڈگری یافتہ لوگوں کو تربیت دے کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ جہاں اور جس شعبہ حیات میں رہیں وہاں اپنے ذاتی کام کے ساتھ بقدر امکان دعوت کی ذمہ داریاں بھی ادا کریں۔ "اشاعت اسلام کالج" کی زیادہ قابل عمل صورت یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد کو محدود مدت کے لئے بلایا جائے اور انھیں زبان سکھائی جائے اور دعوتی مضامین پر انھیں تیار کیا جائے۔ تاکہ وہ جہاں بھی ہوں داعی بن کر دعوتی

دو قسم کے آدمی

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جو اصول کے بارے میں حساس ہو۔ دوسرا وہ جس کی حساسیت صرف اپنی خواہشات اور مفادات کے بارے میں جاگتی ہو۔ پہلی قسم کے انسان ہی حقیقی معنوں میں انسان ہیں اور دوسری قسم کے لوگ انسان نما حیوان ہیں۔ ان کے جینے کی سطح اور حیوانوں کے جینے کی سطح میں کوئی فرق نہیں۔

ایک انسان وہ ہے جو ہر حال میں حق کا اعتراف کرے، خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ اپنے کیے ہوئے وعدہ سے کبھی نہ پھرے، وہ کسی حال میں سچائی کو نہ چھوڑے، خواہ وہ اس کی مصلحتوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا کردار اصول انسانیت کے تابع ہو نہ کہ حالات اور مواقع کے تابع۔ وہ وہی کرے جو اسے کرنا چاہئے نہ کہ وہ جس کو کرنے کے لئے اس کا جی چاہتا ہو۔

دوسرا انسان وہ ہے جو اپنے آپ کو کسی اصول یا معیار کا پابند نہ سمجھے۔ حالات کا دباؤ ہو تو حق پرست بن جائے اور جہاں دباؤ نہ ہو وہاں وہ حق کو نظر انداز کر دے۔ وعدہ پورا کرنے میں فائدہ نظر آئے تو وعدہ پورا کرے اور جہاں فائدہ کا محرک نہ ہو وہاں وعدہ سے بے پروا ہو جائے۔ ایک ہی قسم کے معاملہ میں اس کا رویہ ایک شخص کے ساتھ کچھ ہو اور دوسرے شخص کے ساتھ کچھ۔

بظاہر دیکھنے میں ہر آدمی ایک ہی شکل کا دکھائی دیتا ہے مگر تجربہ بتاتا ہے کہ یکساں شکل کے اندر دو الگ الگ انسان چھپے ہوئے تھے۔ مومن بااصول انسان کا نام ہے اور غیر مومن بے اصول انسان کا نام۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو مومن کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جو قابل پیشین گوئی کردار (predictable chracter) کا حامل ہو۔ اس کی اصول پسندی کی بنا پر اس کے بارے میں پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا جا سکے کہ کن حالات میں وہ کس قسم کے رویہ کا اظہار کرے گا۔

بے خبری

ایک مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک وہ اس پر بولتے رہے کہ ہندستان میں مسلمان مسائل سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان کو تعصب اور زیادتی کا سامنا ہے۔ ان کے لئے ترقی کے دروازے بند ہیں۔ آخر میں ان سے میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ وہ راجستھان میں ایک بزنس کر رہے ہیں۔ اور پچھلے دو سال کے عرصہ میں انہوں نے اطمینان بخش کامیابی حاصل کی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ جو کاروبار وہ کر رہے ہیں اس میں ان کا سابقہ ۹۹ فیصد غیر مسلموں سے پڑتا ہے۔ یہ غیر مسلم ان کے لئے نہایت مددگار (helpful) ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میں نے کہا کہ آپ کی سوچ میں ایک تضاد ہے۔ اور یہی تضاد آپ کو اصل معاملہ سمجھنے نہیں دیتا۔ آپ اس تضاد کے خول سے باہر آجائیں تو آپ خود بخود جان لیں گے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ماشاء اللہ ایک مسلمان ہیں۔ آپ نے یہاں ایک کاروبار شروع کیا۔ خود آپ کے بیان کے مطابق اسی ہندستان میں آپ کا کاروبار ترقی کر رہا ہے۔ غیر مسلموں کی طرف سے آپ کو کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ ذاتی طور پر اس مثبت تجربہ کے باوجود کیوں آپ ایسا کہہ رہے ہیں کہ اس ملک میں مسلمان سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں بعض اردو اخبارات کی رپورٹوں اور بعض مسلم رہنماؤں کے بیانات کا حوالہ دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ تعصب اور زیادتی کے نظریہ کی اصل جڑ کیا ہے۔ یہ جڑ ملک کے اپنے حالات میں نہیں ہے بلکہ خود مسلمانوں کی زرد صحافت اور زرد قیادت اس کی ذمہ دار ہے۔ اگر ہمارے درمیان یہ زرد صحافت اور یہ زرد قیادت نہ ہو تو اس معاملہ کو جاننے کے لئے مسلمانوں کے پاس ان کا ذاتی تجربہ ہوگا اور پھر وہ یقینی طور پر جان لیں گے کہ ان کے وطن میں ان کے لئے ہر قسم کی ترقی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔

تعارف اسلام

ڈاکٹر ارن کمار دہلی کے ایک ممتاز ڈنٹسٹ ہیں۔ ہمارے گھر کی ایک خاتون کو دانت میں تکلیف تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر کمار سے اپائنٹمنٹ لیا۔ مقرر تاریخ پر جب وہ وہاں گئیں تو اپنے ساتھ ہمارے یہاں کی چھپی ہوئی انگریزی کتاب *A Treasury of the Quran* لیتی گئیں اور ڈاکٹر کمار کو ہدیۃً پیش کیا۔

ڈاکٹر کمار اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دانت کا کام کرنے کے بعد جب وہ ان کے یہاں کی خاتون ریسپشنسٹ کے یہاں گئیں تاکہ اپنا بل ادا کریں تو خاتون کلرک نے ڈاکٹر سے اس کام پر فیس کی رقم معلوم کی تو ڈاکٹر نے کہا کہ ان سے فیس نہیں لینا ہے۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے دعوت و تعارف کا کام کتنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ ایک طرف جدید دور کی سہولتوں نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ اسلام کے موضوع پر خوبصورت کتابیں تیار کی جائیں جن کو ہدیۃً یا قیمۃً لوگوں میں پھیلایا جائے۔ دوسری طرف دور جدید میں مذہبی آزادی اور مطالعہ کے شوق نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ لوگوں کو جب مطالعہ کی کوئی چیز فراہم کی جائے تو وہ شوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں۔

اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچانا مسلمانوں کی لازمی ذمہ داری ہے۔ پہلے زمانہ میں اس کام کو انجام دینا سخت مشکل تھا۔ اب زمانہ کی تبدیلیوں نے صورت حال بالکل بدل دی ہے۔ دعوت کا کام پہلے اگر مذہبی جبر کے حالات میں کرنا پڑتا تھا تو اب یہ کام مذہبی آزادی کے حالات میں کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ پہلے اگر اس کام کے لئے صرف تھوڑے وسائل میسر تھے تو اب کثیر وسائل اس کے لئے حاصل ہو گئے ہیں۔ پہلے اگر محدود دائرہ میں یہ کام کیا جا سکتا تھا تو اب وسیع تر دائرہ میں اسلام کی اشاعت کے دروازے کھل گئے ہیں، وغیرہ۔

محبت فاتح عالم

محبت ایک طاقت ہے۔ وہ کسی ہتھیار کے بغیر لوگوں کو فتح کر لیتی ہے۔ ہتھیاروں کا وار انسان کے جسم پر ہوتا ہے اور محبت کا وار انسان کے دل پر۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہتھیار زیادہ طاقت ور ہے جو دل کو جیت لے۔ جسم کو ہرانے والا ہتھیار مقابلۃً بے حد کمزور ہے اور اسی کے ساتھ نہایت وقتی بھی۔

محبت کا یہ اصول زندگی کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ گھر میں ہوں یا پڑوس میں۔ آپ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ ہر موقع پر ایسے معاملات پیش آتے ہیں جب کہ آپ کو دوسرے سے کوئی اختلاف یا شکایت ہو جائے۔ ایسے موقع پر اگر آپ ردعمل کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر دونوں فریقوں کے درمیان نفرت اور ضد بڑھے گی۔ اور نفرت اور ضد معاملہ کو صرف بڑھاتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں معاملہ کو گھٹانے والی یا اس کو حل کرنے والی نہیں۔

اس کے بجائے اگر ایسا ہو کہ جب کسی بھی شکایت یا اختلاف کی صورت پیش آئے تو آپ ردّعمل کی نفسیات کا شکار نہ ہوں۔ آپ فریق ثانی کے رویہ سے اوپر اٹھ کر اس کے ساتھ نرمی اور محبت کا معاملہ کریں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ دیکھیں گے کہ معاملہ جہاں پیدا ہوا تھا وہیں وہ ختم ہو گیا۔ جو اختلاف بظاہر دوری کا سبب بننے والا تھا وہ قربت بڑھانے کا ذریعہ بن گیا۔

کوئی شخص آپ سے کڑوا بول بولے تو آپ اس کا جواب میٹھے بول سے دیجئے۔ کوئی شخص آپ کو اپنے لئے مسئلہ سمجھے تو آپ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو بے مسئلہ بنا لیجئے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ بدمعاملگی کرے تو آپ اس کے ساتھ اچھے برتاؤ کا ثبوت دیجئے۔ کوئی شخص آپ کو بدنام کرے تو آپ اس کا تذکرہ اچھے الفاظ کے ساتھ کیجئے۔ کوئی شخص آپ پر غصہ ہو جائے تو آپ اس کے لئے برف کی طرح ٹھنڈے پڑ جائیے۔ کوئی شخص آپ کے ساتھ بدخواہی کرے تو آپ اس کے حق میں خیر خواہ بن جائیے۔ یہی محبت کا طریقہ ہے، اور محبت بلاشبہ فاتح عالم ہے۔

تیسرا امکان

برطانیہ کی خاتون اسکالر کیرن آرم اسٹرانگ (Karen Armstrong) ایک منصف مزاج خاتون ہیں۔ اسلام کے بارہ میں ان کی تحریریں عدل وانصاف پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کی ایک قابل مطالعہ کتاب لندن سے ۱۹۹۱ میں چھپی ہے۔ ۲۸۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام یہ ہے:

Muhammad: A western attempt to understand Islam

اس کتاب میں انہوں نے موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں پر تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ موجودہ زمانہ کا انقلابی اسلام، اپنے انتہا پسندانہ اور سفید وسیاہ حل کے ساتھ ایک نوجوان کا مذہب ہے:

> Radical Islam with its extreme and black-and-white solutions, is a young person's faith. (p. 12)

معاملہ کو بلیک اینڈ وہائٹ میں لینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی صرف دو حالتوں کے درمیان سوچ سکے۔ مثلاً اگر اس کے ملک میں بظاہر ایک غیر صالح حکمراں ہے تو وہ یہ سمجھے کہ اس کو کسی نہ کسی طرح اقتدار سے ہٹادو اس کے بعد اپنے آپ صالح حکومت قائم ہو جائے گی۔ مگر زندگی اس طرح صرف دو صورتوں کے درمیان نہیں ہوتی۔ عین ممکن ہے کہ آپ دعوم مچا کر غیر صالح حکمراں کا خاتمہ کریں اور اس کے بعد عملاً ایک تیسری صورت سامنے آجائے، یعنی ایک اور غیر صالح حکمراں کا اقتدار پر قبضہ۔

جو لوگ معاملات کو سفید وسیاہ کی صرف دو صورتوں میں دیکھتے ہیں وہ ہمیشہ اصلاح کے نام پر تباہی لانے کا سبب بنتے ہیں۔ حقیقی اصلاح کے لئے ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو دو صورتوں کے دائرہ سے باہر آکر تیسرے امکان کو دیکھ سکے، جو یہ جانے کہ ہر ایسا اقدام باطل ہے جو عملی طور پر ایک نظام فساد کو ہٹا کر دوسرے نظام فساد کی آمد پر منتج ہونے والا ہے۔

مشتے بعد از جنگ

دو پہلوانوں کے درمیان کشتی ہو۔ ان میں سے ایک دوسرے کو پچھاڑ کر اس کے اوپر بیٹھ جائے، اس کے بعد ہارا ہوا آدمی اپنے ہاتھ سے جیتے ہوئے پہلوان کو مارنا چاہے تو اس کو فارسی میں مشتے بعد از جنگ کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا فعل سراسر احمقانہ ہے، کسی بھی درجہ میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

جب نزاع پیدا ہو تو اس کے ابتدائی مرحلہ میں وہ وقت ہوتا ہے جب کہ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہو۔ اگر آپ نے کسی جھوٹے بھرم میں پڑ کر اس وقت کو کھو دیا تو اس کے بعد آپ کے لئے صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہو گیا ہے اس کو صبر و تحمل کے ساتھ گوارا کریں۔ فیصلہ کا وقت گزر جانے کے بعد جنگ کو جاری رکھنا صرف اپنے نقصان میں اضافہ کرنا ہے۔ اس قسم کی کوشش مشتے بعد از جنگ ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں کسی کے لئے نیا مستقبل پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

موجودہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ بے شمار عوامل کے تحت ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے معلوم اور نامعلوم اسباب یکجا ہوتے ہیں، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو سکے۔ فطرت کا یہ قانون جس طرح بقیہ دنیا میں کار فرما ہے اسی طرح وہ انسانی زندگی میں بھی کام کر رہا ہے۔

نزاع کے ابتدائی مرحلہ میں فیصلہ کا اپنے اختیار میں ہونا بہت سے اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ مختلف اسباب کی یکجائی اس کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے حق میں ایک مفید فیصلہ لے سکے۔ لیکن اگر وہ بر وقت فیصلہ کرنے میں ناکام رہا تو یہ اسباب بہت جلد منتشر ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ حالات کا سرا آدمی کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی صابرانہ روش اختیار کر کے آنے والے وقت کا انتظار کرے جب کہ دوبارہ ایسے اسباب اکٹھا ہوں جو اس کو از سر نو اپنا مطلوب فیصلہ لینے کا موقع دے سکیں۔ فیصلہ کے وقت چوک جانا اگر غلطی ہے تو مشتے بعد از جنگ غلطی پر دیوانگی کا اضافہ۔

علمی جہاد

رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، آپ نے فرمایا کہ میری امت میں برابر ایک گروہ موجود رہے گا جو حق کے لئے قتال کرے گا۔ اس حدیث میں بظاہر قتال کا لفظ ہے۔ مگر امام بخاری (۲۵۶-۱۹۴ھ) نے اس کو جنگ کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ علمی جہاد کے معنی میں لیا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے جس باب کے تحت نقل کیا ہے اس کا عنوان (ترجمۂ باب) انہوں نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے:

باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق یقاتلون و ھم اھل العلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے بیان میں کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہتے ہوئے قتال کرے گا، اور اس سے مراد علم والے ہیں۔ (کتاب الاعتصام)۔ امام بخاری کے اس ترجمۂ باب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث میں "قتال" کو اس کے لفظی معنی میں نہیں لے رہے ہیں۔ بلکہ حقیقی معنی میں لے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ اس سے مراد علمی مجاہدین ہیں، یعنی وہ لوگ جو علم کی راہ سے اللہ کے دین کی خدمت کریں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مستقل اور مسلسل جاری رہنے والی چیز علمی جہاد ہی ہے۔ قتال مسلسل جاری رہنے والی چیز نہیں۔ چنانچہ ابو بکر الجصاص رازی حنفی (م ۳۷۰ھ) نے لکھا ہے کہ علمی جہاد اصل ہے اور جسمانی یا عسکری جہاد صرف ایک شاخ ہے (فجھاد العلم اصل و جھاد النفس فرع، احکام القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۱۹)

علمی جہاد کی سب سے بڑی شکل یہ ہے کہ دلائل کے ذریعہ اسلام کی حجت لوگوں کے اوپر قائم کی جائے۔ اس کے خلاف علمی اعتراضات کو اعلیٰ علمی سطح پر رد کیا جائے۔ اسلام کو ایک فکری اور نظریاتی قوت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے لایا جائے۔

انسانی شخصیت

کیمسٹری کا پہلا سبق جو ایک طالب علم سیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی صورت بدل لیتی ہے:

Nothing dies, it only changes its form.

اس عالمی کلیہ سے انسان کے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح مادہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ جلنے یا پھٹنے یا کسی اور حادثہ سے وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ شکل بدل کر دنیا کے اندر اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ اسی طرح ہم مجبور ہیں کہ انسان کو بھی نا قابل فنا مخلوق سمجھیں اور موت کو اس کے خاتمہ کے ہم معنی قرار نہ دیں۔

یہ محض بالواسطہ قیاس نہیں بلکہ ایک ایسا واقعہ ہے جو براہ راست تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر علم الخلیہ (cytology) بتاتا ہے کہ انسان کا جسم جن چھوٹے چھوٹے خلیوں (cells) سے مل کر بنا ہے وہ مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ایک متوسط قد کے انسان میں ان کی تعداد تقریباً ۲۶ پدم ہوتی ہے۔ یہ خلیے کسی عمارت کی اینٹوں کی طرح نہیں ہیں جو ہمیشہ وہی کے وہی باقی رہتے ہوں۔ بلکہ وہ ہر روز بے شمار تعداد میں ٹوٹتے ہیں اور غذا ان کی جگہ دوسرے تازہ خلیے فراہم کرتی رہتی ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ ظاہر کرتی ہے کہ اوسطاً ہر دس سال میں ایک جسم بدل کر بالکل نیا جسم ہو جاتا ہے۔ گویا دس برس پہلے میں نے اپنے جس ہاتھ سے کسی معاہدہ پر دستخط کیے تھے وہ ہاتھ اب میرے جسم پر باقی نہیں رہا۔ پھر بھی "پچھلے ہاتھ" سے دستخط کیا ہوا معاہدہ میرا ہی معاہدہ رہتا ہے۔ جسم کی تبدیلی کے باوجود اندر کا انسان پہلے کی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے۔ اس کا علم، اس کا حافظہ، اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں، اس کے خیالات بدستور اس کی ہستی میں شامل رہتے ہیں۔ اسی لئے ایک حیاتیاتی عالم نے کہا ہے کہ انسانی شخصیت تغیر کے اندر عدم تغیر کا نام ہے:

personality is changlessness in change.

اگر صرف جسم کے خاتمہ کا نام موت ہو تو ایسی موت تو "زندہ" انسانوں کے ساتھ بھی ہر روز پیش آتی رہتی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر کا ایک شخص جس کو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، وہ جسمانی خاتمہ کے معنی میں چھ بار مکمل طور پر مر چکا ہے۔ اب چھ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو ساتویں بار کی موت سے کیوں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو موت کے بعد بھی زندہ موجود رہتا ہے۔ دوسری چیزیں اگر گیس کی صورت میں باقی رہتی ہیں تو انسان اپنے شعوری وجود کی صورت میں اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔

موت کے بعد زندگی کے اور بھی بہت سے استدلالی قرائن ہیں ان میں سے ایک نطق (الذاریات ۲۳) ہے۔ انسان کا بولنا ایک انتہائی عجیب ظاہرہ ہے۔ نطق آدمی کی پوری شخصیت کی علامت ہے۔ یہ نطق حیرت انگیز طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

آواز کی ریکارڈنگ کے جدید طریقوں نے اس حقیقت کو ایک معلوم اور معروف چیز بنادیا ہے۔ ۲۴ اگست ۲۰۰۰ کی صبح کی خبروں میں میں نے ریڈیو پر سنا کہ ہندستان کے مرکزی وزیر مسٹر کمار منگلم کا آج صبح سویرے دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد رات کو آٹھ بجے دوبارہ جب میں نے ریڈیو کو کھولا تو اس میں اس کی تفصیلی خبر کے ساتھ وفات یافتہ وزیر کا ایک بیان ان کی اپنی آواز میں سنایا جارہا تھا جو انہوں نے اپنی موت سے کچھ پہلے دیا تھا۔ جب میں نے ان کی آواز کو سنا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے ایک شخص جو مر گیا تھا وہ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اور اٹھ کر لوگوں کے سامنے بول رہا ہے۔

نطق کے بارہ میں یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو جدید ریکارڈنگ کے دور میں ہر ایک کے سامنے آرہا ہے۔ یہ گویا خدا کی ایک نشانی ہے جو ظاہر ہو کر انسان کو بتا رہی ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں مر کر آخرت کی دنیا میں دوبارہ جی اٹھنا ہے۔

بہار کا سفر

مدرسہ صدیقیہ، سرسیا (چمپارن) کی دعوت پر بہار کا سفر ہوا۔ ۲۵ مئی ۲۰۰۰ کو میں دہلی سے پٹنہ پہنچا اور ۲۷ مئی ۲۰۰۰ کو دہلی واپسی ہوئی۔ اس سفر میں بہت سے تجربات و مشاہدات پیش آئے ان کا مختصر حال یہاں لکھا جاتا ہے۔

۲۵ مئی کو صبح ۹ بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ دہلی کی سڑکوں پر وہی مانوس مناظر تھے۔ ایرپورٹ پہنچا تو پہلی خوش کن خبر یہ ملی کہ جہاز (انڈین ایر لائنز ۸۰۹۱) ٹھیک ٹائم پر ہے۔ مگر بعد کو اعلان ہوا کہ جہاز کی روانگی میں کچھ تاخیر ہے۔ یہ تاخیر بڑھتی رہی یہاں تک کہ وہ ایک گھنٹہ لیٹ ہو کر ساڑھے گیارہ بجے دہلی سے روانہ ہوا۔

اصل یہ ہے کہ انڈین ایر لائنز کے پاس اس وقت صرف ۵۵ جہاز ہیں اور تقریباً سب کے سب پرانے ہو چکے ہیں۔ ان جہازوں میں ہر روز مرمت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایک جہاز زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال تک چلایا جاتا ہے مگر ہندستان میں اس کی کوئی حد نہیں۔ کیوں کہ نیا جہاز خریدنے کے لئے کثیر زر مبادلہ درکار ہے۔ مگر زر مبادلہ کی کمی کا سبب کسی بھی درجہ میں یہ نہیں ہے کہ ہمارا ملک غریب ہے۔ اس کا واحد سبب کرپشن ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ صورت حال کب تک باقی رہے گی۔

جہاز میں میرے قریب کی سیٹ پر ایک بہاری بھر کم آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا سیلولر ٹیلی فون غالباً اپنے گھر سے ملایا اور کہا: میں دہلی سے بول رہا ہوں۔ ایسا ہے کہ یہ فلائٹ پہلے رانچی جائے گی اور پھر پٹنہ آئے گی۔ پٹنہ پہنچنے کا وقت ۲ بجے ہے۔ یہ سن کر میں نے سوچا کہ آج کے زمانہ میں اور قدیم زمانہ میں کتنا فرق ہے۔ قدیم زمانہ میں جب کوئی شخص سفر کرتا تھا تو اس کی خبر اس کے گھر والوں کو صرف اس وقت ملتی تھی جب کہ وہ وہاں پہنچ گیا ہو۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ خواہ آپ دنیا کے کسی بھی حصہ میں ہوں جدید مواصلاتی ذرائع کو استعمال کر کے منٹوں اور

سکنڈوں میں زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی خبر پہنچا سکتے ہیں۔

جہاز کے اندر پڑھنے کے لئے آج کے اخبارات کے علاوہ انڈین ائر لائنس کی فلائٹ میگزین سواگت (مئی ۲۰۰۰) موجود تھا۔ اس کو اٹھایا تو اس کی کور اسٹوری ہندستان کے قلعوں کے بارے میں تھی۔ اس کا عنوان تھا:

Forts, Legacies of the past.

اس باتصویر مضمون میں ہندستان کے مختلف قلعوں کی رنگین تصویریں تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں تصویر دہلی کے لال قلعہ کی تھی جس کو شاہ جہاں نے بنوایا تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے، دہلی کے لال قلعہ سے تھوڑی دوری پر یہاں کی جامع مسجد واقع ہے۔ دونوں کا جائے وقوع اس طرح ہے کہ جب قلعہ کی تصویر لی جاتی ہے تو اس کے فوکس میں جامع مسجد نمایاں طور پر دکھائی دینے لگتی ہے۔ چنانچہ سواگت کی موجودہ تصویر میں بھی ایسا ہی تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے مسلمانوں کا وہ دور یاد آگیا جو پانچ سو سال پہلے دنیا میں موجود تھا۔ اس وقت مسلمان زندگی کے مختلف شعبوں میں اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ جدھر سے بھی دیکھا جائے ان کا فوکس میں آنا لازمی تھا۔ مثلاً علم الحساب کی بات ہو تو فوراً عربی ہندسہ (Arabic Numerals) کا تذکرہ سامنے آجائے گا۔ علم جغرافیہ کا چرچہ ہو تو الادریسی کا نام سامنے آجائے گا جس نے یورپ کے ایک بادشاہ کے لئے پہلا عالمی نقشہ بنایا تھا۔ بحری جہازرانی کا تذکرہ ہو تو ملاح ماجد کا نام سامنے آجاتا ہے جس نے واسکوڈی گاما کے لمبے سفر میں اس کی رہنمائی کی تھی۔ طرز تعمیر کا ذکر ہو تو تاج محل کا نام فوراً سامنے آجاتا ہے جو اپنے زمانہ کے لحاظ سے ایک تعمیری چھلانگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ علم طب کا تذکرہ ہو تو فوراً ان مسلم حکماء کا نام سامنے آجائے گا جنہوں نے تاریخ میں سب سے پہلے آپریشن کا طریقہ ایجاد کیا۔ علم افلاک کا تذکرہ ہو تو ان مسلمانوں کا نام سامنے آجاتا ہے جنہوں نے تاریخ کی سب سے پہلی رصد گاہ بنائی۔

علم تاریخ کا ذکر کیا جائے تو فوراً ابن خلدون کا نام سامنے آجاتا ہے جس نے فن تاریخ کو

پہلی بار شاہی داستان کے دائرہ سے نکال کر اس کو انسانی تاریخ کا موضوع بنایا۔ لندن کے برٹش میوزیم میں آج بھی ایسے قدیم سونے کے سکے رکھے ہوئے ہیں جن کو ڈھالنے کے لئے بغداد کے مسلم سکہ گر بلائے گئے تھے۔ چنانچہ ان مسلم سکہ گروں کے نام ان پر کندہ ہیں۔

مسلمانوں نے اپنے زمانہ عروج میں دنیا کو سب سے بڑی جو چیز دی وہ یہ ہے کہ انہوں نے جدید سائنس کے دور کا آغاز کیا۔ اس معاملہ میں انسانیت کے لئے مسلمانوں کی جو دین ہے اس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

جہاز کے اندر اعلانات ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس جہاز کے کیپٹن مسٹر محبوب ہیں۔ یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ترقی کے وہ تمام مواقع موجود ہیں جو کسی دوسرے کے لئے ہو سکتے ہیں۔

۱۹۴۷ سے لے کر اب تک مسلمانوں کے تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ مسلمانوں کو یہ تاثر دے رہے تھے کہ ہندستان ان کے لئے ایک پرابلم کنٹری ہے۔ میں غالباً پہلا شخص تھا جس نے مسلمانوں کو یہ بتانا شروع کیا کہ اس ملک میں ان کے لئے وہ تمام مواقع پوری طرح موجود ہیں جو کسی دوسرے ملک میں ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے مشن کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں مگر میں نے اللہ کی توفیق سے اپنا مشن جاری رکھا۔ آج یہ حقیقت اتنی نمایاں ہو چکی ہے کہ بے آنکھ والے بھی اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلم رہنماؤں کی نظر کچھ انتہا پسند ہندوؤں کے لکھے یا بولے ہوئے لفظوں پر تھی۔ اس کے برعکس میری نگاہ فطرت کے قوانین اور تاریخ میں کام کرنے والی قوتوں پر تھی۔ اور زندگی کا فیصلہ ہمیشہ تاریخی قوانین کے تحت ہوتا ہے، کسی لیڈر کا اخباری بیان اس کا فیصلہ نہیں کرتا۔

پٹنہ ایرپورٹ پر میں اترا تو وہاں مولانا عبد الرحیم امدادی، مسٹر ایم ٹی خان، مولانا بدر الدین قاسمی وغیرہ موجود تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہو کر پہلے مسٹر ایم ٹی خان کی

رہائش گاہ (عدالت گنج) پہنچا۔ یہاں کچھ دیر قیام رہا اور لوگوں سے مختلف موضوعات پر بات ہوئی۔

مسٹر ایم ٹی خان ہائی کورٹ میں ایک اچھے عہدہ پر ہیں۔ اپنے عہدہ کے لحاظ سے ان کو موجودہ مکان سے زیادہ بڑا سرکاری مکان مل رہا تھا مگر ان کے ہندو پڑوسیوں نے سخت اصرار کیا کہ وہ یہیں رہیں، وہ دوسرے مکان میں نہ جائیں۔ چنانچہ انہوں نے موجودہ مکان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔

پٹنہ ریاستِ بہار کی راجدھانی ہے۔ بہار ہندستان کی چند بڑی ریاستوں میں سے ایک ہے۔ اس کی ابتدائی تاریخ ۱۵۰۰ قبل مسیح تک جاتی ہے۔ ساڑھے تین ہزار سال کی اس طویل مدت کے درمیان بہار کے جغرافی نقشہ میں بھی بار بار تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اس کے سیاسی نقشہ میں بھی۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ البتہ ایک سبق آموز بات یہاں قابل ذکر ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانکا (۱۹۸۴) میں بہار پر چار صفحہ کا مقالہ شامل ہے۔ اس میں مسلم عہد اور برطانی عہد کے لئے حیرت انگیز طور پر دو مختلف قسم کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً بہار میں برطانی عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے "برطانیہ کے تحت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

Under the British it formed a part of the Bengal presidency until 1912 (2/984)

اس کے بعد انسائیکلوپیڈیا کے اسی مقالہ میں جب مسلم عہد کا تذکرہ کیا گیا ہے تو برعکس طور پر وہاں "مسلم حملہ آور" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

The name Bihar (Vihar) dates back to about AD 1200 and was given by the Muslim invaders who were struck by the large number of Buddhist monasteries (viharas) they saw. (2/984)

تاریخ نویسی کا یہ غیر علمی انداز ہر قوم اور ہر گروہ میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ غالباً یہ سب سے بڑی وجہ ہے جو اس میں رکاوٹ بن گئی کہ انسانی سوچ کا ارتقاء حقیقت پسندانہ بنیاد پر ہو سکے۔ انسانی تاریخ کو مجرد طور پر خارجی حقائق کی روشنی میں لکھنا چاہئے نہ کہ ذاتی تعصبات کی روشنی میں۔

۲۵ مئی ۲۰۰۰ کی شام کو پٹنہ سے موتی ہاری کے لئے روانگی ہوئی۔ بارش کی وجہ سے

موسم بہت خوش گوار ہو گیا تھا۔ مگر سڑک کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ہماری گاڑی ہر قدم پر اس طرح ہچکولے کھاتی ہوئی چل رہی تھی جیسے کہ ہم پختہ سڑک پر نہ چل رہے ہوں بلکہ کسی کچی سڑک پر چل رہے ہوں۔

آزادی کے بعد جن ہندستانی لیڈروں کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور آئی وہ سب رومانی قسم کے لیڈر تھے۔ وہ سوشلسٹ سوسائٹی، نان الائنڈ مومنٹ، پبلک سکٹر، مزدور نواز قوانین اور سماج واد جیسے خیالی افکار میں گم تھے۔ انہوں نے سڑک اور اس طرح کی دوسری چیزوں پر توجہ دینے کے بجائے اپنی خیالی دنیا کو قائم کرنے پر ساری طاقت لگادی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی خیالی دنیا تو بن نہ سکی کیوں کہ وہ بننے والی ہی نہ تھی۔ اور جو کام ممکن تھا وہ اس لئے انجام نہیں پایا کہ اس کے لئے انہوں نے حقیقی طور پر کام ہی نہیں کیا۔

راستہ میں ایک بہت لمبا پل آیا معلوم ہوا کہ یہ پل گنگا ندی کے اوپر بنایا گیا ہے اور وہ تقریباً پانچ کلو میٹر لمبا ہے۔ یہ پل آزادی کے بعد بنایا گیا ہے۔ اس سے پہلے صرف کشتیوں کے ذریعہ سفر ہوا کرتا تھا۔ لمبا راستہ طے کرنے کے بعد موتی ہاری پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ یہاں رحمٰن ماڈل اکیڈمی میں پروگرام تھا۔ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے تھے۔ مگر ہمارے پہنچنے میں تین گھنٹے کی تاخیر ہو گئی۔ بہت سے لوگ انتظار کرنے کے بعد واپس ہو گئے تھے۔ تاہم یہاں ایک اجتماع ہوا اس میں بھی کافی لوگ شریک تھے۔ میں نے تعلیم کی اہمیت پر تقریر کی۔

موتی ہاری میں رحمٰن ماڈل اکیڈمی کے جلسے میں کئی اعلیٰ سرکاری افسران بھی شریک تھے۔ رحمٰن اکیڈمی کے بانی ڈاکٹر ایم۔ اے۔ رحمٰن ہیں۔ یہ تعلیمی ادارہ انہوں نے ۱۹۸۹ میں قائم کیا تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ تعلیم کا مقصد صرف جاب حاصل کرنا یا پیسہ کمانا نہیں ہوتا بلکہ تعلیم کا اصل مقصد انسان کو باشعور بنانا ہے۔

ایک مسلم افسر نے بتایا کہ بہار میں سرکاری سروس میں ہندو مسلم کے درمیان امتیاز نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ یہاں مسلم افسران کی تعداد کافی ہے۔ موتی ہاری سے رات میں روانہ ہو کر ہم پٹنہ

منشاٹولہ (جامع مسجد) پہنچا۔ یہاں کی زیر تعمیر مسجد میں ایک جلسہ رکھا گیا تھا۔ اس میں تعمیر ملت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے ترقی کے تمام مواقع موجود ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ محنت کے ساتھ کام کیا جائے۔

منشاٹولہ کی مسجد میں تقریر کے بعد ہم لوگ شانتی ہوٹل گئے اور رات یہاں گذاری۔

۲۶ مئی ۲۰۰۰ کی صبح کو ہمارا قافلہ ہوٹل سے روانہ ہو کر بتیا کے یتیم خانہ میں پہنچا۔ یہ یتیم خانہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک، لڑکوں کے لئے، اور دوسرا، لڑکیوں کے لئے۔ یتیم خانہ نہایت وسیع رقبہ میں قائم ہے اور تعمیر وغیرہ کے لحاظ سے کافی شاندار ہے۔ یتیم خانہ کے رجسٹر پر میں نے جو الفاظ لکھے وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

۲۵ مئی ۲۰۰۰ کو بتیا کا یتیم خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اس کو اپنی امیدوں سے زیادہ پایا۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو زیادہ سے زیادہ ترقی عطا فرمائے۔

کسی بچہ یا بچی کا یتیم ہونا کوئی برائی نہیں۔ یہ ایک نعمت ہے جو فطرت کی طرف سے کسی کو دی جاتی ہے۔ اگر یتیم ہونا نعمت نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ پیغمبر اسلام کے لئے یتیمی کا انتخاب نہ فرماتے۔ یتیم ہونا کسی بچہ یا بچی کے لئے قدرت کی طرف سے ایک خوشخبری ہے۔ اس بات کی خوشخبری کہ تم کو زندگی کے سفر کے لئے وہ کورس عطا کیا گیا ہے جو اس انسان کو عطا ہوا جس کے بارے میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم حضرات بھی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ آپ ﷺ پوری تاریخ بشری کے سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے۔

یتیم بچہ یا بچی کو پیدا ہونے کے بعد دنیا میں اپنے فطری امکان کو بروئے کار لانے کے لئے اور کیا چیز ملنی چاہئے اس کا اشارہ اس قرآنی آیت میں ملتا ہے۔

الم یجدك یتیماً فاوی (الانشراح)۔ یعنی اپنے آغاز حیات میں اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے ایک ماویٰ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ یتیم خانہ اور اسی طرح تمام یتیم خانے اسی آیت کی عملی تفسیر ہیں۔ وہ یتیموں کو ماوی فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کے کام کو میں اپنی زبان میں منصوبۂ خداوندی

سمجھتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بتیا کے اس یتیم خانہ کو حقیقی معنوں میں یتیموں کا ماوی بنائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ ترقی عطا فرمائے۔

یتیم خانہ کے ایک طالب علم فصیح اختر (۱۷ سال) نے ایک نعت سنائی۔ غالباً یتم نے ان کی آواز کو کافی پر اثر بنادیا تھا۔ اس نعت کا ایک شعر یہ تھا:

پتھر کا کلیجہ بھی شق ہو فولاد بھی پانی پانی ہو   اتنا ہے کلام رب میں اثر جو تم کو اثر معلوم نہیں

یہ یتیم خانہ ۱۹۲۸ سے قائم ہے۔ ایک صاحب نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ بچپن میں میں یتیم ہو گیا تھا۔ میرے رشتہ داروں نے مجھے اس یتیم خانہ میں داخل کر دیا۔ میرے ساتھ دو یتیم بچے اور تھے۔ ہم تینوں نے یتیم بچوں کی حیثیت سے اس یتیم خانہ میں پرورش پائی۔ اس وقت بظاہر ہمارا کوئی مستقبل نہ تھا۔ مگر آج ہم تینوں اللہ کے فضل سے کامیاب زندگی گذار رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ آپ کے اسی یتیم ہونے کا نتیجہ ہے۔ یتیمی کی حالت بہترین حالت ہے۔ یتیمی آدمی کے اندر خود شناسی پیدا کرتی ہے۔ وہ آدمی کے اندر خود کفیل بننے کا جذبہ ابھارتی ہے۔ یتیم آدمی سمجھتا ہے کہ میرا کوئی سہارا نہیں، اس لئے مجھ کو خود ہی سارا عمل کرنا ہے۔ اس طرح وہ دوسروں سے زیادہ محنت کرنے لگتا ہے۔ یتیمی کے حالات آدمی کو ہیرو بنادیتے ہیں۔

بتیا میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب وہ تھے جن کی عمر ۳۰ سال تھی۔ ان کے والدین کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ رشتہ داروں نے ان سے بڑی بے رخی برتی۔ حتی کہ ان کو معمولی مدرسہ میں داخل کر دیا۔ چنانچہ ان کا ابتدائی زمانہ تکلیفوں اور مصیبتوں میں گذرا۔ بے عزتی اس کے علاوہ تھی۔ اس کے بعد وہ کسی طرح بمبئی پہنچ گئے وہاں انہوں نے محنت کرنا شروع کیا یہاں تک کہ اب وہ ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ بچپن میں وہ بے سہارا اور یتیم تھے۔ اب وہ پورے معنوں میں ایک سلف میڈ مین (self-made man) ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ان کے سینہ میں لوگوں کے خلاف سخت شکایات ہیں۔ ان کا سینہ ماضی کی تلخ یادوں سے بھرا ہوا ہے۔

میں نے ان سے نصیحت کے طور پر دو باتیں کہیں۔ ایک بات یہ کہ یاد رکھئے، سب سے بڑی عبادت اللہ کا شکر ہے۔ شکر بے حد لطیف چیز ہے۔ شکر اور نفرت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ جو آدمی شکر جیسی افضل عبادت کا انعام لینا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنے سینہ کو نفرت سے مکمل طور پر پاک رکھے۔ گندے برتن میں آپ دودھ رکھیں تو دودھ خراب ہو جائے گا۔ اسی طرح نفرت اور انتقام سے بھرے ہوئے سینہ میں شکر جیسے نورانی جذبہ کا جگہ پانا ممکن نہیں۔

دوسری بات ان سے میں نے یہ کہی کہ جن لوگوں نے آپ کو بچپن میں بے سہارا چھوڑ دیا، دراصل یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کو ترقی تک پہنچایا۔ فطرت کا یہ قانون ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو بے سہارا پائے اس کے اندر عمل کا بے پناہ جذبہ ابھر آتا ہے۔ زندگی کی مشکلات کسی انسان کے لئے مہمیز کا حکم رکھتی ہیں۔ اس دنیا میں ترقی کے درجہ تک وہی پہنچتا ہے جس کو زندگی میں جھٹکے لگتے ہیں، یہ گویا شاک ٹریٹمنٹ کا معاملہ ہے۔ یعنی زحمت میں رحمت۔

مولانا قاری بدر الدین قاسمی (۲۹ سال) آج کل بمبئی میں رہتے ہیں۔ Tel. 4158145 ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ ایک موقع پر میں نے کہا کہ اعلان حق کوئی مطلق چیز نہیں۔ اگر اعلان حق کوئی مطلق چیز ہوتی تو حدیث میں یہ نہ ہوتا کہ: من صمت نجا (جو چپ رہا اس نے نجات پائی) انہوں نے کہا کہ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فمن لم یستطع فبلسانہ ومن لم یستطع فبقلبہ و ذلک اضعف الایمان۔ میں نے کہا کہ اس حدیث کو سمجھنے میں عام طور پر سخت غلطی کی جاتی ہے۔ اس حدیث میں استطاعت کی شرط لگی ہوئی ہے۔ استطاعت کا مطلب اقدام کی استطاعت نہیں ہے، بلکہ نتیجہ کی استطاعت ہے۔ یعنی عملی اقدام یا لسانی اقدام کر کے اگر مطلوب نتیجہ بر آمد کرنا اپنے بس میں ہو تو اقدام کیا جائے گا ورنہ خاموشی اختیار کی جائے گی۔ اور صرف دعا پر اکتفا کیا جائے گا۔

بتیا میں کئی لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے ایک جناب محمد امیر اللہ صاحب تھے۔

انہوں نے کافی رقم خرچ کر کے ایک قابل قدر کام کیا ہے۔ یہ ایک قسم کے تعلیمی مسافر خانہ کا قیام ہے جو بس اسٹینڈ اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان واقع ہے۔

جتیا میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے ایک مسٹر حیدر علی ہیں۔ ان کا پورا خاندان ابتدا سے الرسالہ کا قاری رہا ہے۔ ان کی والدہ جن کی عمر ۸۵ سال ہو گئی ہے، وہ اب بھی بغیر عینک کے الرسالہ پڑھتی ہیں۔ ان کی صاحبزادی صوفیہ حیدر جنہوں نے حال ہی میں بی۔ ایس۔ سی۔ کا کورس کیا ہے، نہایت اہتمام سے الرسالہ کا مطالعہ کرتی ہیں اور الرسالہ کا ہر شمارہ بار بار پڑھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ الرسالہ مطبوعات کا برابر مطالعہ کر رہی ہیں۔ میں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ زندگی میں سب سے اہم چیز حوصلہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے گھر والوں کو اور رشتہ داروں کو الرسالہ مطالعہ کے لئے دیتی ہوں مگر کم لوگ اس طرح کی سنجیدہ چیزوں کے مطالعہ میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ان عزم الجزاء مع عزم البلاء یعنی جتنی زیادہ تکلیف کے ساتھ عمل کیا جائے اتنا ہی زیادہ اس کا ثواب ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ایسے لوگوں کے بارے میں شکایت کے بجائے یہ سوچیں کہ وہ آپ کے ثواب میں اضافہ کر رہے ہیں۔

سفر سے واپسی کے بعد صوفیہ حیدر صاحبہ کا ایک خط ملا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ "آپ کے دورہ کے بعد میرے حوصلوں میں کافی اضافہ ہو گیا ہے"۔ اب وہ زیادہ سرگرمی کے ساتھ خواتین میں الرسالہ مشن کو پھیلانے کا کام کر رہی ہیں۔

اس طرح مختلف لوگوں سے ملنے کے بعد ہم لوگ جن پیا پہنچے۔ یہاں جناب شفیع اختر صاحب (رستم بیڑی والے) کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ جس میں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ کئی ممتاز ہندو صاحبان بھی یہاں موجود تھے۔ اس موقع پر میں نے قومی یکجہتی کے موضوع پر تقریر کی۔ لوگوں نے اچھے تاثر کا اظہار کیا۔ اس اجتماع میں کچھ اخبار نویس بھی موجود تھے۔ تقریر کے بعد لوگوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک بڑے شہر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں الرسالہ مشن سے اتفاق رکھتا ہوں اور اس کے لئے عملی طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر ٹائم نہیں ملتا۔ میں نے کہا کہ یہ کسی ایک شخص کی بات نہیں۔ ہندستان سے لے کر امریکہ تک آپ کو بے شمار ایسے لوگ ملیں گے جو کہیں گے کہ میں دین کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر ٹائم نہیں ملتا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ سو سال پہلے کوئی آدمی ایسا نہیں کہتا تھا حالاں کہ اس وقت بھی یہی ٹائم تھا۔ پہلے بھی اسی طرح ۲۴ گھنٹہ کے رات اور دن ہوتے تھے۔

اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پہلے ایک آدمی کو اپنا ٹائم دینے کے لئے زیادہ کھونا نہیں پڑتا تھا۔ اب اس کو ٹائم دینے کے لئے بہت زیادہ کھودینا پڑتا ہے۔ سکہ کی اصطلاح میں پہلے ٹائم کی قیمت بہت کم تھی اور اب سکہ کی اصطلاح میں ٹائم کی قیمت بہت بڑھ چکی ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر آج لوگ ٹائم کا عذر پیش کرتے ہیں۔ جب کہ ماضی میں وہ اس قسم کا عذر نہیں کرتے تھے۔

مزید غور کیجئے تو حقیقۃ ٹائم کا مسئلہ نہیں بلکہ حرص کا مسئلہ ہے۔ آج بھی لوگ اگر سادگی اور قناعت کو اپنا طریقہ بنائیں تو وہ تھوڑے ٹائم میں اتنی کمائی کر سکتے ہیں جو ان کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ضرورتوں پر قانع نہیں۔ وہ اپنے سماجی اسٹیٹس کو بڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ٹائم کی ہر مقدار ان کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو حقیقت بیانی سے کام لے کر یہ کہنا چاہئے کہ ہم دینی مشن کو اتنا اہم نہیں سمجھتے کہ اس کے لئے ہم اپنا ٹائم دیں۔ ہمارے پاس ٹائم ہے مگر اس کا زیادہ بہتر استعمال ہمارے نزدیک کسب مال ہے۔

جمن پیا سے روانہ ہو کر ہم لوگ ساٹھی پہنچے۔ یہاں مدرسہ ریاض العلوم واقع ہے۔ وہ ۱۹۴۶ میں قائم ہوا۔ وہ ترقی کرتے کرتے ایک بڑا تعلیمی ادارہ بن چکا ہے۔ اس میں لڑکوں کی تعلیم

کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ آج جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز ریاض العلوم کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد مسجد میں اجتماع ہوا۔ وسیع مسجد پوری طرح بھری ہوئی تھی۔

ریاض العلوم کی مسجد کی تقریر میں میں نے دینی تعلیم کی اہمیت اور مدارس دینیہ کے کردار پر خطاب کیا۔ یہ ایک تفصیلی خطاب تھا اس خطاب میں دوسری باتوں کے علاوہ میں نے ایک بات یہ کہی کہ بہت سے لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس ملک میں مدارس کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ مدارس کے خلاف غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ مدارس کے نظام کو تباہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے کہا کہ اس قسم کی مخالفانہ کوششیں ہر چیز کے خلاف اور ہمیشہ کی جاتی رہی ہیں۔

قرآن کے بیان کے مطابق، یہ دنیا عداوتوں کی دنیا ہے۔ ہمیں عداوتوں کے ماحول میں جینا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہم منفی رد عمل سے بچیں اور مثبت رد عمل کے ذریعہ ان حالات کا خاموش مقابلہ کریں۔ میں نے کہا، صحیح البخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ نے فرمایا: ان اللہ یعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف۔ اس حدیث میں یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ مسائل کا مقابلہ اگر تشدد کے انداز میں کیا جائے تو صرف ناکامی ہمارے حصہ میں آئے گی۔ اس کے برعکس اگر مسائل کا مقابلہ نرمی اور امن کے اسلوب میں کیا جائے تو کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ جمعہ کے پروگرام کے بعد ریاض العلوم میں پریس کانفرنس تھی اس میں دینک جاگرن "ہندستان" اور دوسرے اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ سوال وجواب کی صورت میں یہ کانفرنس دیر تک چلتی رہی۔

ایک ہندو اخبار نویس نے کہا کہ سارے مذہبوں کو ایک کیسے ملایا جائے۔ کیوں کہ جب تک سارے مذاہب ایک نہ ہو جائیں ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا کہ اتحاد کا کوئی تعلق مذہبوں کو ایک کرنے سے نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے درمیان آپس میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کورو اور پانڈو دونوں کا

مذہب ایک تھا۔ اس کے باوجود دونوں میں خونیں جنگ ہوئی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں ہونے والی دو عالمی جنگوں میں دونوں فریق ایک ہی مذہب کو ماننے والے تھے۔ حال کی خلیجی جنگ دو ہم مذہب لوگوں کے درمیان ہوئی وغیرہ۔

میں نے کہا کہ اتحاد کا راز ٹالرنس ہے۔ اگر آپ کو ملک میں اتحاد لانا ہے تو مذہبوں کو بے فائدہ طور پر ایک کرنے کی بات نہ کیجئے۔ بلکہ لوگوں کو اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنے کا سبق دیجئے۔ لوگوں سے کہئے کہ فرق واختلاف فطرت کا لازمی حصہ ہے۔ دوسرے معاملات میں ایسا ہے کہ لوگ فرق اور اختلاف کے باوجود باہمی احترام کے اصول پر زندگی گزارتے ہیں۔ یہی اصول مذہب کے دائرہ میں بھی کار آمد ہے۔

ریاض العلوم ساٹھی میں برابر لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور ان سے دینی اور ملی موضوعات پر تبادلۂ خیال جاری رہا۔ ایک صاحب جو میرے ساتھ سفر میں شریک تھے، وہ شہری زندگی کے عادی ہیں۔ ہمارا سفر زیادہ تر دیہاتی علاقوں میں ہوا، جہاں اونچے نیچے راستے تھے۔ ہم کو طرح طرح کے پر مشقت معاملات سے سابقہ پیش آیا۔ اس تجربہ سے وہ کچھ گھبرا گئے اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے سفر کے اس تجربہ کو پر تاسف (deplorable) قرار دیا۔ میں نے کہا کہ اسلام نام ہے ہر واقعہ سے مثبت اثر لینے کا۔ مثلاً یہ تکلیف دہ تجربات جو ہمارے ساتھ گذر رہے ہیں، اس سے ہم کو شکر کی غذا لینا چاہئے۔ کیوں کہ یہ ہمارے لئے صرف ایک وقتی مصیبت ہے، جب کہ وہ ان گاؤں والوں کے لئے مستقل مصیبت ہے۔ ہم کو سوچنا چاہئے کہ اللہ نے ہمارے ساتھ آسانی کا معاملہ فرمایا ہے۔ ہم کو اس سخت امتحان میں نہیں ڈالا، جس میں گاؤں اور دیہات کے یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں۔

۲۶ مئی کی شام کو مغرب کی نماز ریاض العلوم میں پڑھی گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ آگے کے لئے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے مجھے ریاض العلوم کے تحت بننے والا لڑکیوں کا مدرسہ دکھایا گیا۔ یہ ایک کشادہ اور خوب صورت عمارت تھی۔ آج کل سارے ملک میں جگہ جگہ مسلم لڑکیوں

کے لئے اسکول اور مدرسے بنائے جارہے ہیں۔ یہ ایک بے حد خوش آئند بات ہے۔ کچھ لوگ لڑکیوں کی تعلیم پر خدشات ظاہر کررہے ہیں۔ حال میں ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ جو لڑکیاں عالمہ اور فاضلہ بن رہی ہیں ان میں طلاق کی شرح دوسری لڑکیوں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ ان تعلیم یافتہ مسلم لڑکیوں کو آسانی سے سروس مل جاتی ہے۔ اس لئے ان کے اندر شوہر کے تابع نہ رہنے کا وہی مزاج پیدا ہورہا ہے جو مغربی سماج کی لڑکیوں میں اسی سبب سے پایا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ کی یہ اطلاع درست ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس دنیا میں نہ سارے مرد معیاری ہوتے ہیں اور نہ ساری عورتیں۔ آپ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں اس دنیا میں کبھی بھی نہ تمام خواتین معیاری خواتین بن جائیں گی اور نہ تمام مرد معیاری مرد۔

راستہ میں ہم لوگ جناب جمال الدین صاحب کے دفتر پر رکے۔ ان کی تعلیم صرف نویں کلاس تک ہوئی ہے۔ پہلے ان کی معاشی حالت بہت معمولی تھی، مگر اب وہ ایک کامیاب بزنس چلارہے ہیں۔ میں نے انہیں دو نصیحتیں کیں۔ ایک یہ کہ اللہ اگر کسی کو پیسہ دے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ عیش کی زندگی گذارنے لگے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ بقدر ضرورت پر قناعت کرے اور بقیہ پیسے کو اچھے کاموں میں خرچ کرے۔

دوسری نصیحت یہ کی کہ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیے۔ تعلیم میں ہرگز کمی نہ کرے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک باپ اپنے بچے کو سب سے بہتر جو چیز دے سکتا ہے وہ اچھی تعلیم ہے۔ جمال الدین صاحب کے یہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد ہم لوگ آگے بڑھے۔ رات ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں کو سرسیا پہنچنا تھا۔ یہ پورا راستہ تجربات کا ایک سلسلہ تھا۔ ایک جگہ ہماری گاڑی کو ندی کے راستہ سے گزرنا پڑا۔ بارش ہونے کی وجہ سے راستہ میں جگہ جگہ گڑھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ راستہ کار کے ذریعہ نہیں بلکہ ٹریکٹر کے ذریعہ طے ہورہا ہے۔ میں نے کہا کہ اس دنیا میں ہماری زندگی شروع سے آخر تک ایک امتحان ہے۔ اس امتحان کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ

ہم وہ کام کریں جو خدا کی پیدا کی ہوئی گائے کرتی ہے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کا شعر ہے:

کل جو گھاس چری تھی بن میں — دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں

میں نے کہا کہ گائے کے اندر جو واقعہ نیچرل پراسس کے تحت ہوتا ہے وہی انسان کے اندر شعوری پراسس کے تحت ہونا چاہئے، یعنی تکلیف میں شکر کا پہلو نکال لینا۔ مصیبت میں راحت کی غذا حاصل کرنا، ناخوشگوار تجربات کو خوشگوار احساسات میں تبدیل کرنا، وغیرہ۔

اس طرح سفر کرتے ہوئے ہم لوگ سرسیا پہنچے۔ یہاں مدرسہ صدیقیہ میں خطاب کا پروگرام تھا۔ اس مدرسہ کو مولانا عبدالرحیم امدادی نے اپنے پیرومرشد قاری محمد صدیق باندوی کے نام پر قائم کیا ہے۔ یہاں خطاب کا وقت ۱۰ بجے رات تھا۔ یہاں کافی لوگ اکٹھا ہو گئے۔

میں نے اس موقع پر ایک مفصل تقریر کی۔ میری تقریر کا موضوع تعلیم دین کی اہمیت تھا۔ میں نے کہا کہ تعلیم دین فرض کے درجہ میں ضروری ہے۔ تعلیم کا تعلق ایمان سے بہت گہرا ہے۔ ایمان کیا ہے، ایمان دراصل دین خدا کی صداقت کو شعوری اور روحانی طور پر دریافت کرنا ہے۔ یہ دریافت عام حالات میں علم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

کچھ لوگوں نے یہ شکایت کی کہ آپ ہمارے خطوط کے جواب نہیں دیتے۔ میں نے کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ خطوط کا جواب دیتا ہوں، خواہ وہ مختصر کیوں نہ ہو۔ البتہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خط میں لکھنے والے کا پتہ نہیں ہوتا، کبھی سوال واضح نہیں ہوتا، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو الرسالہ کے "سوال وجواب" کے کالم میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی خط ڈاک کی خرابی کی وجہ سے مکتوب الیہ تک نہ پہنچا ہو۔

مدرسہ صدیقیہ کے پروگرام میں حاضرین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہاں کافی دیر ہو گئی۔ یہاں تک کہ رات کے بارہ بج گئے۔ اس کے بعد ہم لوگ ساٹھی کے لئے روانہ ہوئے۔

اندھیری رات تھی۔ ایک بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم چلتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں ایک پہاڑی ندی واقع تھی۔ ایسی ندیوں میں پانی مستقل نہیں رہتا بلکہ سال میں کبھی کبھی

آجاتا ہے۔ چنانچہ یہاں پل کے بجائے ڈھلوان سڑک بنا دی جاتی ہے۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو سڑک پر پانی پھیل چکا تھا۔ ہمارے ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ پانی اتنا زیادہ ہے کہ ہماری گاڑی اس میں سے گزر نہیں سکتی۔ اب یہ مشورہ ہونے لگا کہ راستہ بدل کر ایک اور سڑک سے چلا جائے، اگرچہ وہ راستہ لمبا ہے اور کم از کم دو گھنٹہ کی مسافت بڑھ جاتی ہے۔

ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ اچانک پیچھے سے ایک روشنی دکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ ایک جیپ ہمارے پیچھے آرہی ہے۔ یہ واقعہ انوکھا تھا کیوں کہ سارے راستہ میں ہمیں کوئی بھی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ ہم ایک سنسان سڑک سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ ہماری گاڑی ندی کے کنارے کھڑی ہوئی تھی کہ اچانک جیپ آگے بڑھی اور وہ فوراً دریا میں داخل ہو کر پانی سے گذرتی ہوئی سڑک کے دوسری طرف چلی گئی۔

یہ دیکھ کر ہمارے ڈرائیور کی سمجھ میں آیا کہ پانی اتنا زیادہ نہیں ہے کہ گاڑی اس سے گزر نہ سکے۔ چنانچہ ہمارے ڈرائیور نے بھی گاڑی دریا میں ڈال دی۔ چند منٹ میں ہم لوگ دریا کے اس پار پہنچ چکے تھے۔ عجیب بات ہے کہ یہ جیپ ہمیں آگے دوبارہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے اسماعیل میرٹھی کا ایک قطعہ یاد آیا:

گھوڑ دوڑ میں گدائی کی بازی تھی ایک دن ترکی پہ کوئی تازی پہ اپنے سوار تھا
جو ہچکچا کہ رہ گیا سو رہ گیا ادھر جس نے لگائی ایڑ وہ خندق کے پار تھا

رات مدرسہ ریاض العلوم ساٹھی کے مہمان خانہ میں گزاری۔ صبح کو فجر کی نماز مدرسہ کی مسجد میں ادا کی۔ امام نے دونوں رکعتوں میں سورہ الشمس اور سورہ البروج کی تلاوت کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ پٹنہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

جب ہم پٹنہ میں داخل ہوئے تو گیارہ بج رہے تھے۔ جناب ایم ٹی خان (ڈپٹی رجسٹرار) کی رہائش گاہ پر چند گھنٹے قیام کیا۔ یہاں چند افراد کی ایک نشست میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ مثلاً ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں جب کہ پریس کا دور آچکا ہے اور قرآن پوری طرح محفوظ

ہو چکا ہے تو ایسی حالت میں تحفیظ قرآن کے مدارس کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ تحفیظ قرآن کے ادارے آج کل جتنی کثرت سے قائم ہو رہے ہیں ان سے مجھے زیادہ اتفاق نہیں۔ لیکن خود یہ بات کہ قرآن کے حافظوں کا تسلسل ہر زمانہ میں امت میں جاری رہنا چاہئے، بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ قرآن کی حفاظت سے مراد صرف اس کے لفظی متن کی حفاظت نہیں ہے بلکہ اس کے صوت اور اس کے لہجہ کی حفاظت بھی لازمی طور پر مطلوب ہے اور حفاظت قرآن کا یہ دوسرا پہلو اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا کہ امت میں قرآن کے حفظ اور قرأت کا سلسلہ برابر جاری رہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ نے اپنے دعوتی مشن کے تحت کوئی جماعت نہیں بنائی۔ پھر یہ مشن آپ کے بعد کیسے جاری رہے گا۔ میں نے کہا کہ جماعت یا ادارہ کسی مشن کے تحفظ کا ذریعہ نہیں۔ جماعت یا ادارہ کے ذریعہ جو چیز محفوظ ہوتی ہے وہ تحزب (گروہ بندی) ہے نہ کہ اصولی معنوں میں کوئی مشن۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ میرے بعد میرے نام پر کوئی متعصبانہ حزب بن جائے۔ میری دلچسپی مشن کے تحفظ سے ہے اور وہ اللہ کے فضل سے لٹریچر اور انٹرنٹ اور کیسٹ وغیرہ کی صورت میں ساری دنیا میں جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد یہ سلسلہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری رہے گا۔ آج ہر جگہ ایسے افراد پیدا ہو چکے ہیں جو اس مشن کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ یقینی طور پر جاری رہے گا۔ وہ کسی کے مرنے پر ختم نہیں ہو سکتا۔

پٹنہ سے دہلی کے لئے جہاز کا وقت تین بجے تھا۔ مولانا عبد الرحیم امدادی وغیرہ کے ساتھ ائرپورٹ پہنچا تو جہاز روانگی کے لئے تیار تھا۔ ائرپورٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک آدمی نے پوچھا کہ آپ دہلی جا رہے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ اس نے میرا ٹکٹ لے کر فوراً بورڈنگ کارڈ بنوایا اور تیزی سے مجھے جہاز کے اندر پہنچا دیا۔

میرے دل نے کہا کہ کاش آخرت میں بھی ایسا ہی ہو۔ وہاں بھی جب میں پہنچوں تو ایک فرشتہ میرے انتظار میں کھڑا ہو۔ وہ مجھ کو تیزی سے لے جائے اور جنت کا پروانہ دے کر مجھے جنت میں داخل کر دے۔

آج مئی کی ۲۷ تاریخ تھی۔ جہاز میں پڑھنے کے لئے مختلف اخبارات تھے۔ ۲۷ مئی کے ایشین ایج میں مسٹر ٹی این موری کا ایک خط شائع ہوا تھا۔ یہ میچ فکسنگ (match fixing) کے بارے میں تھا۔ یعنی کسی میچ کی ہار جیت کو پیشگی طور پر طے کر لینا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہندستان کے کھلاڑی کس طرح صرف پیسہ کی خاطر پورے ملک کی عزت کو بیچ سکتے ہیں۔

پچھلے برسوں میں میچ فکسنگ کے واقعات نے پوری قوم کو اکسپوز کر دیا ہے۔ یہاں پچھلے پچاس سال سے دیش بھکتی کا غلغلہ جاری رہا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی معنوں میں دیش بھکتی کا کہیں وجود نہیں۔ ساری کی ساری قوم خویش بھکت ہو رہی ہے نہ کہ دیش بھکت۔

ہوائی جہاز کے ائر کنڈیشنڈ کیبن میں ہمارا سفر جاری تھا یہاں تک کہ دلی قریب آگیا۔ اس وقت جہاز کے اندر اعلانات میں کہا گیا کہ جلد ہی ہم دلی میں اترنے والے ہیں۔ اس میں اناؤنسر نے یہ بھی کہا کہ دہلی کا موسم بہت گرم ہے: .The weather in Delhi is very hot یعنی ۴۱ ڈگری سنٹی گریڈ۔ میرے قریب دو بڑے تاجر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ کبھی پنجابی میں بولتے تھے اور کبھی انگریزی میں اس لئے میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا کہ ان کی گفتگو کس موضوع پر تھی۔ البتہ مذکورہ اعلان کے بعد ایک شخص کی زبان سے یہ الفاظ سنائی دئے کہ ذاتی طور پر میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں:

Personally I have no problem.

مجھے معلوم نہیں کہ کہنے والے نے یہ جملہ کس سیاق میں کہا تھا مگر مذکورہ اعلان کے بعد جب اس کی زبان سے یہ الفاظ سنائی دئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ کہہ رہا ہو کہ دہلی کا موسم اگر بہت گرم ہے تو مجھے اس کی کوئی پریشانی نہیں۔ کیوں کہ یہاں میں ائر کنڈیشنڈ جہاز میں سفر کر رہا ہوں۔ دہلی ائر پورٹ پر اترتے ہی میرے لئے ائر کنڈیشنڈ گاڑی کھڑی ہوگی جو مجھے میرے ائر کنڈیشنڈ گھر میں پہنچا دے گی اور وہاں سے دوبارہ میں ائر کنڈیشنڈ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے اپنے ائر کنڈیشنڈ آفس میں پہنچ جاؤں گا۔

موجودہ ہندستان میں اوپر کے طبقہ کی نفسیات عام طور پر یہی ہے۔ ان لوگوں نے آزادی کے بعد دولت کما کر اپنے ذاتی معاملہ کو خوب درست کر لیا ہے۔ اب انہیں یہ پریشانی نہیں کہ ملک کے بقیہ لوگ کس حال میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہی خود غرضانہ سوچ ہمارے ملک کے تمام مسائل کی اصل جڑ ہے۔

۲۷ مئی ۲۰۰۰ کی شام کو میں واپس دہلی پہنچا تو یہاں ڈاک میں جو خطوط تھے ان میں سے ایک خط حیدرآباد کے ایک صاحب کا تھا۔ انہوں نے حیدرآباد کے اخبار روزنامہ سیاست (۱۵ مئی ۲۰۰۰) میں چھپے ہوئے ایک مضمون کی کٹنگ بھیجی تھی جس کا عنوان یہ تھا:

"جذباتی نعروں کی سیاست اقلیتوں کے لئے مضرت رساں"

مکتوب نگار نے اپنے مفصل خط میں لکھا تھا:

"اخبار سیاست کے اس مضمون کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے کہ وہ آپ کا ہی مضمون ہو جو کہ کئی برس پہلے پڑھا تھا۔ پھر دوبارہ پڑھ رہا ہوں۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ آپ کے نام کے بجائے اس پر کسی اور کا نام لکھ دیا گیا ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے مضمون کو پڑھ کر ہر سطح کے لوگ ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے۔ لیکن یہ اللہ کا آپ پر بڑا فضل رہا ہے کہ آپ کی زندگی میں ہی لوگ آپ کی فکر کی باتیں کہہ رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کی مسلسل کوشش اللہ کے فضل سے رنگ لا رہی ہے، بلکہ سمجھئے کہ لا چکی ہے۔"

سفر سے واپسی کے بعد وہاں سے کئی لوگوں کے خطوط موصول ہوئے۔ ان میں سے ایک جناب اسلم احمد (بتیا، چمپارن) کا خط تھا۔ اس خط کے بعض حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

"میں ایک Commercial Bank (بینک آف انڈیا) میں کام کرتا ہوں۔ میرا واسطہ بہت سے لوگوں سے پڑتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان سبھی ہوتے ہیں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان میں جو پڑھے لکھے لوگ ہیں ان کو الرسالہ کے مشن سے واقف کرایا جائے۔ اس کے لئے میں ان لوگوں کو آپ کی کتابیں ہدیتاً دیتا رہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنے شہر کے

ایک عیسائی مشنری اسکول کے ایک پادری کو جو آکسفورڈ سے انگریزی میں ایم۔اے تھے، الرسالہ انگریزی دو سال تک پڑھایا۔ اسے پڑھنے کے بعد وہ آپ سے بہت متاثر نظر آئے اور الرسالہ کی بہت تعریف کی۔ اس طرح سے میں نے بہت سے غیر مسلم تعلیم یافتہ لوگوں کو الرسالہ کی مطبوعات تحفۃً پڑھنے کو دیں اور اچھا feed back پایا۔"

بہار سے ملنے والے خطوط میں سے ایک اور خط ایک مسلم خاتون صوفیہ حیدر صاحبہ کا تھا۔ اس کے کچھ حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

آپ کا خط مورخہ ۲۳جون مجھے مل چکا ہے جو کہ صرف ایک خط نہیں ہے بلکہ میرے لئے ایک قیمتی نصیحت نامہ ہے۔ یہ کام بظاہر میں پہلے سے اور انجانے میں کر رہی تھی مگر اس سے میرے نظریہ میں اور دل کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مگر آپ کے خط نے میرے سوچنے اور دیکھنے اور سمجھنے میں زبردست مثبت تبدیلی لا دی۔ آپ کی نصیحت کہ "اس دنیا میں کسی کو بھی اپنا مستقل دشمن نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ اس ذہن کے ساتھ کام کرنا چاہئے کہ ہر شخص میرا potential friend ہے۔ اس نصیحت نے نہ صرف جماعت والوں کی طرف سے میرے دل کے کینہ کو صاف کر دیا ہے بلکہ ان کے اور قریب جانے کا حوصلہ بھی عطا کیا ہے۔ اس سے نہ صرف اتحاد ملت کے کام میں اضافہ ہوگا بلکہ کافی خاموشی کے ساتھ میں الرسالہ کے مضامین و نصیحت کو ان کے اندر تک پہنچا سکوں گی۔ اس کا نتیجہ بھی سامنے آرہا ہے۔ ایک خاتون جو خود بھی دینی کام کر رہی ہیں۔ آپ کا الرسالہ کافی شوق سے لے کر پڑھ رہی ہیں۔ انہیں آپ کے الرسالہ کا سفر نامہ بہت پسند آتا ہے۔ آپ کی اعراض کی تعلیم گویا کانٹے کے بدلے پھول دینے کی تعلیم ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرے لیے 'دلوں کو پھیر دینے والے' سے صراط مستقیم پر مضبوطی سے قائم رہنے کی دعا کریں۔ آمین

میری تعلیم میں ہر روز "تذکیر القرآن" بھی شامل ہے۔ میں اس کی تعریف کس طرح کروں؟ بس آپ یہ سمجھئے کہ میں نے اب تک قرآن کو کئی بار پورا پڑھا ہے، معنی کے ساتھ بھی

اور کچھ تفسیر بھی۔ مگر تذکیر القرآن کو پڑھ کر مجھے لگا کہ میں نے ابھی تک قرآن کو پڑھا ہی نہ تھا۔ اب مجھے قرآن ملا ہے، قرآن کو میں نے اب پایا ہے (جیسا کہ قرآن میں ہے کہ قرآن کو تذکیر و نصیحت کے لئے اتارا گیا ہے)۔ میرے بتیا شہر میں کئی جگہ عورتوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ جو مختلف دینی حلقوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ میں ہر ایک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہوں۔

میرے گھر میں تقریباً سب لوگ (امی، ابا، دادی) آپ کا الرسالہ پڑھتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ دوسری کتابیں پڑھتے تھے۔ مگر آج انہوں نے کہا کہ جب سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں اب دوسری کتابوں میں دل نہیں لگتا۔ میری دادی ہر وقت آپ کے الرسالہ و دیگر کتابوں کو پڑھتی رہتی ہیں۔ کل انہوں نے مئی ۱۹۹۷ کے الرسالہ کا 'پونہ کا سفر' پڑھا تو آپ کے لئے دعا کی کہ "اللہ ان کو اور لمبی حیات دے تاکہ دنیا کو سبق پڑھائیں۔ ایسا شخص ہم نے پوری صدی میں نہ دیکھا"۔ آپ ہم سب کے لئے خدا سے دعا کریں۔ میری خواہش ہے کہ میرا گھر، میرا خاندان بلکہ میرا پورا علاقہ و شہر دعوتی مشن سے وابستہ ہو جائے۔ اگر آپ اس کے لئے کوئی قیمتی رائے عطا کریں تو مجھے اس سے محروم نہ کریں۔ (صوفیہ حیدر، بتیا، بہار)

پٹنہ سے میں الائنس کے جس جہاز پر ۲۷ مئی کو دہلی آیا تھا، یہ وہی جہاز تھا جو بعد کو ۱۷ جولائی کو پٹنہ میں اترتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گیا اور ائرپورٹ کے قریب گر پڑا۔ اس کے بیشتر مسافر جل کر مر گئے۔ اس حادثہ پر پٹنہ کے ایک ہندی اخبار نے اپنی رپورٹ چھاپتے ہوئے یہ سرخی لگائی تھی "منزل قریب تھی اور موت نے دستک دے دی"۔

یہ حادثہ جو مذکورہ جہاز کے مسافروں کے ساتھ پیش آیا، جلد یا بدیر یہی انجام سارے انسانوں کے لئے مقدر ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی ہر آن اس اندیشہ سے دوچار ہے کہ اس کی سواری اچانک مسافر سمیت تباہ ہو جائے، خواہ وہ بظاہر اپنی منزل کے عین قریب پہنچ گیا ہو۔

سوال

۱۹۴۷ سے پہلے جب دیش کا بٹوارہ نہیں ہوا تھا تو اس علاقہ کے بیشتر مسلمان یہ کہتے تھے کہ آزادی کے بعد جو اکھنڈ انڈیا بنے گا اس میں غیر مسلموں کی مجارٹی ہوگی۔ اس میں مسلمانوں کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ وہ اپنی پولیٹکل اور کلچرل پہچان کو باقی رکھتے ہوئے زندگی گزاریں۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ایک الگ مسلم لینڈ ہو۔ مگر جب یہ مسلم لینڈ بن گیا تو سین (scene) دوسرا تھا۔ اب یہاں کا حال یہ ہوا کہ جس کو موقع ملا وہ بھاگ بھاگ کر انہیں ملکوں میں پہنچ گیا جہاں ان کے نظریہ کے مطابق غیر مسلم غلبہ قائم تھا۔ چنانچہ آج بڑی تعداد میں مسلمان انہیں مغربی ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں جہاں غیر مسلم تہذیب کا پوری طرح ڈامینیشن (domination) ہے۔ کیا یہ ڈبل اسٹینڈرڈ نہیں۔ کیا اسلام ہم کو یہی سکھاتا ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں۔

(عبدالرحمٰن ایم۔اے، ناندیڑ)

جواب

یہ ایک واقعہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر برصغیر ہند کے تقریباً تمام مسلمان کی سوچ یہی تھی۔ اس زمانہ میں جو لوگ یہ کہتے تھے کہ مذہب اور قومیت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، مذہب کا تعلق عقیدہ سے ہے اور قومیت کا تعلق ہوم لینڈ سے، ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ حتی کہ ایسے افراد کا اس زمانہ میں مسلم سماج کے اندر عزت کے ساتھ رہنا سخت دشوار ہو گیا تھا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو میں نے نہ صرف پڑھا ہے بلکہ ذاتی طور پر اس کا تجربہ کیا ہے۔

یہ بھی ایک معلوم واقعہ ہے کہ جب ایک ہنگامہ خیز تحریک کے بعد ایک الگ مسلم لینڈ بن گیا تو یہی لوگ پہلے خود اس مسلم لینڈ میں اپنی مادی ترقی کی کوشش میں لگ گئے۔ اور جب دیکھا کہ اس مسلم لینڈ میں زیادہ بڑی ترقی کے امکانات نہیں ہیں تو وہ بھاگ بھاگ کر ان ملکوں میں پہنچنے لگے جن کو مادی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک (developed countries) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آج انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، حیدرآباد اور کشمیر کے ۱۰ ملین (ایک کرور) سے زیادہ مسلمان یہاں سے

پاکر امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں چین اور سکون کے ساتھ رہ رہے ہیں بلکہ وہ زبان حال یا زبان قال سے اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا اور اپنے بچوں کا مادی مستقبل شاندار طور پر ان سیکولر ملکوں میں محفوظ کر لیا۔

یہ معاملہ بلاشبہہ ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ان مسلمانوں نے اپنی علیحدہ تہذیبی شناخت کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ انہوں نے اس معاملہ میں یہاں کی غیرمسلم اکثریت سے کسی بھی مصالحت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا حسین احمد مدنی جو متحدہ قومیت کے قائل تھے، ان کو شیخ الاسلام کے بجائے شیخ الاصنام کہا گیا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کو شوبوائے کا نام دیا گیا، وغیرہ۔

ان مسلمانوں نے یہاں ایسی دھواں دار تحریک چلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیرمسلموں میں بہت بڑے پیمانہ پر نفرت اور کشیدگی کی فضا قائم ہو گئی۔ دونوں کے درمیان تعلقات کی اس تلخی نے اس پورے علاقہ میں دعوت کے مواقع کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ نیز یہ کہ اس نام نہاد اسلامی تحریک کے نتیجہ میں انڈیا کے تقریباً بیس کرور مسلمان مزید اضافہ کے ساتھ عین اسی خطرہ میں زیادہ شدت کے ساتھ پھنس کر رہ گئے جس خطرہ سے بچنے کا نام لے کر علیحدہ مسلم لینڈ کی تحریک چلائی گئی تھی۔

یہ بلاشبہہ ایک انتہائی سنگین معاملہ ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام مسلمان ایک مجرمانہ فعل کے مرتکب ہوئے ہیں جنہوں نے علیحدہ تہذیبی شناخت کے نام پر یہ ہنگامہ کھڑا کیا تھا اور اب نہایت اطمینان کے ساتھ اسی قسم کی سیکولر تہذیب سے موافقت کر کے اس کے اندر پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

اسلام کے مطابق، ایسے مسلمانوں کے لئے ان کی موجودہ پرسکون زندگی کا کوئی مبرر (justification) موجود نہیں۔ ان لوگوں کے لئے جائز طور پر صرف دو میں سے ایک کا انتخاب (option) ہے۔ یا تو وہ دوبارہ اپنے حاصل کردہ "مسلم لینڈ" میں واپس جائیں اور وہاں کی سختیوں

اور تلخیوں کو برداشت کرتے ہوئے وہاں زندگی گذاریں۔ ان کے لئے دوسرا ممکن انتخاب یہ ہے کہ وہ کھلے طور پر یہ اعلان کریں کہ ان کا سابقہ نظریہ غلط تھا۔ ایک مسلمان سیکولر لینڈ میں بھی اسی طرح جائز طور پر رہ سکتا ہے جس طرح مسلم لینڈ میں۔

ان مسلمانوں کی موجودہ حالت گویا تیسرا انتخاب (third option) ہے۔ اور اس معاملہ میں تیسرا انتخاب بلاشبہہ کوئی انتخاب نہیں۔ یہ اسی دوہرا معیار کی مثال ہے جس کو حدیث میں "الذی یأتی هؤلاء بوجهٍ وهؤلاء بوجهٍ (صحیح البخاری، کتاب الادب، باب ما قیل فی ذی الوجهین) کہا گیا ہے، اس قسم کی دہرا روش اسلام میں اتنی زیادہ مبغوض ہے کہ اندیشہ ہے کہ اس کے ساتھ "نماز اور روزہ" بھی غیر معتبر ہو جائے۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اس مجرمانہ فعل کے ذمہ دار صرف وہ لوگ نہیں ہیں جو براہ راست طور پر اس تحریک کے علم بردار بنے ہوئے تھے بلکہ وہ لوگ بھی یقینی طور پر اس میں شریک قرار دئے جائیں گے جنہوں نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی یا اب وہ کھلے طور پر اس نظریہ کی غلطی کا اعتراف نہیں کر رہے ہیں۔ ایسے موقع پر کسی کا خاموش رہنا ہمیشہ بالواسطہ تائید کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس مسلّمہ اصول کے مطابق، مذکورہ جرم میں اگر کچھ لوگ براہ راست طور پر شریک ہیں تو دوسرے لوگ بالواسطہ طور پر شریک۔ اس جرم عام سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو کھلے طور پر اس کی غلطی کا اعلان کریں، اور اس کی پرواہ نہ کریں کہ اس اعلان کا نتیجہ انہیں اپنے ہم قوموں کی طرف سے سخت رد عمل (backlash) کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

سوال

میں فلسفہ کا طالب علم ہوں اور اکثر و بیشتر شکوک و شبہات سے دوچار رہتا ہوں۔ فلسفہ کی طرف میرا طبعی میلان ہے۔ ایک قسم کے شکوک رفع ہوتے ہی دوسرے قسم کے شکوک مجھے آگھیرتے ہیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے کیا فلسفہ کا مطالعہ ترک کرنا ہوگا۔ اکثر لوگوں کا مجھے یہ مشورہ ہے کہ فلسفہ کوئی عملی چیز نہیں، فکری چیز ہے اور فکری پیچیدگیوں میں پڑنا اپنا وقت

برباد کرتا ہے۔ اس طرح کی باتوں سے ذہن سازی نہیں ہوتی بلکہ ایمان ویقین کی دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ (طارق اشفاق، اے۔ ایم۔ یو، علیگڈھ)

جواب

اس سوال کا جواب کچھ ممتاز فلسفیوں نے خود ہی کامیاب طور پر دے دیا ہے۔ مثال کے طور پر برٹش فلسفی برٹرینڈرسل نے۔ آپ اس کی کتاب علم انسانی (Human Knowledge) کو گہری نظر سے پڑھیں تو آپ اس میں اپنے سوال کا جواب پالیں گے۔

اصل یہ ہے کہ فلسفہ کم از کم ۵ ہزار سال سے حقیقت کی تلاش میں سرگرم رہا ہے مگر اس کو کبھی حقیقت کی دریافت نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس سائنس کو موجودہ زمانہ میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ فلسفہ علم کلی تک پہنچنا چاہتا تھا جو موجودہ دنیا میں ممکن ہی نہ تھا۔ سائنس نے اسی حقیقت کو دریافت کر کے علم جزئی پر قناعت کر لی اس لئے وہ کامیاب ہو گئی۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایکسرے مشین کے سامنے ایک آدمی کو کھڑا کر کے جب مشین کی سوئچ دبائی جاتی ہے تو فوراً ایک پلیٹ پر آدمی کی داخلی تصویر آجاتی ہے۔ اب فلسفی یہ جاننا چاہے گا کہ ایسا واقعہ کیوں کر ہوا۔ چونکہ انسان کی اپنی محدودیتوں (limitations) کی بنا پر اس علم تک پہنچنا ممکن نہیں اس لئے فلسفی ابدی طور پر اس میں الجھ کر رہ جائے گا۔ اس کے حصہ میں آخر کار کنفیوزن کے سوا اور کچھ نہ آئے گا۔ اس کے برعکس سائنس نے یہ کیا کہ "کیوں" کے سوال کو الگ کر کے "کیا ہے" کو لے لیا۔ اس طرح وہ اس میں کامیاب ہو گئی کہ انسانی تمدن کو ایک قیمتی تحفہ دے سکے۔

اس معاملہ میں حقیقت پسندی کی بات یہ ہے کہ آدمی اجمالی علم پر اکتفا کرے۔ وہ جزئی علم پر راضی ہو جائے اور کلی علم کے پیچھے بے فائدہ طور پر نہ دوڑے۔ قرآن میں اسی حقیقت کو ایک سوال کے جواب میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تم کو اس دنیا میں صرف علم قلیل دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل) اس مضمون کی تفصیل کے لئے راقم الحروف کی کتاب 'مذہب اور سائنس' کا مطالعہ کریں۔

سوال

ایک حدیث اس طرح ہے کہ "حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے خدا کی قسم کھاکر ارشاد فرمایا کہ اس وقت تک دنیا ختم نہ ہوگی جب تک لوگوں پر ایسا دن نہ آئے گا کہ قاتل کو یہ علم نہ ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا اور مقتول یہ نہ جانے گا کہ میں کیوں قتل ہوا۔ کسی نے عرض کیا کہ ایسا کیوں ہوگا۔ ارشاد فرمایا کہ فتنوں کی وجہ سے قتل بہت بڑھ جائے گا۔ پھر ارشاد فرمایا ان فتنوں میں قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں جہنم میں داخل ہوں گے۔" اس حدیث میں قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں کے جہنم میں داخل ہونے کی بات کہی گئی ہے۔ قتل کرنے والا جہنم میں جائے گا یہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن قتل ہونے والا جہنم میں جائے گا، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ حدیث کا اصل مفہوم کیا ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیں۔ (خورشید احمد، شوپیان)

جواب

اس اشکال کا جواب خود حدیث میں موجود ہے۔ روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو سننے کے بعد صحابہ نے آپ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول قاتل کا جہنم میں جانا تو معلوم ہے مگر مقتول جہنم میں کیوں جائے گا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: کل واحد منهما يريد قتل صاحبه (النسائی، تحریم القتل) یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

قتل کا ایک واقعہ وہ ہے جب کہ قاتل یک طرفہ طور پر مجرم ہو اور مقتول یک طرفہ طور پر بے قصور۔ مگر جب بگاڑ بڑھ جائے تو معاملہ یک طرفہ (unilateral) نہیں رہتا بلکہ دوطرفہ (bilateral) ہو جاتا ہے۔ یعنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے دونوں یکساں طور پر سرکش ہوتے ہیں اور یہ صرف اتفاق کی بات ہوتی ہے کہ اس دوطرفہ سرکشی کے دوران ایک شخص مارا گیا اور ایک شخص بچ گیا۔ اس دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ دونوں ہی اللہ کے نزدیک مجرم قرار پائیں گے۔ کیوں کہ اسلام کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ عمل کا دارومدار نیت پر ہے (انما الاعمال بالنیات)۔

سوال

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپسی پر نبوت عطا کی گئی۔ لیکن اس وقت ان کو تورات نہیں دی گئی۔ فرعون اور اس کی قوم کے دریائے قلزم میں غرق ہونے کے بعد کوہ طور پر چالیس روز کا اعتکاف کرنے کے بعد ان کو تورات دی گئی۔ اس کی صراحت قرآن میں کئی مقام پر آئی ہے ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔ اور ہم نے اگلی قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو کتاب عطا کی جو لوگوں کے لئے بصیرت، ہدایت اور رحمت تھی۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ (القصص ۴۳) اس آیت کے "القرون الاولیٰ" کے فقرے کے بارے میں ایک تفسیر یہ آئی ہے: یعنی اگلی قوموں سے مراد قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود وغیرہ ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی گئی۔ (زبدۃ التفسیر من فتح القدیر، للامام الشوکانی ۵۱۲) نزول تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و دعوت کے اولین مخاطب فرعون اور اس کی قبطی قوم تھی۔ اس دعوت کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو کس قسم کی تعلیمات بتاتے تھے اور ان کا ذریعہ کیا تھا۔ قرآن سے اس کی صراحت نہیں ملتی۔ کیوں کہ تورات ان کی ہلاکت کے بعد نازل ہوئی۔ کہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام وہی چیز ان کے سامنے پیش تو نہیں کرتے تھے جسے ہم شریعت اسلامی میں سنت یا وحی غیر متلو کہتے ہیں؟ میری اس الجھن کو دور فرمائیں۔ (غلام نبی، سری نگر)

جواب

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ وہی ہے جو دوسرے تمام پیغمبروں کا معاملہ تھا۔ مصر میں وہ ابھی دورِ دعوت میں تھے اور دورِ دعوت میں ہر پیغمبر اپنی قوم کو صرف توحید کا پیغام پیش کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے بھی فرعون اور قوم فرعون کے سامنے توحید کا پیغام پیش کیا۔ جہاں تک تورات کا تعلق ہے وہ احکام کا مجموعہ ہے۔ اس طرح کے احکام ہمیشہ اس وقت اترتے ہیں جب کہ اس کے موافق معاشرہ بن چکا ہو۔ بنی اسرائیل جو اس وقت کے اہل ایمان تھے، جب

وہ صحراء سینا میں آباد ہوئے اس وقت وہاں ان کا معاشرہ قائم ہو گیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے مشن کے اس دوسرے مرحلہ میں تورات کی صورت میں شرعی احکام انہیں دے دئے گئے۔ یہی معاملہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ میں آپ مرحلۂ دعوت میں تھے۔ چنانچہ اس وقت آپ مکہ کے مشرکین کو توحید کا پیغام دیتے رہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں جب اہل ایمان کا معاشرہ قائم ہو گیا، اس وقت آپ پر احکام نازل کیے گئے۔

سوال

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ: دنیا بقدر مقدر، اور دین بقدر مشقت۔ اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے براہ کرم وضاحت فرمائیں (پرویز اختر صدیقی۔ مہادیو اروڈ، آگرہ)

جواب

اس معاملہ میں صحیح بات یہ ہے کہ دنیا بقدر امتحان، اور دین بقدر اخلاص۔ وہ تمام چیزیں جن کو دنیا کہا جاتا ہے وہ سب امتحان کا پرچہ ہیں، مثلاً مال، اولاد، شہرت، مقبولیت، عہدہ اور اقتدار۔ اللہ کو جس چیز میں جس آدمی کا امتحان لینا منظور ہوتا ہے وہ چیز اس کو دے دی جاتی ہے۔ دنیا کی محرومی نہ تو سزا کے لئے ہے اور نہ دنیا کی فراوانی انعام کے لئے۔ دونوں ہی یکساں طور پر امتحان کے لئے ہیں۔

جہاں تک دین کا معاملہ ہے وہ تمام تر اخلاص پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی نقشۂ محنت ہے اور اس نقشہ کے مطابق جو آدمی پریکٹس کرے اس کو پریکٹس کرتے کرتے دین مل جائے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کی نظر آدمی کے اندرونی اخلاص پر ہوتی ہے۔ جس آدمی کے اندر جتنا اخلاص ہوتا ہے اسی کے بقدر وہ اللہ کی توفیق سے دین میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ گویا کہ اس معاملہ میں صحیح فارمولا یہ ہے کہ دنیا بقدر امتحان اور دین بقدر اخلاص۔

۱۔ ڈاکٹر پرکاش لوئی جو انڈین سوشل انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو ہیں۔ انہوں نے اپنے پروجیکٹ کے سلسلہ میں ۱۰ جون ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ اس کا موضوع تھا "اسلامک فنڈ منٹلزم"۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ فنڈ منٹلزم یا اسلامک اکسٹریمزم (Islamic Extremism) کا ماخذ قرآن و سنت نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ مسلم قوم پرستی کا ایک ظاہرہ (phenomenon) ہے۔ کچھ مسلمانوں کی سیاسی حوصلہ مندی نے اس قسم کی تحریکیں پیدا کی ہیں۔ جس کو جائز ثابت کرنے کے لئے انہوں نے اس کو اسلامی نام دے دیا ہے۔

۲۔ ۱۵ جون ۲۰۰۰ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے یہاں سیرت کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ قرآنی آیات کی روشنی میں یہ بتایا گیا کہ آج کے حالات میں سیرت رسول کا سبق کیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر جسیکا ایو اسٹرن (Jessica Eve Stern) نے ۱۶ جون ۲۰۰۰ کو دہلی میں صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے انٹرنیشنل افیرس ڈپارٹمنٹ میں سینئر فیلو ہیں۔ وہ جہاد اور ٹررزم کے مسئلہ پر ریسرچ کر رہی ہیں۔ مفصل انٹرویو کے دوران جو باتیں انہیں بتائی گئیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ جہاد اور جنگ ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ جہاد کے لفظی معنی کوشش کے ہیں۔ اس سے مراد اصلاً پر امن دعوتی جدوجہد ہے۔ جنگ اسلام میں صرف دفاع کے لئے ہے اور وہ بھی قائم شدہ حکومت کی طرف سے نہ کہ عوام کی طرف سے۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ آج کل مختلف مسلم ملکوں میں "اسلامی نظام قائم کرو" کے نام پر مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں میں جو لڑائی جاری ہے وہ اسلام میں قطعاً جائز نہیں۔ اسلام کی ۱۴ سو سالہ تاریخ میں کبھی علماء نے اس قسم کی جنگ نہیں چھیڑی۔ یہ صرف بیسویں صدی کے بعد بعض نام نہاد اسلام پسند رہنما ہیں جنہوں نے قرآن کی بعض آیتوں

کی غلط تفسیر کر کے مسلمانوں کو اس قسم کی ناجائز جنگ میں الجھادیا ہے۔

• ۱۷جون ۲۰۰۰ کو اسٹار ٹی وی پر صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم پرسنل لا اور خطبۂ جمعہ سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ صرف جمعہ میں چھپی ہوئی تقریر سنادینا مسلمانوں کی اصلاح کے لئے کافی نہیں۔ مسلمانوں کی اصلاح کے لئے زیادہ گہری بنیادوں پر مسلسل عمل کرنا ہوگا اس کے بعد ہی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔

• انٹیگرل ہیومنزم (Integral Humanism) کے عنوان کے تحت ایک جلسہ ہماچل بھون (نئی دہلی) میں ۸ جولائی ۲۰۰۰ کو ہوا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس کو خطاب کیا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ سماج کا بہتر فرد بننے کے لئے آدمی کے اندر دو صفتیں ہونی چاہئیں۔ ایک، ہر قیمت پر بے غرض بنے رہنا، کسی بھی انٹرسٹ کی بنا پر اخلاقی معیار سے تجاوز نہ کرنا۔ دوسرے، انسانیت کے لئے اتنی زیادہ خیر خواہی کہ آدمی دوسرے کا درد اپنے سینہ میں محسوس کرنے لگے۔

• محترمہ صوفیہ حیدر، بتیا (بہار) میں سرگرمی کے ساتھ دعوتی کام میں مشغول ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے بعض تجربات لکھ کر بھیجے۔ اس کے جواب میں انہیں خط کے ذریعہ یہ رہنمائی دی گئی: اس دنیا میں کسی کو بھی اپنا مستقل دشمن نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ اس ذہن کے ساتھ کام کرنا چاہئے کہ ہر شخص میرا پوٹینشیل حامی (potential friend) ہے۔ اگر بالفرض کوئی مرد یا عورت ایسی بات کہہ دے جو آپ کے دل کو ناگوار ہو تو اس کو محض وقتی سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہئے۔ ناخوشگوار بات کا بہترین جواب یہ ہے کہ اس سے برا اثر نہ لے کر خوشگوار انداز میں اس کا جواب دیا جائے۔

• خدا کے فضل سے الرسالہ مشن سے جڑے ہوئے لوگ ملک کے اندر اور ملک کے باہر اکثر

جگہوں پر خاموش دعوتی عمل میں مصروف ہیں۔ وہ اپنے تجربات خط اور ٹیلی فون اور فیکس اور انٹرنٹ کے ذریعہ بھیجتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کو برابر رہنمائی دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بمبئی کے جناب فاروق فیصل صاحب نے وہاں کے کچھ اردو اخبارات کے منفی پروپیگنڈوں کے تراشے بھیجے جس پر انہیں مرکز سے یہ رہنمائی دی گئی:

جنگل میں شیر نکلتا ہے تو کوے شور کرتے ہیں مگر شیر کوؤں کے شور وغل کی پروا کئے بغیر پر اعتماد انداز میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی رویہ آپ لوگوں کا بھی ہونا چاہئے۔ جھوٹے پروپیگنڈے سچے مشن کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتے۔ بلکہ وہ "رفع ذکر" بن کر مشن کے مزید تعارف کا باعث بنتے ہیں۔

۸ دو نئی کتابیں تیار ہوئی ہیں جو اب چھپائی کے مرحلہ میں ہیں۔ ایک، مطالعۂ قرآن (صفحات ۲۷۲)۔ اس کتاب میں قرآنی آیات کا علمی اور تذکیری مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ قرآن کی ہر سورہ سے کچھ آیتیں منتخب طور پر لی گئی ہیں۔ اس طرح اس کتاب میں قرآن کی تمام ایک سو چودہ سورتوں کا مطالعہ شامل ہے۔ دوسری کتاب انگریزی میں ہے جس کا نام یہ ہے: Islam Rediscoverd ۔ یعنی اسلام کی از سر نو دریافت۔ یہ کتاب دراصل ان غلط فہمیوں کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جو آج کی تعلیم یافتہ دنیا میں اور خاص طور پر مغربی دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کتاب میں غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کا براہ راست حوالہ دئے بغیر ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کو قرآن و سنت کی روشنی میں اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہوتی چلی جائیں۔ پوری کتاب جدید اسلوب میں لکھی گئی ہے جس کو آج کل سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔

۹ اللہ کے فضل سے انٹرنٹ اب الرسالہ مشن کو پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن چکا ہے۔ اس پر مسلسل مختلف دعوتی موضوعات پر مضامین آرہے ہیں۔ ان کو پڑھنے والے برابر اپنے تاثرات بھیج رہے ہیں۔ یہاں اس قسم کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

1. Asslamu Alaykum, Al-hamdulillah, now Maulana's articles are being discussed in e-groups. This is really very good news. I hope and pray that more and more people egroups will discuss al-risala's message in future. Amin. In my view this is the beginning of a breakthrough. (Kaleem, New York.)

2. Maulana Sahab, This is another example of people including Pakistan forum egroup who are circulating the al-Risala articles among themselves. This is really encouranging. From now onwards you will get emails of comments from our web site for you as Maulana@al-risala.org you might have noticed in this your address given under every emailed article. You will receive these emails at skhan@vsnl.com. (Omar Farooq, Ralleigh, USA)

3. Respected Maulana, It was really a thought provoking article (articles on Discovery of Islam). May Allah reward you for that. (Abdul Azeez Abdul Raheem, Dahran)

4. Asslamu Alaikum, I am Abdulla Khan from Solapur. I want Al-Risala English agency and other books also. I am doing dawah work in English among non-Muslim people. So I want it, please tell me the rules etc. our group and I want to do Dawah in a peaceful way as explained by Maulana Wahiduddin Khan. We like his works. So please respond immediately. Also if old issues of Al-Risala English can be sent free, they would be welcomed. (Abdullah Khan, Solapur.)

5. Respected Maulana Sahib, I have been following all your writing and works from a long time, and I have a great praise for your works which really stand for the promotion of our Muslim Community.

   I am based in Moscow and will be coming to Delhi very soon. Kindly spare some time for me so that I may meet you in person. (Hilmi Quraishi, Moscow)

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان
زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@ vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 166th Street, Ft. Lauderdale, FL 33326
U.S.A. Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

الرسالہ، نومبر ۲۰۰۰

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

محبت صرف اللہ کے لئے

محبت کا جذبہ انسان کے اندر سب سے زیادہ اعلیٰ جذبہ ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے کو جو سب سے زیادہ قیمتی تحفہ دے سکتا ہے وہ یہی محبت کا تحفہ ہے۔ موجودہ دنیا میں کسی انسان کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے محبت کے جذبہ کو کسی اور طرف بھٹکنے نہ دے۔ وہ صرف اللہ کو اپنے جذبات محبت کا مرکز بنائے۔ کسی اور چیز کو اپنے حب شدید کا مرکز بنانا، قرآن کی زبان میں، اس کو اللہ کے برابر ٹھہرانا ہے۔ اللہ کی اس دنیا میں جو آدمی کسی اور چیز کو اللہ کے برابر ٹھہرائے وہ اللہ کے نزدیک سراسر بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے۔ اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ زور سارا کا سارا اللہ کا ہے اور اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔ (البقرہ ۱۶۵)

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر انسان کے اندر ان کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر یہ چیزیں اس لئے نہیں ہیں کہ آدمی ان کے ساتھ حقیقی محبت کا تعلق قائم کرے۔ یہ چیزیں صرف برائے آزمائش ہیں۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون ہے جو ان چیزوں کو اپنا محبوب بناتا ہے اور وہ کون ہے جو ان سے اوپر اٹھ جاتا ہے، اس کے لئے کوئی چیز اللہ کے ساتھ حب شدید میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لوگوں کے لئے خوش نما کر دی گئی ہے محبت خواہشوں کی ـــــ عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتی، یہ دنیوی زندگی کے سامان ہیں۔ اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے، کہو، کیا میں تم کو بتاؤں اس سے بہتر چیز، ان لوگوں کے لئے جو ڈرتے ہیں۔ ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور

پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی رضامندی ہوگی اور اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے بندے۔
(آل عمران ۱۴۔۱۵)

موجودہ دنیا میں ایک اندیشہ یہ ہے کہ آدمی سے اس کی کوئی محبوب چیز کھو جائے، اور پھر اس کی یاد میں وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ ہلکان کرلے کہ اس کے دل میں اللہ کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔ اس لئے اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر چیز کو اللہ کی ملک سمجھو اور اس کے کھوئے جانے پر یہ سوچ کر صبر کرلو کہ جب تک اللہ نے چاہا وہ چیز میرے پاس رہی اور جب اللہ نے چاہا وہ چیز مجھ سے جدا ہو گئی۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (البقرہ ۱۵۵۔۱۵۶)

محبت کے جذبہ کو گہرائی کے ساتھ اللہ سے وابستہ رکھنے کے لئے ایک اور خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ انسان کو پیشگی طور پر یہ بتادیا گیا ہے کہ آخری انجام کے اعتبار سے یہ چیزیں سراسر بے حقیقت ہیں۔ آج کی زندگی میں جو چیز آدمی کو بہت خوشنما نظر آتی ہے اور وہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے، موت کے بعد والی ابدی زندگی میں ان کے اندر اس کے لئے کشش نہ ہوگی۔ حقیقت کھلنے کے بعد آدمی ان چیزوں سے اس طرح بھاگے گا جیسے کہ وہ اس کے لئے بہت بڑی مصیبت ہوں۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

پس جب وہ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا۔ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر لگا ہوگا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی، ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں۔ (العبس ۳۳۔۴۲)

دنیا کی جو چیزیں اپنی ظاہری خوش نمائی کی بنا پر انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں، ان کے بارے میں قرآن وحدیث میں کثرت سے ایسے حوالے ہیں جو ان چیزوں کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مال کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم ساری زندگی اس کوشش میں لگے رہتے ہو کہ تمہارے پاس مال کا انبار اکٹھا ہو جائے۔ حالانکہ تم بہت جلد اس طرح مر جاتے ہو کہ مال کا کوئی حصہ تمہارے ساتھ نہیں جاتا۔ چنانچہ فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا، یہاں تک کہ تم مر کر قبروں میں پہنچ گئے۔ (التکاثر ۱۔۲)

اسی طرح عورت ہر زمانہ میں اس کا سبب بنی رہی ہے کہ وہ انسان کی توجہ کو حق سے ہٹادے۔ انسان عورت کی محبت میں اتنا زیادہ گم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو بھی بھول جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: مار أیت من ناقصات عقل و دین اغلب للب الوجل الحازم من احداکن (مسلم، کتاب الایمان) یعنی میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو ناقص عقل اور ناقص دین کے باوجود ایک دانش مند آدمی کی عقل پر اتنی زیادہ غالب آجائے۔

انسان کے پاس اپنے رب کے سامنے پیش کرنے کے لئے جو سب سے قیمتی اثاثہ ہے، وہ یہی محبت کا اثاثہ ہے۔ آخرت میں وہی شخص کامیاب ہوگا جس کے بارے میں زمین و آسمان یہ گواہی دیں کہ اس نے اپنا یہ سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ غیر مشترک طور پر اپنے رب کے لئے پیش کر دیا تھا۔

اللہ جب تک غیب میں ہے انسان اس کو بھلا کر دوسری بے حقیقت چیزوں کو اپنا مرکز محبت بنا لیتا ہے، مگر قیامت میں جب اللہ اپنے عظمت و جلال کے ساتھ ظاہر ہوگا تو تمام دوسری چیزیں بالکل بے رونق دکھائی دینے لگیں گی، ہر چیز اپنی کشش کھودے گی۔ اس وقت انسان حسرت وافسوس کے ساتھ سوچے گا کہ اصل قابل توجہ ہستی تو صرف اللہ کی تھی۔ مگر میں اپنے اندھے پن کی بنا پر دوسری بے حقیقت چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنائے رہا۔ اس وقت انسان اپنے تباہ کن غلطی پر پشیمان ہوگا، مگر اس دن کا پشیمان ہونا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ دن اپنے عمل کا انجام پانے کا دن ہوگا، نہ کہ عمل کرنے کا دن۔

درخت کی مثال

درخت خدا کی ایک انڈسٹری ہے۔ درخت کا آغاز ایک چھوٹے بیج سے ہوتا ہے۔ بیج کے اندر وہ تمام امکانات نہایت کاریگری کے ساتھ سموئے ہوتے ہیں کہ جب بھی اس کو موافق حالات ملیں وہ ایک درخت کی صورت میں اپنے کو ظاہر کرنا شروع کردے۔

بیج کے بونے کی جگہ مٹی ہے۔ آپ بیج کو پتھر میں ڈال کر اس کے متوقع نتائج حاصل نہیں کرسکتے۔ بیج کو جب مٹی میں ڈالا جاتا ہے تو اچانک وہ پوری کائنات سے اس طرح جڑ جاتا ہے جیسے کہ ساری کائنات صرف اسی کی پرورش کے لئے بنائی گئی تھی۔ مٹی نرم ہو کر اس کو موقع دیتی ہے کہ وہ اس کے اندر اپنی جڑیں داخل کرے۔ بیکٹیریا کروڑوں کی تعداد میں اس کے جڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں تاکہ فضا سے نائٹروجن الگ کر کے اس کی خوراک فراہم کریں۔ زمین کی تہیں اپنی معدنیات اور نمکیات کو پانی میں گھول کر اس کی جڑوں کو پہنچاتی ہیں تاکہ وہ کھنچ کھنچ کر اوپر کی طرف جائے اور درخت کی نشو و نما کا ذریعہ بنے۔ زمین سے لے کر سورج تک کائنات کا پورا کارخانہ متحرک ہو جاتا ہے تاکہ اس کے لئے مختلف موسم پیدا کرے اور گرمی اور سردی اور بارش کے حالات سے گزارتے ہوئے اس کو ایک مکمل درخت کی صورت میں کھڑا کردے۔

یہ درخت پوری کائنات سے اس طرح ہم آہنگ ہوتا ہے کہ کہیں بھی ماحول کی دوسری چیزوں سے اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ وہ اگر زمین سے پانی لیتا ہے تو خود بھی زمین سے لی ہوئی رطوبت کو اپنے پتوں کے ذریعہ خارج کر کے بارش کے عمل میں معاون بنتا ہے۔ وہ اگر زمین سے اپنی خوراک حاصل کرتا ہے تو خود بھی اپنے پتوں اور پھولوں کو زمین پر گرا کر اس کی زرخیزی میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اگر ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ لیتا ہے تو ایک اور مفید چیز آکسیجن کی صورت میں اسے لوٹا دیتا ہے۔ وہ کائنات سے الگ ہوتے ہوئے پوری کائنات سے اس طرح جڑا ہوا ہوتا ہے کہ کسی چیز سے بھی کبھی اس کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔

درخت سایہ تلاش کرنے والے کے لئے سایہ مہیا کرتا ہے۔ وہ اپنے پاس سے گزرنے والوں کے لئے مہک اور سرسبز منظر کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ جو شخص اس سے غذا حاصل کرنا چاہے اس کے لئے اس کے پاس لذیذ پھل موجود ہوتا ہے۔ حتی کہ جو لوگ اس کو کاٹ ڈالتے ہیں ان کو بھی وہ لکڑی مہیا کرتا ہے جس سے وہ اپنی مختلف تمدنی ضرورتوں کو پوری کریں۔ جب بھی تجربہ کا کوئی لمحہ آتا ہے تو درخت عین وہی ثابت ہوتا ہے جس کی اس سے امید کی گئی تھی۔

ان سب کے ساتھ درخت ایک ایسا وجود ہے جو زمین میں اپنی جڑیں داخل کرکے خود اپنے بل پر کھڑا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ درخت کا تقریباً نصف حصہ سطح زمین کے نیچے ہوتا ہے اور نصف حصہ سطح زمین کے اوپر۔ وہ زمین کی تہوں میں اس طرح گڑا ہوا ہوتا ہے کہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے اور فضا میں اس طرح بلند ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں سے بے روک ٹوک اپنا رزق حاصل کرے۔

قرآن میں مومن کی مثال درخت سے دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو کن صفات کا حامل ہونا چاہئے۔ مومن وہ ہے جس کے اندر وہی صفتیں انسانی سطح پر موجود ہوں جو درخت کے اندر مادی سطح پر پائی جارہی ہیں۔ مومن کو وہی کام شعور کے تحت کرنا ہے جس کو درخت طبعی قانون کے تحت انجام دے رہا ہے۔ مومن کو خود اپنے ارادہ سے اسی سرسبز دنیا کی تخلیق کرنی ہے جس کو درخت نظام قدرت کی پابندی میں جبراً وجود میں لاتا ہے۔

عام درخت مٹی کے اندر سے نکلتا ہے۔ مومن کا درخت روحانیت کی ربانی زمین پر اگتا ہے۔ ایک دنیا کے مادی اجزاء سے بنتا ہے اور دوسرا عالم آخرت کے جنتی اجزاء سے۔ عام درخت مادی دنیا کا درخت ہے تو مومن انسانی دنیا کا درخت۔

درخت ایک نمو پذیر وجود ہے، اسی طرح مومن بھی ایک نمو پذیر وجود ہے۔ مومن وہ انسان ہے جو ربانی فکر کی بنا پر اس قابل ہو جاتا ہے کہ پوری کائنات اس کے لئے معرفت کا دستر خوان بن جائے۔

برائی کے خلاف روک

قرآن میں ہدایت دی گئی ہے کہ نماز قائم کرو، بے شک نماز فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے (اقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر) ابن ابی حاتم نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

من لم تنھہ صلوٰتہ عن الفحشاء والمنکر فلا صلوٰۃ لہٗ — جس کی نماز اس کو فحشاء اور منکر سے نہ روکے تو اس کی نماز نماز نہیں۔

نماز کیا ہے، نماز اس حقیقت کی یاددہانی ہے کہ آدمی ایک ایسے خدا کے سامنے زندگی گزار رہا ہے جس کو آدمی اگرچہ نہیں دیکھتا، مگر خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ جو آدمی مسجد سے یہ سبق لے کر لوٹے، کیا وہ باہر آکر خدا سے غافل زندگی گزار سکے گا۔ نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے۔ جو آدمی اس اقرار میں سچا ہو کیسے ممکن ہے کہ نماز کے بعد وہ اپنی بڑائی کا جھنڈا اٹھانے میں مصروف ہو جائے۔ نماز میں آدمی جو کچھ پڑھتا ہے وہ خدا کے سامنے اس بات کا عہد ہوتا ہے کہ وہ خدائی احکام کا پابند بن کر زندگی بسر کرے گا۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ باہر نکل کر وہ لوگوں کے درمیان سرکش اور باغی کی طرح رہنے لگے۔ نماز کے افعال اس بات کا اظہار ہیں کہ آدمی کا سینہ خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہے۔ پھر کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ آدمی مسجد میں تو خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہونے کا دعویٰ کرے اور جب باہر نکلے تو اس طرح رہنے لگے جیسے کہ اس کے سینے میں نہ خدا کا خوف ہے اور نہ خدا کی محبت۔

نماز اگر حقیقی روح کے ساتھ پڑھی جائے تو یقیناً وہ فحشاء اور منکر سے روکنے والی بن جائے گی۔ لیکن اگر نماز حقیقی روح سے خالی ہو تو وہ محض ایک رسم ہو گی جس کا آدمی کی اصل زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ بظاہر نماز ہو گی مگر حقیقۃً وہ نماز نہ ہو گی۔ کیوں کہ وہ آدمی کو فحشاء اور منکر سے روکنے والی نہ بن سکی۔

یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ باپ کو کھڑا دیکھ کر بھی جو بیٹا لیٹا رہے اس کے اندر باپ کا ادب نہیں۔ بہن کو فاقہ میں دیکھ کر جس بھائی کی مٹھی نہ کھلے وہ بھائی بھائی نہیں۔ دوست کی موت کی خبر جس کا قہقہہ بند نہ کرے اس کی دوستی دوستی نہیں۔

بھاری قیمت

۲۰۰۰ء میں جو انوکھے انکشافات ہوئے ان میں شاید سب سے انوکھا انکشاف وہ تھا جس کو میچ فکسنگ (match-fixing) کہا جاتا ہے۔ یعنی کھیل کے مقابلہ میں ہار جیت کو پیشگی طور پر طے کر لینا اور اس کے معاوضہ میں بڑی بڑی رقمیں وصول کرنا۔ اس سلسلہ میں جن کھلاڑیوں کے نام بار بار میڈیا میں آئے ہیں ان میں سے ایک ساؤتھ افریقہ کا کرکٹ کیپٹن ہانسی کرونیا (Hansie Cronje) ہے۔

میچ فکسنگ کا یہ راز کھل گیا اور دوسرے بہت سے کھلاڑیوں کی طرح حانسی کرونیا بھی قانون کی پکڑ میں آگیا۔ ماہرین نے اس سے زبردست پوچھ گچھ (interrogation) کیا۔ شروع میں اس نے اپنے کو بچانے کی کوشش کی مگر آخر کار مجبور ہو کر اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ حانسی کرونیا اس سے پہلے کھیل کی دنیا میں ہیرو بنا ہوا تھا مگر اس انکشاف کے بعد اچانک وہ زیرو ہو گیا۔ اس کی دولت اور عزت اور اس کا مستقبل سب کچھ اچانک خاک میں مل گیا۔ اب وہ اتنے زبردست حزن اور مایوسی (depression) کا شکار ہوا کہ اس کے نفسیاتی ڈاکٹر آین لوئس (Ian Leuis) کا کہنا ہے کہ اندیشہ ہے کہ حانسی کرونیا کا حافظہ گہرے طور پر متاثر ہو جائے اور آئندہ وہ معتدل زندگی گزارنے کے قابل نہ رہے۔

حانسی کرونیا نے اپنی اس بھیانک غلطی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب مجھ سے اس قسم کی پیش کش کی گئی تھی، کاش میں نے اسی وقت اس سے انکار کر دیا ہوتا۔ اس نے کہا کہ ایک سادہ نہیں میری زندگی کو کہیں زیادہ پرسکون بنادیتا اور میری وہ حالت نہ ہوتی جس میں کہ اب میں مبتلا ہوں:

A simple no would have made my life a whole lot easier and I wouldn't be in the situation I am in now. (TOI, 22 June, 2000)

آج کی دنیا کے اس واقعہ میں اُس سنگین تر واقعہ کی ایک جھلک ہے جو کل کے دن آخرت

میں لوگوں کے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے موجودہ امتحان کی زندگی میں خدا کے حکم کو توڑا ہوگا، جنھوں نے دنیوی ترغیبات (temptations) کی خاطر آخرت کے تقاضوں کو نظر انداز کیا ہوگا، جنھوں نے ابدی فائدوں کے مقابلہ میں وقتی فائدوں کو ترجیح دی ہوگی، وہ جب آخرت میں اپنی اس غلطی کا بھیانک انجام دیکھیں گے تو اچانک ان کا سارا قلعہ دھڑام سے گر جائے گا۔ وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے وقتی محرومی کو برداشت کر لیا ہوتا تو ہم کو ابدی تباہی اور محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

قرآن میں انسانیت کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہرگز نہیں، بلکہ تم چاہتے ہو جلد آنے والی (عاجلہ) کو۔ اور تم چھوڑتے ہو دیر میں آنے والی (آخرت) کو۔ (القیامہ ۲۰-۲۱) اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: یہ لوگ جلدی ملنے والی چیز (عاجلہ) کو چاہتے ہیں۔ اور انہوں نے چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو (الدہر ۲۷)

موجودہ دنیا میں آدمی کے سامنے جب کوئی خوشنما چیز آتی ہے تو وہ اس کی طرف اتنا زیادہ راغب ہوتا ہے کہ وہ نہیں (no) کہنے کی ہمت نہیں کرپاتا، وہ اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔ مگر موت کے بعد وہ دیکھے گا کہ ایک انتہائی وقتی خوشی کی قیمت اس کو ابدی محرومی کی صورت میں ادا کرنی پڑے گی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔ مگر اس وقت وہ اپنی اس نادانی پر افسوس کرے گا مگر اس وقت افسوس کرنا اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

صحیح طرز فکر

میں نے تقریباً ہر موضوع کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس مطالعہ کے دوران میں اُس موضوع تک پہنچا جس کو آرٹ آف تھنکنگ (art of thinking) کہا جاتا ہے۔ اس پر میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ عمل تفکیر (thinking process) کو درست طور پر چلانے کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ سوچنے کا درست طریقہ کیا ہے۔ ورنہ برسوں کی ذہنی کاوش کے باوجود وہ صرف کنفیوزن(confusion) میں مبتلا رہے گا۔ اگرچہ اپنے خیال کے مطابق وہ یہی سمجھے گا کہ میں سوچنے کا عمل کر رہا ہوں۔ کسی معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر تک پہنچنے کی یہ سب سے زیادہ ضروری شرط ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ آدمی کو یہ جاننا چاہئے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے بلکہ کسی اور نے اس کو اپنے نقشہ کے مطابق بنایا ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق یہ بنانے والا خدا ہے۔ اور خدا نے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کیا ہے کہ علم ایک کثیر خزانہ ہے جس کا صرف قلیل حصہ انسان کو دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

لمبی مدت کے تجربہ کے بعد جدید سائنس نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

یہاں میں ایک متقابل مثال دوں گا۔ ہم جانتے ہیں کہ ۵ ہزار سال کی مسلسل کوشش کے باوجود فلسفہ کا کوئی حاصل(achievement) نہیں۔ اس کے برعکس سائنس نے دنیا کو بہت زیادہ چیزیں دی ہیں۔ اس فرق کی واحد وجہ یہ ہے کہ فلسفہ نے اس حقیقت کا اعتراف نہیں کیا کہ وہ صرف جزئی علم تک پہنچ سکتا ہے، اس کو جزئی علم پر قناعت کرتے ہوئے کلی رائے قائم کرنا ہے۔ اس کے برعکس سائنس نے علمی قناعت کا یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ اسی کا نتیجہ وہ تمام مادی ترقیاں ہیں جو موجودہ زمانہ میں سائنس کے ذریعہ انسان کو ملیں۔

فلسفہ اور سائنس کے اس فرق کو بطور علامت لیتے ہوئے میں کہوں گا کہ جو آدمی اپنے تھنکنگ پراسس (thinking process) کو کامیابی کے ساتھ منزل تک پہنچانا چاہتا ہے، اس کو چاہئے کہ وہ "فلاسفر" نہ بنے بلکہ وہ "سائنٹسٹ" بنے۔ یعنی فطرت کے نظام کے مطابق، وہ جن باتوں کو جان سکتا ہے ان کو وہ جاننے کی کوشش کرے۔ اور جن باتوں کو وہ اپنی محدودیت کی بنا پر نہیں جان سکتا ان کے بارے میں وہ اجمالی علم پر قناعت کرے۔ اسی حقیقت کو ایک عالم نے ان الفاظ میں بیان کیا: ابھموا ما ابھمہ اللہ (جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا تم بھی اس کو مبہم رکھو)

علم کے دو پہلوؤں میں فرق کے اصول کو ملحوظ رکھنے کی یہی واحد تدبیر ہے جو آدمی کو کنفیوزن (confusion) سے بچا سکتی ہے جو کہ صحیح نتیجۂ فکر تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جو آدمی اس حقیقت کو جانے کہ کنفیوزن کیا ہے اور رائٹ تھنکنگ (right thinking) کیا، اس نے گویا وہ چیز پالی جو موجودہ دنیا میں علم کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

صحیح رائے تک پہنچنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی ظاہر (appearance) اور حقیقت (reality) میں فرق کرے۔ وہ صرف گہرے تجزیہ کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرے۔ اس کی ایک مثال کچھ لوگوں کی وہ بات ہے جو اکثر نقل کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ قرآن کو ڈسکریڈٹ کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ قرآن ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں اترا جب کہ لوگ سادہ قسم کی فطری زندگی گزارتے تھے۔ اب بڑی بڑی ترقیاں ہو چکی ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ انسان کے لئے قدیم قرآن میں اپیل نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک سطحی بات ہے۔ آج جو ترقی ہوئی ہے وہ تمام تر ٹکنکل ترقی ہے اور قرآن کا خطاب انسانی فکر سے ہے نہ کہ فنی ترقیات سے۔ جہاں تک انسانی ذہن کے لیول کا تعلق ہے وہ آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ نفسیاتی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ پانچ ہزار سال پہلے یونان کے فلسفیوں کا جو درجۂ فکر تھا وہ عین وہی تھا جو آج کے انسان کا درجۂ فکر ہے۔ اس اعتبار سے آج کے انسان اور ماضی کے انسان میں کوئی فرق نہیں۔

قرآن ایک نظریاتی کتاب ہے۔ اس کا خطاب فطرت انسانی سے ہے۔ قرآن کے پیغام کو

سمجھنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ذہنی استعداد (intellectual competence) ہے نہ کہ فنی استعداد (technical competence)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا انسان جس طرح قرآن کا مخاطب بن سکتا تھا، ٹھیک اسی طرح آج کا انسان بھی قرآن کا مخاطب بن سکتا ہے۔ کیوں کہ دونوں کے معیار ذہنی میں کوئی فرق نہیں۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان کی جو فکری سطح ہے، کسی کمی کے بغیر وہی فکری سطح پیغمبر کے زمانہ کے لوگوں کی بھی تھی۔ مثلاً دور جدید کے ایک مغربی مفکر ولیم رالف انگ (William Ralph Eng) کا قول ہے جو گویا آج کے ایک تعلیم یافتہ انسان کی ذہنی سطح کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نے کہا:

The wise man is he who knows the relative value of things.

ٹھیک یہی بات ایک صحابیٔ رسول حضرت عمر فاروق نے اپنے الفاظ میں اس طرح کہی:
ليس العاقل الذى يعرف الخير من الشر ولكنه الذى يعرف خير الشرين۔ (عقل مندوہ نہیں جو خیر کو اور شر کو جانے بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کمتر شر (lesser evil) کون سا ہے۔ یہ دونوں مثالیں بتاتی ہیں کہ معیار ذہن کے اعتبار سے آج کے انسان اور ساتویں صدی کے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ پھر جو قرآن ساتویں صدی کے انسان کو اپیل کر سکتا تھا وہ موجودہ زمانہ کے انسان کو کیوں اپیل نہیں کرے گا۔

آخری بات یہ کہ فکرِ صحیح کی کلید یہ ہے کہ آدمی منتشر ذہن اور درست ذہن کے فرق کو جان لے:

To know the difference between a sound mind
and confused mind is key to right thinking.

دو نکاتی پروگرام

مغربی ملکوں میں اس وقت دس ملین سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔ ان مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مشترک مسئلہ صرف ایک ہے ــــــ سیکولر سوسائٹی میں وہ اپنی اسلامی پہچان کو کیسے باقی رکھیں۔ وہ اپنی نسلوں کے دینی تحفظ کو کس طرح یقینی بنائیں۔ موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا یہ حل نہیں کہ اس کے بارے میں مغربی ملکوں کے مسلمان وہاں احتجاج کریں یا مطالباتی مہم چلائیں۔ اس قسم کی کوئی بھی کوشش وہاں اکثریت کے لئے ناقابل قبول ہوگی۔ وہ مسئلہ میں اضافہ تو کرسکتی ہے مگر وہ مسئلہ کا حل نہیں بن سکتی۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں مغربی ملکوں کے مسلمان حقیقت پسندانہ انداز اختیار کریں۔ وہ ناممکن کے پیچھے اپنی طاقت ضائع کرنے کے بجائے اس چیز کو اپنی جد وجہد کا مرکز بنائیں جو موجودہ حالات کے باوجود ان کے لئے ممکن ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایک نتیجہ خیز فارمولا درکار ہے۔ یہ فارمولہ واضح طور پر قرآن میں موجود ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن ہمیں دو نکاتی فارمولہ دیتا ہے جو قابل عمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

اس دو نکاتی فارمولے کا پہلا جزء یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو خارج رخی کوششوں (external oriented efforts) کے بجائے داخل رخی کوششوں پر اعتماد کرنا چاہئے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر میں بنی اسرائیل کے لئے اسی نوعیت کے مسائل پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے پیغمبر نے اللہ کی رہنمائی کے تحت انہیں یہ ہدایت دی کہ: **اجعلوا بیوتکم قبلۃً** (یونس ۸۷) یعنی تم لوگ اپنے گھروں کو اپنا قبلہ بنالو۔

اپنے گھروں کو اپنا قبلہ بنانے کا مطلب یہ تھا کہ اپنے گھروں کو اپنا مرکز عمل بنالو۔ دین کے تعلق سے تمہارے جو فرائض ہیں ان کو اپنے گھر کے اندر انجام دو۔ اگر تم اعلان کے ساتھ اپنی دینی ذمہ داری کو ادا نہیں کرسکتے تو اعلان کے بغیر اس کو انجام دینے کا نظام بناؤ۔

اس اصول کی روشنی میں مغربی ملکوں میں آباد مسلمانوں کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنے دینی تحفظ کا جو کام خارجی نظام کی مدد سے انجام نہیں دے سکتے اس کو وہ اپنے داخلی انتظام کے تحت انجام دیں۔ وہ اپنی نسلوں کے دینی تحفظ کا انتظام کریں۔ وہ کیسٹ اور لٹریچر اور تقریروں کے ذریعہ اس تعلیمی اور تربیتی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اس پروگرام کا دوسرا اجزء دعوت ہے۔ دعوت اہل اسالم کے لئے خارجی تبلیغ کے ساتھ داخلی تحفظ کا ذریعہ بھی ہے۔ قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ تم اس چیز کو لوگوں تک پہنچادو جو اللہ کی طرف سے تمہارے اوپر اتاری گئی ہے۔ اس دعوتی عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تم کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ (المائدہ ٦٧)

دعوت کیا ہے۔ دعوت انسان کو دین فطرت کی طرف بلانا ہے۔ دعوت گویا لوگوں کو خود ان کے اپنے دین سے روشناس کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت کے اندر تسخیری طاقت موجود ہے۔ دعوت اہل اسلام کے لئے خارجی حالات کے مقابلہ میں تحفظ کا طاقتور ذریعہ ہے۔ دعوت مسئلہ کو نظر انداز کر کے خود مسئلہ پیدا کرنے والے کو اپنا نشانہ بناتا ہے۔ اور تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ طریقہ ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔

موجودہ حالات میں مغرب میں آباد مسلمانوں کے لئے قرآن سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ یہی ہے۔ یہی دو نکاتی پروگرام ان کے مسئلہ کا حل ہے۔ "گھروں کو مرکز عمل بنانا" اگر حالات کے مقابلہ میں دفاعی تدبیر ہے تو دعوۃ ورک گویا حالات کے مقابلہ میں عملی اقدام۔

پہلے اصول کی ایک عملی مثال جدید ترکی ہے جہاں سخت قسم کی خارجی ناموافقت کے باوجود مسلمان اپنے دین کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے۔ دوسرے اصول کی ایک عملی مثال تیرہویں صدی عیسوی میں پیش آنے والا تاتاریوں کا واقعہ ہے جب کہ بظاہر ایک مخالف قوت کو دعوت کے ذریعہ شاندار طور پر اپنا حامی بنالیا گیا۔

ہریانہ کا سفر

سرودھرم ایکتا مشن (پانی پت) کے دو نمائندے اپریل ۲۰۰۰ کے آخر میں مجھ سے دہلی میں ملے۔ ان کے نام یہ ہیں: مسٹر بلراج ملک (ایڈوکیٹ) اور مسٹر دیے آنند۔ ان کی سنستھا کا انگریزی نام یہ ہے: مومنٹ فار یونائیٹیڈ ورلڈ۔ پانی پت کے لئے ان کا ٹیلی فون نمبر یہ ہے:

Off: 65404, Mobile: 98120- 30481

ان لوگوں سے پہلی ملاقات کافی لمبی تھی اور دلچسپ بھی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مختلف مذہب کے لوگ مل جل کر رہیں۔ ہر طرف پیار محبت کا ماحول ہو۔ انہوں نے کہا کہ آخر سب مذہب ایک ہی ہیں۔ سب ایک ہی سچائی کو بتاتے ہیں پھر آپس کا جھگڑا کس لئے۔ میں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔ مگر ہم آہنگی کے اس مقصد کا صحیح فارمولا انسانی یکسانیت ہے نہ کہ مذہبی یکسانیت۔ "تمام مذاہب ایک ہیں یہ ایک خلاف واقعہ نظریہ ہے"۔ کیوں کہ مختلف مذاہب کی تعلیمات میں ایسے واضح فرق ہیں کہ کوئی آدمی سنجیدگی کے ساتھ ان سب کو ایک نہیں کہہ سکتا۔ البتہ تمام انسان ایک ہیں" بالکل درست بات ہے، اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ انسانی یکسانیت کے اسی اصول کی بنیاد پر سماجی اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے۔

میں نے کہا کہ ایک سماج میں کچھ لوگ سیاہ فام ہوں اور کچھ لوگ سفید فام۔ ایسے سماج میں اتحاد قائم کرنے کے لئے یہ مہم چلائی جائے کہ سیاہ رنگ اور سفید رنگ دونوں ایک ہیں تو کبھی اتحاد قائم نہیں ہوگا۔ کیوں کہ دونوں رنگوں میں واضح فرق ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے کہ دونوں قسم کے لوگ یکساں طور پر انسان ہیں، تو نہایت آسانی سے ان کے درمیان اتحاد قائم ہو جائے گا، کیوں کہ انسانی یکسانیت ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس معاملہ کی مزید تفصیل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ "تمام مذاہب ایک ہیں" کا فارمولا

لمبے تجربہ کے بعد اس طرح ناکام ہو چکا ہے کہ اب اس کا مزید تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ سماجی اتحاد کا یہ نظریہ سب سے پہلے بادشاہ اکبر (وفات ۱۶۰۵) نے پیش کیا مگر اقتدار کی مکمل حمایت کے باوجود وہ ناکام ہو گیا۔ پھر ڈاکٹر بھگوان داس (وفات ۱۹۵۸) نے ساری عمر کی جدوجہد کے بعد ایک ضخیم کتاب لکھی جس کا نام تھا وحدۃ المذاہب (Essential Unity of All Religions) مگر ان کی یہ انسائیکلو پیڈیائی مہم بھی مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی (وفات ۱۹۴۸) نے اپنی عوامی مقبولیت کا پورا زور اس نظریہ کے حق میں لگا دیا۔ مگر وہ بھی سراسر ناکام رہے۔ اسی طرح کے سیکڑوں بڑے بڑے دماغ سماجی اتحاد کے اس فارمولے کو لے کر اٹھے مگر وہ اپنے مقصد میں ایک فی صد بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

پھر ان لوگوں نے کہا کہ اب آپ ہی بتائیے کہ سماجی اتحاد کا صحیح فارمولا کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس مقصد کے لئے صحیح فارمولا صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جس کو ہم اب بھی بڑے پیانہ پر استعمال کر رہے ہیں، اور وہ ہے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرنا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مذہبی اتحاد کا صحیح فارمولا باہمی اعتراف (mutual recognition) نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح فارمولا باہمی احترام (mutual respect) ہے۔

سرو دھرم ایکتا مشن کے مذکورہ دونوں ذمہ دار میری باتوں کو غور سے سنتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کی رائے اس کے بارے میں کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ کی بات سے ۸۰ فیصد اتفاق ہے۔ وہ لوگ مجھے کرنال میں ہونے والے ایکتا مشن کے اجلاس (۷ مئی ۲۰۰۰) میں چیف گیسٹ کے طور پر شرکت کی دعوت دینے آئے تھے۔ میں نے کہا کہ جب آپ لوگوں کو میری بات سے پورا اتفاق نہیں ہے تو ایسی حالت میں آپ کے اجلاس میں شریک ہونا میرے لئے ممکن نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ مسئلہ بے حد اہم ہے۔ آپ لوگ اس پر مزید غور کیجئے، اس کے بعد مجھے بتائیے۔ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ چند دن کے بعد ان کا ٹیلی فون آیا کہ ہم نے اپنی کمیٹی میں آپ کی بات کو رکھا اور اس پر کافی سوچ بچار کیا۔ آخر کار ہمارے تمام ممبروں نے آپ کی بات

سے پورا اتفاق کر لیا ہے۔ اب آپ کو ہمارے اجلاس میں شرکت پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں نے ان کی دعوت کو منظور کر لیا۔

پروگرام کے مطابق ۷ مئی ۲۰۰۰ کی صبح کو دہلی سے کرنال کے لئے روانگی ہوئی۔ دہلی سے کرنال کا فاصلہ ۱۲۵ کیلو میٹر ہے۔ یہ فاصلہ بذریعہ روڈ طے ہوا۔

اس سفر کا پہلا تجربہ بہت خوشگوار تھا۔ کل تک یہاں سخت گرمی کا موسم چل رہا تھا۔ ۷ مئی کی صبح کو ۷ بجے جب ہماری گاڑی دہلی کی سڑکوں پر آگے بڑھ رہی تھی تو اچانک فضا میں بادل گھر آئے اور بارش ہونے لگی۔ مزید خوشگوار بات یہ تھی کہ بارش زیادہ لمبی نہیں ہوئی بلکہ کچھ دیر بارش ہوئی اور پھر تھم گئی۔ گویا کہ وہ صرف موسم کو خوشگوار بنانے کے لئے آئی تھی۔ مجھے مولانا اقبال احمد سہیل (تاریخ وفات ۱۹۵۵) کا ایک مصرعہ یاد آیا:

برس کے بادل جو کھل گیا ہے تو لوگ خوشیاں منا رہے ہیں

دہلی سے نکل کر ہماری گاڑی ہریانہ کے علاقہ میں داخل ہوئی۔ اب ہم لوگ نیشنل ہائی وے نمبر ایک پر چل رہے تھے۔ یہ ہمارے ملک کی سب سے اہم سڑک مانی جاتی ہے، لیکن اس کا تقابل اگر امریکہ اور ترقی یافتہ مغربی ملکوں سے کیا جائے تو وہ بہت کمتر معلوم ہوگی۔

سڑک، ٹیلی فون اور اسی طرح کے دوسرے وسائل کو انفراسٹرکچر (infrastructure) کہا جاتا ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا کہ پچاس سال سے زیادہ مدت گزرنے کے باوجود ہندستان ایک ترقی یافتہ ملک نہ بن سکا جب کہ اسی مدت میں بہت سے ملک جدید معیار کے مطابق، ترقی یافتہ ملک بن چکے ہیں۔ حتیٰ کے سنگاپور جیسے چھوٹے ملک بھی۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے ملکوں نے سب سے زیادہ زور بہترین انفراسٹرکچر پر دیا۔ جب کہ ہمارے یہاں اس کے بجائے نظریاتی کٹرپن (ideological fanaticism) پر سارا زور دیا گیا۔

میں اپنے مطالعہ سے یہ سمجھا ہوں کہ ہر انسان پیدائشی طور پر ترقی کرنا اور آگے بڑھنا

چاہتا ہے۔ ہر انسان کے اندر بے پناہ جذبہ ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو استعمال کر کے اپنے حوصلوں کی تکمیل کرے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے۔ ایسی حالت میں انسان کو ترقی کے لئے کسی نظریہ (ideology) کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے وہ سہولتیں (facilities) فراہم کی جائیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے فطری حوصلوں کی تکمیل کر سکیں۔ مثلاً تعلیم کے اچھے ادارے، حوصلہ بڑھانے والا ماحول، عمدہ سڑکیں، ٹیلی فون اور بجلی کی عمدہ سہولت، معاون انتظامیہ، سرکاری پابندیوں سے آزاد ماحول، ہر آدمی کے لئے ترقی کے یکساں مواقع، صحت سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی آسان دستیابی، امن اور تحفظ کا ماحول وغیرہ۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں مختلف قسم کے نظریاتی جنون کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی کام درست طور پر نہ ہو سکا۔ البتہ دوسرے غیر متعلقین عنوانات پر دھوم مچائی جاتی رہی۔

۱۲۵ کیلو میٹر کا یہ سفر غیر متوقع طور پر نہایت خوشگوار موسم میں ہوا۔ ہلکی بارش، آسمان میں بادلوں کی ٹکڑیاں، اس قسم کے مناظر یاد دلا رہے تھے کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں قدرت نے پانی کی نعمت کو وافر مقدار میں فراہم کیا ہے۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ آج کل ہمارے ملک کا تقریباً ایک تہائی حصہ پانی کی شدید کمی کی زد میں ہے۔ بہت سے مقامات پر انسان سے لے کر مویشی اور فصلوں تک سب پانی کی کمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کا سبب قدرت نہیں ہے بلکہ ہماری انتظامی نااہلی ہے۔ ہندستان میں کثرت سے بارشیں ہوتی ہیں مگر اس پانی کا صرف چھ فیصد حصہ ہمارے حصہ میں آتا ہے۔ باقی سارا پانی بہہ کر سمندروں میں جا گرتا ہے۔

شہری علاقوں میں آج کل ایک نئی مصیبت یہ سامنے آئی ہے کہ زمینی پانی کی سطح خطرناک حد تک نیچے چلی گئی ہے۔ دہلی بھی انہیں شہروں میں شامل ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں نہایت غیر منصوبہ بند انداز میں شہروں کو سیمنٹ کنکریٹ کا جنگل بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب بارش ہوتی ہے تو پانی کا بہت کم حصہ زمین میں جذب ہو کر نیچے پہنچتا ہے۔ اس کا بڑا حصہ بہہ کر باہر نکل جاتا ہے۔ قدرت نے ہندستان کے ساتھ اتنی زیادہ فیاضی کی تھی کہ یہاں کبھی پانی کی

کمی نہ ہو۔ مگر فطرت کے نظام کو مصنوعی اسکیموں کے ذریعہ بگاڑ دیا گیا جس کا نتیجہ پانی کی بھیانک قلت کی شکل میں بر آمد ہوا۔

ہماری پہلی منزل پانی پت تھی۔ ہم لوگ پانی پت میں داخل ہوئے تو سڑک کے دونوں طرف خوبصورت مکانات کا سلسلہ دکھائی دیا۔ یہ پچھلے کچھ برسوں کا کرشمہ ہے۔ پانی پت میں ہینڈ لوم اور اون کا بزنس بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس خوشحالی کے اثرات شہر میں ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔

پانی پت میں ہم لوگ مسٹر بلراج ملک ایڈوکیٹ کی رہائش گاہ پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے۔ وہ سرو دھرم ایکتا مشن کے جنرل سکریٹری ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ مشن آپ کے لئے ایک وقتی مشن ہے یا وہ آپ کی پوری زندگی کا مشن ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو یہ سوچ کر یہاں آئے ہیں کہ ـــــ منزل دور ہے اور ہمیں چلتے ہی رہنا ہے۔ میں نے کہا کہ یہی سچی مشنری اسپرٹ ہے۔ مشن ساری عمر کے لئے ہوتا ہے، وہ تھوڑے دن کے لئے نہیں ہوتا۔

پانی پت میں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب نے بات چیت کے دوران کہا کہ یہاں کافی انٹر نیشنل تھنکنگ پائی جاتی ہے۔ یہاں کے ایک صاحب نے کہا کہ یہاں کے لوگوں کا انٹرایکشن ہر روز ڈائرکٹ یا انڈائرکٹ دوسرے دیشوں سے ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا کاروباری سمبندھ ساری دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اپنے آپ یہ سوچ لوگوں میں آجاتی ہے کہ جب ہم ایک دوسرے پر نربھر ہیں تو پھر آپس میں نفرت کیسی۔

موجودہ زمانہ تیز رفتار کمیونی کیشن کا زمانہ ہے۔ آج یہ حالت ہے کہ دنیا کے ایک کونے میں ایک ترقی ہو تو فوراً وہ دوسرے کونے میں پہنچ جاتی ہے۔ ایک سائنس داں انسانیت کے فائدے کی ایک چیز دریافت کرتا ہے تو اس کی دریافت بہت جلد تمام انسانوں کے لئے قابل قبول بن جاتی ہے۔

مسٹر بلراج ملک کے کمرہ میں ایک قدرتی منظر کی تصویر فریم کر کے دیوار پر لگی ہوئی تھی

سوامی پریم مورتی نے اپنی تنظیم مانو سیوا سنگھ کے بارے میں ایک ہندی پمفلیٹ دیا اس میں کچھ اقوال لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو قول یہ تھے:

"ہر گھٹنا بھگوان کی لیلا ہے"۔

"کاریہ اسی کا سدھ ہوتا ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے"۔

میں نے سوامی جی سے پوچھا کہ کوئی سوتر کی بات بتایئے۔ انہوں نے ایک لمحہ سوچا، اس کے بعد کہا: ہر سمیہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار رہے۔ کیوں کہ جو اللہ تعالیٰ کرتے ہیں وہ صحیح کرتے ہیں۔

مسٹر ستیش سگلانی روٹری کلب کے ممبر ہیں۔ وہ ایک تاجر ہیں اور اسی کے ساتھ سماجی ویلفئر کا کام بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے ۸ سال سے وہ یہ کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے ۹ ہزار لوگوں کی بیڑی چھڑائی، ۹۰۰ لوگوں کی شراب چھڑائی۔ ۴۲ آدمی کا گانجہ اور ہیروئن چھڑائی، وغیرہ۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اس میں کامیاب کیسے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ہر آدمی فطری طور پر جینا چاہتا ہے اور اچھی طرح جینا چاہتا ہے۔ وہ ایک بری عادت میں پھنس گیا ہم اس کو اس سے نکالتے ہیں۔ کاؤنسلنگ (counselling) اور ترغیب (persuasion) کے ذریعہ اس کا ذہن بناتے ہیں۔ اس کو دوائیں دیتے ہیں۔ حتی کہ اس کے گھر کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح اس معاملہ میں ہماری مدد کریں۔ انہوں نے بتایا کہ جدید سائنس کی دریافت کردہ حقیقتوں کو ہم انہیں آسان انداز میں سمجھاتے ہیں کہ کس طرح نشہ انسان کے پورے سسٹم کو خراب کر دیتا ہے۔ اور اس کو جیتے جی بیکار بنا دیتا ہے۔ اس طرح جب اس کو ہماری بات سمجھ میں آجاتی ہے تو وہ اس طرح اپنی عادت چھوڑنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ ہم نے ۸ سال کی مدت میں ۴۰ ہزار آدمیوں پر کام کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے جزئی طور پر نشہ چھوڑ دیا اور تقریباً ۲۰ پرسنٹ لوگوں نے کلی طور پر۔

مولانا محمد الیاس صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ پانی پت کے ایک مدرسہ میں مہتمم ہیں۔ اس مدرسہ کا نام الجامعۃ الاسلامیہ دار العلوم ہے۔ اس ادارہ میں طلبہ کی تعداد ۱۱۵ ہے۔ اس مدرسہ

کی چھ شاخیں مختلف دیہاتوں میں قائم ہیں۔ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد پانی پت کا علاقہ مسلمانوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ پانی پت میں صرف ایک مولانا لقاء اللہ صاحب باقی رہ گئے تھے۔ مگر مولانا محمد الیاس صاحب نے بتایا کہ اب پانی پت میں ۲ لاکھ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ یہی معاملہ پورے ہریانہ اور پنجاب کا ہوا۔

۱۹۴۷ میں کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ علاقہ دوبارہ مسلمانوں سے آباد ہو گا۔ مگر تاریخ ہمیشہ انسانوں کے مزعومات کو رد کر دیتی ہے۔ اسی کی ایک مثال یہ علاقہ بھی ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ مدرسہ کے کام سے جڑے ہوئے ہیں اور اسی کے ساتھ آپ تبلیغ سے بھی جڑے ہوئے ہیں اپنے کچھ تجربات بتایئے۔ انہوں نے اپنے تجربات بتاتے ہوئے ایک دلچسپ بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ آج کل سب سے بڑا جہاد مدرسہ چلانا ہے۔ اگر آپ تبلیغ میں جائیں تو ہر جگہ آپ کا اعتراف ہو گا۔ ہر جگہ آپ کی ضیافتیں ہوں گی۔ ہر جگہ آپ کا استقبال کیا جائے گا۔ ہر جگہ قیام اور دوسری ضرورتوں کا اچھا انتظام ملے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ کہیں جائیں اور وہاں لوگوں کے سامنے مدرسہ کی بات کریں تو لوگ سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کریں گے، منہ پھیر کر ادھر ادھر چلے جائیں گے۔ مدرسہ کے کام میں بےعزتی ملتی ہے جب کہ تبلیغ کے کام میں جایئے تو وہاں آپ کو عزت ملے گی۔ انہوں نے کہا کہ اس زمانہ میں جس کو جہاد کا ثواب لینا ہو وہ ایک مدرسہ چلائے۔

۷ مئی کو ساڑھے دس بجے وہ سمیلن شروع ہوا جس کے لئے میں کرنال آیا تھا۔ یہ سمیلن مانو سیوا سنگھ کے ہال میں ہوا۔ یہ ادارہ ایک وسیع پارک جیسے ماحول میں قائم ہے۔ صبح کی بارش کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہال کی تمام کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ یہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے۔ حاضرین میں ۹۹ فیصد ہندو تھے۔ میرے سوا صرف دو مسلمان اور دو سردار نظر آئے۔ سب سے مختصر تقریر سردار راؤ گرو بخش سنگھ کی تھی۔ یہاں مقررین کو دس منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ سردار گرو بخش سنگھ کو بھی دس منٹ دیا گیا مگر وہ صرف ایک منٹ کے لئے بولے۔ انہوں نے

کہا کہ: منش کی ایک ہی ذات، اس کو پہچانو۔ (انسان سب ایک ہیں۔ اس حقیقت کو جانئے)

مجھے اس سمّیلن میں چیف گیسٹ کے طور پر بلایا گیا تھا۔ اپنی آدھ گھنٹہ کی تقریر میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسائل نظر آتے ہیں ان کا پیدا کرنے والا انسان ہے۔ جنگ کون چھیڑتا ہے، انسان۔ صنعتی کثافت سے پانی اور فضا کو کون آلودہ کرتا ہے، انسان۔ کرپشن کے ذریعہ قومی معیشت کو کون تباہ کرتا ہے، انسان۔ سیاسی طاقت کو فسادی طاقت میں کون تبدیل کرتا ہے، انسان۔ اس لئے اصل مسئلہ نظام (سسٹم) کو بدلنے کا نہیں، بلکہ انسان کو بدلنے کا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنایا جائے۔

مذہب کا اصل مقصد یہی ہے۔ مذہب کا نشانہ انسان کو انسان بنانا ہے۔ انسان کی اصلاح ہو جائے تو بقیہ چیزوں کی اصلاح اپنے آپ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں میں نے اسلامی تعلیمات سے کچھ مثالیں پیش کیں۔ اور بتایا کہ اسلام کا اصل نشانہ فرد کی اصلاح ہے۔ کسی حکومت یا سسٹم کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف گن کلچر چلانا اسلام نہیں۔

میں نے کہا کہ اسلام اور حب وطنی میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اسلام دین فطرت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کی ہر بات اپنے آپ اسلام میں شامل ہے، خواہ قرآن وحدیث میں صراحۃً اس کا ذکر ہو یا نہ ہو۔ مثلاً قرآن میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ اے مسلمانو، تم اپنے وطن سے محبت کرو۔ مگر وطن کی محبت لکھے بغیر اسلام میں شامل ہے۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ اے مسلمانو، تم اپنی ماؤں سے محبت کرو۔ مگر ماں سے محبت یقیناً اسلام کا ایک حصہ ہے۔ کیوں کہ وہ فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح وطن سے محبت بھی اسلام کا ایک حصہ ہے کیوں کہ وہ فطرت کا ایک حصہ ہے۔

مسٹر پردیپ کمار ایڈوکیٹ (پانی پت) کرنال کے سمیلن میں موجود تھے۔ انہوں نے میری تقریر کے بارے میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ آپ کی اسپیچ کو سن کر یہ لگا کہ ہم بھی دھارمک ہو سکتے ہیں۔ اب تک ہم سمجھتے تھے کہ دھارمک ہونے کا مطلب ہے جنونی ہونا۔ اس لئے ہم دھرم سے دور ہی رہتے تھے۔ مگر آپ کی باتوں کو سن کر اور آپ کو دیکھ کر اب ہم سمجھے کہ دھرم

انسانیت سے پیار کا نام ہے۔ آپ جس دھرم کو ریپرزنٹ کرتے ہیں اس سے کسی کو بھی بیر نہیں ہو سکتا۔

سمینار سے پہلے ہندو جا گیبلس (ٹی وی) نے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ حالات سے تھا۔ میں نے کہا کہ میڈیا کے لوگ ہمیشہ منفی خبروں کو نمایاں کرتے ہیں اس لئے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر طرف بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔ حالاں کہ ان کے سوا بے شمار مثبت خبریں ہیں مگر میڈیا ان کو نمایاں نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ مثال کے طور پر یہ مانو سیوا سنگھ جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے ہیں یہ لوگ رات دن سماجی خدمت اور تعمیری کام میں لگے ہوئے ہیں مگر میڈیا میں میں نے کبھی ان کے بارے میں نہ سنا اور نہ پڑھا۔ اس کا علم مجھے صرف اس وقت ہوا جب کہ میں کرنال آیا اور اس کو براہ راست اپنی آنکھ سے دیکھا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں کسی حکومت کو مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں سمجھتا۔ مسلم کمیونٹی ہو یا کوئی دوسری کمیونٹی، ہر ایک کے مستقبل کا انحصار خود اپنے عمل پر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ڈیما کریسی کے زمانہ میں کوئی حکومت نہ کسی کو کوئی چیز دے سکتی ہے اور نہ کسی سے کوئی چیز چھین سکتی ہے۔ اس لئے ہمارے مشن کا سارا زور اس پر ہے کہ ہم مسلمانوں کے اندر تعمیری سوچ پیدا کریں۔

سمینار کے بعد پریس کانفرنس ہوئی۔ اس میں اکثر اخباروں کے مقامی نمائندے موجود تھے۔ اکثر سوالات تیز و تند نوعیت کے تھے۔ مگر میں نے ہر سوال کا ٹھنڈے طریقہ سے جواب دیا۔

دہلی کے اردو اخبار (قومی آواز ۸ مئی ۲۰۰۰) میں ان پاکستانی خواتین کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس کے مطابق، "پاکستان کی ایک خاتون صحافی عارفہ نور نے پاکستان سوسائٹی کو طالبان زدہ بنانے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ماضی قریب میں ملاؤں نے فتویٰ دیا تھا کہ عورتوں کو گھر سے باہر نکلتے وقت سر ڈھا کنا چاہئے لیکن پاکستان کی عام عورتوں نے ملاؤں کے اس فتویٰ کو ٹھکرا دیا اور وہ منظم طاقت کے سامنے عورتوں کو سر ڈھانکنے پر مجبور نہیں کر سکے۔ (صفحہ ۱)

پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان میں اسلام کے نام پر جو سیاست چلائی گئی اس میں پر جوش سلام پسند قائدین فخر کے ساتھ یہ کہتے تھے کہ "پاکستان اسلام کے نام پر الاٹ ہو چکا ہے"۔ لیکن سلام کے نام پر کیا جانے والا یہ ہنگامہ جب اپنے آخری انجام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پاکستان حقیقۃً نوش فہمی کے نام پر الاٹ ہوا تھا۔ اگر چہ نام نہاد اسلام پسند بطور خود یہ سمجھتے رہے کہ پاکستان سلام کے نام پر الاٹ ہوا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلم تحریکیں اٹھیں ان سب میں یہ مشترک کمی تھی کہ ان کے رہنما یہ سمجھنے میں ناکام رہے کہ روح عصر کیا ہے اور تاریخ کی طاقتیں کدھر جارہی ہیں۔ اسی بے خبری کا یہ نتیجہ ہے کہ سو سال کی ہنگامہ خیز تحریکیں اور بے شمار جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود ملت کے حصہ میں مزید تباہی کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

مانو سیوا سنگھ (کرنال) کے بانی اور ذمہ دار سوامی پریم مورتی بظاہر اپنے حلیہ کے اعتبار سے ایک غیر اہم انسان دکھائی دیتے ہیں مگر ان میں بیک وقت دو اعلیٰ صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے سینہ میں انسانیت کا درد رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ ان کو زندگی کا کافی تجربہ بھی ہے۔ انہوں نے بہت سی قیمتی باتیں بتائیں۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ۱۰ سے ۱۲ سال کی عمر بچوں کے بننے کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر تک اگر ان سے کام نہ کرایا جائے تو پھر وہ ساری عمر کام نہ کر سکیں گے۔

یہ بلا شبہہ ایک درست بات ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ اپنی عادتوں کے پابند ہوتے ہیں۔ جس کے اندر جو سوچ بن گئی وہ دوبارہ اس کے علاوہ کچھ اور سوچ نہیں پاتا، وہ اسی پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اسی طرح جو شخص جس چیز کا عادی ہو گیا وہ دوبارہ اپنی عادتوں کو بدل نہیں پاتا۔ استثنائی طور پر کوئی شخص ایسا ہوتا ہے جو اپنی سوچ یا اپنی عادت کو ازسر نو تشکیل دے۔

کرنال سے ہم لوگ ۷ مئی ۲۰۰۰ کی شام کو واپس دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں ہمارا قافلہ کچھ دیر کے لئے پانی پت میں رکا۔ یہاں جو کچھ دیکھا اور جن سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے ایک مسٹر پی سی بجاج (Tel. 67838, 68982) تھے۔ وہ ۱۹۴۷ میں پاکستان سے انڈیا

آئے اور پانی پت میں اپنا کاروبار قائم کیا۔ وہ پانی پت میں ہینڈلوم کا ایک بڑا کارخانہ چلاتے ہیں۔ ان کا شوروم اور ان کا آفس اتنا بڑا ہے کہ وہ خود ایک دنیا معلوم ہوتا ہے۔

مسٹر بجاج کو ان کے شاندار آفس میں دیکھ کر ایک عام آدمی سمجھے گا کہ وہ بہت خوش قسمت ہیں۔ مگر ان کی اس خوش قسمتی کا راز یہ نہیں ہے کہ وہ چاندی کا چمچہ اپنے منھ میں لے کر پیدا ہوئے یا ان کے نام کوئی بڑی لاٹری کھل گئی۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز پچاس سال کی مسلسل محنت ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۷۶ سال ہے مگر آج بھی وہ رات اور دن کے درمیان تقریباً ۱۸ گھنٹہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ ان سے کسی بھی وقت ملیں، وہ آپ کو ہر وقت خوش اور تروتازہ دکھائی دیں گے، وہ اپنی تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ سوشل کاموں کے لئے بھی پابندی کے ساتھ وقت نکالتے ہیں۔ ان کی زندگی اس حقیقت کا پیغام ہے کہ ـــــ محنت کرو اور بااصول زندگی گزارو، تم یقیناً کامیاب رہو گے۔

پانی پت اگرچہ کرنال کا ایک قصبہ ہے مگر وہ خود ایک شہر کے مانند ہے۔ مزید یہ کہ اس کی تاریخی حیثیت بہت زیادہ ہے۔ ۱۸۶۷ میں پانی پت میں میونسپلٹی کا قیام عمل میں آیا۔ پانی پت میں کئی اچھے تعلیمی ادارے ہیں۔ یہاں اون اور سوت کے بہت سے کارخانے ہیں جو پاور لوم سے چلتے ہیں، وغیرہ۔

پانی پت میں تین بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ تاریخ کی کتابوں میں پانی پت کی جنگیں (Battle of Panipat) ایک مستقل عنوان بن گیا۔ یہاں ہونے والی ۳ بڑی جنگوں کی تفصیل یہ ہے۔

پہلی جنگ وہ ہے جو ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ کو لڑی گئی۔ یہ جنگ مغل سردار بابر، کابل کا حکمراں، اور دہلی کے سلطان ابراہیم لودی کے درمیان ہوئی۔ اگرچہ ابراہیم لودی کی فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر بابر کی انتہائی منظم فوج کے مقابلہ میں اس کو شکست ہوئی۔ ابراہیم لودی خود بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ یہی جنگ برصغیر ہند میں مغل سلطنت کا آغاز بنی۔

دوسری جنگ ۵ نومبر ۱۵۵۶ کو ہوئی۔ یہ جنگ شہنشاہ اکبر کے اتالیق سردار بیرم خاں اور عادل

شاہ سوری کے سپہ سالار ہیمو بقال کے درمیان لڑی گئی۔ ہیمو بقال کے پاس ایک لاکھ سپاہی تھے اور مغل فوج کی تعداد ۲۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن بالآخر ہیمو گرفتار ہوا اور اس کی فوج تتر بتر ہو گئی۔

پانی پت کی تیسری جنگ جنوری ۱۷۶۱ میں لڑی گئی۔ یہ جنگ مراٹھا کمانڈر سداشیو بھاؤ اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان ہوئی مرہٹہ فوج کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی اور شاہ ابدالی کے پاس تقریباً چالیس ہزار سوار اور تقریباً ۴۰ ہزار پیادہ سپاہی تھے۔ آخر کار مرہٹوں کو مکمل شکست ہوئی۔

مرہٹوں کی شکست کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ اس کے سردار سداشیو بھاؤ نے غیر منصوبہ بند انداز میں فوج کی تعداد بہت بڑھالی جب کہ اتنی بڑی تعداد کے لئے کھانے پینے کا معقول انتظام موجود نہ تھا۔

اس معاملہ کا ایک سبق آموز پہلو یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی کی بظاہر کامیابی کا فائدہ تمام تر انگریزوں کو ملا۔ خود احمد شاہ ابدالی کو اپنے فوجیوں کے اصرار کی بنا پر ہندستان سے واپس جانا پڑا۔ دوسری طرف مرہٹوں کا زور ٹوٹ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو کسی بڑی مزاحمت کے بغیر انڈیا میں اپنا قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد لمبی مدت تک اس علاقہ سے سیاسی استحکام ختم ہو گیا۔ اس سیاسی انارکی نے انگریزوں کے لئے کامیابی کا راستہ ہموار کر دیا:

This began 40 years of anarchy in north-west India
and cleared the way for later British supremacy.

شری پیارے لال (کرنال) کا ایک پیپر یہاں کے سمینار میں پڑھا گیا۔ اس تقریر میں انہوں نے وحدت ادیان کے نظریہ کو پیش کیا تھا۔ میں نے تجربہ کیا ہے کہ جو لوگ وحدت ادیان کی بات کرتے ہیں وہ ہمیشہ بیانیہ انداز میں بولتے ہیں۔ کسی دلیل کے بغیر بیانیہ انداز میں اپنی بات کہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تقریر و تحریر میں نہ کوئی دلیل ہوتی ہے اور نہ کوئی علمی تجزیہ۔ مذکورہ پیپر کا بھی یہی حال تھا۔ کچھ اشعار اور کچھ تمثیلیں، بس اسی پر سارا مضمون تیار کیا گیا تھا۔

پیپر میں قرآن کی ایک آیت کا بھی حوالہ دیا گیا تھا۔ وہ آیت یہ ہے: **وکان اللہ بکل شیٔ محیطا** (النساء ۱۰۸) اس آیت سے انہوں نے ہمہ اوست (monism) کا نظریہ نکالا تھا، حالانکہ

اس آیت کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس آیت میں اللہ کی قدرت کا ہر چیز میں چھایا ہوا ہونا بتایا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر چیز اللہ کی ذات یا اس کے وجود کا حصہ ہے۔ یہ کوئی دلیل نہیں بلکہ محض لفظی تک بندی ہے۔ بد قسمتی سے اس قسم کی لفظی تک بندی ہر مذہبی گروہ اور ہر مذہبی فرقہ میں رائج ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی اکثر فرقے اور گروہ اسی قسم کی کمزور دلیلوں پر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ لفظی تک بندی کو علمی دلیل کا درجہ دئے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ سائنسی استدلال کا زمانہ ہے۔ آج مبنی بر عقل دلیل (reason-based argument) کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر میرے علم کے مطابق، کسی بھی مذہبی گروہ میں اس قسم کا استدلالی طریقہ موجود نہیں۔ اسلام مکمل طور پر ایک علمی و عقلی مذہب ہے مگر موجودہ زمانہ میں مجھے کوئی بھی مسلم مقرر یا محرر دکھائی نہیں دیتا جس نے حقیقی معنوں میں سائنسی استدلال کے اصول پر اپنے فکر کو پیش کیا ہو۔

ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد میری زبان سے نکلا۔ جنت کی قیمت عمل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل کی کوئی بھی مقدار جنت کی قیمت نہیں بن سکتی۔ جنت کا استحقاق صرف ایک چیز ہے، اور وہ سوال (دعا) ہے۔ جنت صرف ان انسانوں کے لئے ہے جو حقیقی طور پر یہ کہہ سکیں: اللهم انا نسألك الجنة و نعوذ بك من النار۔ عمل بھی اسی لئے ہے کہ آدمی کو حقیقی معنوں میں سائل بنا سکے۔ جو عمل آدمی کے اندر اس پیغمبرانہ سوال کی اسپرٹ جگائے وہی عمل ہے اور جو عمل یہ اسپرٹ نہ جگائے وہ عمل بھی حقیقی عمل نہیں۔

سوال کیا ہے۔ سوال دراصل رب العالمین کی کامل قدرت کے مقابلہ میں اپنے کامل عجز کا اعتراف کرنا ہے۔ سچا سوال ہمیشہ احساس عجز سے ابھرتا ہے نہ کہ احساس عمل سے۔

ایک مجلس میں مجھ سے کہا گیا کہ قرآن کی کوئی آیت ہم کو بتائیے جس میں ہمارے لئے کوئی نصیحت ہو۔ میں نے یہ آیت پڑھی: لاتؤتوا السفهاء أموالكم (النساء ۵) یعنی تم نادانوں کو اپنے مال نہ دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال کو ٹھیک طور پر سنبھالنے کے لئے عقل اور شعور کی

ضرورت ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کو مالدار بنانے سے پہلے انہیں باشعور بناؤ۔

میں نے کہا کہ اس کی ایک قریبی مثال پنجاب ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد پنجاب میں لوگوں کے پاس کثرت سے مال آگیا۔ مگر تعلیم میں کمی کی بنا پر وہ زیادہ باشعور نہ تھے چنانچہ کچھ نادان لیڈروں کے بہکاوے کے نتیجہ میں وہاں متشددانہ انداز میں علیحدگی کی تحریک چل پڑی۔ اس کے انتہائی غیر حقیقت پسندانہ سیاست کا نتیجہ صرف جان و مال کی تباہی کی صورت میں برآمد ہوا۔

میں نے کہا کہ پنجاب میں جو لوگ اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے تھے۔ وہ اس تحریک کی غلطی کو اچھی طرح سمجھتے تھے، مثال کے طور پر ڈاکٹر مہندر سنگھ۔ اگر پنجاب میں ڈاکٹر مہندر سنگھ جیسے تعلیم یافتہ لوگ ہوتے تو کبھی اس قسم کی جذباتی تحریک وہاں نہ پھیلتی۔ مگر پنجاب میں جس نسبت سے مال آیا اسی نسبت سے وہاں تعلیم نہ آسکی۔ اس غیر متناسب ترقی نے وہاں علیٰحدگی پسندی کو فروغ دیا۔ اس تباہ کن تحریک کو کچلنے میں صرف نئی دہلی کا جو خرچ ہوا اس کی مقدار ایک سو کرور روپیہ تھی۔ دوسرے نقصانات اس کے علاوہ ہیں۔

پانی پت میں ایک تعلیم یافتہ ہندو نوجوان مسٹر چودھری سے ملاقات ہوئی۔ واپسی میں وہ گاڑی میں ہمارے ساتھ دہلی تک آئے۔ ان کا خاندان ۱۹۴۷ میں پاکستان سے یہاں آگیا تھا۔ پاکستان میں یہ لوگ جس بستی میں رہتے تھے وہاں کے مسلمانوں سے اب بھی ان کے اچھے تعلقات ہیں اور وہ جب بھی ہندستان آتے ہیں تو ان سے ضرور ملتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ حال میں ان کا ایک مسلمان دوست پاکستان سے آیا اور پانی پت میں کچھ وقت ان کے ساتھ رہا۔ اس مسلمان نے ایک روز بے تکلفی کے انداز میں کہا کہ "یار، ہمارے اور تمہارے درمیان کیا فرق ہے۔ سارا جھگڑا صرف نام ہی کا تو ہے اپنا نام بدل لو اور پاکستان آجاؤ"۔

میں نے سوچا کہ دو قومی تحریک کا یہ یک قومی انجام کیسا عجیب ہے۔ ۷ مئی ۲۰۰۰ کی رات کو ہم لوگ دہلی واپس پہنچے۔

ہندستان کے مسلم رہنماؤں اور جماعتوں کے قائدین سے سوالات

سوال نامہ برائے اردو نیوز (جدہ)

(۱) آزادی کے ۵۳ سال گزر جانے کے بعد بھی مسلمانانِ ہند یکسو نہیں ہیں، انہیں ہمیشہ مسائل درپیش رہے ہیں، آج بھی وہ مختلف النوع مسائل و مشکلات سے دوچار ہیں، آپ کے نزدیک اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟

(۲) اتحاد ملت کے لئے وقتاً فوقتاً کوششیں کی جاتی ہیں مگر خاطر خواہ نتائج بر آمد کیوں نہیں ہوتے، آپ کے خیال میں اتحاد ملت کی راہ میں بنیادی رکاوٹیں کیا ہیں؟

(۳) ملت کے مشترک مسائل پر غور و خوض کر کے ان کے حل ڈھونڈنے کے لئے کیا مسلم مجلس مشاورت اور ملی کونسل کافی ہیں یا کوئی نیا پلیٹ فارم وجود میں آنا چاہئے؟

(۴) ہندستانی مسلمانوں کو یوں تو فسادات اور تعلیم و رزگار کے میدانوں میں پسماندگی جیسے مسائل ہمیشہ درپیش رہے اور آج بھی بڑی حد تک درپیش ہیں، لیکن ہمارا احساس ہے کہ فی زمانہ سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہندستانی مسلمانوں کی دینی شناخت کا ہے۔ اگر آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں تو اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟

(۵) آپ (کی جماعت یا تنظیم) کے پاس ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور اس کی تعمیر و ترقی کے لئے کیا منصوبہ ہے؟

(٦) تعلیم اور روزگار کے میدان میں کی جانے والی کوششوں کو آپ کافی سمجھتے ہیں یا کچھ مزید چاہتے ہیں؟

(۷) عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟

(۸) مسئلہ فلسطین کے حل بالخصوص یروشلم اور مسجد اقصیٰ کی بازیابی کی لئے آپ کے خیال میں کیا کیا جانا چاہئے؟

(۹) حکومت ہند اور اسرائیل کے بڑھتے ہوئے تعلقات کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

(۱۰) سنا ہے نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ میں ایف بی آئی (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن) نے اپنا دفتر کھول لیا ہے جس کا واحد مقصد "اسلامی دہشت گردی" کی روک تھام بتایا گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(۱۱) کیا آپ چاہیں گے کہ مسلم ممالک اور ہندستانی مسلمانوں کے درمیان باقاعدہ رابطہ کی کوئی شکل پیدا کی جائے اور اس چیز کو ہندستان اور مسلم ملکوں کے درمیان قریبی تعلقات قائم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے؟

اردو نیوز (جدہ) کے سوال نامہ کا جواب

۱ مسائل استثنائی طور پر مسلمانان ہند کی زندگی کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وہ انسانی زندگی کا عمومی حصہ ہیں۔ ان کا سامنا معتدل انداز میں کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کو غیر ضروری طور پر یہ یقین دلایا جائے کہ تم اپنے ملک میں مسائل کا شکار ہو رہے ہو۔ بد قسمتی سے زبان و قلم کے حاملین نے مسلمانوں کو اسی فرضی اندیشہ میں مبتلا کیا۔ اس بنا پر ہندستانی مسلمانوں کا ردّ عمل اس ملک میں غیر معتدل ہو گیا۔ کامیابی کا راز حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا ہے۔ مگر مذکورہ غلط سوچ کی بنا پر مسلمان ماضی میں ایسا نہ کر سکے۔ حالانکہ یہی ہندستانی مسلمان جب باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں وہ مکمل طور پر مقامی حالات کی رعایت کرتے ہوئے عمل کرتے ہیں، اور کامیاب رہتے ہیں۔ ہندستان میں بھی انہیں یہی حقیقت پسندانہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

۲ اتحاد ملت کی رکاوٹ اتحاد کا غلط فارمولا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اختلاف کو ختم کرو تاکہ اتحاد قائم ہو۔ مگر یہ ایک غیر فطری بات ہے۔ اتحاد کا صحیح فارمولا یہ ہے کہ ــــــ اختلاف کو برداشت کرو تاکہ اتحاد قائم ہو۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد قائم ہوتا ہے نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا تو عملاً ممکن ہی نہیں۔ مزید یہ کہ اختلاف کوئی برائی (evil) نہیں۔ بلکہ وہ عین رحمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ذہنی ارتقاء کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر اختلاف رائے نہ ہو تو ذہنی ارتقاء کا عمل رک جائے گا۔ ایسی حالت میں اصل کام یہ ہے کہ اختلاف اور تنقید کے معاملہ میں لوگوں کی غیر ضروری حساسیت کو ختم کیا جائے نہ کہ لاحاصل طور پر خود اختلاف کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

۳ مسلم مجلس مشاورت اور ملی کونسل، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی دوسری تحریکوں کی طرح، صرف ردّ عمل کی تحریکیں ہے، وہ کسی مثبت فکر یا ایجابی نظریہ کے تحت وجود میں نہیں آئیں۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں صرف وہ تحریک کامیاب ہوتی ہے جو حالات

کے مثبت جواب (positive response) کے طور پر وجود میں آئے، نہ کہ حالات کے منفی جواب (negative response) کے طور پر۔ اور یہ تحریکیں یقینی طور پر اس معیار پر پوری نہیں اتر تیں۔

۴ فساد، تعلیم، بے روزگاری اور دینی شناخت کے مسائل حقیقی سے زیادہ فرضی ہیں۔ فسادات کا مسئلہ بر صغیر ہند کے مسلمانوں کے بے برداشت مزاج کی وجہ سے ایک سنگین مسئلہ بن گیا۔ اسی طرح تعلیمی پس ماندگی کا مسئلہ اس لئے پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو تعلیم کے بجائے غیر ضروری سیاسی مسائل میں الجھادیا گیا۔ بے روزگاری کے مسئلہ کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کو محنت کا سبق دینے کے بجائے بے نتیجہ طور پر رزرویشن کا سبق دیا گیا۔ اسی طرح دینی شناخت کے مسئلہ کی حیثیت بھی ایک فرضی خطرہ کی ہے۔ ہندستان میں اس وقت جتنا زیادہ دینی کام ہو رہا ہے وہ کسی بھی دوسرے ملک میں نہیں ہو رہا ہے، حتی کہ مسلم ملکوں میں بھی نہیں۔ مذہبی آزادی دور جدید کا ایک مسلمہ اصول ہے، ایسی حالت میں مسلمانوں کی مذہبی شناخت کے لئے کسی خارجی خطرہ کا کوئی امکان ہی نہیں۔

۵ ہم اپنا کام اسلامی سنٹر اور الرسالہ مشن کے تحت کر رہے ہیں۔ ہماری تشخیص کے مطابق تمام مسائل کی جڑ صحیح طرز فکر کا فقدان ہے، اس لئے ہم اپنی تمام کوشش مسلمانوں کے اندر فکری بیداری اور شعوری تعمیر پر لگائے ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں کا تعلق غیر مسلموں سے داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ حریف اور رقیب کا۔ موجودہ زمانہ میں "غلط رہنمائی کے نتیجہ میں" مسلمانوں کا تعلق غیر مسلموں سے رقابت کی بنیاد پر قائم ہو گیا جو دعوتی عمل میں ایک سنگین رکاوٹ ہے۔ ہم مسلمانوں کے اندر دوبارہ دعوتی شعور کو زندہ کر رہے ہیں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معتدل فضا قائم ہو تا کہ دعوتی عمل دوبارہ موثر انداز میں جاری ہو سکے۔

۶ تعلیم اور روزگار کے میدان میں اب ہندستانی مسلمانوں کے اندر ایک نمایاں تغیر (sea change) آچکا ہے۔ آج کا ہندستانی مسلمان ان دونوں میدانوں میں اتنی تیزی سے

آگے بڑھ رہا ہے کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندستانی مسلمان تمام مسلم ملکوں سے آگے بڑھ جائیں گے ـــــ جہاں تک عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کا تعلق ہے، وہ بظاہر کوئی روشن تصویر پیش نہیں کرتے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلم دنیا کے مسلمانوں میں پر شور تحریکوں کے باوجود، ابھی تک اس چیز کا فقدان ہے جس کو سمت کا شعور (sense of direction) کہا جاسکتا ہے۔

۷ فلسطین کے مسئلہ کی جڑ یہ ہے کہ ۱۹۴۸ سے لے کر اب تک اس معاملہ میں جو کچھ کیا گیا وہ سب جذباتی ردّ عمل کے تحت کیا گیا نہ کہ کسی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت۔ اس مسئلہ کے حل کا آغاز یہ ہے کہ اس غلطی کی اصلاح کی جائے۔ اس اصلاح کی پہلی علامت یہ ہوگی کہ اس موضوع پر جذباتی تقریر اور متشددانہ طریقہ کو مکمل طور پر ترک کردیا جائے اور کامل یکسوئی کے ساتھ پرامن طریقہ کار کو اختیار کیا جائے۔

۸ حکومت ہند اور اسرائیل کے تعلقات کی نوعیت میرے نزدیک کوئی غیر معمولی چیز نہیں۔ یہ قومی انٹرسٹ کا معاملہ ہے جو ہر ایک کے ہاں پایا جاتا ہے۔ امریکہ کھلے طور پر اسرائیل نواز ہے۔ اس کے باوجود اکثر عرب ممالک اس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ نیز تقریباً ۸ ملین مسلمان اسی اسرائیل نواز امریکہ میں آباد ہو کر اس کی قومی مشین کا پرزہ بنے ہوئے ہیں۔ پھر ایک کے بارے میں احتجاج اور دوسرے کے بارے میں خاموشی کا کیا جواز۔

۹ "اسلامی جہاد" کے نام پر جب امریکہ کے مفادات کو تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو ہر ملک اسی طرح اپنے تحفظ کی تدبیر کرے گا، خواہ وہ امریکہ ہو یا کوئی دوسرا مسلم یا غیر مسلم ملک۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ان لوگوں کو نصیحت کی جائے جو اسلام کے نام سے غلط طور پر تشدد کا کلچر چلا رہے ہیں نہ کہ امریکہ کو۔

۱۰ ہندستانی مسلمان اور مسلم ممالک کے درمیان مذہبی روابط ہمیشہ سے موجود ہیں اور آئندہ بھی باقی رہیں گے۔ مگر ایسا تعلق جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر سیاسی نوعیت رکھتا ہو، وہ نہ پہلے مفید تھا اور نہ آئندہ مفید ہوسکتا ہے۔ (۱۲ اگست، ۲۰۰۰)

ایک خط

برادر محترم عبدالسلام اکبانی صاحب   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۲۵ اگست کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آپ نے گفتگو کے دوران زاویۂ نظر (attitude of mind) کا تذکرہ کیا تھا۔ جس کا ذکر الرسالہ ماہ ستمبر ۲۰۰۰ (صفحہ ۶۱) میں آیا ہے۔ زاویۂ نظر کا معاملہ ہر شخص اور ہر قوم کی زندگی میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ زاویۂ نظر کی درستگی اور نادرستگی پر تمام دوسری انفرادی اور قومی سعادتوں کا دارومدار ہے۔

زاویۂ نظر کیا ہے۔ اس کی ایک سادہ مثال ٹائمس آف انڈیا (۲۳ اگست ۲۰۰۰) میں نظر سے گزری۔ جاپان کے موجودہ وزیر اعظم یوشیرو موری (Yoshiro Mori) حال میں ہندستان کے دورے پر آئے تھے۔ وہ سب سے پہلے بنگلور گئے۔ وہاں مشہور سافٹ ویر کمپنی انفوسیز (Infosys) نے ان کا استقبالیہ (reception) دیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انفوسیز سافٹ ویر کمپنی کے چیر مین نرائن مورتی (N. R. Narayana Murthy) نے کہا کہ جاپان ایشیا کا ہیرا ہے:

Japan is the jewel of Asia.

اس کے جواب میں جاپانی وزیر اعظم نے ہندستانی ماہرین کو جاپان آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ جاپان میں ایک کہاوت ہے کہ اگر ہیرے کی پالش نہ کی جائے تو اس میں چمک نہیں آئے گی۔ ہیرے کے لئے ضروری ہے کہ اس پر پالش کی جائے:

In Japan, there is a saying that if the jewel is not polished, it will not shine. It is necessary for the jewel to be polished.

اس مثال میں دیکھئے۔ جاپانی وزیر اعظم اگر اپنے اندر فخر پسندی کا مزاج لئے ہوئے ہوتے تو وہ مسٹر نرائن مورتی کے جواب میں پر فخر انداز میں کہتے کہ آپ کے اس اعتراف کا شکریہ۔ مگر جاپان کا قومی مزاج تواضع پسندی کا مزاج ہے۔ اسی مزاج کی بنا پر جاپانی وزیر اعظم کی زبان سے

فخریہ الفاظ کے بجائے منکسرانہ الفاظ نکلے۔

زاویۂ نظر (attitude of mind) کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے سائنٹفک طرز خیال (scientific attitude)، اور دوسرا ہے متعصبانہ طرز خیال (biased attitude)۔ سائنٹفک طرز خیال یہ ہے کہ آدمی کے ذہن پر کسی غیر متعلق چیز کا غلبہ نہ ہو، وہ خالص حقائق کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرے۔ وہ اپنی ذات کو الگ کرکے بے لاگ طور پر حقیقتوں کو دیکھ سکے۔ اس کے برعکس متعصبانہ طرز فکر یہ ہے کہ آدمی کا ذہن ایک متاثر ذہن ہو۔ وہ اس ذہنی کمزوری میں مبتلا ہو جائے جس کو پیشگی طور پر اچھا یا برا خیال رکھنا (preoccupation) کہا جاتا ہے۔ اس فرق کو دوسرے لفظوں میں حقیقت پسندانہ طرز فکر (realistic approach) اور غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر (un-realistic approach) کہہ سکتے ہیں۔

عربی کا ایک مقولہ ہے کہ کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبك الشیٔ یعمی و یصم)۔ یہی بات برعکس طور پر بھی درست ہے۔ یعنی کسی چیز سے بغض آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے (بغضك الشیٔ یعمی و یصم)۔

میں سمجھتا ہوں کہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا معاملہ، دونوں ہی معاملہ میں آدمی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے اندر صحیح طرز فکر پایا جائے۔ غلط طرز فکر اگر جزئی طور پر ہو تب بھی وہ آدمی کے لئے ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔

طرز فکر کا نادرست ہونا کوئی سادہ بات نہیں، وہ نہایت سنگین بات ہے۔ جو لوگ اس کمزوری میں مبتلا ہوں، ان کا نقطۂ نظر اور طریق عمل دونوں غلط ہو کر رہ جائیں گے، ایسے لوگ، حدیث کے الفاظ میں، پہلے قول زور کا شکار ہوں گے اور اس کے بعد عمل زور کا شکار۔ مزید یہ کہ حقائق کی اس دنیا میں چونکہ غیر حقیقی نقطۂ نظر قابل عمل نہیں، اس لئے حالات کے دباؤ کے تحت آخر کار وہ دہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) کا شکار ہو جائیں گے جس کا دوسرا نام منافقت ہے۔ یہاں میں اس معاملہ کی کچھ مثالیں نقل کروں گا۔

۱۔ دہلی میں ایک بدنام ہندی اخبار ہے۔ وہ ہر ایک کے بارے میں الٹی باتیں چھاپتا رہتا ہے۔ اس نے ہندستان کی ایک اسلامی جماعت کے بارے میں چھاپا کہ وہ پاکستان کی ایجنٹ ہے۔ جماعت کے لوگوں نے جب اس کو پڑھا تو ایسا نہیں ہوا کہ وہ اس کو صحیح مان کر اس کی عمومی تشہیر کرنے لگیں۔ بلکہ اس کو دیکھتے ہی انہوں نے کہہ دیا کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس کے برعکس اسی اخبار میں میرے بارے میں ایک بے ہودہ رپورٹ چھپی تو اس جماعت کے لوگوں نے فوراً اس کو صحیح مان کر اس کو ہر طرف پھیلانا شروع کر دیا۔

اس دہرا روش کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ یہ لوگ متعصبانہ طرز فکر میں جی رہے تھے۔ اپنے بارے میں متعصبانہ محبت اور دوسرے کے بارے میں متعصبانہ بغض۔ اس کا نقصان انہیں یہ اٹھانا پڑا کہ وہ دہرا طرز فکر کی برائی میں مبتلا ہو گئے۔ اپنے معاملہ میں ان کے سوچنے کا طریقہ کچھ تھا اور دوسرے کے معاملہ میں ان کے سوچنے کا طریقہ کچھ اور۔

۲۔ اس معاملہ کی دوسری مثال یہ ہے کہ پچھلے تقریباً دو سو سال کے درمیان ہر ملک کے مسلم رہنماؤں کی سوچ پر کم و بیش ایک ہی چیز کا غلبہ رہا ہے، اور وہ مغربی استعمار (colonialism) کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو اتنا زیادہ بڑھایا گیا کہ موجودہ زمانہ میں پیدا ہونے والا تمام مسلم لٹریچر مغرب کی نفرت سے بھر گیا۔ مغربی قومیں اسلام دشمن ہیں، مغربی قومیں اسلام کے خلاف سازش کر رہی ہیں۔ یہ تصور دور جدید کی پوری مسلم نسل پر چھا گیا۔

یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان جن مسائل کا شکار ہوئے ان کا سبب تمام تر خود مسلمانوں کا داخلی زوال تھا۔ مگر مذکورہ منفی ذہن کی بنا پر دنیا بھر کے مسلم مقررین اور محررین نے یہ کیا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل و مصائب کو مغربی استعمار کے خانہ میں ڈال دیا۔ یہ منفی ذہن اتنا زیادہ بڑھا کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ مغربی قوموں سے مسلمانوں کا رشتہ عداوت اور مقاطعہ کا ہونا چاہئے نہ کہ محبت اور تعلق کا۔

۳۔ ایک اور پہلو سے دیکھئے تو یہ سارا معاملہ زاویۂ نظر (angle of vision) کا نظر آتا

ہے۔ کسی چیز کو دیکھنے کے کئی رخ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ ایک چیز کو اس کے صحیح رخ سے دیکھیں تو اس کے بارے میں آپ کی جو رائے بنے گی وہ درست رائے ہوگی۔ اس کے برعکس اگر اس چیز کو غلط رخ سے دیکھا جائے تو آپ کی رائے اس کے بارے میں بالکل غلط ہو جائے گی۔

اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک کتاب چھپی تھی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ برٹش ایمپائر نے ہندستان میں جو ریلوے لائن بچھائی ہے وہ ریلوے لائن نہیں ہے بلکہ وہ لوہے کی زنجیریں ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ ان میں ہندستان کو ہمیشہ کے لئے جکڑ دیا جائے۔ زاویۂ نظر کے فرق کی بنا پر رائے کے مختلف ہونے کی یہ بڑی عجیب مثال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں جو ریلوے لائن بچھائی گئی وہ ملک کے لئے ایک عظیم نعمت تھی۔ اس نے ہمارے ملک میں پہلی بار سواری اور بار برداری کو انتہائی آسان بنا دیا۔ حتی کہ یہی ریلوے لائنیں تھیں جس کے اوپر نہرو اور دوسرے لیڈروں نے سوار ہو کر آزادی کی تحریک سارے ملک میں پھیلا دی۔ اب اگر جواہر لال نہرو اس زاویۂ نظر سے ریلوے لائن کو دیکھتے تو وہ اس کو ملک کے حق میں ایک نعمت بتاتے مگر انہوں نے ریلوے لائن کو بالکل مختلف زاویۂ نظر سے دیکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قیمتی ریلوے لائن ان کو غلامی کی آہنی زنجیر دکھائی دینے لگی۔

اس غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ پوری مسلم نسل دہرا معیار (ڈبل اسٹینڈرڈ) کا شکار ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک طرف اپنے سابقہ فکری تسلط (obsession) کی بنا پر اپنی تقریر اور تحریر میں برطانیہ اور امریکہ کو ہمیشہ برا کہتے ہیں۔ حتی کہ اگر کوئی ایسا نہ کہے تو فوراً اس کو اسلام دشمنوں کا ایجنٹ قرار دے دیتے ہیں۔ مگر انہی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی وہ اپنی اولاد کو اور اپنے رشتہ دار کو برطانیہ اور امریکہ بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ ان "اسلام دشمن" طاقتوں کی مشین کے پرزے بن سکیں، صرف اس قیمت پر کہ وہاں ان کو مادی اعتبار سے زیادہ بہتر زندگی حاصل ہو جائے گی۔

دہلی، ۲۶ اگست ۲۰۰۰   دعاگو   وحید الدین

۱۔ ناگپور کے قارئین الرسالہ نے وہاں اپنا ایک حلقہ بنایا ہے۔ اس کا نام انہوں نے پازیٹیو تھنکرس فورم (Positive Thinkers' Forum) رکھا ہے۔ قارئین الرسالہ کے حلقہ کے لئے یہ موزوں ترین نام ہے۔ جس زمانہ میں اشتراکیت کا زور تھا، اس سے متاثر ادیبوں نے ہر جگہ ایسے حلقے بنائے تھے جن کا نام ترقی پسند ادیب (Progressive writers) ہوتا تھا۔ اس نام میں کوئی معنویت نہ تھی۔ حلقہ الرسالہ کے لئے پازیٹیو تھنکرس فورم کا نام بہت بامعنی ہے۔ دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ اور ہر مقام پر پازیٹیو تھنکرس فورم کے نام سے حلقہ بنا کر کام کرنا چاہئے۔ اس نام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے بخوبی طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس فورم کا بنیادی ذہن کیا ہے اور وہ کس قسم کا فکری انقلاب لانا چاہتا ہے۔

۲ اٹلی کی ایک تنظیم اسوسی ایشن کلچرل آرمونیا (Associatione Culturale Armonia) کے پریزیڈنٹ اٹومبری ماریو (Attombbri Mario) کی قیادت میں نصف درجن اطالوی افراد کا ایک وفد ۱۱ اگست ۲۰۰۰ کو اسلامی مرکز میں آیا۔ اور صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ گفتگو کا موضوع خاص طور پر روحانیت (spirituality) تھا۔ ان لوگوں کو تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ اسلام میں روحانیت کا تصور کیا ہے۔ انہوں نے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی کہ وہ اٹلی میں روحانیت کے موضوع پر ہونے والے سیمنار میں ضرور شرکت کریں۔

۳ بی بی سی لندن کے لئے مسٹر شکیل اختر نے ۱۷ اگست ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں بظاہر مسلمانوں کے لئے جو مخالف حالات پیدا ہوئے ہیں ان کا ایک عظیم مثبت پہلو ہے۔ اصل یہ ہے کہ لمبی مدت سے مسلمانوں کے رہنما ان کو فخر کی غذائیں دے

رہے تھے۔ وہ انہیں جذباتیت میں مبتلا کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلمان پدرم سلطان بود کی نفسیات میں جینے لگے تھے۔ یہ نفسیات کسی قوم کی ترقی میں مستقل رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلم مقرریرین اور محررین نے اس نفسیات کو اتنا زیادہ گہرا بنادیا تھا کے صرف سمجھانے بجھانے سے یہ ختم ہونے والی نہیں تھی۔ موجودہ حالات گویا مسلمانوں کے معلم بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمان تیزی سے حقیقت پسند بنتے جارہے ہیں۔ یہ انٹرویو ۲۶ اگست ۲۰۰۰ کو بی بی سی لندن کے شام کے پروگرام میں نشر کیا گیا۔

۴ بی بی سی لندن کے ایک پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے ان کے ایک پینل ڈسکشن میں حصہ لیا۔ اس میں تین آدمی شریک تھے ـــــ وشنو ہری ڈالمیا، پروفیسر تھمپو، صدر اسلامی مرکز۔ اس کا نظم براہ راست لندن سے کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام ۱۸ اگست ۲۰۰۰ کی شام کو ہوا۔ پروگرام کے کنڈکٹر مسٹر ٹریوک بارنیز (Trevok Barnes) لندن سے ہر ایک کا نام لے کر سوال کرتے تھے۔ اور نئی دہلی میں بیٹھے ہوئے تینوں آدمی باری باری اس کا جواب دیتے تھے۔ یہ پروگرام انگریزی میں تھا اور اس کا عنوان یہ تھا:

Increasing intolerance in present Indian society.

ایک سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ موجودہ انٹالرنس کا سبب مذہبی قدروں کا انحطاط ہے۔ اس لئے مذہبی قدروں کا احیاء کر کے اس مسئلہ کا حل کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہندستان میں ہونے والے تشدد کے واقعات کا کشمیر کی متشددانہ تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

۵ کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) میں تاریخ کے پروفیسر این سلی ایمبری (Ainslie T. Embree) نے ۲۸ اگست ۲۰۰۰ کو دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ وہ مذہب اور امن کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ان کے سوالات کا تعلق اس سے تھا کہ اسلام میں

جنگ اور امن کے بارے میں کیا تعلقات ہیں۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام مکمل طور پر امن اور انسانیت کا مذہب ہے۔ وہ پر امن طریقہ کار کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے۔ گوریلا وار اور پراکسی وار اسلام میں جائز نہیں۔ ملک اور قوم اور مال کی جنگ کو خواہ اسلام کے نام پر لڑا جائے پھر بھی وہ اسلامی جنگ نہیں ہوگی۔ یہ انٹرویو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہا۔

۶ ہفت روزہ نئی دنیا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر جمشید عادل نے ۲۸ اگست ۲۰۰۰ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اعلان (۲۸ اگست ۲۰۰۰) سے تھا جس میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے نہایت نرم انداز اختیار کیا ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ یہ تو عین ہمارے اندازے کے مطابق ہے۔ ہم پچھلے ۲۵ سال سے یہ کہتے آئے ہیں کہ آر ایس ایس یا بھارتیہ جنتا پارٹی مسلمانوں کے لئے حقیقی خطرہ نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا کے معاملات کا فیصلہ فطرت کے قوانین اور تاریخی عوامل کرتے ہیں نہ کہ کوئی فرد یا جماعت۔

۷ زی ٹی وی کی ٹیم نے ۲۸ اگست ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اجلاس (۲۷-۲۸ اگست) سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور آر ایس ایس سے مسلمانوں کی دوری کی وجہ کچھ تاریخی شبہات ہیں۔ جب تک ان شبہات کو دور نہ کیا جائے مسلمان کبھی بھی بڑی تعداد میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو ووٹ نہیں دیں گے۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو اگر مسلمانوں کا ووٹ لینا ہے تو ان کو کھلے طور پر یہ اعلان کرنا ہوگا کہ وہ جس راستہ پر چل رہے تھے وہ درست نہ تھا۔ یہ کہنا کہ کانگریس نے بھاجپا کے اندر غلط فہمی پھیلائی مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے بجائے انہیں خود اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے۔

۸ گاندھی سمیتی اینڈ درشن سمیتی کی سالانہ میٹنگ ۲۹ اگست ۲۰۰۰ کو ساؤتھ بلاک (نئی دہلی)

میں وزیر اعظم ہند کی صدارت میں ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں
شرکت کی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ اس وقت ملک کا سب سے بڑا مسئلہ اخلاقی زوال
مسئلہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اخلاقی اور انسانی قدروں کو زندہ کرنے کے لئے ملک گیر پیما
پر ایک مہم چلائی جائے۔

۹ نئی دہلی کے جیز زاینڈ میری کالج میں ۳۰ اگست ۲۰۰۰ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں کالج
طالبات اور اساتذہ اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو خطاب کی دعوت دی گئی
انہوں نے اس موقع پر پازیٹیو وے آف لائف کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کے بع
بڑی تعداد میں سوالات کئے گئے جن کا جواب دیا گیا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ پازیٹ
وے آف لائف کے سلسلہ میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے۔

۱۰ دوردرشن کے پروگرام "روزانہ" کے تحت ان کی ٹیم نے ۳۱ اگست ۲۰۰۰ کو صدر اسلا
مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اعلا
(۲۷۔۲۸ اگست ۲۰۰۰) سے تھا۔ جواب کا خلاصہ یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو یہ جاننا چاہ
کہ مسلمانوں کے درمیان اس کی امیج منفی بن گئی ہے۔ جب تک کسی قابل لحاظ اقدام کے
ذریعہ اس منفی امیج کو دور نہ کیا جائے مسلمان بھارتیہ جنتا پارٹی کو سپورٹ دینے کے لئے تیا
نہیں ہوں گے۔

۱۱ روزنامہ راشٹر سہارا ہندی (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر سرویش نے ۳ ستمبر ۲۰۰۰ کو صد
اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نیویارک میں ہونے والی آل مذاہب
کانفرنس (۲۸۔۳۰ اگست ۲۰۰۰) سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا سے تشدد کو خ
کرنے کے لئے اس قسم کی آل مذاہب کانفرنس مفید نہیں۔ دنیا میں مذہب کے نام پر
تشدد ہو رہا ہے اس کا سبب عوام کی تعلیمی پس ماندگی ہے۔ اسی بنا پر سطحی لیڈروں کو یہ مو
ملتا ہے کہ عوام کے جذبات کو مذہب کے نام پر بھڑکا کر تشدد برپا کریں۔ اس مسئلہ کو خ

کرنے کی صورت یہ ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنایا جائے۔

۱۲ ہندی روزنامہ دینک جاگرن (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر الوک کمار نے ۳ ستمبر ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور رزولیوشن (۲۸ اگست ۲۰۰۰) سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے کسی پارٹی سے کوئی نفرت نہیں۔ میں ہر پارٹی کو انسانیت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ مگر اس رزولیوشن کے ذریعہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اس میں شامل ہوں اور اس کو ووٹ دیں۔ مگر مسلم عوام کی نظر میں بھاجپا کی تصویر پرہندو اور اینٹی مسلم تصویر ہے۔ بھاجپا کو اپنی یہ تصویر درست کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی مسلمان اس کو ووٹ دے سکتے ہیں۔

۱۳ سہارا ٹی وی (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو میں ۴ ستمبر ۲۰۰۰ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ انٹرویور مسٹر ونود دوا تھے۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بھارتیہ جنتا پارٹی کے ناگپور اعلان اگست ۲۰۰۰ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہمارا میسیج یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو جانے کہ پولیٹکس گیو اینڈ ٹیک (give and take) کا نام ہے۔ اگر وہ مسلمانوں کا ووٹ چاہتے ہیں تو انہیں بھی مسلمانوں کو کوئی قابل لحاظ چیز دینا ہوگا۔ مثلاً وہ یہ اعلان کریں کہ عبادت گاہ ایکٹ (Places of Worsihip Act) کے مطابق ہر مسجد کو ۱۹۴۷ کی حیثیت پر باقی رکھا جائے گا اور جہاں تک بابری مسجد کا سوال ہے اس کے معاملہ میں عدالت کے فیصلہ کو مِن وعَن تسلیم کیا جائے گا۔ اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہم یہ کہیں گے کہ پالیٹکس میں کوئی لگی بندھی پالیسی نہیں ہوتی بلکہ جو چیز لگی بندھی ہوتی ہے وہ انٹرسٹ ہے:

There are no fixed policies, there are only fixed interests.

ماہنامہ الرسالہ کے مطالعہ سے لوگ کس قسم کا اثر قبول کر رہے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں دو خط نقل کئے جاتے ہیں:

۱ میں ایک دینی درسگاہ کا خادم ہوں۔ حالیہ دنوں تک آپ کا سخت ناقد و مخالف رہا حالانکہ میں نے براہ راست آپ کی تصنیفات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ میری مادری زبان بنگالی ہے۔ اردو تھوڑا بہت سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ عالم نما اکابرین سے بارہا سن کر میں نے بھی آپ کو ایک گمراہ و ضدی عالم سوء سمجھ لیا تھا۔ پھر ایک دن خیال آیا کہ کیوں نہ آپ کو پڑھ لیا جائے؟ چنانچہ تلاش کر کے الرسالہ کے چند شمارے، اسفار کی چند کتابیں اور علم جدید کا چیلنج پڑھا۔ پڑھ کر میرا ہوش ٹھکانہ پر آیا۔ آپ کے بارے میں منفی سوچ کے لئے اپنے آپ پر بہت شرمندہ ہوا۔ آپ کے فکر و خیال تو ماشاء اللہ بہت ہی معقول اور حقیقت پسند ہیں بلکہ دور جدید کے ہمہ گیر مسائل کا سب سے آسان و بہترین حل پیش کرتے ہیں..... میں بلا کسی جھجک کے آپ سے متفق ہوں۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی بہترین تخلیقات کی توفیق دے اور لوگوں کے لئے آپ رہبر حق ثابت ہوں۔ بے شک آپ امام الوقت ہیں۔

میرے اکثر احباب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ میرے اندر جدید تعلیم یافتہ مسلمان اور غیر مسلم حضرات میں دعوتی کام کرنے کا جذبہ و شوق ہے، عزم و حوصلہ بھی ہے۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ اس سے پہلے میں دینی مدارس کی بنیاد ڈال چکا ہوں۔ سب کے سب ترقی پذیر ہیں۔ اب میں آپ کی فکر و نظریات پر مبنی ایک جدید اسلامی درسگاہ بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں آپ میری رہنمائی فرمائیں، بہت ممنون ہوں گا۔ کاش بنگلور میں آپ کا کوئی پروگرام ہو تاکہ آپ کو دیکھنے اور سننے کا موقع نصیب ہو جائے۔ گذشتہ ۲۷ یا ۲۸ اگست کی رات .B.B.C کی اردو نشریات کے تحت میزان پروگرام میں آپ کے خیالات سن کر خوشی ہوئی۔ آپ کا تجزیہ برحق ہے۔

ہو سکے تو انگریزی میں ایک سیٹ دعوتی لٹریچر ارسال فرمائیں جو غیر مسلم حضرات میں اسلام کے تعارف کے لئے مفید ہو۔ کچھ ہی عرصہ بعد انشاء اللہ انگریزی دعوتی لٹریچر کافی تعداد

میں قیمتاً خریدنے کا ارادہ ہے۔ والسلام

نور الہدیٰ، جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور۔ ۱، یکم ستمبر ۲۰۰۰

کل رات ریڈیو پر بی بی سی لندن کی اردو سروس کی نیوز سننے کے دوران پہلی بار مجھے آپ کی آواز و خیالات سننے کو ملے۔ یہ نیوز کے بعد ہفتہ وار پروگرام میزان میں سننے کو ملا۔ میں قریب دو مہینہ سے صرف شام کے وقت بی بی سی لندن کی نیوز سن رہی ہوں۔ اس سے پہلے کئی بار الرسالہ کے خبر نامہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا انٹرویو فلاں دن ریڈیو پر نشر ہوا۔ مگر الرسالہ کی یہ خبر وہ دن گزرنے کے بعد ہی ملتی تھی۔ ہندستان میں مسلمانوں کی حالت پر کئی رہنماؤں کے خیالات سننے کے دوران معلوم ہوا کہ اب بھی کئی عالم ایسے ہیں جو مسلمانوں کے پچھڑے پن و بدحالی کا ذمہ دار یہاں کے سیاسی رہنماؤں اور ان کی تعصب پرستی کو ہی سمجھتے ہیں اور بتاتے ہیں۔ وہ اس چیز کو چیلنج کے طور پر نہیں لے پاتے۔ بیس سال سے لے کر آج تک آپ کے سوا کوئی اور نہیں جو مسلمانوں کی موجودہ حالت کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو ہی بتائے۔ یہ بات اتنی آسان بھی نہیں کہ سب اسے جلدی مان ہی جائیں گے۔ مثال کے طور پر میرے شہر کے کئی لوگوں کے علاوہ میرے ایک بزرگ بھی ایسے ہی ہیں۔ وہ الرسالہ تو خوب شوق سے پڑھتے ہیں مگر آپ کی اس بات کو وہ جلدی سمجھ نہیں پاتے۔ اس اختلافی مزاج پر جب بھی میرے اور مذکورہ بزرگ کے بیچ بات ہوتی ہے تو مجھے کافی ٹنشن ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں کہ اس حقیقت کو آج نہیں شاید کل سبھی کی طرح یہ بزرگ بھی سمجھ جائیں گے اور مان لیں گے۔

۱۸ اگست کو ستمبر کا الرسالہ ملا۔ یہ دیکھ کر مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی کہ اس بار کا الرسالہ صرف دینی مدارس پر ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں مدرسہ کی پڑھائی و انتظام اطمینان بخش نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے تشویش کے احساس کے ساتھ الرسالہ پڑھنا شروع کیا اور پڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ پورا الرسالہ پڑھ لیا۔ کئی باب کو میں نے بار بار پڑھا۔ مثلاً دینی مدارس کا

امتیاز، مدرسہ کلچر، تجربات کی روشنی میں، وغیرہ۔ الرسالہ پڑھنے کے بعد مجھے جو کچھ ملا اس میں مدرسہ سے متعلق مثبت نظریہ، وسیع جانکاری، علم، اور خواہش کہ کاش میری بھی تعلیم و تربیت کسی دینی مدرسہ میں ہوئی ہوتی یا میرے علاقہ میں لڑکیوں کی کوئی دینی درسگاہ ہوتی جس میں میں اب بھی پڑھنے کے لئے جاسکتی۔ میری دعا ہے کہ اپنے ملک میں مدارس سینٹر جلد از جلد قائم ہو۔ P 57 پر آپ کے ذاتی تجربات کی سبھی باتوں میں خاص طور پر ۴ نمبر پر درج حدیث کے کلمات "تم غصہ نہ کرو" کو میں نے اپنی زندگی کا حصہ بنایا ہے۔ خدا مجھے صبر دے اور غصہ نہ کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ آپ کے پورے الرسالہ میں تمام اچھی باتوں کے درمیان صرف آپ کے ایک عمل کو نہیں سمجھ پائی۔ وہ P. 33 پر درج یہ جملہ ہے کہ "میں نے ۱۹۶۶ کے آخر میں ان سے بیعت بھی کرلی"۔ یہ کس طرح کا عمل ہے؟ بیعت کے بارہ میں مجھے کوئی علم نہیں ہے جس کی وجہ سے میں آپ کے اس کام کو سمجھ نہیں سکی ہوں۔

آپ کے ستمبر کے الرسالہ سے میں نے ایک اور چیز پائی ہے اور وہ ہے اپنی محنت سے انگریزی سیکھنا۔ جب سے آپ نے مجھے انگریزی سیکھنے کو کہا ہے میں اسی وقت سے اس کام میں لگ گئی تھی مگر الرسالہ پڑھنے کے بعد میں نے اس کام کو اور تیز کر دیا ہے۔ انگریزی زبان کے بعد اردو زبان بھی میں شروع سے سیکھوں گی اور انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گی۔ خدا میری کوشش کو کامیابی تک پہنچائے اور مدد فرمائے۔ خواہش تو میری عربی زبان بھی سیکھنے کی ہے، انشاء اللہ۔ آپ کا ستمبر کا الرسالہ دینی مدارس پر ایک بہترین کتاب ہے۔ مجھے اس کتاب کی دوسری زبانوں میں اشاعت کا انتظار رہے گا، خاص کر انگریزی اور ہندی زبان میں۔ یہ کتاب خاص کر مجھے ان لوگوں کو دینا ہے جو صرف سیکولر تعلیم میں یقین رکھتے ہیں۔

والسلام علیکم (صوفیہ حیدر، بتیا، چمپارن، بہار)

۳ جدہ کے اخبار اردو نیوز کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر محمد لئیق اللہ خاں نے ۱۹ اگست ۲۰۰۰ کو اپنے اخبار کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی

مسلمانوں کے مسائل نیز مسلم دنیا کے مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے حوالہ سے عام طور پر مسائل اور مخالفانہ سازشوں کا ذکر کیا جاتا ہے مگر یہ منفی طرز فکر نہ اسلام کے مطابق ہے اور نہ عقل کے مطابق۔ خود قانون قدرت کے تحت دنیا میں ہمیشہ مسائل رہتے ہیں۔ اور مسلمان ہو یا غیر مسلمان ہر ایک کو مسائل کے درمیان اپنی زندگی کی تعمیر کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ مسائل پر فریاد کرنے کے بجائے ان کو ایک فطری حقیقت سمجھ کر اپنی جدو جہد منصوبہ بندی کی جائے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد طریقہ ہے۔

☆ ☆ ☆

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128,
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@ vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Street,
Ft. Lauderdale, FL 33328
U.S.A. Tel./Fax 718-2583439
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صوم و صلوٰۃ نمبر

الرسالہ، دسمبر ۲۰۰۰

فہرست

عبادت

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور جن کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ) یہ آیت حقیقتِ واقعہ کے اتنا زیادہ مطابق ہے کہ اگر صرف اسی ایک آیت پر غور کیا جائے تو وہ کسی آدمی کے اندر یہ یقین پیدا کرنے کے لیے کافی ہوگی کہ قرآن خداوند عالم کی کتاب ہے، انسان جیسی ایک مخلوق اس قسم کی کتاب وجود میں لانے پر قادر نہیں۔

انسان کی ہستی کے دو پہلو ہیں۔ایک نفسیاتی (یا روحانی) اور دوسرے جسمانی۔ ان دونوں پہلوؤں سے انسان کی ترکیب ایسی ہے گویا وہ عبادتِ الٰہی کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔عبادت کا سب سے زیادہ کامل مظہر نماز (صلاۃ) ہے۔ اس آیت کی روشنی میں نماز اور انسانی شخصیت کا مطالعہ کیجیے۔

انسان کی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان عین اپنی تخلیق کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کے آگے وہ اپنے آپ کو جھکا دے۔یہی وجہ ہے کہ بیشتر انسان کسی نہ کسی کے آگے اپنے آپ کو جھکائے ہوئے ہوتے ہیں، اور اس جھکاؤ سے انھیں خصوصی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ مگر غیر خدا کے آگے جھکنا اس جذبہ کا غلط استعمال ہے۔ اس طرح آدمی غیر خدا کو وہ چیز دیدیتا ہے جو اسے صرف خدا کو دینا چاہیے۔

نماز میں جب آدمی خدا کے آگے جھکتا ہے تو اس کو اپنے اس جذبہ کی پوری تسکین حاصل ہوتی ہے۔ نماز میں خدا کے آگے جھک کر وہ اپنے وجود کے اس پورے تقاضے کا جواب پالیتا ہے جو اس کے اندر اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ وہ اس کو نکالنا چاہے تب بھی وہ اس کو نکال نہ سکے۔یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے فطری جذبہ کا مرجع حقیقی طور پر خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد انسان کے جسم کو لیجئے۔ آپ کسی آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے شروع سے آخر تک دیکھیں۔آپ محسوس کریں گے کہ نماز آدمی کے پورے جسم کا مکمل استعمال ہے۔آپ کو ایسا معلوم ہوگا گویا آدمی اسی لیے بنایا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھے۔

نماز کے لیے آدمی کا اپنے دونوں پیروں پر کھڑا ہونا، قبلہ رخ متوجہ ہونا۔ پھر ہاتھ باندھنا۔زبان سے نماز کے کلمات ادا کرنا اور امام کی آواز سن کر ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف جانا، دونوں ہاتھ گھٹنے پر رکھ کر رکوع کرنا، ہاتھ اور پیشانی اور بقیہ پورے جسم کو استعمال کرتے ہوئے سجدہ میں جانا، پھر چہرہ کو دائیں اور بائیں

گھما کر سلام کرنا، دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کرنا۔ وغیرہ

یہ ساری چیزیں انسان کے جسم سے اتنا زیادہ مطابقت رکھتی ہیں، اور ان حرکات میں انسان کے تمام اعضار اس طرح شامل ہوجاتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتاہے گویا انسان کا پورا جسم اسی لیے بنایا گیا تھا کہ وہ نماز کی شکل میں اپنے رب کی عبادت کرے۔

تمام انسان فطرت اللہ پر پیدا کیے گیے ہیں۔ یہ فطرت اللہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے اور نماز کی صورت میں اس کی عبادت کرے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التی	پس تم یکسو ہوکر اپنا رخ اس دین کی طرف سیدھا رکھو۔
فطرالناس عليها لا تبديل لخلق الله ذٰلك	اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایاہے۔ اس کے
الدين القيم ولكن اكثرالناس لايعلمون۔	بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن
منيبين اليه واتقوه واقيموالصّلاة	اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہوکر اور اسی
ولاتكونوا من المشركين۔	سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو۔

نماز کی یہی خاص صفت ہے جس کی بنا پر تاریخ میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں کہ بہت سے لوگوں نے صرف مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر اسلام قبول کرلیا۔

آدمی کے اندر جو فطرت ہے وہ عبادت کی فطرت ہے۔ آدمی کا پورا وجود عبادت کا طالب ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتاہے کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر نماز پڑھنے کا جذبہ لیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا پورا جسم اور اس کے تمام اعضار نماز کی صورت میں ڈھل جانے کا خاموش داعیہ لیے ہوئے ہیں۔

اب جب ایک آدمی کسی نمازی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا پورا وجود کہہ اٹھتاہے کہ یہی وہ عمل ہے جس کی طلب وہ اپنے اندر لیے ہوئے تھا۔ نماز اس کو خود اپنی تلاش کا جواب معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کی فطرت کی یہ تڑپ اس کو مجبور کرتی ہے اور وہ نمازیوں کے ساتھ نماز میں جھک جاتاہے۔

(اركعوا مع الراكعين)

ارکان اسلام

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بُنی الاسلامُ علیٰ خمس۔ شھادۃِ اَن لا الٰہ الا اللہ و اَنّ محمداً عبدُہ و رسولُہ واقامِ الصلاۃ وایتاءِ الزکاۃ والحجِّ وصوم رمضان (متفق علیہ)

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

اس حدیث کے مطابق، اسلام میں پانچ چیزیں ستون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عمارت کچھ ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے، اسی طرح اسلامی زندگی پانچ بنیادی ارکان پر قائم ہوتی ہے۔ یہ پانچ ارکان دراصل پانچ اصول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو اپنی زندگی کو ان پانچ اصولوں پر قائم کرے۔

کلمۂ شہادت کا مطلب خدا کی خدائی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا اعتراف ہے۔ اس کلمہ کے ذریعہ ایک آدمی خدا کا اس کے تمام صفات کمال کے ساتھ اقرار کرتا ہے۔ وہ محمد عربی کی اس حیثیت کا اقرار کرتا ہے کہ خدا نے ان کو تمام انسانوں کا ابدی رہنما بنایا۔ یہ حقیقت جس کے دل میں اتر جائے وہ اس کی پوری نفسیات میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسے آدمی کا سینہ ہر سچائی کے اعتراف کے لیے کھل جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جس کے لیے کوئی بھی چیز حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہ بنے۔

نماز کی اصل تواضع ہے۔ جس آدمی کے اندر نماز کی حقیقت پیدا ہو جائے وہ گھمنڈ اور انانیت جیسی چیزوں سے یکسر خالی ہو جائے گا، اس کا رویہ ہر معاملہ میں تواضع کا رویہ بن جائے گا۔

زکاۃ کی حقیقت خدمت خلق ہے۔ جس آدمی کے اندر فی الواقع زکاۃ کی روح پیدا ہو جائے وہ تمام انسانوں کا خیر خواہ بن جائے گا، وہ ہر ایک کے لیے مفید بن کر زندگی گزارے گا۔

حج کی حقیقت اتحاد ہے۔ جو آدمی سچے جذبہ کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرلے اس کے اندر اختلاف کا مزاج ختم ہو جائے گا۔ وہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہنے لگے گا۔

روزہ کی حقیقت صبر ہے۔ جو آدمی سچا روزہ دار ہو، وہ اسی کے ساتھ لازماً صبر دار بھی ہوگا۔ اس کے اندر یہ عمومی مزاج پیدا ہو جائے گا کہ وہ ناگواریوں کو برداشت کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان زندگی گزارے۔

پانچ وقت کی نماز

اسلام کی عبادات میں سب سے اہم عبادت نماز ہے۔ نماز اہل ایمان کے اوپر رات دن کے درمیان پانچ وقت کے لئے فرض کی گئی ہے۔

احادیث میں نماز کے تمام مسائل تفصیل کے ساتھ آئے ہیں، ان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نماز اہل ایمان کے اوپر پانچ وقت کے لئے فرض ہے۔ فرض نمازوں کا پانچ ہونا روایات سے بتواتر ثابت ہوتا ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور دوسری کتب حدیث میں کثرت سے ایسی روایات ہیں جن میں الصلوات الخمس کے الفاظ آئے ہیں، اس سے صراحۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں جو مخصوص اوقات میں مقرر کی گئی ہیں۔

نماز کا حکم قرآن میں

قرآن میں نماز کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: إن الصلوة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً (النساء ۱۰۴) یعنی بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا بھی اسی طرح مقرر وقت ہے جس طرح حج کا مقرر وقت ہے۔ نیز یہ کہ نماز کا ایک وقت جب گزر جاتا ہے تو اس کے بعد اس کا دوسرا وقت آتا ہے اور اس طرح رات اور دن کے درمیان اس کی یہ ترتیب مسلسل جاری رہتی ہے (تفسیر ابن کثیر ۱/۵۴۹)

اب سوال یہ ہے کہ نماز کے یہ مقرر اوقات کیا ہیں۔ قرآن کے مطالعہ سے واضح طور پر اس کے پانچ اوقات معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو پانچ اوقات حدیث سے معلوم ہوتے ہیں، ٹھیک وہی اوقات خود قرآن سے بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔	سورج نکلنے سے پہلے	(قبل طلوع الشمس، طه ۱۳۰)	فجر
۲۔	دوپہر ڈھلنے کے وقت	(لدلوك الشمس، بنی اسرائیل ۷۸)	ظہر
۳۔	غروب آفتاب سے پہلے	(وقبل غروبها، طه ۱۳۰)	عصر
۴۔	جب شام ہوتی ہے	(حين تمسون ، الروم ۱۷)	مغرب
۵۔	جب رات تاریک ہو جائے	(الى غسق الليل، بنی اسرائیل ۷۸)	عشاء

اس طرح قرآن سے پانچ نمازیں مع تعیین اوقات ثابت ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن میں ایسی آیت بھی موجود ہے جس سے صرف استنباط کے طور پر نہیں بلکہ صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوپر جو نمازیں فرض کی ہیں وہ محدود طور پر پانچ ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے:

حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطیٰ (البقرۃ ۲۳۸) یعنی پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی۔

جملہ کی ترتیب بتا رہی ہے کہ اس آیت میں صلوۃ وسطیٰ کا لفظ جس نماز کے لئے آیا ہے وہ صلوات سے علیحدہ ایک نماز ہے۔ یعنی یہ کہا گیا ہے کہ "نمازوں" کی پابندی کرو اور اسی کے ساتھ اُس نماز کی جس کا وقت "نمازوں" کے بیچ میں آتا ہے۔ صلوات جمع کا لفظ ہے جو عربی قواعد کے مطابق تین یا اس سے زیادہ نمازوں کے لئے ہے۔ استعمال بتاتا ہے کہ یہاں اس سے تین سے زیادہ نمازیں مراد لینا ضروری ہے۔ کیوں کہ تین کے عدد میں کوئی چوتھی چیز رکھی جائے تو وہ اس کا "بیچ" نہیں بن سکتی۔ کم از کم عدد جو یہاں صلوات سے مراد ہو سکتا ہے وہ چار ہے۔ چار کا عدد لینے کی صورت ہی میں یہ ممکن ہے کہ ایک اور نماز اس میں اس طرح شامل کی جائے کہ وہ اس کا بیچ بن جائے۔ گویا صلوٰۃ وسطیٰ وہ بیچ کی نماز ہے جس کے دونوں طرف دو دو نمازیں ہیں۔ باعتبار مفہوم آیت کا ترجمہ یہ ہوگا —— "بیچ کی نماز کی پابندی کرو اور بیچ کی نماز سے پہلے دو نمازوں کی اور بیچ کی نماز کے بعد دو نمازوں کی"۔ اس سے صاف طور پر یہ نظام معلوم ہوتا ہے کہ رات میں دو نمازیں مقرر کی گئی ہیں اور پھر دن میں دو نمازیں۔ اور ان کے بیچ میں ایک نماز ہے۔ رات کی دو نمازوں سے مراد مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں۔ دن کی دو نمازوں سے مراد فجر اور ظہر اور بیچ کی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس طرح کل پانچ نمازیں ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو نقشۂ ذیل:



پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو اس نماز کی جو نمازوں کے بیچ میں ہے (قرآن)

مذکورہ آیت کی یہ تشریح صحابہ اور تابعین سے بھی ثابت ہے، مثال کے طور پر مسند احمد اور سنن ابی داؤد کی روایت کے مطابق حضرت زید ابن ثابت انصاریؓ نے کہا کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد بیچ کی نماز ہے جس کے اول بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں (**إن قبلها صلاتین و بعدها صلاتین**) تفسیر ابن کثیر ۱/۲۹۰۔

اسی طرح نحاس تابعی کا قول ہے کہ الصلوۃ الوسطیٰ سے مراد عصر ہے۔ کیوں کہ اس سے پہلے دن کی دو نمازیں ہیں، اور اس کے بعد رات کی دو نمازیں ہیں، **انها العصر ، لأن قبلها صلاتَی نهارٍ و بعدها صلاتَی لیلٍ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ۴/۲۱۰)**۔ نمازوں میں سے ایک نماز کو بیچ کی نماز، الصلوۃ الوسطیٰ کہنا لازمی طور پر نماز کے متعدد ہونے کو ثابت کرتا ہے اور آیت کے الفاظ کے مطابق جب اس تعدد کو متعین کیا جائے تو لازمی طور پر وہ پانچ کا عدد بنتا ہے۔ پانچ سے کم کا عدد لینے کی صورت میں آیت کی تشریح ممکن نہیں۔

نماز کی اصل اللہ کی یاد ہے۔ مگر اس کا نظام ایسی حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے نہایت جامعیت کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے ہیں ــــ نماز اتحاد اور اجتماعیت کا سبق ہے۔ وہ بندے کو اپنے رب سے جوڑتی ہے۔ وہ ہمارے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ وہ ہمارے اوقات کو منظم کرتی ہے۔ وہ ہلکی جسمانی ورزش کا فائدہ دیتی ہے۔ وہ بار بار ہماری صفائی کرتی رہتی ہے، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ہر قسم کی روحانی اور جسمانی برکتوں کا مجموعہ ہے۔ مسلمان اگر حقیقی شعور کے ساتھ نماز پر قائم ہو جائیں تو ان کی دنیا بدل جائے اور وہی ان کے تمام مسائل کے حل کے لئے کافی ہو جائے۔

پانچ نمازیں اہل ایمان کے لئے نظام الاوقات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس میں یہ سبق ہے کہ اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اپنے کاموں کو پانچ حصوں میں منظم کر لیں۔ یعنی کچھ کام فجر اور ظہر کے درمیان اور کچھ کام ظہر اور عصر کے درمیان اور کچھ کام عصر اور مغرب کے درمیان اور کچھ کام عشاء اور فجر کے درمیان۔

وضو کی برکت

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے وضو کیا۔ پھر بہتر طریقہ پر وضو کیا۔ اس سے اس کی خطائیں جاتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ ناخن کے نیچے کی بھی (من توضأ فاحسن الوضوءَ خرجت خطایاہُ حتی تخرج من تحتِ اظفارہ، رواہ مسلم)

بہتر وضو سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت دوسری روایتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص بھی وضو کرے۔ پھر وہ اس کو پوری طرح کرے۔ اس کے بعد وہ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، وہ جس دروازہ سے چاہے داخل ہو جائے (ما منکم من احد یتوضأ فیبلغ الوضوء ثم قال: اشهدُ اَن لَّآ اِلٰه الا اللّٰهُ وَحدَہ لا شریک لہ واشهدُ انّ محمداً عبدُہ ورسولُہ الا فُتِحت لہ ابواب الجنۃ الثمانیۃ یدخلُ من ایّھا شاء، رواہ مسلم)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرے تو اس کے بعد یہ دعا پڑھے کہ خدایا مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے بنا۔ اور مجھ کو پاک صاف لوگوں میں سے بنا (اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین، الترمذی) ایک اور روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اس کے بعد آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ خدایا مجھے خطاؤں سے پاک کر دے جس طرح سفید کپڑا دھو کر میل سے پاک کر دیا جاتا ہے (اللّٰھم نقّنی من الخطایا کما ینقّی الثوب الابیضُ من الدنس)

مختلف روایتوں میں یہ بات مختلف انداز سے بتائی گئی ہے کہ وضو سے آدمی کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ وضو اس کے گناہوں کے میل کو دھوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے

نماز

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اور کفر کے درمیان ترک صلاۃ ہے۔ (بین الرجل والکفر ترك الصلاة) حضرت عمر نے فرمایا کہ نماز دین کا کھمبا ہے۔ (الصلاۃ عماد الدین) نماز "اللہ اکبر" کے قول سے شروع ہوتی ہے اور "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کے قول پر ختم ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: تحریمها التكبير وتحليلها التسليم۔

نماز کی ابتدائی تیاری وضو سے شروع ہوتی ہے۔ وضو کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں جس کا وضو نہ ہو اور اس کا وضو نہیں جس نے اس پر اللہ کے نام کو یاد نہ کیا (لاصلاۃ لمن لا وضوء له ولا وضوء لمن لم يذكر اسم الله عليه) وضو حقیقۃً ایک قسم کی عملی دعا ہے۔ آدمی اپنے جسم کے کچھ نمائندہ حصوں کو دھوکر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے کہ اسی طرح تو اپنی رحمت کے پانی سے میرے پورے وجود کو پاک کردے، تو میرا تزکیہ کر کے مجھے جنت میں داخل کردے۔

مؤذن جب اذان کے کلمات کہتا ہے تو اس کے بارہ میں حکم ہے کہ تمام نمازی اس کو سن کر اسی طرح اپنی زبان سے دہرائیں۔ یہ دہرانا درحقیقت مؤذن کی پکار پر لبیک کہنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس دینی عمل کے لیے پوری طرح تیار ہے جس کی طرف اس کو بلایا گیا ہے۔

اس کے بعد آدمی اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کہہ کر نماز میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہ اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے کہ اس دنیا میں بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہے۔ پھر آدمی ادب سے کھڑا ہوتا ہے، وہ جھکتا ہے اور زمین پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔ یہ اس بات کا عملی اقرار ہے کہ خدا بڑا ہے، میں چھوٹا ہوں۔ میں آخری حد تک اس کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

آخر میں نمازی اپنے دائیں اور بائیں چہرہ پھیر کر کہتا ہے کہ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ اس طرح گویا وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کے لیے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبہ کا اظہار کرتا ہے۔ خدا کو گواہ بنا کر وہ عہد کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے گا کہ اس کی وجہ سے کسی کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، ہر ایک کی جان اور مال اور آبرو، ہر چیز اس سے محفوظ اور مامون رہے۔

نماز کی حقیقت

یہ عصر کی نماز تھی ۔ امام نے نماز پوری کر کے سلام پھیرا، تھوڑی دیر بیٹھے اور اس کے بعد دعا کر کے اٹھ گیے ۔ ایک مقتدی نے امام صاحب کو روکا ۔ اور تضحیک کے انداز میں بولے : "عصر کی نیت کی تھی یا ظہر کی ؟" یہ سن کر تمام نمازی ہنس پڑے جو پہلے ہی سے امام صاحب کو عجیب معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔

میں نے مذکورہ مقتدی سے پوچھا کہ کیا بات ہے ۔ انھوں نے جواب دیا کہ " عصر کے وقت تسبیح (فاطمہ) پڑھی جاتی ہے ۔ مگر امام صاحب نے تسبیح پڑھے بغیر دعا کر لی اور اٹھ گیے ۔" خیریت یہ ہے کہ امام صاحب نے کسی قسم کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ خاموشی کے ساتھ اپنے حجرہ میں چلے گیے ۔ اگر انھوں نے کوئی تیز جواب دیا ہوتا تو یقیناً بات بڑھتی اور زبانی تنقید باقاعدہ ہاتھاپائی میں تبدیل ہو جاتی ۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آج کل نماز کا کیا حال ہے ۔ وہ نماز کو صرف اس کے ڈھانچے کے اعتبار سے جانتے ہیں ۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ کچھ لوگ "مسنون" ڈھانچہ کو نماز سمجھے ہوئے ہیں اور کچھ لوگوں نے مبتدعانہ طور پر اس میں کچھ غیر مسنون چیزوں کا اضافہ کر لیا ہے ۔

نماز کا بلاشبہ ایک ڈھانچہ ہے ۔ مگر نماز کی اصل حقیقت اس کی اندرونی اسپرٹ ہے ، اور یہ اندرونی اسپرٹ خشوع ہے ۔ حتی کہ اگر کسی کی نماز میں ظاہری ڈھانچہ ہو مگر اس میں خشوع کی کیفیت نہ پائی جائے تو ایسی نماز حدیث کے مطابق نماز ہی نہیں (لاصلوٰۃ لمن لم یتخشع)

ڈھانچہ والی نماز اور خشوع والی نماز کی ایک پہچان یہ ہے کہ جو آدمی ڈھانچہ والی نماز پڑھے ، اس کی نظر دوسرے کی نماز پر ہوتی ہے ۔ اور جو آدمی خشوع والی نماز پڑھے اس کی نظر اپنی نماز پر ۔ پہلی قسم کا آدمی دوسروں کی نماز میں "ٹکنکل" خامی نکال کر ان کے خلاف تقریر کرے گا ۔ اور دوسری قسم کا آدمی خود اپنی نماز کی کمیوں کو سوچ کر چپ رہے گا ۔ وہ اپنے احتساب میں اتنا زیادہ مشغول ہوگا کہ اس کو یہ فرصت ہی نہ ہوگی کہ وہ دوسروں کی نماز پر تبصرہ کرے ۔

نماز اللہ کی یاد کا نام ہے ، اور اللہ کی یاد کسی آدمی کے اندر جو کیفیت پیدا کرتی ہے اسی کو خشوع کہا گیا ہے ۔

رب کے پاس اس حال میں پہنچتا ہے کہ وہ بالکل پاک صاف ہوتا ہے اور اس کو جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانی سے ہاتھ پاؤں کو دھونا اپنے آپ آدمی کو گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ خطا اور گناہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قلبی اعمال ہیں۔ ان کا تعلق آدمی کی نیت اور ارادہ سے ہے۔ اس لیے وہ اسی وقت دھل سکتے ہیں جب کہ آدمی کا قلب دھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی روایتیں اس انسان کے لیے ہیں جس کا جسمانی وضو اس کے لیے روحانی وضو بن جائے۔ جو وضو کا عمل اس طرح کرے کہ اسی کے ساتھ اس کا قلب اور ذہن بھی دھلتا چلا جائے۔ جس کی نفسیات اس کے وضو میں شامل ہو گئی ہو۔

ایک شخص جس کے دل میں اللہ کا خوف اور آخرت کا فکر سمایا ہوا ہو، وہ جب وضو کرتا ہے تو اس کے اندرونی احساسات کے اثر سے اس کا وضو کا عمل ایک ربانی عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا مادی عمل اس کی روحانی کیفیات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ وضو کے ظاہری عمل میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا ذہن دعا اور ذکر کے باطنی عمل میں۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا ـــــ جس ہاتھ اور پاؤں اور چہرے کو آپ نے آج کے دن پانی سے دھویا ہے، اس کو کل کے دن اپنی رحمت سے دھو دیجئے۔ جس جسم کو آپ نے دنیا میں مادی اعتبار سے پاک کیا ہے، اس کو قیامت کے دن اپنی رحمت اور مغفرت کے نورانی غسل سے پاک کر دیجئے۔

جب ظاہری وضو کے ساتھ یہ باطنی وضو مل جائے تو یہی وہ وضو ہے جس کے بعد آدمی کے لیے جنت کے سب دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم جس دروازہ سے چاہو داخل ہو جاؤ۔

جسمانی وضو جسم کی پاکی ہے، اور روحانی وضو روح کی پاکی۔

نماز میں خشوع

"نماز دراصل وہی ہے جو خشوع کی نماز ہو" ایک صاحب نے کہا "میں جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو بہت کوشش کرتا ہوں کہ خشوع کے ساتھ نماز پڑھوں۔ مگر میری نماز خشوع کی نماز نہیں بنتی"۔

جواب یہ ہے کہ خشوع کی نماز اس طرح کسی کو حاصل نہیں ہوتی کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑا ہو تو اپنے اوپر خشوع طاری کرنے کی کوشش کرے۔ نماز کا خشوع دراصل ایک مسلسل واقعہ کا وقتی ظہور ہے۔ آدمی جب نماز سے پہلے کی زندگی میں اللہ کے آگے اپنے کو جھکائے ہوئے ہو تو اس کا یہ جھکاؤ اس کی نماز میں مزید کیفیات کے ساتھ ابھر کر وہ چیز بن جاتا ہے جس کو خشوع کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آدمی کا حال یہ ہو کہ وہ نماز سے باہر غیر خاشعانہ زندگی گزار رہا ہو تو نماز میں وقتی طور پر وہ خاشع نہیں بن سکتا۔ ایک شخص ہے جس سے کسی کو محبت ہے تو اس محبت کرنے والے کے ساتھ ہی یہ واقعہ پیش آئے گا کہ اس کی یاد سے اس کا دل بھر آئے۔ اس کے برعکس جس کو اس شخص سے کوئی لگاؤ نہ ہو وہ وقتی تدبیر سے اس کی خاطر رونے والا نہیں بن سکتا۔

ایک شخص لوگوں کے درمیان تواضع کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص ڈھٹائی کا۔ ایک شخص معاملات میں انصاف کرتا ہے اور دوسرا بے انصافی سے پیش آتا ہے۔ ایک عاجزانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہے اور دوسرا متکبرانہ نفسیات کے ساتھ۔ ایک شخص اعتراف و تسلیم کو اپنا طریقہ بنائے ہوئے ہے اور دوسرا ہٹ دھرمی اور انکار کو، تو یہ ناممکن ہے کہ دونوں کی نمازیں یکساں قسم کی ہوں۔ ان میں صرف پہلا شخص ہے جس کی نماز خشوع کی نماز بنے گی۔ دوسرا شخص خواہ کتنا ہی چاہے یہ ناممکن ہے کہ وقتی طور پر ہاتھ باندھ کر اور قبلہ رو ہو کر وہ اپنی نماز کو خشوع کی نماز بنالے۔ خشوع کی نماز دراصل خاشعانہ زندگی کا ایک وقتی مظہر ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں خاشع نہ بنا ہو وہ کبھی خشوع کی نماز نہیں پڑھ سکتا۔

مجھے ایک بار معلوم ہوا کہ ایک محلہ کے دو مسلمانوں میں جھگڑا ہے۔ جھگڑا صرف شان کا تھا نہ کہ کسی واقعی مسئلہ کا۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ان میں سے ایک شخص کے پاس گیا جو حیثیت میں زیادہ بڑے تھے۔ ہم نے ان کی بنائی ہوئی شاندار مسجد میں مغرب کی نماز ادا کی۔ یہیں مسجد میں مذکورہ بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آئے۔ مگر جب ہم نے بتایا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ آپ سے درخواست کریں کہ آپ فلاں مسلمان سے اپنا جھگڑا ختم کر دیں تو اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ وہ کسی قیمت پر اپنے مسلمان بھائی کے آگے "جھکنے" پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی گفتگو سے ان کی جس نفسیات کا اندازہ ہو رہا تھا وہ یہ تھی کہ ——— میرے پاس پیسہ ہے۔ میرے ساتھ اعوان وانصار ہیں۔ میں نے ایک شاندار مسجد کھڑی کر کے جنت خرید لی ہے، پھر مجھے کسی کے آگے جھکنے کی کیا ضرورت ـ مگر یہی نفسیات سب سے زیادہ خشوع کی قاتل ہے جو شخص بندوں کے درمیان جھکی ہوئی زندگی گزار نہ رہا ہو وہ خدا کے سامنے بھی جھکنے والا نہیں بن سکتا۔ جو شخص اپنی صبح و شام کی زندگی میں خاشع نہ ہو وہ مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے بھی خشوع کا تجربہ نہیں کرسکتا۔

اللہ کے لئے جھکنے والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں جب حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے گا اور لوگ سجدہ کے لئے بلائے جائیں گے تو وہ لوگ سجدہ نہ کر سکیں گے جو اللہ کے سچے بندے نہ بنے تھے۔ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی اور ان پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ یہ حال ان لوگوں کا ہوگا جن کو دنیا میں سجدہ کے لئے بلایا جاتا تھا مگر وہ سجدہ نہ کرتے تھے (قلم ۴۳) قیامت میں انسان کو جو رسوائی اور عذاب ہوگا اس کی سب سے بھیانک صورت وہ ہوگی جب کہ مالک کائنات اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ وہ خدا جس نے ہم کو پیدا کیا، جس کے کھلانے سے ہم کھاتے ہیں اور جس کے چلانے سے ہم چلتے ہیں۔ جس نے ہم کو وہ سب کچھ دیا ہے جو ہمارے پاس ہے۔ ایسا عظیم اور محسن خدا بے پردہ انسان کے سامنے ہوگا۔ ایک طرف انسان ہوگا جس کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ دوسری طرف خدا ہوگا جس کے پاس ساری طاقتیں ہیں۔ انسان کا عجز اور خدا کی قدرت دونوں اپنی کامل صورت میں سامنے ہوں گی۔ اس وقت انسان چاہے گا کہ خدا کی عظمت و جلال کے آگے جھک جائے مگر وہ جھک نہ سکے گا۔ وہ چاہے گا کہ اس کی خدائی کے آگے اپنی بندگی کا اظہار کرے مگر وہ اس اظہار پر قادر نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اپنے آقا اور محسن کے لئے حمد کے کلمات ادا کرنے سے بھی اس کی زبان گونگی ہو جائے گی۔ ایک طرف اللہ کے سچے بندے اپنے رب کے آگے اپنے کو ڈال کر حقیقت کا اعتراف کر رہے ہوں گے۔ دوسری طرف وہ ذلت و رسوائی کا مجسمہ بنا ہوا کھڑا ہوگا۔ یہ ایسا ہولناک لمحہ ہوگا کہ انسان چاہے گا کہ کاش زمین پھٹ پڑے اور وہ اس کے اندر دھنس جائے۔ اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ بندہ اپنے خالق اور مالک کے سامنے ہو مگر وہ اس کے آگے اپنی بندگی کا اقرار نہ کر سکے۔ واضح ہو کہ یہ حال صرف معروف قسم کے کافروں یا بے نمازیوں کا نہ ہوگا بلکہ ان لوگوں کا بھی ہوگا جو محض ظاہری سجدہ کرتے تھے، ان کی روح اللہ کے لئے ساجد نہیں بنی تھی۔ جنھوں نے وہ سجدہ نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے۔ وہ ہمہ تن اس کے آگے جھک جائے۔ بخاری نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

یکشف ربنا عن ساقه فیسجد له کل مومن و مومنة ویبقی من کان یسجد فی الدنیا رياء وسمعة فیذهب لیسجد فیعود ظهره طبقا واحدا

(تفسیر ابن کثیر)

اللہ قیامت کے دن اپنے آپ کو ظاہر کرے گا۔ اس وقت مومن مرد اور عورتیں اللہ کے لئے سجدہ میں گر جائیں گے مگر جو شخص دنیا میں دکھانے اور سنانے کے لئے سجدہ کرتا تھا وہ سجدہ میں جانا چاہے گا مگر سجدہ نہ کر سکے گا۔ اس کی پیٹھ اکڑ جائے گی۔

زندگی میں بار بار وہ لمحہ آتا ہے جب کہ ایک طرف آدمی کی انا ہوتی ہے اور دوسری طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر جو شخص انانیت کا راستہ اختیار کرے اور اللہ کے حکم کے آگے نہ جھکے اس نے اللہ کو سجدہ نہیں کیا۔ اگر وہ متعین اوقات میں بظاہر سجدہ کر رہا ہو تب بھی حقیقت کے اعتبار سے وہ سجدہ نہ کرنے والوں میں شامل ہے۔ اس نے ایسا سجدہ کیا ہے جو دنیا میں دیکھنے اور سننے والوں کو تو سجدہ معلوم ہوتا ہے مگر اللہ کی نظر میں وہ سجدہ نہیں۔ ایسے تمام لوگ آخرت میں اس اصلی حالت میں نمایاں ہو جائیں گے جہاں وہ باعتبار حقیقت دنیا میں تھے۔ دنیا میں ان کے سامنے اللہ کا حکم آیا مگر انھوں نے اس کو نظر انداز کیا۔ دنیا

میں وہ وقت آیا جب کہ ان کو اللہ کے خوف سے جھک جانا چاہیے تھا مگر اس وقت انھوں نے سرکشی دکھائی۔ دنیا میں انھوں نے اس حق کا انکار کیا جو اللہ نے اپنی سنت کے تحت اپنے ایک بندے کی زبان پر جاری کیا تھا۔ وہ اپنے عزت و وقار اور اپنے دنیوی مفاد کو سنبھالنے میں مشغول رہے۔ ایسے لوگ گویا اسی دنیا میں سجدہ کے وقت سجدہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی یہی حالت آخرت میں کھل کر سامنے آجائے گی۔ دنیا میں ان کے دکھانے اور سنانے والے سجدے آخرت کے حقیقی عالم میں ان کے کسی کام نہ آئیں گے۔ آخرت میں اللہ کے آگے جھکنا کسی انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ اس اعلیٰ اعزاز کے حق دار وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہو کہ وہ اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔

عبادت خانہ میں آدمی اللہ کے سامنے جو "سجدہ" کرتا ہے وہ باعتبار ظاہر اقرار سجدہ ہے نہ کہ ثبوتِ سجدہ۔ آدمی عبادت کے وقت سجدہ کر کے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے آگے جھکنے والا ہے مگر اس اقرار کا ثبوت اس کو بندوں کے ساتھ معاملات میں دینا ہے۔ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں جب تک وہ "جھکنے" کا رویہ اختیار نہ کرے اس کا اقرار بے ثبوت رہتا ہے اور بے ثبوت اقرار کی کوئی قیمت اللہ کے یہاں نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اللہ وہ نہیں کہ مسلمانوں کو چھوڑ دے اس حالت پر جس پر کہ تم ہو جب تک وہ جدا نہ کر دے ناپاک کو پاک سے (آل عمران ۱۷۹) گویا ایمان قبول کر کے آدمی "نماز روزہ" کی جو عام زندگی اختیار کرتا ہے اسی سے اس کے لئے جنت کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ لازماً اس کو جانچا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا نماز روزہ حقیقی نماز روزہ ہے یا "دیکھنے اور سننے والا" نماز روزہ ہے۔ یہ جانچ کہاں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا خود سامنے نہیں آتا نہ خدا کے فرشتے کوئی قلب نما آلہ لے کر آسمان سے اترتے۔ یہ جانچ انسان اور انسان کے معاملات میں ہوتی ہے۔ آدمی نماز کے ذریعہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے جھک جانے والا ہے۔ روزہ کے ذریعہ وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کے ڈر سے اس کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دینے والا ہے۔ اس اقرار کا عملی امتحان انسانی تعلقات میں ہوتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک حق کا معاملہ آجاتا ہے۔ وہاں ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے۔ خواہ یہ جھکنا بظاہر ایک کمزور انسان کے آگے جھکنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔ ایسے موقع پر آدمی اگر جھک جائے تو گویا وہ اللہ کے آگے عملی طور پر جھک گیا۔ اس نے نماز میں کئے ہوئے اپنے اقرارِ سجدہ کو سچا ثابت کیا۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک حق کا معاملہ جو بظاہر کسی انسان کی نسبت سے پیش آیا ہے اس کو وہ محض انسان کا معاملہ سمجھ لے اور عزت و وقار کا خیال اس کو سرکشی پر آمادہ کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جانچ کے وقت وہ اللہ کے آگے نہیں جھکا، اس نے اپنے اقرارِ سجدہ کا عملی ثبوت نہیں دیا۔ اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان معاملات میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ جائز اور ناجائز کے مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ انسان سے معاملہ کرتے ہوئے اس کے لئے ایک رویہ ظلم کا رویہ ہوتا ہے اور دوسرا انصاف کا رویہ۔ ایسے موقع پر آدمی اگر خدا کے منع کئے ہوئے طریقہ سے رک جائے اور اپنے کو صحیح اور منصفانہ رویہ کا پابند بنائے تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ روزہ رکھ کر اس نے اطاعتِ الٰہی کا جو اقرار کیا تھا اس کو اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا۔ اس نے اپنے اقرارِ روزہ کا عملی ثبوت دے دیا۔ اس کے برعکس اگر معاملہ کے وقت اس پر مفاد اور مصلحت کا خیال غالب آجائے، وہ انصاف کے طریقے کو چھوڑ کر ظلم اور بے راہ روی کا طریقہ اپنا لے تو گویا اس نے خدا کی اطاعت نہیں کی۔ اس نے اپنے اقرارِ روزہ کا عملی ثبوت نہیں دیا۔

بندہ کو اپنے رب کے سامنے جو "سجدہ" کرنا ہے اس کے تین خاص مواقع ہیں۔ ایک موقع وہ ہے جس کو اعتراف حق کہا جاسکتا ہے۔ اللہ اپنے کسی بندے کی زبان سے جب حق کا اعلان کرائے تو لوگوں کے اوپر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس پر لبیک کہیں۔ وہ اپنے رب کی آواز کو پہچانیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو ان کی مثال اس بدقسمت بچہ کی ہوگی جو اپنے مہربان باپ کو دیکھنے کے لئے اندھا ہو جائے اور اس کی آواز کو سننے کے لئے اپنے کان کو بہرا کرلے۔ خدا کی آواز اگرچہ ایک انسان کی زبان سے بلند ہوتی ہے مگر وہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جس کی تصدیق سارے زمین وآسمان کر رہے ہوتے ہیں اور آدمی کی اپنی فطرت پوری طرح جس کا ساتھ دے رہی ہوتی ہے۔ ایسی آواز کے آگے نہ جھکنا اتنا بڑا انکارِ سجدہ ہے جس کے بعد ظاہری سجدوں کی کوئی قیمت نہیں۔ سجدہ کے جانچ کا دوسرا میدان اللہ کی راہ میں قربانی ہے۔ اللہ کو یہ مطلوب ہے کہ وقت کے تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کرکے اس کا دین لوگوں تک پہنچایا جائے۔ دین کی اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کا ممکن انتظام کیا جائے۔ کچھ مخالفین اگر خدا کے دین کو دبانا چاہیں تو اللہ کے وفادار بندے کھڑے ہو کر دین کی طرف سے دفاع کریں خواہ اس راہ میں ان کو اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑے۔ یہ دین کے لئے قربانی کے مواقع ہیں۔ جو لوگ ان مواقع پر اپنے جان ومال کو پیش کریں وہ جانچ میں پورے اترے اور جو لوگ اپنے جان ومال کو دین کی ضرورتوں میں نہ دیں وہ جانچ میں ناکام ہو گئے۔ "سجدہ" کے امتحان کا تیسرا میدان روزمرہ کے انسانی تعلقات ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان معاملہ کرتے ہوئے جب بھی ایسا ہو کہ دو قسم کا رویہ سامنے آجائے۔ ایک وہ ہو جس کا حکم اللہ نے دیا ہے، دوسرا وہ ہو جو اپنے جی کی خواہش کے مطابق ہے۔ اس وقت جو شخص اللہ کے حکم کے آگے جھک گیا وہ اللہ کے آگے سجدہ کرنے والا بنا اور جو شخص اپنے جی کی خواہش پر چلا اس نے گویا سجدہ سے انکار کردیا۔

نماز میں رکوع کے لئے جھکنا اور سجدہ کے لئے گر پڑنا اگر حقیقی معنوں میں جھکنا اور گر پڑنا ہو تو مسجد کا سجدہ اور مسجد کے باہر کا سجدہ ایک دوسرے سے الگ نہیں رہتے۔ بلکہ دونوں ایک ہی واقعہ کی دو مختلف صورتیں بن جاتی ہیں۔ اسی طرح روزہ میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑنا اگر سچے شعور اور جذبہ کے ساتھ ہو تو رمضان کے مہینے میں خدا کی ممنوعات کو چھوڑنا اور اس کے بعد زندگی کے معاملات میں خدا کی ممنوعات کو چھوڑنا دو الگ الگ چیزیں نہیں رہتیں۔ بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رخ بن جاتے ہیں۔ جو شخص اس طرح سجدہ کرنے والا اور اس طرح روزہ رکھنے والا بن جائے وہ اللہ کی یاد میں جینے لگتا ہے، وہ آخرت کی فضاؤں میں سانس لینے لگتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے اللہ کے داعی کو پہچان کر اس کا اعتراف کرلینا یا اللہ کے دین کے لئے قربانی دینا ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کسی شخص کا اپنے محبوب بیٹے کو پہچاننا اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردینا۔

آخرت کا دن سچائی کے اعتراف کا دن ہے، اس دن وہی لوگ سچائی کے اعتراف کی توفیق پائیں گے جنھوں نے دنیا میں سچائی کے اعتراف کا ثبوت دیا ہو۔ آخرت کا دن مالک کائنات کے آگے جھکنے کا دن ہے، اس دن وہی لوگ مالک کائنات کے آگے جھکنے کے اہل ہوں گے جو دنیا کے معاملات میں اس کے آگے جھکنے والے بنے ہوں۔ آخرت کا دن اللہ کی رحمتوں میں شامل ہونے کا دن ہے۔ اس دن وہی لوگ اللہ کی نعمتوں میں شامل ہوں گے جنھوں نے اس وقت اللہ کی پکار پر لبیک کہا ہو جب کہ اللہ ابھی پردۂ غیب میں ہے۔ آخرت کا دن وہ دن ہے جب کہ اللہ اپنی تمام نعمتیں اپنے بندوں پر انڈیل دے گا، ایسے انعام میں حصہ پانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے دنیا میں اپنے تمام اثاثہ کو اللہ کی راہ میں قربان کردیا ہو۔

نماز باجماعت

عن عبدِاللہ بن عمرَ أنَّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: صلاۃ الجماعۃ تفضُلُ صلاۃَ الفذِّ بسبع وعشرین درجۃً

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جماعت کے ساتھ نماز تنہا نماز کے مقابلہ میں ۲۷ درجہ افضل ہے۔

(موطا الامام مالک ۹۳)

نماز کی مطلوب کیفیات جماعت کی نماز میں بڑھ جاتی ہیں۔ اس لئے اس کا ثواب بھی اللہ کے یہاں تنہا نماز کے مقابلہ میں زیادہ ہوجاتا ہے۔

جماعت کی نماز کے لئے آدمی کو پہلے سے سوچنا پڑتا ہے کہ اب وقت آگیا ہے۔ اب مجھ کو مسجد چلنا چاہئے۔ اس طرح نمازی کا ذہن پیشگی طور پر عبادت کی سوچ میں لگ جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ ہر قدم اس کو یاد دلاتا ہے کہ تم خدا کی عبادت کے لئے جارہے ہو۔ اس طرح گویا وہ نماز سے پہلے نماز میں مشغول ہوجاتا ہے۔

مسجد میں اس کو نماز کا پورا ماحول ملتا ہے۔ یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ میں اکیلا نمازی نہیں ہوں بلکہ میں ایک وسیع نمازی برادری میں شامل ہوں۔ پہلے اس کی حیثیت اگر صرف نماز پڑھنے والے کی تھی تو اب اس کی حیثیت نماز قائم کرنے والے کی بن جاتی ہے۔

پھر جماعت کی نماز خود اپنے اندر عظیم ثواب رکھتی ہے۔ اکیلے کی نماز میں گویا کہ وہ اپنا امام آپ تھا۔ یہاں اس نے دوسرے کی امامت میں نماز ادا کرکے مزید تواضع اور خشوع کا ثبوت دیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اپنے انفرادی اسلام کا احساس تازہ کیا تھا۔ جماعت کی نماز میں اس نے دوسرے ہم مذہبوں کے ساتھ اجتماعی اسلام کا زندہ تجربہ کیا۔ اکیلے کی نماز میں اس نے ایک فرد کی سطح پر فیضان خداوندی کو پایا تھا، جماعت کی نماز میں وہ پورے مجموعہ پر اترنے والے فیضان خداوندی میں شریک ہوگیا۔

اسی کے ساتھ جماعت کی نماز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آدمی مسجد کے مقدس ماحول میں اپنے دوسرے بھائیوں سے جڑ جاتا ہے۔ وہ ان سے سیکھتا بھی ہے اور ان کو سکھاتا بھی ہے۔ وہ ان سے پاتا بھی ہے اور انہیں بھی ہے۔ اکیلے کی نماز میں اس نے اگر صرف نماز ادا کی تھی تو جماعت کی نماز میں وہ پورے اسلام کو ادا کرنے والا بن جاتا۔

مسجد اور نماز

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری امت پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ مسجدوں پر فخر کریں گے مگر اس کو (ذکر و نماز سے) بہت کم آباد کریں گے (یأتی علی امتی زمان یتباھون بالمساجد ثم لا یعمرونھا الا قلیلا) فتح الباری ۱/۶۴۲

حضرت انسؓ سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ لوگ مسجدوں پر فخر کرنے لگیں (لا تقومُ الساعة حتی یتباھی الناسُ فی المساجد) سنن ابی داؤد ۱/۱۲۰

اس طرح کی روایتیں دراصل دور زوال کے مظاہر کو بتاتی ہیں۔ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ روح ختم ہو جاتی ہے، اور ظاہری چیزوں کی دھوم بڑھ جاتی ہے۔ ایسے زمانہ میں لوگ مسجدوں کی کثرت کا پرجوش طور پر چرچا کرتے ہیں۔ وہ مسجد کی شاندار تعمیرات پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اپنی قومی عظمت کو مساجد کے در و دیوار میں نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے زمانہ میں لوگ صرف ظاہر کو جانتے ہیں، اس لیے ان کے پاس عمارتی عظمت کے سوا کوئی اور عظمت نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے کو برتر محسوس کر سکیں۔

مگر جب لوگوں میں دین کی روح زندہ ہو تو ان کی نظر میں در و دیوار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ معمولی طور پر بنی ہوئی مسجدوں میں نماز پڑھ کر ان کو اور زیادہ سکون ملتا ہے۔ ان کو ایسی مسجدیں پسند آتی ہیں جہاں روشنیوں کا انتظام نہ ہو، کیوں کہ وہاں توجہ الی اللہ میں ان کے لیے کوئی چیز حارج نہیں ہوتی۔ نرم قالینوں پر سجدہ کرنے کے بجائے انھیں مٹی کے فرش پر اپنی پیشانی رکھنا زیادہ محبوب ہوتا ہے، کیوں کہ یہ ان کے عاجزانہ سجدہ کے زیادہ حسب حال ہوتا ہے۔

در و دیوار کی عظمتیں ان لوگوں کے لیے خلل اندازی کا باعث ہونے لگتی ہیں جو اللہ کی عظمت و کبریائی میں کچھ لمحات گزارنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے اور ان کے رب کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو، اس لیے وہ سادہ مسجدوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں نہ کہ چمک دمک والی مسجدوں کو۔

تہجد کی حقیقت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ: ومن الليل فتهجد به نافلة لك. یعنی رات کو تہجد پڑھو، یہ نفل ہے تمہارے لئے (الاسراء ۷۹) عربی زبان میں نافلہ کے معنی زائد کے ہوتے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ نافلۃ وہ ہے جو اصل سے زائد ہو (والنافلة ما كان زيادة على الاصل) لسان العرب ۱۱/۶۷۱

اس اعتبار سے نافلۃ لک کا مطلب ہوگا زائدۃ لک۔ یعنی تہجد کی نماز تمہارے لئے پانچ نمازوں پر زائد ہے۔ روزانہ پانچ وقت کی نمازیں فرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے پانچ نمازوں کو اپنے بندوں کے اوپر فرض قرار دیا ہے (خمس صلوات فرضهن الله على العباد) اور تہجد کی نماز کی حیثیت زائد نماز کی ہے۔

یہ انسان کی ایک فطری خواہش ہے کہ جس سے اس کو قلبی لگاؤ ہو اس کے معاملہ میں وہ مقرر فرائض سے بڑھ کر کچھ کرنا چاہتا ہے۔ تہجد کی نماز بندہ کی اسی خواہش کی تکمیل کے لئے ہے۔ عمومی طور پر اس صلاۃ زائد کا بہترین وقت رات کا آخری پہر ہے۔ اس وقت آدمی ایک نیند لیکر تروتازہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے ان پرسکون لمحات کو کچھ دیر کے لئے خدا کی یاد میں گزارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ فجر سے پہلے چند رکعت نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

مگر بعض انسانوں کے احوال کے اعتبار سے اس صلاۃ زائد کے لئے دوسرے اوقات بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص رات کو دیر میں سویا۔ اس کی نیند دیر میں کھلی۔ اس نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ اب وہ اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرنے لگا۔ ایسے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی صلاۃ زائد کو اپنے ان پرسکون لمحات میں ادا کرے۔

زائد کا یہ اصول ہر معاملہ میں ہے۔ تجدید کلمہ گویا شہادت زائد ہے۔ تہجد اسی طرح صلاۃ زائد ہے۔ نفل روزہ صوم زائد ہے۔ انفاق عام کی حیثیت زکاۃ زائد کی ہے۔ عمرہ گویا حج زائد ہے۔ یہی معاملہ تمام اسلامی اخلاق اور اسلامی اعمال کا ہے۔

عمل زائد میں ایک خاص لذت ہے جو عمل زائد ہی میں ملتی ہے۔ کسی اور طرح اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

قیادت کی تربیت

ایک مشہور مسلم شاعر کا نسانہ کے بارہ میں دو شعر یہ ہے:

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے اس کو کیا جانے یہ بیچارے دو رکعت کے امام
لاکو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ بات موجودہ دور زوال کی نمازوں کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ اصل نماز اگر اپنی روح کے ساتھ زندہ ہو تو خود مذکورہ شاعر کے مطابق، وہ ایک عظیم انقلابی چیز بن جائے گی:

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

حقیقت یہ ہے کہ نماز پوری زندگی کے لئے ایک تربیت ہے۔ نماز ایک اعتبار سے مسجد کا ایک وقتی عمل ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایسا انقلاب انگیز عمل ہے جو انسانی زندگی میں ہمہ گیر نتائج پیدا کرنے والا ہے۔

نماز کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق امامت سے ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز کا وقت آئے تو تم میں سے ایک شخص اذان دے اور تم میں سے جو آدمی سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرے (واذا حضرتِ الصلاۃ فلیؤذن لکم احدکم ولیؤمکم اکبرکم) ایک اور روایت میں ہے کہ یؤم القوم اقرؤھم لکتاب اللہ) فتح الباری ۲/ ۲۰۰

اکبر اور اقرأ (زیادہ علم والا) دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسے شخص کی امامت پر راضی ہو جایا کریں جو ان کے درمیان زیادہ پختہ کار اور زیادہ واقف کار ہو۔ جو آدمی علم اور عمر میں بڑا ہوگا۔ اس کے اندر لازماً یہ صفتیں دوسروں سے زیادہ پائی جائیں گی۔

اس طرح مسجد میں یہ تربیت دی جاتی ہے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمان کس طرح رہیں۔ وہ اس طرح رہیں کہ جب بھی کوئی اجتماعی معاملہ ہو تو پختگی اور واقفیت میں جو لوگ کم ہوں وہ اپنے کو پیچھے کرلیں اور جو آدمی پختگی اور واقفیت میں زیادہ ہے اس کو اپنا قائد بنانے پر راضی ہو جائیں۔

دعاء

دعا کا تصور عام لوگوں کے ذہن میں تقریباً وہی ہے جو عاملین کے یہاں پر اسرار کلمات کا ہوتا ہے۔ عامل یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں الفاظ کسی خاص ترتیب یا خاص تعداد میں زبان سے ادا کر دیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ فلاں صورت میں برآمد ہوگا۔ اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ دعا الفاظ کے کسی مجموعہ کا نام ہے جس میں خاص تاثیرات چھپی ہوئی ہیں۔ اگر آدمی دعا کے ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر دے تو اس کے نتیجہ میں وہ تمام تاثیرات لازماً ظاہر ہونا شروع ہو جائیں گی۔

مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ دعا اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی خاص قسم کے لفظی مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جو احساس احتیاج کے تحت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور پھر لفظوں کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔

قرآن میں بہت سے انبیاء اور صلحاء کی دعائیں مذکور ہیں (مثلاً حضرت موسیٰ کی دعا، اصحاب کہف کی دعا، امرأۃ فرعون کی دعا) یہ ثابت ہے کہ ان لوگوں کی زبان عربی نہیں تھی۔ انبیاء کے متعلق قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ وہ مختلف علاقوں میں آئے اور وہ جہاں آئے وہیں کی مقامی زبان میں کلام کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی دعا ان کی اپنی مادری زبان (مقامی زبان) میں ہوتی تھی نہ کہ عربی زبان میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ان کی دعا صرف معناً مذکور ہے نہ کہ لفظاً۔

اسی طرح حدیث میں بہت سے انبیاء کی دعائیں مذکور ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی یہ دعا جو انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو سکھائی:

> اللّٰهم فارجَ الهَم و كاشفَ الغمّ و مجيبَ دعوةِ المضطرّين رحمٰنَ الدنيا و الآخرة رحيمَهما انت ترحمني فارحمني برحمةٍ تُغْنني بها عن رحمةِ مَنْ سواك (رواه البزار والحاكم والاصبهاني)

اے اللہ، مصیبت کو ہٹانے والے اور غم کو دور کرنے والے اور مجبور کی پکار کو سننے والے، دنیا اور آخرت کے رحمان اور رحیم، تو ہی دونوں کا رحمان ورحیم ہے پس تو مجھ پر ایسی رحمت فرما جو مجھے تیرے سوا دوسروں سے مستغنی کر دے۔

ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کی زبان عربی نہیں تھی اس لئے یقینی طور پر یہ دعا انھوں نے اس زبان میں بتائی جو ان کی اور حواریوں کی پیدائشی زبان تھی۔ حدیث میں یہ دعا اگرچہ عربی زبان میں نقل ہوئی ہے مگر یہ نقل بالمعنی ہے نہ کہ نقل بالالفاظ۔

دعا کب قبول ہوتی ہے

قرآن میں مختلف مقامات پر دعا کی حقیقت بتائی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ انہ لا یحب المعتدین ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا وادعوہ خوفا وطمعا ان رحمت اللہ قریب من المحسنین (اعراف ۵۶-۵۵)

پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ پسند نہیں کرتا حد سے نکل جانے والوں کو۔ اور مت خرابی پھیلاؤ زمین میں اس کی درستی کے بعد۔ اور پکارو اس کو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے۔ یقیناً اللہ کی رحمت قریب ہے نیکی کرنے والوں سے۔

اس موقع پر احسان کا مطلب ہے دعا کے موافق عمل کرنا۔ دوسری جگہ یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی مسلمین حم سجدہ ۳۳

اور کون شخص ہے بہتر بات میں اس شخص سے کہ پکارے اللہ کی طرف اور صالح عمل کرے اور کہے کہ میں حکم بردار ہوں

دعا کیا ہے۔ بندے کا اعترافِ عجز اپنے رب کے سامنے۔ جب ایک شخص اللہ پر اس حد تک یقین اور بھروسہ کر لیتا ہے کہ اس کی ساری امیدیں بس ایک اللہ سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور سے نہ اس کو پانے کی امید ہوتی ہے اور نہ چھننے کا اندیشہ۔ اس وقت اس کی زبان سے جو بیتابانہ کلمات نکل پڑتے ہیں، اسی کا نام دعا ہے بندہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ کی سپردگی میں دے دیتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ میرے رب! مجھے اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔ تیرے سوا کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔ تیرے سوا کوئی کسی کو سایہ نہیں دے سکتا۔

دعا کے یہ الفاظ اللہ کی نظر میں اسی وقت دعا ہیں جب کہ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) سے اس کی تصدیق ہو رہی ہو۔ آدمی اپنے رب سے اپنے لئے جس رحمت اور عفو و درگزر کا طالب ہے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ رحمت اور عفو و درگزر کا وہی طریقہ اختیار کرنا زمین کی اصلاح ہے۔ اور جب ایسا ہو کہ آدمی اپنے لئے تو رحمت اور عفو و درگزر کا امیدوار ہو اور خود دوسرے انسانوں کے ساتھ سرکشی اور بے پروائی کا طریقہ اختیار کرے تو اس کا نام زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ اللہ کے سامنے حد بندگی میں ہونے کا اقرار کرنا اور دنیا کی زندگی میں جب دوسرے انسانوں سے عملی سابقہ پیش آئے تو حد بندگی سے نکل جانا ایسا تضاد ہے جو ایک طرف زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے اور دوسری طرف آدمی کی دعا کو اللہ کی نظر میں بالکل بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی اپنی دعا کو اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مگر اس بات کا ثبوت اس کو انسانی تعلقات ہی میں دینا ہے کہ وہ اپنی دعا میں محسن ہے یا نہیں۔ جو شخص انسانی تعلقات میں اپنی دعائیہ حیثیت کو بھول جائے اس کی مثال ایسے آدمی کی ہے جس نے زبان سے بڑے بڑے دعوے کئے مگر جب اس کا امتحان لیا گیا تو وہ صفر سے زیادہ نمبر حاصل نہ کر سکا۔

آپ اپنے رب سے امید وار ہیں کہ وہ آپ کی کوتاہیوں کو نہ دیکھے بلکہ اپنی شان کریمی کے تحت آپ سے معاملہ فرمائے۔ اگر آپ فی الواقع اس پکار میں سچے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دنیا کی زندگی میں جب آپ کا معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے اوپر آپ قابو یافتہ ہوں تو آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی بے بسی یاد آجائے اور آپ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کریں۔ آپ کو اللہ کے عذاب کا ڈر ہے۔ آپ اس کی پکڑ سے بچنے کے لئے اس سے دعا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ جب کوئی انسان آپ کی گرفت میں آجائے تو آپ اس کے ساتھ غصہ اور انتقام کے تحت کارروائی نہ کریں بلکہ فیاضی اور حسن سلوک کے ساتھ معاملہ کرکے اللہ سے کہیں کہ خدایا تو بھی مجھ سے فیاضی کا معاملہ فرما۔ آپ اللہ کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنی عاجزی کا اعتراف کر رہے ہیں، اس اعتراف میں آپ اس وقت سنجیدہ ہیں جب کہ آپ کا یہ حال ہو کہ آپ ایک انسان پر قدرت پالیں اور اس پر اپنی کبریائی کا مظاہرہ کر سکتے ہوں مگر اس وقت آپ کو اللہ کے مقابلہ میں اپنی عاجزانہ حیثیت یاد آجائے اور آپ اپنے رب سے یہ کہتے ہوئے اس شخص کو چھوڑ دیں کہ خدایا میں نے اس سے درگزر کیا تو بھی مجھ سے درگزر فرما۔"

اس کے برعکس اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ اللہ کے سامنے عاجزی کے کلمات دہرائیں اور اس کے بعد بندوں کے ساتھ گھمنڈ اور سرکشی کا طریقہ اختیار کریں۔ اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں اور اپنے بھائی کی خطائیں معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اللہ سے امید وار ہوں کہ وہ آپ کی حاجتیں پوری کرے اور آپ کا سابقہ جب کسی دوسرے محتاج انسان سے پڑے تو اس کی حاجت پوری کرنے کا کوئی جذبہ آپ کے اندر نہ ابھرے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دعا کے ساتھ عمل صالح (دعا کے موافق عمل) نہیں کر رہے ہیں۔ آپ اپنی دعا میں مخلص نہیں ہیں۔ ایسی دعا کی اللہ کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ ایسی دعا حقیقۃً دعا نہیں بلکہ سوانگ ہے اور سوانگ کسی شخص کو سزا کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام کا۔

دعا کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ برکت والے الفاظ ہیں، ان کو رٹ کر صحتِ ادا کے ساتھ دہرا دو اور پھر ان کے جادوئی اثرات ظاہر ہونے لگیں گے۔ خدا اور بندے کا معاملہ اس قسم کا مشینی معاملہ نہیں ہے۔ خدا الفاظ کو نہیں خود آپ کی ہستی کو دیکھتا ہے۔ خدا کو وہ کلمات درکار ہیں جو آدمی کی اپنی پکار بن کر نکلے ہوں۔ جو اس واقعہ کا ایک فطری اظہار ہوں کہ بندہ صرف ایک اللہ سے ڈرتا ہے اور صرف اسی سے امید رکھتا ہے۔ اس کے احساسات اپنے رب سے اس طرح وابستہ ہو گئے ہیں کہ ہر آن وہ اس سے مصروفِ کلام رہتا ہے، کبھی دل سے اور کبھی زبان سے۔ دعا دراصل پگھلے ہوئے دل کا بیتابانہ طور پر باہر نکل آنا ہے۔ جب کوئی بندہ اس معنی میں دعا کرنے والا بن جائے تو اس کا پورا وجود دعا میں ڈھل جاتا ہے۔ دعا کے الفاظ اور اس کی ہستی الگ الگ نہیں رہتے۔ وہ اندر سے بھی وہی ہوتا ہے جو بظاہر دعا میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی دعا جس طرح خدا کے سامنے اس کے سوال کا مظہر ہوتی ہے اسی طرح وہ بندوں کے مقابلہ میں اس کے کردار کو بتاتی ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت ہے جو خدا کے سامنے تضرع کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور بندوں کے مقابلہ میں تواضع اور عدم استکبار کی صورت میں۔

رمضان کا روزہ

دہلی کے ایک مسلمان تاجر جناب محمد عثمان صاحب سے ۲۹ نومبر ۱۹۹۲ کو ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ روزہ ہر قسم کی ایمرجنسی کا سامنا کرنے کی تربیت ہے۔ روزہ کی اس تشریح کی تصدیق ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر کے اصل معنی ہیں رک جانا۔ صبر کا لفظ جزع کا نقیض ہے۔ الجوہری نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے جزع کے وقت اپنے آپ کو تھامنا (الصبر حبس النفس عند الجزع)

زندگی میں ہمیشہ خلافِ مزاج باتیں پیش آتی ہیں۔ زندگی نام ہے ناموافق باتوں کا سامنا کرتے ہوئے سفر حیات طے کرنے کا۔ جو آدمی جتنا زیادہ بامقصد اور جتنا زیادہ بااصول ہوتا اتنا ہی زیادہ اس کو اپنی پسند کے خلاف چیزوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس صفت کی ضرورت دنیوی معاملات میں بھی پیش آتی ہے اور دینی معاملات میں بھی۔ روزہ اسی قسم کی صابرانہ زندگی کی تربیت ہے۔ روزہ میں آدمی کے معمولات ٹوٹتے ہیں۔ وقت پر کھانا اور وقت پر سونا اس کو میسر نہیں آتا۔ مسلسل ایک مہینہ تک اس کو بھوک، پیاس، بے خوابی جیسے تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ طبیعت کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے اس کے اندر جھنجلاہٹ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مگر اس پر بھی اس کو صبر کرلینا پڑتا ہے۔

برداشت کی اس زندگی کو خود اپنے ارادہ سے اختیار کرنے کا نام روزہ ہے۔ لوگ مجبورانہ صبر کرتے ہیں، روزہ دار اختیارانہ صبر کرتا ہے۔ جن چیزوں کو لوگ دباؤ کے تحت چھوڑتے ہیں، روزہ دار ان چیزوں کو اصول کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ جس صابرانہ روش کو لوگ ذاتی مفاد کے لیے اختیار کرتے ہیں، اس صابرانہ روش کو روزہ دار خدا کی مرضی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کا صبر اگر اپنی ذات کے لیے ہے تو مومن کا صبر خداوند ذو الجلال کے لیے۔ روزہ ایک بے روح رسم نہیں، وہ ایک زندہ تربیت ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں جو آدمی اس کورس کو صحیح طور پر مکمل کرلے وہ اس کے بعد پورے سال کے لیے ایک ایسا انسان بن جائے گا جو ہنگامی حالات میں بھی معتدل زندگی گزارے، جو بے صبری کے مواقع پر بھی صابر انسان بنا رہے۔

روزہ کا مقصد آدمی کی روحانیت کو جگانا اور اس کو ربّانی انسان بنانا ہے۔

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ۔۔۔ تم لوگ ربانی بنو(آل عمران ۷۹) اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رب والے یا اللہ والے بن کر زندگی گذارو۔ خود پرستی کی زندگی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی زندگی اختیار کرو۔

دنیا میں زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اپنی خواہشوں کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ اور دوسرا ہے خدا کی مرضی کے زیر اثر زندگی گذارنا۔ ربانی انسان وہ ہے جو خدا کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اسی کی یاد میں جیئے۔ وہ ہر معاملہ میں خدا کی مرضی کو جاننے کی کوشش کرے اور جو خدا کی مرضی ہو اس پر اپنی زندگی کو ڈھال لے۔ اس کے برعکس غیر ربانی انسان وہ ہے جو اپنے آپ میں جیتا ہو۔ جس کے لئے اس کی خواہشیں ہی سب کچھ ہوں۔ جو اپنی خواہشوں کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہو۔

رمضان کے مہینے کا روزہ کسی آدمی کو ربانی انسان بنانے کی تربیت ہے۔ روزہ آدمی کی ذاتی خواہشوں پر پابندی لگاتا ہے۔ روزہ یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی ذات کے لئے جینے کے بجائے خدا کے لئے جیو۔ اپنی خواہشوں کو سب کچھ سمجھنے کے بجائے صرف خدا کو اپنا سب کچھ بنالو۔

روزہ آدمی کو ربانی انسان بنانے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دنیا اور آخرت کی کامیابیاں مقدر کی گئی ہیں۔

روزہ کیا ہے .....

روزہ اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے

نظم یا ڈسپلن ہر معاملہ میں کامیابی کے لئے ضروری ہے، خواہ وہ دنیا کا معاملہ ہو یا دین کا معاملہ۔ نظم یا ڈسپلن صحتِ کار کی ضمانت ہے۔ کسی کام کی بخوبی ادائیگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام میں نماز کو مقرر اوقات میں فرض کیا گیا ہے۔ روزہ اور دوسری عبادات بھی مقرر تاریخوں میں اور مقرر وقت پر ادا کی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ تمام دینی اعمال کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظم اور ڈسپلن کے بغیر کوئی بھی اسلامی عمل صحیح طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا۔

روزہ نظم اور ڈسپلن کی اسی اسپرٹ کو پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ رمضان کا پورا مہینہ روزہ دار کو سخت ڈسپلن کے تحت گذارنا ہوتا ہے۔ سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، غرض ہر مشغولیت کو ایک سخت قسم کے نظام الاوقات کے تحت انجام دینا ہوتا ہے۔ اس طرح کی ایک منظّم زندگی پورے مہینہ تک جاری رہتی ہے۔ اس طرح کی ایک ماہانہ زندگی آدمی کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سال کے بقیہ مہینوں میں بھی نظم اور ڈسپلن کے تحت زندگی گذارے۔

روزہ ایک مومن کے لئے اخلاقی ڈسپلن کی سالانہ تربیت ہے۔ روزہ آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ ایک بااصول انسان بنا ہوا ہو۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے کنٹرول میں دیئے ہوئے ہو۔

روزہ خود انضباطی (سلف کنٹرول) کی مشق ہے۔ وہ ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کی ایک سالانہ تربیت ہے۔

فاقہ نہیں

۲۵ جنوری ۱۹۹۷ کو دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں روزہ پر ایک اجتماع تھا۔ اس موقع پر جناب سید حامد صاحب نے کہا کہ ایک بار دہلی میں ایک جلسہ تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی موجود تھے۔ اس موقع پر ایک تقریر ڈاکٹر تارا چند کی بھی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ سال کا پورا ایک مہینہ روزہ میں بتانے کا جو طریقہ مسلمانوں میں ہے اس کے بارہ میں مسلمانوں کو نظرثانی کرنا چاہیے۔ یہ اپنی کارکردگی کو گھٹانے کے ہم معنی ہے۔ یہ طریقہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ ہے۔

میں نے اپنی تقریر میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک غیر معقول اعتراض ہے۔ علمی حیثیت سے اس کے اندر کوئی وزن نہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ روزہ کوئی فاقہ کشی (starvation) نہیں ہے۔ روزہ دار ایک مہینہ کے دوران صرف یہ کرتا ہے کہ وہ دن میں نہ کھا کر رات کو کھاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض فرقے ایسے ہیں جو ۲۴ گھنٹہ میں صرف ایک بار کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ہر قسم کی ترقیاں حاصل کی ہیں۔ پھر ایک مہینہ کے لیے دن کے بجائے رات کو کھانا کیوں کر ترقی میں رکاوٹ بن جائے گا۔

روزہ دراصل اپنی غذائی عادتوں (food habits) پر کنٹرول کرنے کا نام ہے۔ اس کو ایک لفظ میں غذائی تنظیم (regulated eating) کہہ سکتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ جسمانی صحت کے لیے بہترین طریقہ ہے۔ منظم انداز میں خوراک لینے والے ہمیشہ صحت مند رہتے ہیں اور زیادہ کام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس غیر منظم خوراک لینے والے لوگ اپنی صحت کو خراب کر لیتے ہیں اور نتیجۃً اپنی کارکردگی کی مقدار کو بھی گھٹا لیتے ہیں۔

ماہ رمضان کے روزہ کا مطلب شاید مذکورہ قسم کے لوگ یہ لے لیتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایک مہینہ تک مسلسل کھانا اور پینا چھوڑ کر فاقہ کی زندگی گزاریں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ اسلامی حکم کا مطلب صرف یہ ہے کہ عام حالت میں اگر لوگ دن کو کھاتے ہیں اور رات کو نہیں کھاتے

تو رمضان میں ایک مہینہ کے لیے وہ اس ترتیب کو بدل دیں۔ یعنی دن میں نہ کھا کر رات کے اوقات میں کھائیں۔ روٹین میں اس قسم کی تبدیلی جسمانی اعتبار سے بھی مفید ہے اور روحانی اعتبار سے بھی۔

ماہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں یہ اصولی اور نظریاتی بات تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اصولی اور نظریاتی اعتبار سے ماہ رمضان کے روزہ کے بارہ میں مذکورہ قسم کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کے حق میں کوئی واقعی دلیل موجود نہیں۔

مگر یہ صرف اصول اور نظریے کی بات نہیں۔ عملی واقعات بھی اس کو بالکل بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔ عملی واقعات سے میری مراد (روزہ داروں) کی تاریخ ہے۔ مسلمان پچھلے چودہ سو سال سے سال میں ایک مہینہ روزہ رکھتے چلے آرہے ہیں۔ مگر تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ اس روزہ نے کسی بھی درجہ میں ان کو کمزور نہیں کیا۔

اسلام کے دور اول میں اصحاب رسولؐ کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی۔ یہ سب کے سب روزہ دار تھے، مگر انھوں نے تاریخ کا اہم ترین انقلاب برپا کیا۔ یہ اصحاب رسولؐ روزہ دار قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں عرب قبائل، رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر سب کے سب غیر روزہ دار لوگ تھے۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ پیش آیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ غیر روزہ داروں کے اوپر روزہ دار قوم نے کھلی فتح حاصل کی۔

اس کے بعد روزہ دار مسلمانوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، اور وقت کی سب سے بڑی سلطنت قائم کی۔ ایک شاعر نے بجا طور پر کہا ہے کہ:

نہ تھا پلّہ کسی ملّت کا دنیا میں گراں ہم سے

پھر یہی روزہ دار لوگ تھے جنھوں نے بغداد میں اس وقت کا سب سے بڑا علمی مرکز قائم کیا۔ انھوں نے اسپین میں وہ علمی ترقیاں کیں جو بعد کو یورپ کے سائنسی انقلاب کی بنیاد بنی۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ آدمی کو کمزور نہیں کرتا۔ روزہ آدمی کو ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے طاقت ور بناتا ہے۔ نظریاتی مطالعہ بھی اس کی تصدیق کر رہا ہے اور تاریخ کا عملی مطالعہ بھی۔

شکر گزاری

روزہ کا مہینہ روحانی تزکیہ کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ خدا سے قریب ہونے کا مہینہ ہے۔ روزہ کا مہینہ ان صفات کی تربیت کا خصوصی مہینہ ہے جو کہ اسلام میں مطلوب ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں روزہ (فاسٹنگ) کے باب کے تحت درج ہے کہ اسلام میں رمضان کے مہینہ کو توبہ کے مہینہ کے طور پر منایا جاتا ہے اور صبح سے شام تک مکمل فاقہ کیا جاتا ہے:

The month of Ramadan in Islam is observed as a period of penitence and total fasting from dawn to dusk. (IV/62)

توبہ بلاشبہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ حتی کہ پیغمبر اسلام کو حدیث میں نبی التوبہ کہا گیا ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/ ۱۰۵) توبہ اسلام کے پورے نظام سے اتنا زیادہ جڑا ہوا ہے کہ روزہ سمیت، کوئی بھی اسلامی عمل اس کی روح سے خالی نہیں۔

تاہم قرآن میں روزہ کا حکم دیتے ہوئے اس کی جو خاص حکمت بتائی گئی ہے، وہ شکر اور تقویٰ ہے۔ قرآن کے مطابق، رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر شکر اور تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو۔ (البقرہ)

قرآن کا ابتدائی نزول رمضان کے مہینہ میں ہوا۔ اس بنا پر وہ اہل ایمان کے لئے شکر گزاری کا مہینہ قرار پایا۔ کیوں کہ یہ اللہ کی عظیم نعمت ہے کہ اس نے قرآن کی شکل میں وہ ہدایت نامہ اتارا جو انسان کے لئے سچا رہنما بن سکے۔

تقویٰ سے مراد محتاط زندگی ہے۔ انسان کے لئے دونوں جہان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں ہمیشہ احتیاط والا طریقہ اختیار کرے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے، اور روزہ کے ذریعہ لوگوں کو اسی محتاط زندگی کی تربیت دی جاتی ہے۔

روزہ سلف ڈسپلن کی سالانہ مشق ہے۔ روزہ اختیار کے باوجود بے اختیاری کا ایک تجربہ ہے۔ اسی آدمی کا روزہ سچا روزہ ہے جو روزہ کے عمل سے اس قسم کی ذاتی تربیت پا کر نکلے۔ جس کا روزہ اس کو حقیقی معنی میں شاکر اور متقی بندہ بنا دے۔

اللہ کی پکار

الترمذی اور ابن ماجہ کی ایک روایت روزہ کے بارہ میں ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی خبر دی ان میں سے ایک یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ جب آتا ہے تو اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور اے شر کے طالب رک جا (ینادی منادٍ، یاباغیَ الخیر اقبل ویاباغی الشر اقصر) (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱)

ان الفاظ میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں جب ایک آدمی روزہ رکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ اس کی مادی قوتوں میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے، اور اس کی روحانی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح فطری طور پر اس کے اندر ایک طلب ابھرتی ہے ـــــ نیکی کی طرف بڑھنے کی اور برائیوں سے دور بھاگنے کی۔

روزہ آدمی کی شخصیت کے حیوانی پہلو کو دباتا ہے۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے لطیف احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کر سکے۔

روزہ ایک شدید تجربہ ہے۔ وہ آدمی کے معمولات کو توڑ دیتا ہے۔ آدمی کے صبح و شام غیر معمولی حالات میں بسر ہونے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کمزوری آتی ہے۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ بے آرامی اور بے سکونی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

روزہ کا یہ پہلو آدمی کو موت اور آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ موت کے بعد آدمی کے اوپر محرومی اور بے بسی کی جو کلی حالت پیش آنے والی ہے، روزہ گویا جزئی طور پر اسی محرومی اور بے بسی کی پیشگی یاد دہانی ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آنے والے دن کو اس سے پہلے محسوس کرے جب کہ وہ بالکل سامنے آچکا ہو۔ وہ موت سے پہلے موت کے بعد کی تیاری کرنے میں لگ جائے۔

تقریر رمضان

پچھلے کچھ سالوں سے ہمارے یہاں افطار پارٹی کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر سال رمضان میں سیکڑوں کی تعداد میں اس طرح کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ ان افطار پارٹیوں میں لوگ جمع ہوکر کھاتے پیتے ہیں تفریحی باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی افطار پارٹیوں پر فارسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے:

تن پروریٔ خلق فزوں شد زریاضت جز گرمیٔ افطار ندارد رمضان ہیچ

آج کے پروگرام کا یہ انداز نہایت صحت مند ہے کہ افطار پارٹی کے ساتھ یہاں اس اسلامی عبادت کے موضوع پر تقریروں کا پروگرام رکھا گیا۔ یہ ایک مفید طریقہ ہے۔ اس کے لیے میں پروگرام کے منتظمین کو مبارک باد دیتا ہوں۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے اجتماعات زیادہ سے زیادہ کیے جائیں اور مختلف مواقع کو اسلام کے مثبت تعارف کے لیے استعمال کیا جائے۔

اب مجھے روزے کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہے۔ روزہ ایک سالانہ عبادت ہے جو رمضان کے مہینہ میں ادا کی جاتی ہے۔ اس کا آغاز رمضان کا نیا چاند دیکھ کر ہوتا ہے۔ جب شعبان کا مہینہ ختم ہوتا ہے اور رمضان کی پہلی شام آتی ہے تو تمام آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں تاکہ وہ ہلالِ رمضان کو دیکھ سکیں۔ روزہ کی عبادت اگر شمسی مہینہ کی بنیاد پر قائم کی جاتی تو ایسا نہ ہوتا۔ کیوں کہ شمسی مہینہ کو علم الحساب کے ذریعہ مقرر کیا جاتا ہے نہ کہ آسمان میں نیا چاند دیکھ کر۔

یہ گویا رمضان کے مہینہ کا پہلا سبق ہے۔ اسی طرح رمضان یہ پیغام دیتا ہے کہ تم زمین سے اپنی نظریں اٹھاؤ اور آسمان کی طرف دیکھو۔ تم نیچے کی طرف دیکھنے والے نہ بنو بلکہ اوپر کی طرف دیکھنے والے بنو۔ تم مخلوقات کی سطح سے بلند ہوکر خدا کی سطح پر جینا سیکھو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو فطرت کی زبان میں اس طرح کہا گیا ہے کہ — سادہ زندگی اور اونچی سوچ:

Simple living and high thinking

اب میں روزہ کی حقیقت کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں کچھ باتیں کہوں گا۔

۱۔ قرآن میں جہاں روزہ کا حکم دیا گیا ہے وہاں ارشاد ہوا ہے کہ یہ حکم تم کو اس لیے دیا جارہا ہے کہ تاکہ تمہارے

اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ آدمی کے اندر روحانی صفات پیدا ہوں۔ وہ روحانی ترقی (spiritual development) کا درجہ حاصل کرے۔

روحانیت ایک فطری صفت ہے۔ وہ ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود رہتی ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو فطرت کے اس عمل میں رکاوٹ (distraction) پیدا کرنے والی ہوں۔ انھیں میں سے ایک کھانا پینا بھی ہے۔ آدمی صبح سے شام تک مختلف صورتوں میں کچھ نہ کچھ کھاتا پیتا رہتا ہے۔ یہ کھانا پینا فطرت کے اس عمل کے راستہ میں ایک مستقل خلل اندازی ہے۔ چنانچہ ایک مہینہ کے لیے دن کے اوقات میں اس خلل اندازی پر روک لگادی جاتی ہے تاکہ روحانی ارتقار کا عمل آدمی کے اندر بے روک ٹوک جاری ہو سکے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہے (ولخلوف فم الصائم عند اللہ اطیب من ریح المسك) مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱

اس حدیث میں گویا خوشبو کا لفظ محض اپنے لفظی معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ علامتی معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کا ظاہری پہلو اگرچہ ناخوش گوار ہے اس کا اندرونی پہلو خوش گواریوں سے بھرا ہوا ہے۔ بھوک پیاس کا پُرمشقت تجربہ آدمی کے اندر اس کی روحانیت کو جگاتا ہے۔

انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ اس کے اندر مادیت بھی ہے اور روحانیت بھی۔ روحانیت کی ترقی ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ مادیت کے عنصر کو دبایا جائے۔ روزہ اسی قسم کی ایک تدبیر ہے۔ روزہ کا مقصد آدمی کو اس کے لیے تیار کرنا ہے کہ وہ اپنی روحانیت کا محافظ بن جائے۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنی مادی ضرورتوں میں کمی کرے، خواہ کمی کرنے کا یہ عمل کھانے اور پینے جیسی ناگزیر انسانی ضروریات تک کیوں نہ پہنچ جائے۔

۲۔ حدیث میں روزہ کو شہر الصبر کہا گیا ہے۔ یعنی صبر کا مہینہ۔ اس سے روزہ کا ایک اور اہم پہلو معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ صبر وضبط ہے۔ صبر کیا ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ وہ بے قید زندگی کے مقابلہ میں پابند زندگی کا طریقہ اختیار کرے۔ اس اعتبار سے روزہ خود انضباطی (self-discipline) کی مشق ہے جو صالح زندگی گزارنے کے لیے انتہائی طور پر ضروری ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑے (مشکوٰۃ المصابیح ۱/۶۲۲)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ میں کھانے پینے کا ترک ایک علامتی ترک ہے۔ یہ علامتی ترک اس بات کا سبق ہے کہ آدمی ہر قسم کے جھوٹ اور برائی کو چھوڑ دے۔ وہ اپنے معاملات میں اخلاقی پابندی کا طریقہ اختیار کرے۔

اس طرح روزہ انسان کو سماج کا ایک صالح ممبر بناتا ہے۔ وہ انسان کو اس مقصد کے لیے تربیت دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اعلیٰ کردار کے ساتھ زندگی گزارے اور پست کرداری کا طریقہ چھوڑ دے۔

۳۔ حدیث میں روزہ کے مہینہ کو شہر المواساۃ (ھو شھر المواساۃ) کہا گیا ہے۔ یعنی دوسروں کی ہمدردی کا مہینہ (مشکوٰۃ المصابیح ۱/۶۱۳)

اس پہلو کو دوسرے لفظوں میں انسانی خدمت کہا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے روزہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ روزہ دار کے اندر انسانیت کا درد پیدا کرے۔ وہ دنیا میں صرف اپنے لیے نہ جئے بلکہ دوسروں کے لیے جینا سیکھے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے فرمائے گا کہ میں تمہارے پاس بھوکا آیا مگر تم نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ کہے گا کہ خدایا تو تو رب العالمین ہے تو کیسے بھوکا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آئے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوک کی حالت میں تیرے پاس آیا تھا اگر تو اس کو کھلاتا تو مجھ کو تو اس کے پاس پاتا (صحیح البخاری، کتاب المرضیٰ)

انسان کے انسان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی ضروریات میں ان کے کام آئے۔ وہ سماج کے اندر اس طرح زندگی گزارے کہ دوسروں کی حاجتوں کو پورا کرنا بھی اس کی زندگی کے پروگرام کا ایک جزء بنا ہوا ہو۔ یہ انسانی صفت اس کے اندر ہو سکتی ہے جو دوسروں کی تکلیفوں کو اپنے سینے میں محسوس کرے۔ روزہ گویا یہی کیفیت پیدا کرنے کی ایک تربیت ہے۔ روزہ کے ذریعہ بھوک اور پیاس کے تجربہ کو انسان کا ذاتی تجربہ بنا دیا گیا۔ حاجت مند کے درد کو حاجت براری کرنے والے کے دل میں اتار دیا گیا تاکہ وہ انسانی خدمت کی راہ میں زیادہ سے زیادہ سرگرم ہو سکے۔

۴۔ رمضان کا ایک اور پہلو وہ ہے جس کا ذکر قرآن کی سورۃ نمبر ۹۷ میں آیا ہے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر (شب قدر) میں اتارا۔ یعنی وہ رات جب کہ سال بھر کے متعلق

قضاوقدر کے محکم اور اٹل فیصلے زمین میں کام کرنے والے فرشتوں پر خدا کی طرف سے اتارے جاتے ہیں۔ یہ رات رمضان میں آتی ہے۔ چنانچہ رمضان کی آخری راتوں میں روزہ دار خصوصی طور پر عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ اس رات کے فیوض کو پاسکیں۔ اس سورت (القدر) کا ترجمہ یہ ہے :

> ہم نے اس کو اتارا ہے شب قدر میں۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اترتے ہیں۔ ہر حکم لے کر۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے، صبح نکلنے تک۔

اس سورۃ میں لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا کہ وہ ہزار مہینہ سے بہتر ہے۔ یہ مدت تقریباً ۸۴ سال بنتی ہے۔ یعنی وہ مدت جو کہ انسان کی اوسط عمر کی مدت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر شب قدر کی برکتوں کو پالے جو گویا روزے کی سعادتوں کا آخری نقطۂ عروج (culmination) ہے تو وہ تمام عمر کے لیے اصلاح یافتہ ہو جائے گا۔ اور اگر وہ شب قدر کی سعادتوں کو جزئی طور پر پائے تب بھی کم از کم سال بھر اس کی زندگی پر اس کے مبارک اثرات باقی رہیں گے۔ رمضان کے مہینہ کی اس اہم ترین رات کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ سلامتی ہی سلامتی ہے :

It is all peace till the rising of the dawn.

اس سے روزہ کا ایک اور اہم پہلو معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ روزہ کا مقصد آدمی کے اندر یہ صفت پیدا کرنا ہے کہ اس کی روح سراپا سلامتی بن جائے۔ وہ اپنے سماج کے اندر امن وسلامتی کے ساتھ رہنے لگے۔ سلامتی کی روح وہ ہے جو تکلیفوں میں بھی پرسکون رہے، مادی رغبتوں سے اوپر اٹھ جائے جو ناخوش گواریوں کے ماحول میں بھی خوش گوار جذبات کے ساتھ جینے لگے۔

جس انسان کے اندر سلامتی کی یہ صفت پیدا ہو جائے اس کا وجود پورے ماحول کے لیے سلامتی بن جاتا ہے۔ وہ سماج کا ایک ایسا پر امن شہری بن جاتا ہے جس سے دوسروں کو صرف امن وسلامتی ملے۔ حتی کہ دوسرے لوگ اگر اس کو ستائیں تب بھی وہ اپنی پر امن روش پر پوری طرح قائم رہے۔

سلف کنٹرول کی تربیت

روزہ کے لیے اصل عربی لفظ صوم ہے۔ صوم کے معنی ہیں رکنا (abstinence) روزہ میں چوں کہ آدمی کھانے پینے سے اور دوسری خواہشوں سے رک جاتا ہے، اس لیے اس کو صوم کا نام دیا گیا۔

اسلامی شریعت میں روزہ مسلسل ایک مہینہ تک کے لیے ہے۔ ہر سال قمری کیلنڈر کے اعتبار سے رمضان کے مہینہ میں یہ روزہ رکھا جاتا ہے۔ سال میں ایک مہینہ کا یہ روزہ ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو اس کو رکھنے کی طاقت رکھتا ہو۔

یہ روزہ رمضان کے مہینہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور مہینہ کی آخری تاریخ کو ختم ہوتا ہے۔ چونکہ اس کا انحصار چاند دیکھنے پر ہے، اس لیے وہ کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا۔

صبح کو روزہ شروع کرنے سے پہلے جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو سحری کہتے ہیں۔ اس سحری کا وقت صبح صادق (morning twilight) کے ظہور تک رہتا ہے۔ روزہ توڑنے کے لیے جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو افطار کہتے ہیں۔ اس کا وقت سورج ڈوبنے کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے۔ روزہ دار پر کھانے پینے وغیرہ کی جو پابندی ہے وہ صرف دن کے لیے ہے۔ رات کے وقت کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

شام کو روزہ توڑتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: خدایا، میں نے تیرے حکم سے روزہ رکھا اور تیری اجازت سے میں نے افطار کیا۔ یہ دعا روزہ کی روح کو بتاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کی مرضی کا پابند بنائے۔ یہ پابندی پوری زندگی میں مطلوب ہے۔ رمضان کے مہینہ کا روزہ اسی پابند زندگی کی ایک سالانہ علامتی مشق ہے۔

اسلام کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو امتحان (Test) کے لیے رکھا گیا ہے۔ اس کو جو آزادی ملی ہے وہ اسی لیے ہے کہ وہ اس کو خود اپنی مرضی سے خدا کے حکموں کی پابندی میں استعمال کرے۔ آزادی کے اس پابند استعمال کے لیے آدمی کو اپنی خواہشوں پر روک لگانا پڑتا ہے۔ اس کے لیے سلف کنٹرول کی استعداد درکار ہے۔ روزہ اسی سلف کنٹرول کی سالانہ تربیت ہے۔

سلف کنڑول والی زندگی کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ روزہ یہی صبر کی صفت آدمی کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے۔ دنیا میں اسلامی طرز کی زندگی گزارنے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی اہمیت ہے وہ صبر ہے۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صبر کرنے والوں کو خدا کے یہاں بے حساب اجر دیا جائے گا (39.10)

بے حساب اجر کی یہی خوش خبری حدیث میں روزہ کے لیے بھی بتائی گئی ہے۔ ابوھریرہؓ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے نیک اعمال کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا (بے حساب) بدلہ دوں گا (بخاری ومسلم)

بے حساب بدلہ کا استحقاق اصلاً صبر کے لیے ہے۔ صبر اسلام میں سب سے بڑی نیکی اور سب سے زیادہ قابل قدر صفت ہے۔ روزہ آدمی کو اسی صابرانہ زندگی کے لیے تیار کرتا ہے، اسی لیے روزہ پر بھی بے حساب انعام رکھ دیا گیا۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ کسی کو گالی دے اور نہ کسی سے جھگڑا کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو وہ اس سے کہہ دے کہ "میں ایک روزہ دار آدمی ہوں"

یہی وہ چیز ہے جس کو صبر یا پابندی کہا گیا ہے۔ یعنی اشتعال کا موقع پیش آئے تو اس پر مشتعل نہ ہونا۔ دوسروں کے منفی رویہ کے باوجود اپنے آپ کو مثبت رویہ پر قائم رکھنا۔ کوئی شخص زیادتی کرے تب بھی یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جوابی زیادتی سے بچانا۔

روزہ ایک سالانہ تربیتی کورس ہے جو آدمی کو اسی ضبط نفس کے قابل بناتا ہے۔ جس آدمی کے اندر ضبط نفس آجائے اس کے اندر وہ طاقت آگئی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو تھامے، جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو شریعت کی مقرر کی ہوئی اخلاقی حد پر باقی رکھے، اور صحیح اور مطلوب زندگی گزارے۔

روزہ میں کھانا اور پانی چھوڑنا علامتی طور پر غیر مطلوب چیزوں کو چھوڑنے کا سبق ہے۔ اسی لیے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ جو آدمی جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور اپنا پینا چھوڑ دے۔

ہمدردی کا مہینہ

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کا مہینہ شہر المواسات ہے۔ (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۳) یعنی لوگوں کی مدد کرنے اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا مہینہ۔ یہ روزہ کا وہ پہلو ہے جس کو انسانی پہلو کہا جا سکتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کے مہینہ میں بہت زیادہ صدقہ کرتے تھے۔ اس مہینہ میں کوئی بھی سوال کرنے والا آپ کے یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ روزہ کے مہینہ میں جو شخص کسی کو کھلائے تو وہ اس کے لئے مغفرت کا ذریعہ ہوگا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی روزہ دار کو کھلائے گا تو وہ بھی اس روزہ کے ثواب میں شریک ہو جائے گا (۶۲۱)

روزہ کے مہینہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آدمی بھوک پیاس کا ذاتی تجربہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ امیر اور غریب دونوں کو یکساں طور پر ہوتا ہے۔ یہ تجربہ صرف ایک بار وقتی طور پر نہیں ہوتا بلکہ مسلسل ایک مہینہ تک ہر روز اس کو اس خصوصی کورس سے گزارا جاتا ہے۔

اس طرح روزہ ہر آدمی کو یہ تجربہ کراتا ہے کہ انسانی ضرورتیں کیا ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ پیاس کیا ہے اور بھوک کیا چیز ہے۔ جو لوگ عام حالات میں بھوک پیاس کو محسوس نہیں کر پاتے وہ بھی رمضان کے مہینہ میں ذاتی طور پر اس کا تجربہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح روزہ ہر آدمی کو ایک سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ امیر آدمی بھی کچھ دیر کے لئے اسی حالت پر پہنچ جاتا ہے جس حالت پر ایک غریب آدمی جی رہا تھا۔

اس طرح ہر آدمی کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے۔ ہر آدمی دوسروں کے احساس میں شریک ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھر آتا ہے کہ وہ دوسروں کی ضرورت میں ان کے کام آسکے۔ وہ بقدر استطاعت دوسروں کی مدد کرے۔ اس طرح روزہ ایک دوسرے کی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کا ایک عام جذبہ پیدا کر دیتا ہے جو رمضان کے بعد بھی مہینوں تک باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سال بھر پورا ہو کر پھر دوسرا رمضان آجاتا ہے جو دوبارہ آدمی کے اندر وہی انسانی جذبات ابھار دے۔

دو فرحتیں

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: للصائم فرحتان. یفرحهما. اذا افطر فرح و اذا لقی ربه فرح بصومه. یعنی روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوگا۔ جب وہ افطار کرتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنے رب سے ملے گا تو اپنے روزہ کے انعام پر خوش ہوگا (فتح الباری ۴/۱۴۱، صحیح مسلم بشرح النووی ۸/۳۱)

روزہ دار دن بھر بھوکا پیاسا رہتا ہے۔ اس کے بعد شام کو جب وہ افطار کرتا ہے اور کھانا اور پانی اس کے جسم میں داخل ہوتا ہے تو قدرتی طور پر اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ پھر موت کے بعد آخرت میں جب یہ روزہ دار اللہ سے ملے گا اور اللہ اس کی روزہ داری کے بدلے میں اس کو جنت میں داخل کرے گا تو اس وقت مزید اضافہ کے ساتھ اس کو کامل خوشی حاصل ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ دنیا کی زندگی کی علامت ہے اور افطار آخرت کی زندگی کی علامت۔ دنیا میں مومن کو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے اور قربانیوں کو برداشت کرنا ہے۔ لذتوں سے محروم ہو کر اس کو خدا کی اطاعت کرنا ہے۔ مگر آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا۔ وہاں اس کے لئے خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور وہاں اس کے لئے آرام ہی آرام۔ اس طرح روزہ علامتی طور پر مومن کی دنیا کا تعارف ہے، اور افطار علامتی طور پر مومن کی آخرت کا تعارف۔

دنیا کی زندگی، مومن کے لئے فاقہ کی زندگی ہے، اور آخرت کی زندگی، مومن کے لئے اکل و شرب کی زندگی۔ دنیا میں مومن کے لئے ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں، اور آخرت میں مومن کے لئے انعام ہی انعام۔

روزہ آدمی کو احساس دلاتا ہے کہ دنیا میں اسے قربانیوں کی حد تک جا کر اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اور افطار کی صورت میں اس کو یہ تجربہ کرایا جاتا ہے کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جبکہ اس کا خدا اس طرح کی قدردانی کرے گا کہ اس کو ابدی جنتوں میں داخل کر دے گا جہاں ہر قسم کی لامحدود خوشیاں اور لذتیں بھی ہوں گی، اور اسی کے ساتھ ان سے بہرہ اندوز ہونے کی مکمل آزادی بھی۔

روزہ اور دعا

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں رمضان کے روزہ کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ عین اسی کے درمیان دعا کی آیت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ: اور جب میرے بندے تم سے میری بات پوچھیں تو میں بالکل قریب ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں۔ امید ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے (البقرہ ۱۸۶)

یہ ترتیب بتاتی ہے کہ روزہ اور دعا کے درمیان خاص تعلق ہے۔ روزہ دار انسان عین اسی وقت ایک دعاگو انسان ہوتا ہے۔ روزہ دعا کے ساتھ خصوصی مناسبت رکھتا ہے۔

دعا کیا ہے۔ دعا تڑپتے ہوئے دل کی پکار ہے۔ وہ نفسیاتی سوز کا ایک لفظی اظہار ہے۔ روزہ یہی تڑپ اور یہی سوز وگداز پیدا کرتا ہے۔ روزہ آدمی کے اندر اخبات کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے آدمی کے اندر سچی دعا ابلنے لگے۔

شام کو روزہ کی تکمیل کے وقت جب آدمی یہ کہتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے حکم سے روزہ رکھا، اور تیرے حکم سے میں نے افطار کیا، تو یہ صرف کچھ الفاظ نہیں ہوتے۔ یہ دراصل ایک روحانی تجربہ ہوتا ہے جو لفظوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح مہینہ بھر روزہ آدمی کے اندر عجز وگداز کی کیفیات پیدا کرتا ہے اور اس کے تحت آدمی بار بار خصوصی دعاؤں کا تجربہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ روزہ کا مہینہ پورا ہو جاتا ہے، اس وقت خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ خدایا، تو میرے بقیہ تمام مہینوں کو روزہ کے اس مبارک مہینہ کے تابع کر دے۔ خدایا، میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی، اب تو بھی میری دعاؤں کو قبول کر لے۔

روزہ گویا دعا کی تیاری ہے۔ روزہ آدمی کو چارج کرتا ہے تاکہ وہ حقیقی طور پر دعا کے قابل ہو سکے۔ وہ مطلوب کیفیات کے ساتھ خدا کو پکارنے لگے۔

خدا اپنے بندوں سے قریب ہے، ہر چیز سے زیادہ قریب۔ خدا اپنے بندے سے اتنا زیادہ قریب ہے کہ وہ ان کی پکار کو سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ قرآن میں خدا کا یہ تعارف کسی بندے کے لئے بے حد سکون بخش ہے کہ وہ اپنے رب کو براہ راست پکار سکتا ہے، وہ اپنے رب سے براہ راست اپنا مدعا بیان کر سکتا ہے۔

خدا بلاشبہ اپنے بندوں کے قریب ہے۔ مگر یہ قربت کسی بندے کے لئے ذاتی واقعہ اسی وقت بنتی ہے جبکہ اس پر بندگی کے حقیقی تجربات گزریں۔ جب اس پر احتیاج کی حالت طاری ہو۔ روزہ آدمی کو اسی موافقِ دعا تجربہ سے گزارتا ہے۔ وہ قربت خداوندی کی کیفیات پیدا کرکے آدمی کو سچا دعاگو بناتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا احساس بندگی کے تحت نکلنے والے الفاظ کا نام ہے، اور روزہ اسی احساس بندگی کو پیدا کرنے کی سالانہ تربیت۔ پانی کو نعمت کے طور پر محسوس کرنا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی کو پیاس لگے اور ٹھنڈا پانی اس کی رگوں کو تر کر دے۔ جس آدمی پر پیاس کا تجربہ نہ گزرے وہ پانی کی نعمت کا احساس بھی نہیں کر سکتا۔

روزہ آدمی کے اندر پیاس پیدا کرتا ہے تاکہ جب وہ پانی پئے تو وہ پانی کی نعمت پر سچا شکر ادا کر سکے۔ روزہ آدمی کو احتیاج کی حالت کا احساس دلاتا ہے، تاکہ جب اس کی احتیاج پوری ہو تو وہ بھرپور کیفیات کے ساتھ کہہ سکے کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے میری ضرورتوں کی تکمیل کا اتنا اعلیٰ انتظام فرمایا۔

نئی کتابیں



اخلاقی پرہیزگاری

حدیث میں رمضان کو شہر الصبر کہا گیا ہے (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۳) یعنی صبر و برداشت کا مہینہ۔ اس مہینہ میں آدمی کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے منفی جذبات پر قابو رکھتے ہوئے فتنوں کی اس دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکے۔ آدمی کے منفی جذبات ہی اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور روزہ اسی سب سے بڑے انسانی مسئلہ کے حل کی ایک مقدس تدبیر ہے۔

اس بات کو حدیث میں اس طرح کہا گیا ہے کہ ہر چیز کی ایک زکاۃ ہوتی ہے، اور جسم کی زکاۃ روزہ ہے (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۳۹) یہاں زکوٰۃ سے مراد پاکی ہے۔ یعنی ہر چیز کو پاک کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اور جسم کو پاک کرنے کے لئے روزہ کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کی حیثیت جسم انسانی کے لئے غسل جیسی ہے۔ پانی کا غسل جسم کے ظاہری حصہ کو پاک کرتا ہے، اور روزہ جسم کے باطنی حصہ کو پاک کرنے والا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لئے بلایا جائے اور وہ روزہ دار ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں (اذا دعی احدکم الی طعام وھو صائم فلیقل انی صائم) مشکاۃ المصابیح ۱/۶۴۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو تو وہ نہ بری بات بولے اور نہ شور کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں۔ (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱)

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی عملی پرہیز کی حالت اپنے آپ پر طاری کرے۔ اس طرح اس کے اندر ایک قسم کی پرہیزی فکر ابھرتی ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ دنیا میں مجھے پرہیز والی زندگی گزارنا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اسے کھانے کی کوئی چیز پیش کرے تو وہ فوراً کہہ دیگا کہ میں روزہ دار ہوں۔ کوئی اس کو برا کہے یا اس کے ساتھ اشتعال انگیزی کرے تو اس کے جواب میں وہ مشتعل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس کا دل اس کے اندر سے کہہ رہا ہوگا کہ تم نے تو روزہ رکھ کر پرہیزگار بننے

کا عہد کر رکھا ہے۔ تم کیسے برائی کے فعل میں کسی کے ساتھ شریک ہو سکتے ہو۔

اس طرح روزہ آدمی کے اندر یہ مزاج بناتا ہے کہ وہ غیر انسانی باتوں سے پرہیز کرے۔ وہ غیر شریفانہ قسم کے قول وفعل سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ وہ اخلاقی پرہیز کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارنے لگے۔

یہ پرہیز گاری ہی موجودہ دنیا میں ہر قسم کی دینی اور دنیوی ترقی کی واحد ضمانت ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو امتحان کے لئے بسایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں طرح طرح کی آزمائشی ترغیبات بھی رکھ دی گئی ہیں تاکہ اس کے ذریعہ آدمی کو جانچا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ کون آزمائش میں پورا اترا، اور کون آزمائش میں ناکام ہو گیا۔

سب سے پہلے آدمی کا اپنا نفس ہے۔ آدمی کے نفس کے اندر بہت سے ناپسندیدہ جذبات پیدائشی طور پر موجود ہیں۔ مثلاً حسد، غصہ، نفرت، بغض، خودغرضی، مفاد پرستی، خودبینی، مصلحت پرستی اور انانیت وغیرہ۔ جب کوئی موقع آتا ہے تو یہ جذبات ابھرتے ہیں اور آدمی کو اپنی طرف کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اسی پرہیز گاری کے اصول پر عمل کرے جس کی تربیت ایک اضافی کورس کے ذریعہ رمضان کے مہینہ میں اس کو دی گئی ہے۔

اسی طرح شیطان بار بار آدمی کو بہکاتا ہے۔ انسانی پروپگنڈے اس کو غلط سمت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ عمومی رواج آدمی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ان تمام مواقع پر آدمی گمراہی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت جو آدمی پرہیز گاری کا اصول اختیار کر کے اپنے کو انحراف سے بچا لے وہ کامیاب ہے، اور جو شخص ایسا نہ کر سکے وہ دنیا میں بھی ناکام ہے اور آخرت کی طویل تر زندگی میں بھی ناکام۔

"پرہیز" ایک مستقل اصول ہے۔ اور روزہ اسی پرہیز کے اصول کا ایک سبق ہے۔ روزہ دار وہی ہے جس کا روزہ اس کو پرہیز گارانہ زندگی گزارنے کے قابل بنا دے۔

روزہ کا فائدہ

جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو شیاطین کو باندھ دیا جاتا ہے اور خدا کی رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں (سُلسِلَتِ الشیاطین و فُتحت ابوابُ الرحمۃ)
شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب امتوں میں سے کوئی امت روزہ کا التزام کرتی ہے تو اس کے شیطانوں کو بیڑیوں میں باندھ دیا جاتا ہے اور اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور آگ کے دروازے اس کے اوپر بند کر دیے جاتے ہیں (واذا التزمتہ امۃ من الامم سُلسلت شیاطینھا وفتحت ابواب جنانھا وغلقت ابواب النیران عنھا) حجۃ اللہ البالغہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسانوں میں بھی ہوتے ہیں اور جنات میں بھی (الانعام ۱۱۲) حدیث کے مطابق، روزہ ان دونوں ہی قسم کے شیطانوں سے نجات دینے والا ہے۔ جو قوم حقیقی طور پر روزہ کے اوپر قائم ہو جائے وہ ان دونوں ہی قسم کے شیطانوں سے محفوظ ہو جائے گی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قسم کے شیاطین کے لیے انسان کے اوپر قابو پانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ خود انسان کا اپنا نفس ہے، شیاطینِ جن لوگوں کے نفس کو خواہشوں کے فریب میں مبتلا کر کے ان کے اوپر قابو پاتے ہیں اور پھر جدھر چاہتے ہیں ان کو ادھر لے جاتے ہیں۔

شیاطینِ انس کے لیے بھی انسان کے اوپر قابو پانے کا راستہ یہی ہے، وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے انسان کا نفس بھڑک اٹھے۔ اور جب انسان کا نفس بھڑک اٹھتا ہے تو وہ اپنی عقل کھو دیتا ہے۔ اور پھر شیاطینِ انس کو موقع مل جاتا ہے کہ جس طرح چاہیں اس کو استعمال کریں۔

روزہ آدمی کے نفس کو زیر کرتا ہے۔ وہ آدمی کے حیوانی جذبات کو گھٹاتا ہے اور اس کے ملکوتی جذبات کو ابھارتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ نفسیاتی خواہشوں کا شکار نہ ہو۔ وہ اشتعال انگیز باتوں پر بھڑک کر قابو سے باہر نہ ہو جائے۔ اس طرح روزہ شیاطینِ جن اور شیاطینِ انس دونوں کو گویا اس طرح زنجیروں میں باندھ دیتا ہے کہ وہ انسان کے اوپر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

روزہ کیا ہے

روزہ خود انضباطی (self-discipline) کی مشق ہے۔ روزہ کے دنوں میں آدمی خود اپنے ارادہ اور فیصلے سے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد جب شام کا وقت آتا ہے تو دوبارہ وہ خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو خود انضباطی کی زندگی گزارنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ سال کے ایک مہینہ میں کھانے پینے کے معاملہ میں روزہ دار بن کر وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ سال کے بقیہ مہینوں میں وہ اپنے ہر معاملہ میں روزہ دارانہ زندگی گزار سکے۔

کائنات میں انسان کے سوا بے شمار چیزیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام مکمل طور پر خدا کے تحت ہیں۔ ہر چیز اپنے اختیار کو ترک کر کے خدا کے قانون کی پابندی کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ انسان اطاعت کی اس روش کو خود اپنے ارادہ سے اپنے لئے اختیار کرے۔ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو خدا کا پابند بنالے۔

اسی خود اختیار کردہ پابندی کی تربیت کے لئے روزہ کا نظام مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کوئی سالانہ رسم نہیں، وہ ایک سالانہ تربیت ہے۔ روزہ وقتی طور پر بھوک پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں۔ روزہ مستقل طور پر صبر و برداشت کی زندگی گزارنے کا ایک سبق ہے۔

روزہ میں آدمی کے سامنے کھانا اور پانی ہوتا ہے مگر بھوک پیاس کے باوجود وہ ان کو نہیں لیتا۔ اسی طرح یہ مطلوب ہے کہ آدمی کو خدا کی مرضی کے خلاف چلنے کا موقع ہو مگر خواہش کے باوجود وہ ایسے راستہ پر نہ جائے۔ آدمی کے لئے گھمنڈ کرنے کا امکان پوری طرح موجود ہو، مگر چاہنے کے باوجود وہ گھمنڈ کو چھوڑ کر تواضع کا طریقہ اختیار کرلے۔ آدمی کے لئے بے انصافی کے دروازے کھلے ہوئے ہوں مگر طبیعت کے تقاضے کے باوجود وہ زیادتی اور بے انصافی سے دور رہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس دنیا میں خود عائد کردہ پابندی کی ایک زندگی گزارے۔ روزہ میں یہ پابندی کھانے پینے کے معاملہ میں ہوتی ہے اور بقیہ زندگی میں یہ پابندی اخلاقی سلوک کے معاملہ میں۔

روزہ کی حقیقت

مسند احمد اور الترمذی میں یہ روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہ پیشکش کی کہ وہ میرے لئے مکہ کی وادی کو سونا بنادے۔ میں نے کہا کہ نہیں اے میرے رب، بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پس جب میں بھوکا رہوں تو میں تجھ سے تضرع کروں اور تجھ کو یاد کروں اور جب میں شکم سیر ہوں تو میں تیری حمد کروں اور تیرا شکر کروں (**عرض علي ربي ليجعل لي بطحاء مكة ذهباً، فقلت : لا يا رب! ولكن أشبع يوماً و اجوع يوماً، فاذا جعت تضرعت اليك و ذكرتك، وإذا شبعتُ حمدتك وشكرتك) مشكاة المصابيح ۴۴۳/۳**

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ احوال کے بغیر کیفیات پیدا نہیں ہوتیں۔ بھوک آدمی کے اندر عجز کی کیفیت ابھارتی ہے اور اس کو خدا کی یاد کرنے والا بناتی ہے۔ اس کے بعد جب آدمی کو سیری حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کے اندر شکر کے جذبات کو بیدار کرتی ہے اور اس کو حمد خداوندی میں مشغول کر دیتی ہے۔

یہی روزہ کا اصل مقصد ہے۔ روزہ ایک سالانہ تربیتی کورس ہے جس کے ذریعہ آدمی کے اوپر بھوک کے احوال پیدا کئے جاتے ہیں، تاکہ اس کے اندر عجز اور تضرع اور انابت کی کیفیات ابھریں، وہ اللہ کو یاد کرنے والا بن جائے۔

روزہ میں دن کے وقت آدمی کو بھوک کا تجربہ کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد رات کو اسے اس تجربہ سے گذارا جاتا ہے کہ وہ شکم سیر ہو کر کھائے اور پئے، تاکہ اس کے اندر شکر کے جذبات بیدار ہوں اور اس کا سینہ حمد خداوندی سے معمور ہو جائے۔

تضرع اور شکر دو انتہائی مطلوب دینی کیفیات ہیں۔ رمضان کے روزے کا مقصد یہ ہے کہ دن کی بھوک اور رات کی شکم سیری کے ذریعہ یہ دونوں مطلوب کیفیات آدمی کے اندر پیدا کی جائیں۔

علامتی روزہ

رمضان کے مہینہ کا روزہ ایک اعتبار سے علامتی روزہ ہے۔ قرآن (البقرہ ۱۸۵) کے لفظوں میں وہ م یُسر ہے نہ کہ صوم عُسر۔ رمضان کے مہینہ میں جو روزہ رکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ۳۰ دنوں تک کے لیے ن کے اوقات میں جسم کو کھانے اور پینے سے روک دیا جاتا ہے۔ کھانا اور پانی انسان کی ایک ضرورت ہے۔ ی طرح انسان کی اور بھی اَن گنت ضرورتیں ہیں، محدود مدت کے لیے صرف ایک ضرورت پر پابندی عائد کرنا یا صوم یسر ہے۔ اسی طرح اگر تمام ضرورتوں پر پابندی لگادی جائے تو وہ صوم عسر کے ہم معنی ہوگا۔

مگر انسان اپنے عجز کی بنا پر صوم عسر کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو صوم یسر کم دیا۔ تاکہ وہ اپنی ایک ضرورت کے بارہ میں محدود پابندی کا تجربہ کرکے اپنے اندر اس احساس کو جگائے ب العالمین اگر اسی طرح تمام ضرورتوں پر پابندی عائد کردے تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ ی کے اندر زیادہ سے زیادہ شکر کا جذبہ پیدا ہو۔

اب صوم عُسر کا تصور کیجیے ـــــ انسان کا نظام ہضم (میٹابلزم) اگر کام کرنے سے رک جائے۔ دل خون کے دوران کو جاری نہ کرے۔ دماغ کا کمپیوٹر اگر اپنا کام بند کردے۔ طبیعت مدبرۂ بدن اگر اپنے ں کو روک دے تو یہ سب صوم عسر ہوگا۔ اسی طرح جسم کے باہر سورج اگر روشنی اور حرارت ہماری طرف نہ بھیجے۔ اگر ہوا آکسیجن کی سپلائی نہ کرے۔ زمین اگر اپنی قوت کشش کو معطل کردے۔ اس طرح کی بے شمار یزیں ہیں جو گویا صوم عسر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر وہ پیش آجائیں تو انسان کی پوری زندگی تہہ وبالا کر رہ جائے گی۔

یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے صوم عسر کا حکم نہ دے کر ہم کو صرف صوم یسر کا مکلف کیا۔ سان اگر اس خدائی رحمت کا احساس کرکے اس پر سچا شکر ادا کرے تو اس کو نہ صرف صوم یسر کا اجر ملے گا بلکہ صوم عسر کا عظیم تر ثواب بھی پائے گا۔ اسی لیے حدیث میں یہ بشارت آئی ہے کہ دوسرے تمام اعمال کا اجر ں گنا سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر صوم (روزہ) کا اجر لامحدود ہے، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف ے اپنے بندوں کو دیا جائے گا۔ یہ عظیم ثواب ان لوگوں کے لیے ہے جو جسمانی طور پر صوم یسر کا اہتمام کرنے ے ساتھ شعوری طور پر صوم عسر کا بھی تجربہ کرسکیں۔

دلیل نبوت

رمضان کا مہینہ اسلام میں روزہ کا مہینہ ہے۔ قرآن میں صوم رمضان کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے اگلوں پر وہ فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو (البقرہ ۱۸۳)

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مذاہب کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی چھوٹا یا بڑا مذہب ایسا نہیں ہے جس میں روزہ کا تصور موجود نہ ہو۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی طور پر روزہ کا رواج پایا جاتا ہے۔ انسانی معاشروں کے ایک مغربی عالم نے لکھا ہے کہ یہ مشکل ہوگا کہ کسی بھی ایسے مذہبی نظام کی نشاندہی کی جائے جس میں روزہ (fasting) کو بالکل ہی نہ مانا گیا ہو:

It would be difficult to name any religious system of any description in which it is wholly unrecognized. (X/193)

مزید یہ کہ عرب قبائل میں اس زمانہ میں جو مذہب تھا اس میں روزہ کا رواج پایا نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے مشرکانہ سماج میں روزہ کا کوئی رواج موجود تھا:

We have no evidence of any practice of fasting in pre-Islamic pagan Arabia. (p. 133)

ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے مذکورہ الفاظ محض سادہ الفاظ نہیں۔ بلکہ وہ دلیل نبوت ہیں۔ مواصلات اور معلومات کے جدید دور سے چودہ سو سال پہلے عرب کا ایک آدمی ہرگز یہ نہیں جان سکتا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ کا رواج کسی نہ کسی طرح پایا جاتا ہے۔ جب کہ حال یہ تھا کہ اپنے قریبی معاشرہ میں وہ ایسے عمل کا مشاہدہ بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خدا کے پیغمبر تھے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جو اُس وقت آپ کو اس عالمی واقعہ کی خبر دے سکے۔

عید الفطر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں کے لوگ ایک سالانہ تیوہار مناتے تھے۔ اس میں کھیل تماشا اور دنگل ہوا کرتا تھا۔ آپ نے اہل ایمان سے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے اس سے بہتر دو تیوہار مقرر کئے ہیں ——— عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔

عید الفطر کے معنی ہیں افطار کا تیوہار۔ یہ رمضان کا مہینہ ختم ہونے کے فوراً بعد آتا ہے۔ اس دن مسلمان آزادانہ طور پر کھاتے پیتے ہیں۔ خوش ہو کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ دو رکعت خصوصی نماز اجتماعی طور پر پڑھتے ہیں۔ یہ گویا مہینہ بھر کی پابندی کے بعد آزادی کا دور شروع ہونے کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو عید الفطر کہا جاتا ہے۔

عید کے دن لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باہر آتے ہیں تو ہر طرف السلام علیکم، السلام علیکم کا ماحول قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح لوگوں میں خوش گوار تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ محبت اور ہمدردی کی روایتیں زندہ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے احترام کی قدریں فروغ پاتی ہیں۔ یہ احساس ابھرتا ہے کہ تمام انسان ایک وسیع کنبہ ہیں۔ اور سب کو باہم مل جل کر اور ایک دوسرے کا خیر خواہ بن کر رہنا چاہئے۔

ان احساسات کے تحت جب تمام چھوٹے اور بڑے لوگ میدان میں جمع ہو کر اکٹھے عبادت کرتے ہیں تو وہ اس بات کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ سب کا خدا ایک خدا ہے۔ اور تمام انسان اسی کے بندے ہیں۔ اس طرح عید کے دن کا مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اتحاد اور یک جہتی کو فروغ دینے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

عید کا دن عبادت کا دن ہے۔ عید کا دن خوشی منانے کا دن ہے۔ عید کا دن سماجی قدروں کو فروغ دینے کا دن ہے۔ عید کا دن انسانی تعلقات قائم کرنے کا دن ہے۔ عید کا دن اس لئے ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کرنا سیکھیں۔ لوگ ایک دوسرے کا احترام کرنے کی تربیت حاصل کریں۔ عید کا دن بیک وقت خدائی دن بھی ہے اور اسی کے [redacted] کے ساتھ

انسان کے تعلقات کو بڑھاتا ہے اسی کے ساتھ وہ انسانی تعلقات کو اس بنیاد پر استوار کرتا ہے؛ واحد مضبوط بنیاد ہے، یعنی باہمی محبت۔ عید آغازِ حیات کا دن ہے۔ روزہ کا مہینہ احتساب کا مہینہ ہے اور عید کا دن اس کے بعد نئے حوصلوں کے ساتھ مستقبل کی طرف اپنا سفر شروع کرنے کا دن۔

روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دنیا سے اور دنیا کی چیزوں سے ایک محدود مدت کے لئے کٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ اپنی فطری ضروریات تک میں کمی کر دے۔ رمضان کا اعتکاف اسی کی انتہائی صورت ہے جب کہ بندہ ماسوا سے قطع تعلق کر کے خدا کے گھر میں آکر پڑ جاتا ہے۔ اس کا مطلب لوگوں کو رہبان بنانا نہیں ہے۔ یہ "حساب کئے جانے سے پہلے اپنا حساب کر لو" کا ایک وقتی لمحہ ہے تاکہ مستقل زندگی کے لئے لوگوں کو تیار کیا جائے۔ عید کا دن اس وقتی لمحہ کا خاتمہ ہے جب کہ مسلمان نئے شعور اور نئی قوت عمل کے ساتھ از سر نو زندگی کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ تزکیۂ نفس اور صبر اور تعلق باللہ کی جو دولت اس نے روزہ کے ذریعہ پائی ہے، اس کو وہ ساری زندگی میں پھیلانے کے لئے دوبارہ دنیا کے ہنگاموں میں واپس آجاتا ہے ــــ روزہ وقتی طور پر عالم مادی سے کٹنا ہے اور عید دوبارہ عالم مادی میں لوٹ آنا۔ روزہ جس طرح محض بھوک پیاس نہیں ہے۔ اسی طرح عید محض کھیل تماشہ کا نام نہیں ہے۔ روزہ اللہ سے قربت حاصل کرنے کی کوشش ہے اور عید اس نئے بہتر سال کا آغاز ہے جو روزہ کے بعد روزہ داروں کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

آیئے ہم عید سے اپنی نئی زندگی شروع کریں۔ عید کے دن کو اپنی دینی وملی تعمیر کے آغاز کا دن بنائیں۔ آج ہم نئی ایمانی قوت اور نئے عملی حوصلہ کے ساتھ زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوں۔ ہمارا سینہ خدا کے نور سے روشن ہو۔ ہماری مسجدیں خدا کے ذکر سے آباد ہوں۔ ہمارے گھر تقویٰ اور تواضع کے گھر بن جائیں۔ اللہ کے لئے ہم سب ایک ہو کر وہ جدوجہد شروع کریں جس کے نتیجہ میں ہم کو دنیا میں اللہ کی نصرت ملتی ہے اور آخرت میں اللہ کی جنت۔ روزہ کے بعد عید کا آنا روزہ داروں کے لئے خوش خبری ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے اعلان ہے کہ اگر ہم نے روزہ کی اسپرٹ کو زندگی میں استعمال کیا تو ہم دونوں جہان کی خوشیوں سے ہم کنار ہوں گے۔